ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ

(جلد اوّل)

مرتبۂ

سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیفؔ جائسی مدیر ماہنامہ شعاع عمل لکھنؤ

نام کتاب	:	ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ (جلد اول)
مرتب	:	سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیف جائسی
طباعت	:	بار اول
تعداد اشاعت	:	پانچ سو (۵۰۰)
سال اشاعت	:	جولائی ۲۰۱۸ء
قیمت	:	(۳۰۰) روپئے

ناشر

ولایت پبلیکیشنز، نئی دہلی

عرض ناشر

فہرست

ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ (جلد اول)

عرضِ مرتب

خدا کا شکر ہے کہ چند مہینوں کے اندر بندہ کی ترتیب کردہ ایک ضخیم جلد مجدد شریعت حضرت غفران مآبؒ اور ان کے پانچ مجتہد فرزندوں کی حیات اور خدمات کے متعلق اور دو جلدیں خاندان اجتہاد کے چند علماء ادباء، اور فقہاء کے علمی و عملی کارناموں کے تعلق سے چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اب یہ کتاب ''ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ (جلد اول) پیش ہے جس میں چند منابع، مضامین، ایک کتاب اور دو مرثیے شامل ہیں۔

پہلے دو مضامین مشہور زمانہ فقیہ و مرجع تقلید، محدث و مورخ، ادیب و خطیب اور صاحب طرز شاعر، آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقویؒ عالمؔ کے ہیں جن میں شیعہ مذہب کے خصوصیات و عقائد اور تدریجی احوال بیان کئے گئے ہیں۔

ایک مقالہ اردو زبان وادب کے بڑے ادیب، ناقد شیعہ تاریخ کے ماہر مولانا سید محمد باقر شمسؔ لکھنوی (کراچی) کا ہے جس میں موصوف نے ہندوستان میں شیعوں کی تاریخ اور ان کے عقائد پر بیحد مضبوط اور کامیاب باتیں لکھی ہیں۔

چوتھا مضمون اردو ادبیات کے ماہر، ناقد و ادیب و شاعر خصوصاً مرثیہ نگار مولوی سید قائم مہدی نقوی ساحرؔ لکھنوی (کراچی) کا ہے جو اردو زبان میں دنیا کی پہلی تفسیر توضیح المجید (سات مجلدات) پر ہے جسے اردو ادب میں تفسیر زبروبینہ کے نام سے جانا جاتا ہے اور جو مجدد شریعۃ حضرت غفران مآب کے دوسرے فرزند ارجمند سید المفسرین آیۃ اللہ سید علی کی تصنیف ہے۔

پانچواں مقالہ نامور عالم، ادیب، شاعر، ناقد، مقرر، مورخ، ناول نگار اور صحافی، خطیب اکبر، لسان الشعراء، سید الادباء مولانا سید اولاد حسین شاعرؔ کا ہے جو ہندوتان کی شیعہ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ مولانا کی یہ کتاب ''نظارہ'' لکھنؤ کے ان ابتدائی شماروں سے ماخوذ ہے جب نظارہ رسالہ کی صورت میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں تاریخ شیعہ کا مقدمہ اور دکن کی ابتدائی شیعہ سلطنت کا تذکرہ ہے۔ کاش کہ نظارہ کے اور بھی شمارے مل جاتے تو اسے بھی کتاب لکھتا

اورممکن ہے کہ مولانا نے یہ تاریخ پوری کردی ہو۔افسوس ہے کہ خطیب اکبر کے اکثر منظومات و منثورات کا اب کہیں پتہ نہیں چل رہا کہ کہاں ہیں اور کس کے پاس یا کس کتبخانے میں ہیں۔ممکن ہے کہ کچھ کتابیں رضا لائبریری رامپور یا وہاں کی کسی اور لائبریری میں ہوں اس لئے کہ مولانا ریاست رامپور میں افسر امورخیر کے منصب پر فائز تھے۔

شاعرؔ کے مقالہ کے بعد دنیاوی علوم خصوصاً اسلام اور سائنس پر تحقیقی کام کرنے والے اولین چندلوگوں میں سے ایک شخص یعنی حکیم الامۃ علامۂ ہندی آیۃ اللہ العظمیٰ سید احمد نقوی کی کتاب ہے جس میں شیعہ مذہب کا تعارف نیز ائمہ معصومینؑ کے کارنامے اوران کی قربانیاں ساتھ ہی ان کی اولاد اور چاہنے والوں کے مصائب وشہادت کا ذکر ہے۔مکتوبہ پُراز معلومات ہے۔

چھٹا مقالہ علامہ سید مجتبیٰ حسن کامونپوری کا ہے۔آپ شیعہ ادب وتاریخ کے ماہر ادیب و مورخ ہیں۔اس مضمون میں مولانا نے دینی تعلیم میں شیعوں کے کارنامے دکھائے ہیں آخری حصے میں ہندوستان میں علماء کے خدمات کا ذکر ہے جن ممتاز علماء میں مولانا شاہ محمد طاہر دکنی، پیشوائے دکن علامہ میر محمد مومنؒ، علامہ قاضی نوراللہ شوستریؒ، علامہ تفضّل حسین خان اور مجدد شریعۃ حضرت غفران مآب کے تذکرے ہیں۔مضمون عالی ہے۔لیکن میر محمد مومن کا غفران مآب سے موازنہ شاید مناسب نہیں اس طرح کام اور بھی چند علماء نے کبھی کبھی کیا ہے۔مثلاً کوئی شہید ثالثؒ کو غفران مآبؒ کے مقابلہ میں لاتا ہے۔کوئی خان علامہ کا تقابل کرتا ہے ایسے ہی کوئی علامہ مفتی محمد عباس اور علامہ میر حامد حسین کو ان کے اساتذہ، سلطان العلماءؒ اور سید العلماء کے برابر کرنے کی کوشش کرتا ہے یاد رہے کہ مذکورہ سارے علماء کرام بلکہ اور بھی بہت سے بڑے علماء دکن، کشمیر اور اودھ میں ہوئے جن کے کارنامے آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں لیکن مجدد شریعۃ سید دلدار علی غفران مآبؒ اور ان فرزندوں کا تقابل برصغیر میں کسی بھی عالم سے مناسب نہیں ہے اس لئے کہ ان لوگوں کے زیر تعلیم و تبلیغ کوئی ایک صوبہ نہیں ہے۔ان کا دائرۂ تبلیغ اور حلقہ اثر بہت وسیع ہے۔ان کا دبستان علم واجتہاد پورے برصغیر پر حاوی اور محیط ہے۔جس کے آثار واثرات آج بھی علماء و مداس و مراکز تحقیق کی صورت میں نظر آرہے ہیں۔برصغیر کے بیشتر عالم اگر اپنے سلسلۂ تلمذ پر غور کریں گے تو وہ اپنے کو اس

تسلسل کی ایک کڑی پائیں گے جوحضرت غفران مآبؒ سے شروع ہوا ہے۔

ساتواں مضمون معروف عالم، ادیب اورتذکرہ نویس مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کا ہے جومختصر لیکن معلوماتی ہے۔

آٹھواں مضمون عظیم مورخ مولانا سید محمد باقر شمسؔ کا ہے جوعہد نواب آصف الدولہ بہادر سے متعلق اور خزانۂ معلومات ہے۔ آخر میں دو تاریخی مرثیے ہیں جن میں پہلا مرثیہ خطیب اکبر کا تصنیف کردہ ہے جس میں ہندوستان کی شیعہ تاریخ حضرت علی اصغرؑ اور سیدالشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے فضائل ومصائب ہیں۔ دوسرا مرثیہ شاعر اہلبیتؑ حضرت ساحرؔ اجتہادی کا ہے جس میں برصغیر کے اردو مرثیہ نگاروں کا ذکر ہے اور مرثیہ کے آخر میں منثور صورت میں مذکورہ شعراء کا مختصر تذکرہ جناب ہلال نقوی صاحب کے قلم سے ہے۔ اس جلد میں اور اس سے پہلے کی جلدوں میں مرثیے پورے شائع کئے گئے ہیں۔ اس لئے کہ ہندوپاک میں مجالس عزا میں مرثیہ خوانی ہوتی ہے۔ مرثیہ خوان حضرات ان جلدوں سے مجلسوں میں مرثیے پڑھ سکتے ہیں۔ مرثیے فکری اور فنی اعتبار سے بہت عالی ومعیاری ہیں پھر سننے والے فضائل ومصائب کوسن کر جہاں ثواب حاصل کریں گے وہیں برصغیر کی شیعہ تاریخ سے بھی بخوبی آگاہ ہوں گے۔ ممکن ہے کچھ افراد میں شوق پیدا ہو اور وہ اپنی میراث کا تفصیلی مطالعہ کر کے شیعہ تاریخ پر تحقیقی کام کرنے پر آمادہ ہوں۔ قوی امید ہے کہ خوشہ چینانِ علم وادب اس کتاب سے بھی استفادہ کرتے ہوئے حقیر کو دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں گے۔

گدائے باب علم
مصطفیٰ حسین نقوی اسیفؔ جائسی
مدیر ماہنامہ شعاع عمل، لکھنؤ
نور ہدایت فاؤنڈیشن، امام باڑہ حضرت غفران مآبؒ
مولانا کلب حسین روڈ، چوک لکھنؤ
موبائل نمبر: 09335276180

شیعیت کا تعارف

مصنف

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

شیعیت کا تعارف

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الۡاَنۡبِیَآءِ والۡمُرۡسَلِیۡنَ وَاٰلِہٖ الطَّیِّبِیۡنَ وَالطَّاھِرِیۡنَ

چونکہ شیعی دعوت، شیعی مذہب اور فرقۂ شیعہ کے متعلق بہت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اور بہت سے افراد نیک نیتی کے باوجود ناواقفیت کی بنا پر تاریکی میں مبتلا ہیں اس لئے یہ رسالہ حقیقت امر کو بے نقاب کرنے کے لئے لکھا جارہا ہے تاکہ نیک دل اشخاص سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں اور مخالفت بھی کرنا چاہیں تو سمجھ کر مخالفت کریں۔

لِّیَهۡلِكَ مَنۡ هَلَكَ عَنۡ بَیِّنَةٍ وَیَحۡیٰی مَنۡ حَیَّ عَنۡ بَیِّنَةٍ۔ (سورہ انفال آیت ۴۲)

شیعی دعوت کیا ہے؟

شیعی دعوت کوئی نئی چیز نہیں ہے، وہ وہی اسلام ہے جس کے لئے انبیاؑء کی دعوت رہی، کتب سماوی کی دعوت رہی، جو پیغمبر اسلامؐ کی حقیقی دعوت تھی اور قرآن کی حقیقی دعوت تھی۔

یہی وہ دعوت تھی جس کی خاطر انبیاء ومرسلینؑ نے زحمتیں اٹھائیں۔ حضرت خاتم المرسلینؐ نے جس کی وجہ سے ایذائیں سہیں اور قربانیاں پیش کیں۔

اس دعوت کے محافظ رسولؐ کے بعد آلِ رسولؑ رہے اور چونکہ شیعہ کے معنی عربی میں متبعین اور پیروؤں کی جماعت کے ہیں اس لئے جو اس دعوت کی اصل حقیقت پر برقرار رہے، وہ ''شیعۂ آل رسولؐ یا شیعۂ علیؑ'' کہلائے۔

اسلام کے معنی

اسلام کے معنی لغت میں دو ہیں۔ایک سر نہادن بطاعت یعنی اللہ کے سامنے اطاعت کے لئے سر جھکا دینا اور دوسرے ''سپردن'' یعنی اپنے کو اللہ کے سپرد کر دینا۔

ان دونوں کا نتیجہ یہی ہے کہ اللہ کی مرضی کے مقابلہ میں انسان کا حقِ خودداری، خواہ شخصی ہو یا جمہوری، کوئی چیز نہیں ہے۔ حاکم مطلق صرف اللہ ہے اور جسے وہ اپنا نائب بنائے، صرف اس کی اطاعت انسان کے لئے فرض ہے اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا حق حکومت نہیں رکھتا اور جو حکومت اس کے مقابلہ میں قائم ہو، وہ حکومت ناجائز ہے۔

یہی اسلام ہے اور اسی کا نام شیعیت ہے۔

حکومت الٰہیہ کی بنیاد اور انبیاء و مرسلینؑ کا مشن

کائنات عالم میں ہر شئے خالق فطرت کی مرضی کے مطابق چل رہی ہے۔ یہ فطری اسلام ہے جس سے عالم کا کوئی ذرّہ خارج نہیں ہے۔

انسان بھی کائنات عالم کا ایک جز ہونے کے اعتبار سے اپنے نظام تخلیق اور نشوونما میں کم سنی سے لے کر جوانی اور بڑھاپے کی منزلوں سے گذرتا ہوا موت کے ہنگام تک مثل دنیا کی تمام چیزوں کے ایک قہری تحریک کی پابندی کرتا ہوا چلا جاتا ہے اور اس میں مومن اور کافر کا فرق نہیں ہے۔ مگر انسان میں اس کے شایان شان امتیاز کو نمایاں کرنے کے لئے ایک ارادہ واختیار کا جوہر ودیعت کیا گیا ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اس اختیار کی بدولت کبھی کبھی احکامِ خدا سے سرتابی کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ یہاں اللہ کی مرضی اس کے سامنے تعلیمات کی شکل میں آتی ہے اور اگر وہ ان تعلیمات کو قبول کرتا اور ان پر عمل پیرا ہوتا ہے، تو مومن اور نیکوکار قرار پاتا (ہے) اور اگر ان احکام سے انکار کرتا اور ان کی تعمیل میں غفلت برتتا ہے تو کافر اور گنہگار ٹھہرتا ہے۔ انبیاء ومرسلینؑ آئے تھے، انسانوں کو انہی تعلیمات کے پہنچانے کے لئے اور مقصد یہ تھا کہ انسان خود اختیاری طور پر بھی اللہ کی حکومت کو تسلیم کرلے جس کی قہری طور پر

وہ اپنے نظام فطرت میں اطاعت کرتا ہی ہے یعنی اس کی اختیاری کارگزاری اس کے فطری نظام زندگی کے مطابق ہوجائے۔اس کے نظام حیات میں یہ دوعملی نہ ہو کہ فطری طور پر تو وہ اللہ کا محکوم ہے اور ارادی طور پر وہ اپنے امکان بھر کسی دوسرے کا محکوم ہو یا خود اپنی جگہ حاکم بن بیٹھے۔اسی کا نام وہ اسلام ہے جسے انبیاءؑ لے کر آئے۔ان کا نصب العین تھا: انسانوں کو حکومت الٰہیہ کا احساس پیدا کرانا، ارادی طور پر اس کے وفادار، رعایا ہونے کا اقرار لینا اور اس کے عملی تقاضوں کو پورا کرنا۔

اس کے مقابلہ میں حاکم بننے والے وہی تھے جو خدائی کے دعوے دار ہوئے جیسے فرعون، نمرود اور شداد اور اللہ کے سامنے دوسروں کی اطاعت کرنے والے ان سلاطین کی رعایا وہ عوام تھے جو انھیں خدا مان رہے تھے۔

یہ زعم خدائی کبھی الفاظ کے قالب میں آ گیا۔اور کبھی زبان سے تو خدائی کا دعویٰ نہیں کیا گیا مگر اس کے احکام کے مقابلہ میں مطلق العنانی اور سرکشی کے عملی مظاہرات اسی زعم کی غمازی کرتے رہے اور باطل جبروت کی اندھادھند نمائشیں اپنے پس منظر میں زعم خدائی ہی کا پتہ دیتی رہیں۔

انبیاء ومرسلینؑ کی تمام جنگ ایسے ہی خدایانِ باطل اور ان کے پرستاروں سے رہی۔ ہمیشہ لڑائی اسی کی تھی کہ انبیاءؑ چاہتے تھے کہ دنیا حکومت الٰہیہ کے سامنے سر جھکا دے اور غلط طاقتوں کے علم بردار اس حکومت کے ماننے سے انکار کرتے تھے۔

شاہی، شہنشاہی اور جمہوریت جتنی قسم کی حکومتیں سیاسی دنیا میں مروّج ہیں ان سب کی بنیاد انسانوں پر خود انسانوں کی حکومت کا تخیل ہے یہ حکومت ایک فرد کی ہو یا بہت سے افراد کی ملا کر۔بہرحال اس خداوندی حقِ اقتدار کے خلاف ہے جس کے قائم کرنے کا اسلام علمبردار ہے۔

اس بارے میں اگر افرادِ انسانی کا اجماع اور شوریٰ کوئی وزن رکھتا ہو تو یاد رکھنا چاہئے کہ ہر نبیؑ اور رسولؑ کے مقابلہ میں اس وقت کے خطاکار انسانوں کا ہمیشہ ایسا زبردست اجماع رہا جس سے بڑھ کر مشکل ہی سے کوئی اجماع بنایا جاسکتا ہے۔اگر انسانوں کی اکثریت کا کسی امر

پر متفق ہوجانا حقانیت کی دلیل ہوتا تو انبیاؑء کی نبوتیں اور مرسلینؑ کی رسالتیں سب بے حقیقت ہوجاتیں۔ انبیاؑء کا تو کام ہی یہ تھا کہ وہ غلط اجماعوں کو اپنی ہدایت سے شکست دیں۔ اکثریت کے طلسم کو توڑیں اور اس حقیقت سے روشناس بنائیں جو جمہور کی نگاہ سے اوجھل ہے۔

حاکم حقیقی (اور) خودساختہ یا دم ساختہ حاکموں کا تصادم ہی تھا جو خلقتِ آدمؑ کے بعد سے برابر اسلام اور کفر کی صورت میں نمودار رہا۔

یہ اسلام اور کفر کی جنگ حقیقت میں آزادی اور غلامی کی جنگ تھی۔ غلامی ناجائز دباؤ کی، چاہے وہ نفسانی خواہشیں کیوں نہ ہوں کہ اس میں بھی انسان کا ضمیر محسوس کرتا ہے کہ میں غلط کررہا ہوں، مگر ہواؤ ہوس کی قوت سے اپنے کو مجبور سمجھتا ہے۔ یہ فعل اس کا آزادی کے ماتحت نہیں، بلکہ گرفتاری کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ پھر اس کے آگے طاقت کی غلامی، اکثریت کے دباؤ کی غلامی، تیروتفنگ کے ڈر سے، فوج ولشکر کے دباؤ اور قید وبند کی دہشت سے کسی غلبہ واقتدار کی غلامی۔ اسلام ظاہر میں اللہ کی بندگی کی دعوت دیتا تھا، مگر اس اللہ کی بندگی کے پسِ پشت اس قسم کے ہر دباؤ سے آزادی تھی جو انسانی ضمیر کو راہِ راست کے خلاف چلنے پر مجبور کرے، خواہ وہ ایک فرد کی حکومت ہو یا بہت سوں کی یا اپنے نفسانی خواہشات کی۔ اسلام ان کے لئے آزادی کا پیغام ہے، وہ ضمیر کی حریت کا نام ہے، جس میں قانون صرف عدل واعتدال، نیکی اور فلاح ملاح عام کے اسباب کی ذمہ داری ہے۔ یہاں کوئی تخت وتاج اور حشم وخدم کا مالک بھاری بھرکم تن ونوش رکھنے والا پیش نظر نہیں ہوتا جو ضمیر کو مجبور کرکے اس ضمیر کے تقاضے کے خلاف اپنی اطاعت کرائے، بلکہ احساسات کے حدود سے باہر ایک ان دیکھی طاقت ہے، جو انسان کو ہر اچھائی کی تحریک کرتی اور ہر برائی سے روکتی ہے۔ جس کا ایک ترجمان خود ہر ایک کا عقل وضمیر ہے اور جس کے احکام ہمیشہ اس ضمیر کی آواز کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہ حاکم اللہ ہوتا ہے۔'' اور اس کا قانون وہ ہے جسے قرآن نے جامع الفاظ میں اس طرح بتایا ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ

وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔

(سورۂ نحل:۹۰)

(اللہ کا فرمان عدل ہے اور احسان اور جس جس سے جو رشتہ ہو اس کے تقاضوں کا پورا کرنا اور ممانعت ہے ہر بے اعتدالی بدی اور سیاہ کاری سے۔)

انبیاء و مرسلینؑ صرف اسی حکومتِ عدل کے احکام کی ترجمانی کرتے تھے انھوں نے خود کبھی اپنے کو حاکم نہیں کہا۔ اور اسی لئے انبیاؑء کے لئے یہ ضروری ہوا کہ وہ جذبات سے بری اور ہواؤ ہوس کی قید سے آزاد ہوں۔ ایسے ہی انسان کو معصوم کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر وہ شخص خود نفسانیت میں گرفتار ہوا تو وہ خلائق کو اس آزادی سے متعارف نہیں بنا سکتا، جو اسلام کا حقیقی نصب العین ہے۔ پھر ممکن ہے کہ وہ خود حاکم ہونے کا خواب دیکھنے لگے اور اس طرح دنیا کو اللہ کے بجائے خود اپنے سامنے سر جھکانے کی دعوت دے۔ قرآن نے صاف الفاظ میں اس خطرہ کا اظہار کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اللہ کے فرستادہ نبی اور رسولؐ اس سے بری ہوتے ہیں کہ وہ خلائق کو اللہ سے ہٹا کر خود اپنا غلام بنانے کی کوشش کریں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَن يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّي مِن دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔

(سورۂ آل عمران:۷۹)

بلاشبہ جب حاکم غیر معصوم یعنی ہواؤ ہوس میں گرفتار ہوگا تو اس سے یہ خطرہ ہمیشہ لگا رہے گا اور ایسے حاکم کو تسلیم کرنا الٰہی حکومت کے تقاضوں کے خلاف ہوگا۔

خداوندی آمریت کے لئے خدا اور رسولؐ کے اعلانات

انسان کی انسان پر جس طرح کی بھی حکومت ہو، خواہ آمریت، خواہ جمہوریت سب غلط ہے۔ انسان پر آمریت حاصل ہے تو صرف اللہ کو اس کتابِ محکم میں جو پیغمبر اسلام حضرت محمد

مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کی گئی بار بار اعلان ہوا یہ قرآن کی آیات اتنی واضح اور صاف ہیں کہ ان میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔

ارشاد ہوا: "لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" "خلق کرنا بھی اللہ کا کام ہے اور آمریت بھی اس سے مخصوص ہے۔" اس کے مقابلہ میں انسان کی کسی طرح کی خودمختاری اور خودرائی نہ انفرادی اور نہ شوروی درست ہے ارشاد ہوا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔

(سورۂ احزاب:۳۶)

(کسی ایمان دار مرد یا عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور رسولؐ کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو پھر انھیں اپنے معاملہ میں کچھ بھی اختیار حاصل ہو اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہوگا۔)

یہاں تک کہ رسولؐ کی بھی اطاعت کا حکم ہوا تو یہ کہہ دیا گیا کہ

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (سورہ نساء آیت ۸۰)

(جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے حقیقتاً اللہ کی اطاعت کی۔)

یعنی رسولؐ کی بھی حکومت اللہ کے مقابلہ میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کی جانب سے بحیثیت نائب ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ مسلمانوں کے ذہن میں اللہ کے سوا کسی دوسرے حاکم کے وجود کا تصور نہ ہو۔ اب رسولؐ کے بعد بھی جن اولی الامر کی اطاعت ہوگی، وہ وہی ہوں گے جنھیں اللہ اپنی طرف سے نیابت عطا کرے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ۔ (سورہ قصص آیت ۶۸)

(اللہ ہی خلق کرتا ہے جو چاہتا ہے اور منتخب کرنا بھی اسی کا کام ہے۔)

اسی نیابت کے لحاظ سے جو اللہ کی طرف سے حاصل تھی، پیغمبرؐ خدا کی آمرانہ شان کا

اعلان ان الفاظ میں کیا گیا کہ

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔

(رسولؐ کو مومنین پر خود ان کے نفوس سے زیادہ اختیار ہے۔)

اور اسی کا اقرار رسولؐ نے ہزاروں کے مجمع میں روزِ غدیر خم خود مسلمانوں سے کرایا۔ ان الفاظ میں کہ

اَلَسْتُ اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ۔

(کیا مجھے تم سب پر تمہارے نفوس سے زیادہ حق نہیں ہے؟)

سب نے کہا بلیٰ یعنی کیوں نہیں۔ ضرور آپؐ کو زیادہ حق ہے۔

یہ اقرار خود ان تمام مسلمانوں کی جانب سے خدا اور رسولؐ کی آمریت کے مقابلہ میں اپنے جمہوری وخودارادی تصورات کی نفی اور اس کے حق کے سلب ہونے کا اعتراف تھا۔

مسلمانوں کے بالا اعلان اس اعتراف واقرار کی بنا پر ہی پیغمبرؐ خدا نے اپنے بعد کے لئے اعلان فرمایا:

مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاهُ۔

(جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ بھی مولا ہے۔)

اس اعلان کے پس منظر کو دیکھنے کے بعد صاف نظر آجاتا ہے کہ علیؑ کی اس ولایت کو تسلیم کرنا اللہ اور اس کے رسولؐ کی آمریت مطلقہ کو تسلیم کرنے کا جو حقیقت اسلام ہے، لازمی تقاضا ہے۔

اب اسی کا نام ''شیعیت'' ہوگیا۔ تو وہ کیا اسلام سے الگ کوئی چیز ہے؟ یا حقیقت یہ ہے کہ اسلام شیعی دعوت ہے۔ اور شیعی دعوت عین اسلام ہے۔

اسلام میں دو فرقوں کی بنیاد

نبوت ورسالت کے عنوان سے الٰہی حکومت اور انسانی اقتدار کی جنگ کا آخری مورچہ تھا جسے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰؐ نے فتح کرکے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہُ کی آواز اتنی قوت کے ساتھ عالم

انسانیت تک پہنچا دی کہ اب الٰہی اقتدار کے مقابلہ میں مادی اقتدار کے پرستاروں کو کھل کر سامنے کھڑے رہنے کی تاب نہ رہی۔ اس لئے انھوں نے کلمہ پڑھ کر قبول اسلام کا اعلان کر دیا۔ اور غدیر میں بھی پیغمبرؐ کے سوال کا جواب اقرار کی صورت میں دے دیا۔مگر ان کی ذہنیت پورے طور پر نہ بدلی تھی۔ اس لئے اب انھوں نے خود اسلام کے اندر ''جمہوریت'' کے نام سے ایک مکتب خیال کی بنا قائم کر لی، جس کا نصب العین تھا الٰہی اقتدار کے بجائے انسانوں کے لئے حق خودارادی قائم کرنا اور مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ مادی دلفریبی کی وجہ سے اس کا گرویدہ ہو گیا جب کہ اسلامی تعلیمات کی حقیقی روح کے محافظین الٰہی اختیار کے مقابلہ میں انسانی اقتدار کی کلیۃً نفی کے علم بردار رہے۔

یہ اختلاف تھا جو اب تک سنی اور شیعہ فرقوں کے نام سے قائم ہے۔

ہمارا جرم

ہمارا بنیادی جرم فقط یہ ہے کہ ہم ثبات قدمی کے ساتھ الٰہی حکومت کے وفادار رہے اور اسی کو صحیح تسلیم کرتے رہے۔ اسی کا نام تولاّ ہے اور ان حکومتوں کو جو خدا اور رسولؐ کے مسلسل اعلانات اور قرآن وحدیث کے بلند بانگ تصریحات کے خلاف انسانی اختیار کو کام میں لا کر قائم ہوئیں ناجائز سمجھتے رہے۔ اسی کا نام تبرا ہے جس کو ہمارے مخالف طرح طرح کے بدنما لباسوں میں پیش کرتے رہے ہیں اور اسے ہمارے کفر کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ کفر ہے تو وہی کفر جس کی دعوت ہمیں اسلام نے دی ہے۔

فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَيُؤۡمِنۡ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا۔

(بقرہ آیت:۲۵۶)

(ہماری اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس کفر پر قائم رہنے کی توفیق عطا کرے اور اس عروۃ الوثقیٰ (مضبوط رسی) سے متمسک رکھے جو کبھی شکستہ ہونے والا نہیں ہے۔)

ہمارا دوسرا جرم

رسولؐ اللہ کے دور میں جنھوں نے اسلام قبول کیا اور پیغمبرؐخدا کے جمال جہاں آرا کی زیارت کی ان سب کے لئے ایک اصطلاحی لفظ صحابہ کا قرار پا گیا ہے۔

یہ صحابیت ہمارے نزدیک بھی ایک شرف ہے اور بہت بڑا شرف مگر اس شرف کے کچھ عملی تقاضے بھی ہیں جن میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ منہ دیکھے کی محبت کوئی چیز نہیں۔ اصل وفاداری اور دل ودماغ کے لحاظ سے رسولؐ کے مشن کے ساتھ وابستگی کا ثبوت یہ ہے کہ رسولؐ کے دنیا سے اٹھنے کے بعد بھی ان کے ارشادات اور اعلانات کے ساتھ وفاداری قائم رکھی جائے۔

ہمارا قصور یہی ہے کہ ہم نے صرف ابتدائی حالات یا اسلامی خدمات کو بھی (اگر وہ کچھ ہوں) قابل اعتبار نہیں سمجھا۔ بلکہ ہم ان صحابہ کو قابل احترام سمجھتے ہیں اور ان کے سامنے سرعقیدت جھکاتے ہیں جو پیغمبرؐخدا کے بعد بھی برابر ان کے وفادار رہے ہوں۔ اور اس اسلامی نظام سے غداری کے مرتکب نہ ہوئے ہوں جسے الٰہی حکومت کی شکل میں پیغمبرؐخدا نے قائم کیا تھا۔

ہم نے اصول کو سامنے رکھا ہے۔ اور اصول کے مقابلہ میں شخصیتوں کا کوئی لحاظ نہیں کرتے۔ نہ حق کے مقابلہ میں کثرت تعداد کا کوئی وزن سمجھتے ہیں۔ اس کو ہمارے مخالف ''بُغضِ صحابہ'' کے نام سے ہمارا بڑا جرم قرار دیتے ہیں حالانکہ اگر صحابیت ہی کے معیار پر دیکھا جائے تب بھی تو اہلبیت رسولؐ شرفِ صحبت میں سب سے مقدم نظر آئیں گے جن کی محبت کو قرآن وحدیث کے رو سے ہم جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ پھر آخر ان کی محبت محبت صحابہ کیوں نہ قرار پائے اور جنھوں نے ان سے مخالفت کی انھیں ایذائیں پہنچائیں اور طرح طرح کے مظالم کئے، وہ بغض صحابہ کے مجرم کیوں نہ قرار پائیں۔

تعلیمات اسلام کے دو مکتب اور ہمارا ایک اور بڑا جرم

معاملہ اگر فقط سلطنت وحکومت کا ہوتا تو اسے ایک زمانۂ خاص کی چیز سمجھ کر کم از کم اب نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ بعض اتحاد پسند افراد یہ کہہ کر کہ اب ''رفت وگذشت'' کی دعوت دیتے ہیں کہ اب نہ دنیا میں ابوبکر ہیں اور نہ علیؑ سامنے موجود ہیں۔ اب یہ جھگڑا کیوں کہ ان میں سے کس کی خلافت درست تھی؟ مگر بات تو فقط اتنی نہیں ہے۔

چونکہ اسلام میں دین ودنیا الگ نہیں اور یہاں صحیح سیاست مذہب سے جدا کوئی چیز نہیں۔ اس لئے پیغمبر اسلامؐ نے منجانب اللہ جس طرح اپنے بعد کے لئے ایک نظام حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا تھا، اسی طرح تعلیمات اسلامی، کتاب اور سنت کے صحیح علم کا مرکز بھی بتا دیا تھا کہ وہ یہی افراد ہیں۔

اس اعلان کے مختلف انداز تھے، کبھی ارشاد ہوا:

اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقْلَیْنِ كِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِیْ اَهْلَ بَیْتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ۔

(میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں، اللہ کی کتاب اور میری عترت جو میرے اہلبیت ہیں۔ جب تک ان دونوں سے تمسک رکھو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے۔)

کبھی فرمایا:

مَثَلُ اَهْلِ بَیْتِیْ كَمَثَلِ سَفِیْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَا وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرَقَ وَهَوٰی۔

(میرے اہلبیت کی مثال کشتئ نوح کی سی ہے۔ جو اس پر سوار ہوا، اس نے نجات پائی اور جو اس سے الگ ہوا وہ غرق ہوا۔)

کبھی فرمایا:

اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا فَمَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْیَأْتِ الْبَابَ۔

(میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے جو علم کا طلبگار رہے اسے دروازے پر آنا چاہئے۔)

پیغمبرؐخدا کے بعد جب مسلمانوں کی اکثریت نے نظام حکومت اسلامی کوتسلیم نہ کرتے ہوئے اپنا سیاسی مرکز الگ بنایا تواب سیاسی مصالح اس کے متقاضی ہوئے کہ ان شخصیتوں کو جو ایک محاذ مخالف کی حیثیت رکھتی ہیں ہر حیثیت سے مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل کیا جائے اوران کی اہمیت کوختم کر دیا جائے۔اس لئے انھوں نے ''تعلیمات دینی'' کے لئے بھی دوسرے مرکز تلاش کئے۔مگر رسول نے بمنشائے ایزدی جب کہ ان علوم کا خزانہ دار مخصوص افراد کو بنا دیا تھا تو انھیں یہ مرکز ملتے کہاں۔لہٰذا جمع قرآن کے لئے زید بن ثابت وغیرہ ایسے نوعمر صحابیوں کے خدمات حاصل کئے،تفسیر قرآن میں انبیؑاء سلف کے واقعات کے لئے نومسلم علمائے یہود جیسے کعب الاحبار اور عبداللہ بن سلام کے افواہی روایات سے اپنے معلومات کے دامن کو وسیع کیا۔احادیث رسولؐ کے لئے ابو ہریرہ وغیرہ ایسے بیباک اور جسور اشخاص کے حکایات وروایات کا سہارا لیا اور یہاں تک کہ فقہ اسلامی کی تدوین کا کام دوسری صدی تک نہ ہوسکا اور بالآخر سوڈیڑھ سو برس کے بعد پیدا ہونے والے امام ابوحنیفہ، مالک،شافعی اوراحمد بن حنبل پر انحصار کیا گیا۔جن میں سے سواامام مالک کے سب رسولؐ کے محل ولادت اور محل اقامت یعنی مکہ اور مدینہ دونوں سے دور سرزمین عراق پر متولد ہوئے وہیں رہے اور وہیں مختلف الخیال علماء سے تحصیل علم کر کے اپنی اپنی رائے سے انھوں نے اختلافی مسائل میں کسی ایک شق کو اختیار کر لیا مگر رسولؐ اللہ کی معصوم ہستی کے بعد جنھوں نے اپنی خودمختاری کو قائم رکھ کر رسولؐ کے ارشادات کو من وعن تسلیم نہ کیا، انھوں نے اب اختلافات سے گھبرا کر مذہب کے بارے میں ان جائز الخطا مجتہدین کی فقہوں کو نہ صرف ان کے دور کے لئے بلکہ قیامت تک کے لئے واجب العمل قرار دے دیناضروری سمجھا۔

ہمارا جرم اور بہت بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے رسول اللہ کے بعد جس طرح حکومت کا حقدار صرف انہی کو سمجھا جن کے لئے خدا اور رسولؐ کا اعلان ہو چکا تھا، اسی طرح دینی تعلیمات کے باب میں بھی صرف انہی کی رہنمائی قبول کی ۔ جہاں تک ان کے ارشادات کو سمجھنے اور

ان سے نتائج نکالنے کا تعلق ہے۔ اس کا ضروری علوم سے واقفیت کے ساتھ ہر دور میں ہر شخص کو حق حاصل ہے اور اس معنی میں اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوا ہے لیکن جہاں تک اصل تعلیمات کے ماخذ کا سوال ہے ہم صرف ان ہی ارشادات کو دینی تعلیمات کا سرچشمہ مانتے ہیں جو قرآن، حدیث رسولؐ اور ان اہلبیت معصومینؑ سے پہنچے ہوں جنھیں پیغمبرؐ نے اپنے علوم کا ورثہ دار بنایا اور بتایا تھا۔

ایک بہت بڑا فرق

علم اور عقل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور ذوق تحقیق بالآخر حق تک رسائی کا ذریعہ بنتا ہے۔ حقیقت تفکر و تدبر سے متنفر نہیں، بلکہ اس کی طلب گار رہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے عقل کی آنکھوں پر پردے نہیں ڈالے بلکہ آنکھیں کھولنے کی دعوت دی۔ اس نے ہمیشہ اہل عقل سے غور و فکر نہ کرنے کا شکوہ کیا۔ اور فکر و تدبر کا مطالبہ۔ مگر جبر و تشدد سے قائم شدہ اقتدار ہمیشہ عوام سے قوت احساس کے سلب کرنے کے درپے رہا کرتا ہے اور غور و فکر کو خطرہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ غلبۂ اقتدار کی بنیاد اسی پر ہوتی ہے کہ ایسا ہو گیا ہے۔ لہٰذا سب کو یہی ماننا چاہئے اور جب بھی عوام یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اصل میں ہونا کیا چاہئے تو یہیں سے غلبہ و اقتدار والا نظام اپنے لئے خطرہ محسوس کرتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد برسر اقتدار آنے والی حکومت نے مذہب سے عقل کو بے دخل کیا۔ اور یہ اصول قرار دیا کہ بجائے خود حُسن و قبح کوئی چیز نہیں ہے۔ حکم حاکم وہ ہے جو حُسن و قبح کا معیار ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دیکھو کیا ہے اور بس جو ہو اسی کو سمجھ لو کہ ایسا ہونا چاہئے۔

اس کے برخلاف رسولؐ اسلام اور انہی کی طرح ان کے بعد اہلبیت رسولؐ کی یہ تعلیم رہی کہ اصول مذہب عقلی ہیں۔ اور حُسن و قبح بھی عقلی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز میں پہلے اپنی عقل پر زور دے کر یہ سمجھو کہ ہونا کیا چاہئے۔ اور جب یقینی طور پر یہ سمجھ میں آجائے تو یقین کر لو کہ حقیقت میں ایسا ہی ہے بھی۔

اس سے ہمارے اور ہمارے اغیار کے فکر کے زاویے بدل گئے۔ ہم حسن وقبح کو عقلی سمجھتے ہیں۔ اس لئے جو ہونا چاہئے، اسی کو مانتے ہیں اور اس کے خلاف جو ہو، اسے غلط جانتے ہیں۔

بے شک تعبدی احکام جن میں ہماری ناقص عقل دسترس نہیں رکھتی، ان کو خود عقل ہی کے کہنے سے خالق کے مقرر کردہ معلم کے ارشادات سے معلوم کریں گے مگر جہاں جہاں عقل بطور خود رہنمائی کرتی ہے، وہاں پھر عقل کے فیصلہ کو ہم قطعی حجت ودلیل سمجھتے ہیں۔

سچ پوچھئے تو وہ اصول کہ ''یہ دیکھو کیا ہے اور جو ہوا، اسے حق سمجھ لو'' اگر بنیادی طور پر کارفرما ہو جائے تو حق تعالیٰ کے وجود ہی کو ماننا بے بنیاد ہو جائے۔ کیونکہ وہاں 'ہے' کے دیکھنے کا ہمیں امکان نہیں۔ پھر اسے حق کیونکر سمجھیں۔ اس پر یقین کی بنیاد فقط یہی ہے کہ کائنات عالم کے حدوث وبقا کے لئے ضرورۃً ایک خالق وپروردگار کو ہونا چاہئے اور اس لئے ضرور ہے۔

پھر جب دین کا پہلا سنگ بنیاد صرف عقل کی رہنمائی سے قیام پاتا ہے تو اس کے بعد کبھی بھی عقل کو دین سے بے دخل کیونکر کیا جا سکتا ہے۔

اس کے دوررس نتائج

اندازِ فکر کے اس اختلاف نے ہمارے اور ہمارے غیروں کے درمیان اب مبدا سے لے کر معاد تک ایک بہت بڑی خلیج حائل کر دی اور اس کے بعد ''امامت وخلافت'' ہی میں نہیں بلکہ توحید، رسالت اور معاد تک میں شیعی اور سنی نقطۂ نظر الگ الگ ہو گیا۔ ان میں ہر جگہ درحقیقت پیغمبر اسلامؐ کے بتائے ہوئے اسلام کا صحیح عقیدہ وہی ہے جسے ''شیعیت'' کہتے ہیں۔ اور اس کے خلاف جو عقیدہ ہے وہ اس سے مختلف مکتبِ خیال کی پیداوار ہے جس نے مذہب کو غیر عقلی بنانا ہی اپنے مصالح کے لحاظ سے ضروری سمجھا۔

ہمارے امتیازی عقائد یا اسلام کے حقیقی اصول

توحید

(۱) اللہ ایک ہے، محض ایک۔ ہر طرح سے ایک۔ یہ نہیں کہ اس میں ایک

ذات ہے اور آٹھ صفات اور یہ تو مستقل قدیم ہیں۔ اور ان نو کا مجموعہ ایک خدا ہے۔
یہ سنیوں کا عقیدہ ہے کہ جو نصاریٰ کی تثلیث سے تین گنا بڑھا ہوا ہے۔
قرآن نے نصاریٰ کو متنبہ کیا ہے کہ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنَّمَا هُوَ اِلٰه وَاحِدٌ۔
اسی طرح ہمارا عام مسلمانوں سے یہی تقاضا ہے کہ لَا تَقُوْلُوْا تِسْعَةٌ اَبْنَا هُوَ اِلٰهٌ وَاحِدٌ۔

اللہ کی ذات ہی ہر طرح کے کمال پر حاوی ہے۔ اس کے لئے ذات کے ماسوا صفات کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) وہ جسم اور جسمانیت سے بری ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں مکان آنکھ وغیرہ نہیں ہے۔ نہ وہ کسی مکان اور مستقر میں محدود ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ وہ عرش پر بیٹھا ہوا ہو اور عرش اس کا جسمانی مکان ہو۔

قرآن میں جو اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ہے اس کے معنی غلبہ واقتدار کے ہیں جو خالق کے شایان شان ہے، نہ کہ تمکن واستقرار کے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔

ہمارے خلاف محمد بن عبدالوہاب کے پیرو (وہابی) جماعت کا عقیدہ ہے کہ وہ عرش پر متمکن ہے۔ عرش پر سے اترتا اور آسمانوں کی سیر کرتا ہے اور آسمان اول پر آکر صدا دیتا ہے کہ کون مجھ سے مغفرت کا طلب گار ہے کہ میں اسے بخش دوں؟ کون مجھ سے دعا مانگنا چاہتا ہے، جس کی دعا میں قبول کرلوں۔ یہ باتیں شان الوہیت کے خلاف ہیں، جن کا حقیقت اسلام سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔

(۳) جب کہ وہ جسمانیت سے بری ہے، مکان وسمت وجہت کی پابندیوں سے برتر ہے، تو اسی بناء پر ہم جانتے ہیں کہ آنکھوں سے اسے دیکھنے کا تصور بھی غلط ہے۔ نہ اس دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ کیونکہ جو شے آنکھوں سے دیکھی جائے وہ سمت وجہت اور مکان میں محدود بن جائے گی اور یہ بات شان الٰہی کے بالکل منافی ہے اور جب کہ اس کی الوہیت میں

حال و مستقبل اور دنیا و آخرت کا کوئی فرق نہیں تو نفی رویت میں دنیا اور آخرت کا فرق قرار دینے کے کیا معنی ہیں۔اس لئے قرآن مجید کا اعلان ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ۔

(سورہ انعام: ۱۰۳)

ہمارا عقل کے اسی فیصلہ اور قرآن کے اسی اعلان پر ایمان ہے۔اس کے برخلاف دوسرے مسلمان قیامت میں اس کے دیدار کی امید لگائے ہوئے ہیں جو تعلیم اسلام اور قرآن کے خلاف ہے۔

عدل

(۴) ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ کا ہر فعل وہی ہوتا ہے جو درست و مناسب اور خیر ہو اور اس کے ہر کام میں کوئی مقصد صحیح مضمر ہوتا ہے، کوئی کام عبث نہیں ہوتا، نہ ظلم اور شر کا اس میں گزر مانا جاسکتا ہے۔

یہی وہ عقیدۂ عدل ہے جو توحید کے بعد ہمارے اصول دین کا ایک جز ہے۔دوسرے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اللہ قادر مطلق ہے۔لہٰذا وہ جو چاہے کرے اور اس لئے ظلم و جور ہر بات اس کے لئے روا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ 'جنگل لاء' والا وہ اصول ہے جسے قہر وغلبہ کے جواز کے لئے سلاطین با اقتدار نے اپنے اعمال کو محاسبہ کی گرفت سے نکالنے کے مقصد سے وضع کیا ہے اور اسی کو لے جا کر سیاست کے زیر سایہ رائج شدہ اسلام کے اصول عقائد میں اللہ پر منطبق کر دیا ہے جو اللہ کی شان جلال و کمال کے خلاف ہے اور اسی لئے قرآن نے بار بار اس کے خلاف اعلان کیا ہے، کبھی مثبت طور پر اس طرح کہ

تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقاً وَّعَدْلاً لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔

(سورہ انعام: ۱۱۵)

(تمہارے پروردگار کی بات سچائی اور عدالت سے بھرپور ہے اس کی بات کبھی بدلتی

نہیں۔)

اور کبھی منفی صورت سے ان الفاظ میں کہ

اِنَّ اللہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ۔

(اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔)

اِنَّ اللہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ۔

(اللہ کے یہاں ذرہ برابر بھی ظلم نہیں ہے۔)

ہمارا عقیدہ یہی ہے اور یہی حقیقی اسلام کی تعلیم ہے۔

(۵) ہمارے نزدیک انسان فاعل مختار ہے اور وہ خود اپنے افعال کا ذمہ دار ہے۔ اسی سے اس کو جزا و سزا کا استحقاق ہے۔ اس کے خلاف دوسروں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی افعال کا اصل فاعل پروردگار ہے اور انسان اس کے افعال کا آلۂ کار ہے۔ اس صورت میں اس کو جزا و سزا کا دیا جانا خالق کی طرف سے ظلم قرار پاتا ہے جو اصول عدل کے خلاف ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے: وَمَا ظَلَمَهُمُ اللہُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۔

(سورہ نحل آیت ۳۳))

(اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، وہ خود اپنے نفوس پر ظلم کرتے تھے۔)

اس طرح صاف فعلِ ظلم کی اللہ سے نفی کی گئی ہے اور اسے بندوں کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کی حقیقی تعلیم یہی ہے۔

نبوت

(۶) ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خالق نے خلائق کی ہدایت کے لئے اپنی طرف سے رہبر مقرر کئے۔ ان رہبروں کو انبیاء و مرسلینؑ کہتے ہیں۔ یہ انبیاء و مرسلین انسانی اخلاق و کردار اور بلند اوصاف میں وہ معیاری درجہ رکھتے ہیں کہ خلق خدا کے لئے نمونہ بن سکیں۔ اس لئے ان کے افعال میں عمداً اور سہواً کسی طرح بھی کسی غلطی کا امکان نہیں ہے۔ انبیاءؑ ہر طرح

سے گناہوں سے ہر عمر میں معصوم ہوتے ہیں۔ ان سب میں افضل و برتر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے، جو آخری نبی اور آخری رسول ہیں اوراس لئے آپ کی سیرت مبارک بھی اتنی بلند تھی کہ وہ عام خلق خدا ہی کے لئے نہیں بلکہ انبیاء ومرسلینؑ کے لئے بھی معیاری نمونہ تھی۔ اوراسی لئے مثل قرآن مجید کے آپ کی سیرت طیبہ اور سنت مبارکہ بھی قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے قانون اسلام کا ایک اہم ماخذ ہے۔

ہمارے خلاف دوسرے مسلمان لفظاً انبیاؑء کی عصمت کا اقرار کر لیتے ہیں مگر کبھی تو ان کی زندگی کے مختلف حالات کے لحاظ سے تفریق کرتے ہیں کہ رسالت کے بعد وہ معصوم تھے مگر رسالت ملنے سے پہلے گناہ کا وقوع ہوسکتا ہے، کبھی افعال واعمال کی نوعیت اور رسالت اور بشریت کی حیثیتوں میں فرق کرتے ہیں کہ بحیثیت بشر جو ہیں ان میں غلطی کا امکان ہے۔

اسی کا ایک شاخسانہ وہ ہے جواس زمانہ میں بڑی شدت اختیار کر گیا ہے کہ کتاب خدا یعنی قرآن صرف قانون اسلام کا سرچشمہ ہوسکتا ہے اور سنت رسولؐ وقتی چیز تھی وہ کوئی ناقابل تبدیلی شئے نہیں ہے جس کی پیروی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ضروری ہو۔

یہ سب تصورات ہمارے نزدیک شان رسالت کے خلاف ہیں۔ پیغمبرؐ کی بشریت کا بلند معیار ہی تو خالق کی طرف سے رسالت کے لئے ان کے مبعوث ہونے کی اصل وجہ ہوتا تھا، جسے قرآن نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ

اَللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ۔ (سورہ انعام: ۱۲۴)

(اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں قرار دے؟)

پھر ان کے کردار میں بشریت کے پہلو کو نیچا اور رسالت کے جنبہ کو اونچا قرار دینا کہاں درست ہوسکتا ہے؟

سنت رسولؐ اور سیرت مقدسہ کی پیروی کی دعوت بھی خود قرآن میں ہی صاف صاف موجود ہے:-

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔

(سورہ آل عمران: ۳۱)

(اے رسولؐ) ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو، تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا۔)

اگر صرف قرآن کافی ہوتا تو پیغمبرؐ کی پیروی پر رضائے الٰہی کا انحصار نہ کیا جاتا۔

اس سے ظاہر ہے کہ رسولؐ کے اقوال واعمال کے مقابلہ میں "حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ" کا نعرہ لگانا خود کتاب اللہ کی مخالفت کرنا ہے۔

امامت

(۷) ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح نبوت ورسالت کا تقرر خالق کی جانب سے ہوتا ہے اسی طرح رسولؐ کے بعد حکومت الٰہیہ کے نائب کا تقرر بھی منجانب اللہ ہوتا ہے۔ اس میں انسانوں کے اجماع وشوریٰ وغیرہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اور یہ سلسلہ یکے بعد دیگرے خالق کا مقرر کردہ تا قیامت قائم ہے۔ دوسرے مسلمانوں نے رسولؐ کے بعد اس اختیار کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

اس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔

قیامت

(۸) قیامت کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے جو قرآن وحدیث پر مبنی ہے کہ جزا وسزا کے لئے اسی جسم اور اسی روح میں دوبارہ تعلق قائم کرکے ہر شخص کو نشاۃ ثانیہ عطا کیا جائے گا اور حساب وکتاب کے بعد اچھوں کو بہشت میں اور بروں کو دوزخ میں بھیجا جائے گا اس کے معنی یہ ہیں کہ روح خود ایک جوہر ہے جو اس جسم سے مفارقت کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

دوسرے مسلمانوں کی اکثریت جسم سے الگ روح کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی اور معاد کے معنی یہ قرار دیتی ہے کہ جزا وسزا کے لئے جسم میں پھر روح پیدا کی جائے گی۔

اس صورت میں عالم برزخ جو تمام مسلمانوں کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت ہے کوئی شے نہیں رہتا۔ ہم اس کو اسلامی تعلیمات کے خلاف سمجھتے ہیں۔

فقہی اختلاف

یہ تو وہ اختلافات تھے جو اصول عقائد سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد مسائل و احکام شرعیہ میں بے شمار اختلافات ہو گئے ہیں۔ جن میں ہمارا مسلک ہمیشہ تعلیم اہلبیتؑ کے مطابق ہوتا ہے اور دوسرے مسلمان یہ اقرار کرتے ہیں کہ اہلبیت رسولؐ کی تعلیم وہی ہے مگر خود عملی طور پر ابوحنیفہ وغیرہ کی پیروی کرتے ہیں، جیسے وضو میں ہمارا مسلک پیروں کا مسح جو قرآن مجید کی تعلیم کے عین مطابق ہے اور دوسروں کا مسلک پیروں کا دھونا جو قرآن کے خلاف ہے۔

نماز میں ہمارا طریقہ ہاتھ کھولنا جو اہلبیتؑ رسولؐ ہی نہیں بلکہ اہل سنت کے بھی چار اماموں میں سے امام دارالہجرہ مالک بن انس کے فتوے کے مطابق ہے جو یقیناً سنت رسولؐ سے مدینہ منورہ میں قیام کی بنا پر زیادہ واقف ہو سکتے تھے اور سنیوں کا طریقہ ہاتھ باندھنا ہے جو رسولؐ کی وفات کے ڈیڑھ صدی بعد کوفہ میں پیدا ہونے والے عالموں کے فتوے کے مطابق ہے۔

ایسے ہی دیگر زندگی کے شعبوں کو سمجھنا چاہئے جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں سے معلوم ہو سکتی ہے۔

حکومتوں کا پروپیگنڈا اور ہمارے خلاف اتہامات

چونکہ ہم نے خدا اور رسولؐ کی وفاداری کے پیش نظر ان حکومتوں کو تسلیم نہ کیا جو مسلمانوں میں تخت و تاج کی مالک بن گئی تھیں، اس لئے ہمیشہ حکومت کی مشینری ہمارے خلاف متحرک رہی۔ ہمارے خلاف طرح طرح کے پروپیگنڈے کئے گئے، جنھوں نے مستقل اتہامات کی شکل اختیار کر لی اور حکومت کے کاسہ لیس اور اکثریتی خیال کے علماء نے انھیں اپنی کتابوں میں درج کر دیا۔

یہ اتہامات وہ ہیں جنہیں حقیقت پسند افراد کو ہم سے متنفر بنانے کے لئے ہمیشہ پیش کیا جاتا رہا ہے پھر اس میں عوام کی اکثریت نے جو ہمارے خلاف تھی ہر دور میں اپنی افواہوں سے

اضافہ کیا جن کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور ہمارے خلاف نئے نئے اتہامات کی پیداوار بڑھتی رہتی ہے۔

ان میں سے کچھ اتہامات اوران کے مقابلہ میں جو اصل حقیقت ہے اسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ا۔ یہ عقیدہ کہ ''اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) پشیمان ہوتا ہے۔'' یہ ہماری جانب وہ نسبت ہے جسے اپنی کتابوں میں درج کرنے سے سوادِاعظم کے بڑے بڑے مقدس ومتورع علماء بھی نہیں جھجکتے، حالانکہ ہم اللہ، اس کے ملائکہ، تمام مرسلین اور بندگان صالحین کو گواہ کرکے یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہ ہم پر محض تہمت اورافتراء ہے۔

یہ بالکل ویسا الزام ہے جیسا نسخ کے عقیدہ کی بنا پر تمام مسلمانوں کے خلاف یہود ونصاریٰ الزام لگاتے تھے کہ اللہ شریعتوں میں تبدیلی کرتا ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے پچھتاوا ہوتا ہے اوراس لئے ایک قانون کو منسوخ کرکے وہ دوسرا قانون نافذ کرتا ہے۔ تمام مسلمان اس کے جواب میں یہی کہتے ہیں کہ نہیں۔ تبدیلی پچھتاوے کی بنا پر نہیں بلکہ حالات ومصالح کی تبدیلی کی بنا پر ہوتی ہے۔ بس اسی طرح ہم تقدیراتِ الٰہیہ میں بدا کے قائل ہیں جس کے معنی یہی ہیں کہ مصالح وحالات کی تبدیلی سے مقدرات میں تبدیلی کی جاتی ہے۔ اس کی نظیریں تمام مسلمانوں کے متفق علیہ مسلمات میں موجود ہیں۔ آخر مغفرتِ ذنوب، قبولیتِ دعا، شفاعت، صدقہ وخیرات سے ردِ بلا وغیرہ کیا ہے۔ یہ سب احکام میں تبدیلیاں ہی تو ہیں بس اسی کو بدا کہتے ہیں جس کا قرآن مجید کی اس آیت میں بیان ہے کہ

یَمۡحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَیُثۡبِتُ وَعِنۡدَهٗۤ اُمُّ الۡكِتٰبِ۔ (سورہ رعد: ۳۹)

(اللہ جو بات چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو بات چاہتا ہے قائم رکھتا ہے۔) اور علم کا اصل خزانہ اس کے پاس ہے۔ اور یہ عقیدہ تو قرآن میں یہود کا بتایا گیا ہے کہ ازل میں اللہ کو جو فیصلے کرنا تھے، وہ اس نے کردیئے۔ اب وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ اوراس کی قرآن نے بڑی شدت کے

ساتھ رد کی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا۔ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ۔ (سورہ مائدہ:۶۴)

(اور یہودیوں کوسنو کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں وہ اب کچھ نہیں کرسکتا خود انہی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں گے۔اور یہ اپنے قول سے ملعون قرار پائیں گے۔اللہ کے ہاتھ تو ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں۔)

اس کے بعد یہ پروپیگنڈے کی طاقت نہیں تو اور کیا ہے کہ یہود کے خیال کے مطابق ان کا 'بدا' تو اسلامی عقیدہ قرار پا جائے اور وہ عقیدہ جو قرآنی تعلیم کے مطابق ہے اسے یہ بھیانک لباس پہنا دیا جائے کہ شیعہ (معاذ اللہ) اللہ کی پشیمانی کے قائل ہیں۔

(۲) یہ بھی ہماری طرف نسبت دے دی جاتی ہے کہ شیعہ حضرت علیؑ کو رسول اللہ پر فضیلت دیتے ہیں۔اس سلسلہ میں یہ خرافات بھی ہماری طرف منسوب کر دی جاتی ہے کہ جبرئیل اصل میں رسالت کی وحی لے کر حضرت علیؑ کی طرف آئے تھے مگر دھوکے سے حضرت محمد مصطفیؐ تک پہنچا دی۔

نعوذ باللہ من ھٰذہ النّزھات۔

شیعہ امامیہ اثنا عشریہ آج بحمد اللہ دنیا کے ہر خطہ میں موجود ہیں۔ہر جگہ ان کے علماء ہیں، ان کی کتابیں ہیں اور ان کے مدارس، کہیں بھی دریافت کرلیا جائے تو کہیں اس کی کوئی اصلیت نہ ملے گی۔بے شک شیعہ بعد خاتم الانبیاء حضرت علی بن ابی طالبؑ کو تمام کائنات سے افضل مانتے ہیں جو قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔اس کے علاوہ کوئی امر بھی شیعوں کی طرف منسوب کرنا بہتان عظیم ہے۔

(۳) ایک بہت چلتا ہوا اتہام فرقۂ شیعہ پر یہ ہے کہ ان کا قرآن پر ایمان نہیں ہے، اس لئے کہ یہ تحریف قرآن کے قائل ہیں۔اس اتہام کے پردہ کو تفصیل سے ہم نے اپنے

رسالہ ''تحریف قرآن پر نظر'' نیز ''مقدمہ تفسیر قرآن'' میں چاک کیا ہے۔ یہاں بالاختصار یہ عرض ہے کہ اگر کچھ روایات کے وجود کی بنا پر پورے فرقہ کی جانب کوئی عقیدہ منسوب کرنا درست ہے تو ہم پوری قوت کے ساتھ یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ پھر شیعوں سے پہلے سنی تحریف قرآن کے قائل ہیں کیونکہ کثرت سے ان کے یہاں روایتیں اس طرح کی موجود ہیں۔ اور اگر صرف روایات سے کسی فرقہ کے عقیدہ کو دریافت نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ خود اس فرقہ کے علماء ان روایات کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ تو یہ حقیقت ہے کہ محققین علمائے شیعہ قرآن کے الفاظ میں کسی زیادتی یا کمی ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ آج سے ایک ہزار سال پہلے ہمارے بڑے عالم جناب شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمیؒ نے اپنے رسالہ ''اعتقادات'' میں لکھ دیا ہے کہ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن یہی ہے جو ما بین الدفتین موجود ہے اس میں کوئی زیادتی یا کمی ہرگز نہیں ہوئی ہے۔ بے شک اس کی ترتیب شانِ نزول کے مطابق نہیں ہوئی ہے اسے سب ہی مسلمان تسلیم کرنے پر مجبور ہیں اور اکثر تسلیم کرتے ہیں۔

(۴) بعض جسارت پسند ہماری طرف سے یہ عقیدہ بھی منسوب کر دیتے ہیں کہ شیعہ تناسخ کے قائل ہیں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ اقرار تناسخ اور انکار معاد کو ہم اسی طرح کفر مانتے ہیں جس طرح تمام مسلمان۔ ہمارے یہاں رجعت کے بارے میں احادیث وارد ہیں، مگر رجعت کو تناسخ قرار دینا بالکل ویسا ہے جیسا کوئی حشر ونشر کو، جو تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے، تناسخ سے متحد بنا دے۔ تناسخ کیا ہے؟ ایک شخص کا مرنے کے بعد پھر دوبارہ کسی ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا۔ یہ عقیدۂ اسلامی کے خلاف ہے مگر رجعت مثل قیامت کے اس شخص کا اپنے اسی جسم کے ساتھ دوبارہ زندہ کیا جانا ہے۔ اسے تناسخ سے کیا واسطہ؟

قرآن مجید میں اسے حشر ہی کے لفظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ۔

(سورہ نمل: ۸۳)

(ہم ہر امت میں کے کچھ افراد کو جنھوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تھی محشور کریں گے۔) پھر جس طرح قیامت کا حشر کلی تناسخ سے مختلف چیز ہے، اسی طرح اس حشر جزئی کو بھی جو قرآن کی اس آیت میں مذکور ہے، تناسخ میں داخل کرنا صحیح نہیں ہوسکتا۔

(۵) بڑی مشہور تہمت ہماری جانب سب وشتم اور دشنام طرازی یعنی گالم گلوج کی نسبت ہے، حالانکہ شیعوں کا معیار تہذیب وشائستگی عموماً دوسروں سے بدر جہا زیادہ ہے۔ ہم میں بکثرت ایسے شرفاء ہیں جن کی زبان بچپنے سے لے کر آخر دم تک کسی ایک دفعہ بھی فحش کے الفاظ سے آشنا نہیں ہوئی۔ مگر ضرورت اور موقع کے لحاظ سے کسی کے افعال پر نقد ونظر تہذیب وشائستگی کے ہرگز خلاف نہیں ہے اور سب سے بڑی ضرورت اس گمراہی کا دفع کرنا ہے جو کچھ اشخاص کے ساتھ حسن ظن کی صورت میں صراط مستقیم سے علٰیحدگی کا باعث ہورہی ہو۔ اس ضرورت سے قابل مذمت اشخاص کی مذمت قرآن مجید تک موجود ہے جس سے بڑھ کر اخلاقِ بلند کا معیاری نمونہ کوئی تصور میں نہیں لایا جاسکتا۔ اسی طرح لعنت کو گالی قرار دینا بھی غلط ہے، جب کہ قرآن میں متعدد جگہ لعنت موجود ہے۔ ہم قرآن مجید کی پیروی میں جس طرح رسولؐ اور آل رسولؐ کو مستحق صلوات سمجھتے ہیں، اسی طرح مخالفین رسولؐ وآل رسولؐ کو مستحق لعنت سمجھتے ہیں۔ رہ گیا تبرّا کا لفظ اس کے اصل معنی کسی سے ذہنی اور عملی بے تعلقی کے ہیں۔ اگر اسے گالی سمجھا جائے، تو قرآن سے سورۂ برأت کو حذف کر دیا جائے جس کی ابتدا ہی تبرا سے ہوئی ہے۔

(۶) ہماری طرف یہ غلط نسبت بھی دی جاتی ہے کہ شیعوں کے یہاں جھوٹ بولنا جائز بلکہ واجب ہے۔ یہ بھی سراسر اتہام ہے۔ ہم جھوٹ کو گناہِ عظیم جانتے ہیں اور کاذبین کو لعنت الٰہی کا مستحق سمجھتے ہیں اور اسی لئے صحیح بخاری کی اس حدیث کو حضرت ابراہیم نے (معاذ اللہ) تین جھوٹ بولے، ہم بالکل غلط اور خلافِ اسلام جانتے ہیں۔

لیکن کلمۂ حق کے اظہار اور دین کے اعلان کے لئے بھی ہمارے نزدیک مناسب موقع کی شرط ہے بعض وقت افشائے راز جو خود مفادِ دین کے خلاف ہوتا ہے۔ اسی طرح جان وآبرو

کی حفاظت بھی ایک مہتم بالشان اسلامی فریضہ ہے جو اسی وقت نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ جب دین مبین کا تحفظ قربانی پر موقوف ہو گیا ہو۔ لہٰذا جب تک ایسی قربانی کا محل پیدا نہ ہو، اس وقت تک حفاظت نفس کے لئے عقیدۂ حق کو پردہ میں رکھنا درست ہے۔ جس کی تعلیم قرآن میں موجود ہے:

اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ۔ (نحل:۱۰۶)

اور دوسری جگہ صاف ارشاد ہوا:

اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً۔ (سورہ آل عمران:۲۸)

تمام مفسرین متفق ہیں کہ یہ دونوں آیتیں تقیّہ کے بارے میں ہیں۔ پھر اس قرآنی تعلیم کے ہوتے ہوئے تقیہ کو جھوٹ کہنا کیا خود قرآن اور اسلام کے ساتھ ناروا گستاخی نہیں ہے؟ بیشک جب تحفظ دین قربانی پر موقوف ہو جائے، تو پھر تقیہ کا محل نہیں رہتا۔ اور بسا اوقات تقیہ حرام ہو جاتا ہے۔ کربلا میں حضرت امام حسینؑ کی قربانی اس کی بیّن مثال ہے جس کی یادگار بمنشائے الٰہی ہم نے اب تک قائم رکھی ہے۔

(۷) ہم پر یہ بھی اتہام ہے کہ ہم (معاذ اللہ) تعزیہ کا بت بناتے ہیں اور اسے پوجتے ہیں مگر حقیقت امر یہ ہے کہ کوئی شیعہ تعزیہ کو مستحق پرستش نہیں سمجھتا۔ وہ صرف ضریح امام حسینؑ کی تشبیہہ ہے، جو بطور یادگار بنائی جاتی ہے اور اس نسبت کی بنا پر اس کا احترام کیا جاتا ہے اگر ہر احترام داخل پرستش ہو جائے تو پھر مسجد اور کعبہ اور قرآن سب ہی کا احترام پرستش قرار پائے گا اور شرک میں داخل ہوگا۔

(۸) ایک افترا اور بہتان ہمارے خلاف یہ ہے کہ شیعہ عید نوروز اور عید غدیر پر (معاذ اللہ) ہر حرام کو حلال قرار دے لیتے ہیں۔

حاشاء کلا والی اللہ الشکویٰ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہاں نوروز اور عید غدیر میں مثل عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے نمازیں اور دعائیں وارد ہیں جو ذکر الٰہی پر مشتمل ہیں اور متبرک دنوں میں ہمارے یہاں

خیر وخیرات کا اہتمام دوسرے عام دنوں سے زیادہ کیا جاتا ہے۔اس کے خلاف جو بھی کہا جائے وہ افترا و بہتان کے سوا کچھ نہیں۔

(۹) کہا جاتا ہے کہ شیعوں کے یہاں حضرت امام حسینؑ کی عزاداری کو کافی سمجھا جاتا ہے۔اور نماز روزہ کسی چیز کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ یہ بھی غلط اور بالکل غلط ہے۔ ہم نماز روزہ کے وجوب کو ضروریات دین میں سے جانتے ہیں اور اس کے منکر کو کافر مانتے ہیں اور محبت اہلبیتؑ کا حقیقی تقاضا احکام الٰہی کی اطاعت ہی کو سمجھتے ہیں۔

اس کے علاوہ اور رکیک و بے بنیاد افواہیں کتنی ہیں جو صرف نفرت پیدا کرنے کے لئے ہم پر عائد کر دی گئی ہیں، مثلاً شیعہ اہل سنت کو جو پانی وغیرہ دیتے ہیں، وہ تھوک کر دیتے ہیں یا تازہ بتازہ تہمت جو پاکستان اور بالخصوص کراچی کے کچھ حلقوں میں چلی ہے کہ ہر سال شیعہ کسی سنی کو حلال کرتے ہیں اور ذوالجناح کی چادر پر جو سرخ دھبّے ہوتے ہیں یہ اسی خون کے چھینٹے ہوتے ہیں۔ یہ ایسی لچر پوچ اور بے بنیاد باتیں ہیں جن کی رد کسی علمی رسالہ کے شایان شان نہیں۔

اللہ مسلمانوں کو توفیق عطا کرے کہ وہ حق پر صرف حق کے معیار سے غور کریں اور ایسی بے ہودہ بکواسوں پر اعتنا نہ کریں جنہیں اہل باطل صرف حق سے متنفر بنانے کے لئے تصنیف کیا کرتے ہیں۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

❀❀❀

تاریخ شیعہ کا مختصر خاکہ

مصنف
آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

تاریخ شیعہ کا مختصر خاکہ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہٖ الطَّاہِرِیْنَ

شیعیت کا ابتدائی دور

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں شیعہ اور غیر شیعہ کی کوئی تفریق ظاہر نہ ہوئی تھی تاہم نمایاں طور پر تین آدمی اہلبیتؑ طاہرین کے ساتھ خاص عقیدت رکھتے ہوئے محسوس ہوتے تھے یہ سلمانؓ، ابوذرؓ اور مقدادؓ تھے جو شیعہ کے لقب سے خصوصیت کے ساتھ ملقب ہوئے۔ یہی وہ اشخاص تھے جو وفات پیغمبرؐ خدا کے بعد اس وقت جب کہ ایک دنیا سیاسی رو میں بہہ کر اہلبیتؑ سے کنارہ کش ہوگئی تھی، ایک لمحہ کے لئے بھی رسولؐ اور اہلبیتؑ رسول کی وفاداری سے منحرف نہیں ہوئے اور پیغمبرؐ خدا سے کئے ہوئے اس معاہدہ پر برقرار رہے جو غدیر خم میں ولایت حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے اقرار کے بارے میں ہو چکا تھا۔ ان کی استقامت کے اثر سے چند اشخاص نے اور اس مسلک کو حق سمجھتے ہوئے اس سے وابستگی اختیار کی۔ ان ہی میں سے بارہ ۱۲ آدمی وہ تھے جنھوں نے جمعہ کے دن مسجد رسولؐ میں امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ کے حق خلافت کے ثبوت میں تقریریں کیں اور اکثریت کے ساختہ و پرداختہ

(Self-proclaimed&Self-styled) نظام حکومت کے مقابلہ میں احتجاج کیا۔

ان میں مذکورہ بالا تین بزرگواروں کے علاوہ مہاجرین میں سے عمار بن یاسر، انصار میں سے ابی بن کعب اور خزیمہ بن ثابت ذوالشہادتین اور تاریخی لحاظ سے قابل تعجب امر ہے کہ بنی امیہ میں سے خالد بن سعید بن عاص بھی تھے۔ باقی مہاجرین وانصار میں سے دوسرے اشخاص تھے۔

قبائل عرب میں سے جن کا نام ''مرتدّین'' رکھا گیا اور ان پر منعِ زکوٰۃ (Denying Zakat) کا الزام عائد کر کے ان کے قتل وغارت کو فرض سمجھا گیا۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جن کا جرم بس یہی تھا کہ وہ اس نظام حکومت کو جو پیغمبرؐ خدا کے اعلانات کے خلاف قائم ہوا تھا، قبول نہیں کرتے تھے اور اس طرح تشیع کے مرقع میں مالک بن نویرہ وغیرہ کے خون کی رنگینی بھی اسی دور سے شروع ہوگئی۔

شیعیت کا تدریجی ارتقاء

رفتہ رفتہ کچھ امتداد زمانہ سے سیاست کا نشہ اُترنے کی وجہ سے، کچھ مذکورۂ بالا افراد سے تبادلۂ خیالات (Exchange of views) کے نتیجہ میں اور کچھ حکومت وقت کی ناانصافیوں اور بے ضابطگیوں (Injustices & abuses uiolating law) کو محسوس کرتے ہوئے بہت سے افراد نقطۂ حقیقت کے قریب آتے گئے اور خلافت عثمان میں حکومت کی اقربا پروری (بھائی بھتیجہ واد/ Nepotism) کی پالیسی نے اس رجحان کو تقویت دی۔

عثمان کی مخالفت کرنے والے اگرچہ زیادہ تر ان ہی سیاسی وجوہ سے ان کے مقابلہ کے لئے تیار ہوئے تھے، مگر کچھ افراد ان کے ساتھ ایسے بھی شریک ضرور تھے جو شیعہ اہلبیتؑ ہونے کی وجہ سے اس نظام حکومت کو ہی غلط سمجھے ہوئے تھے۔ ان میں نمایاں افراد عمار بن یاسر، محمد بن ابی بکر اور مالک اشتر تھے۔ ۳۵ھ میں حضرت امیرؑ ظاہری طور پر منصب خلافت پر متمکن ہوئے تو بنی اُمیہ کے مقابلہ میں جنھوں نے آپ کا ساتھ دیا وہ سب شیعۂ علیؑ کہے جاتے تھے۔

ان میں سے بہت سے لوگ قریب سے جناب امیرؑ کے کمالات کو دیکھ کر اور آپ کی تعلیمات سے متاثر ہوکر صحیح معنی میں بھی شیعہ ہو گئے۔عمار یاسر اور مالک اشتر کے ذریعہ عراق میں شیعیت آئی۔اور محمد بن ابی بکر کے ذریعہ سے مصر (Egypt) شیعیت سے روشناس ہوا۔یمن کو حضرت علیؑ سے پہلے ہی اس لئے خصوصیت حاصل تھی کہ وہ آپ ہی کی پُرامن تبلیغ کے ذریعہ دولت اسلام سے مالا مال ہوا تھا۔جناب ابوذر غفاری کے ذریعہ جنھوں نے خلیفۂ ثالث کے دور میں شام (Syria) کے اطراف میں دورہ کیا تھا شام کے پہاڑی صوبہ جبل عامل* کے شہروں میں تشیع کا شیوع ہوا۔

اس دور کے ایسے افراد شیعہ جو نمایاں حیثیت رکھتے تھے مالک اشتر، سعید بن قیس ہمدانی، قیس بن سعد بن عبادہ، حجر بن عدی، عمرو بن حمق خزاعی اور عبداللہ بن بذیل بن ورقاء خزاعی وغیرہ تھے جو جہاد بالسّیف کے بھی بڑے مرد میدان تھے۔

ان کے علاوہ ایسے افراد جو علم و معرفت میں جناب امیرالمومنینؑ سے استفادہ کر کے بڑے درجوں پر فائز ہوئے کمیل ابن زیاد، میثم تمار اور رشید ہجری وغیرہ تھے۔جناب امیرؑ کے روحانی فیوض آپ کی اولاد طاہرین کے علاوہ ان حضرات کے ذریعہ سے پھیلے۔علوم تفسیر وفقہ وفرائض وغیرہ میں عبداللہ بن عباس نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور علوم لسان (Linguistie sciences) میں ابوالاسود دئلی آپ کے خاص شاگرد تھے جنھوں نے قرآن مجید پر نقطے لگائے اور اعراب دیئے۔ان کی اس خدمت سے عالم اسلامی قیامت تک ان کا ممنون احسان رہے گا۔

ادوار ابتلاء اور ان کا ردّ عمل

تحکیم (Arbitration) کے بعد حکومت شام کے اقتدار میں اضافہ ہو گیا اور امام حسنؑ

*اب لبنان میں

کی مصالحت کے بعد معاویہ شاہی تمام عالم اسلامی پر چھا گئی۔یہ دور شیعیت کے لئے بہت ناسازگار تھا حجر بن عدی اپنے چھ ساتھیوں کے ساتھ سولی پر چڑھا دیئے گئے۔

عمر بن الحمق کا سر قلم کر کے نیزے پر بلند کیا گیا۔ حضرمیین کا قتل و غارت کیا گیا۔ زیاد ابن ابیہ ،سمرہ بن جندب اور بسر بن ارطاۃ نے ہزاروں شیعیان علی کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ ۶۰ھ تک یہی عالم رہا۔

اس وقت پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ عالم اسلامی میں جماعت شیعہ بھی کوئی وجود رکھتی ہے مگر ۶۱ھ میں جب کربلا میں حسینؑ بن علیؑ نے کارگاہ قربانی مرتب کی تو دنیا نے شیعیت کی حقیقی طاقت اپنی آنکھوں سے ان بہتر کی شکل میں دیکھی جن کے ایسے مخلص اور ثابت قدم اس کے پہلے کبھی دس بھی یکجا نظر نہ آئے تھے۔ اس کے پہلے پندرہ بیس برس کی مدت تک کسی کو ہمت نہ تھی کہ وہ اہلبیت کے فضائل کا اعلان کر سکے مگر شہادت حسینؑ نے جرأت اظہار کو وہ تقویت پہنچائی کہ سلیمان بن صرد خزاعی کے ساتھ ہزاروں آدمی سر سے کفن باندھ کر میدان میں آ گئے۔ پھر مختار کے مجاہدات میں جو خون حسینؑ کے انتقام کے لئے تھے شیعیت نے کھل کر اپنی زندگی کا ثبوت دیا۔ اگرچہ سلطنت کی بے پناہ طاقتوں نے ان زندگیوں کا گلا گھونٹ دیا مگر وہ روح مردہ نہیں ہوئی اور آخر اسی نے سلطنت بنی امیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بنی عباس نے اسی شیعیت کے زیر سایہ اپنی سلطنت قائم کی۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے حصول اقتدار کے بعد بدعہدی سے کام لیا اور اولاد علیؑ بن ابی طالبؑ سے اپنے سوتیلے پن کی عداوت کا ثبوت دیا۔ شیعہ وزیر ابوسلمہ خلال کو قتل کیا اور ابومسلم اصفہانی کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا اور پھر ائمہ اہلبیتؑ اور سادات پر ایسے مسلسل مظالم ڈھائے جیسے مظالم ڈھانے کا بنی امیہ کو بھی اس تسلسل کے ساتھ موقع نہیں ملا تھا۔

بے شک بنی امیہ کی سلطنت کے اضمحلال اور عباسیہ حکومت کے استحکام کے درمیانی وقفہ میں حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے دور میں ذرا تعلیمات اہلبیتؑ کی اشاعت اور اپنے علمی ذخیرہ کے کسی حد تک تحفظ اور اپنے مذہبی عقائد و احکام کی تدوین کا افراد شیعہ کو موقع ملا۔ اس دور میں مسائل امامت وغیرہ پر مناظرات بھی ہونے لگے تھے اور ہشام بن حکم، ہشام

بن سالم، قیس، ماصر، مومن الطاق وغیرہ کلامی مسائل پر جہاد باللسان (زبان سے جہاد) کا فرض انجام دے رہے تھے زرارہ بن اعین، محمد بن مسلم اور ابوبصیر وغیرہ حفظ احکام شریعت کا، اسمٰعیل حمیری اپنی شاعری سے نشر فضائل اہلبیتؑ کا بیڑا اُٹھائے ہوئے تھے اور جابر بن حیّان طرسوسی علوم عقلیہ اور ابان بن تغلب لسانیات (Linguistics) میں شیعی ثقافت (Culture) کا سکہ بٹھا رہے تھے۔

۱۵۰ھ کے بعد بنی عباس کی سلطنت کا تشدد بہت بڑھ گیا اس حد تک کہ شیعہ علماء اپنے امام عصر حضرت موسیٰ کاظمؑ کا بسا اوقات نام بھی نہ لے سکتے تھے اور الرجل الصالح وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے تھے مگر اس کے بعد مامون الرشید نے سیاسی اسباب کے تقاضوں سے امام رضاؑ کو ولی عہدی دے کر ایک موقع پھر شیعیت کے نمودار ہونے کا پیدا کر دیا۔

ایران پہلے ہی جناب شہر بانو دختر یزدجرد شاہ ایران کے زوجۂ حضرت امام حسینؑ اور والدۂ امام زین العابدینؑ ہونے کی وجہ سے شیعیت سے مانوس ہو چکا تھا۔ اب امام رضاؑ کے خراسان میں قیام نے اسے معارف اہلبیتؑ سے مزید تعارف کا موقع پیدا کر دیا۔

اگرچہ مامون نے پھر اپنی سیاسی غلطی تصور کر کے امام رضاؑ کو زہر دے دیا مگر وہ اثرات جو آپ کے قیام خراسان سے پیدا ہو گئے تھے، مٹائے مٹ نہیں سکتے تھے۔ اسی کے نتیجہ میں قم علوم اہلبیتؑ کا ایران میں ایک بڑا مرکز بن گیا۔

اب شیعیت اتنی پھیل گئی تھی کہ اس کے فنا ہونے کے بظاہر اسباب کا بھی کوئی سوال باقی نہ رہا تھا، پھر بھی حکومت عباسیہ کا تشدد مامون کے بعد پھر بڑھ گیا۔ شیعیت کی ترقی جتنی نمایاں ہوتی جاتی تھی، حکومت کی طرف سے اس کے خلاف مظالم اتنے ہی بڑھتے جاتے تھے۔ اب یہ تیسری صدی کا درمیانی حصہ تھا جس میں متوکل نے محسوس کیا کہ شیعیت کی طرف جذب کا مرکزی نقطہ شہید کربلا حضرت امام حسینؑ کی ذات ہے مگر اب اس وقت حسینؑ تو سامنے نہ تھے کہ

ان کے خلاف فوج کشی کی جاتی لہٰذا قبر امام حسینؑ کے مٹانے کی جدوجہد کی گئی اور زیارت امام حسینؑ کے روکنے کی کوشش کی گئی مگر شمع حسینی کے پروانوں نے ہاتھ کٹوائے، پیر کٹوائے، گردنیں قلم کروائیں، اور اس کے باوجود زیارت سے باز نہ آئے، نہ قدرت نے قبر حسینؑ کے نشان کو مٹانے کی کوشش کامیاب ہونے دی بلکہ درمیان میں مظالم کے بند (باندھ) جذبہ حسینی کو روکنے کی کوشش کے بعد جب کمزور ہو کر ٹوٹتے تھے، تو وہ نئی قوت اور زیادہ جوش وخروش کے ساتھ طوفانی شکل میں آگے بڑھتا تھا۔ بغداد میں امام موسیٰ کاظمؑ اور امام محمد تقیؑ کا قید ہونا اور سامرہ میں امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کی نظر بندی اور محبوس ہونا عراق میں شیعیت کے فروغ کا باعث ہو گیا۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری میں ایران کے مرکز شیعیت قم کے علاوہ خود حکومت عباسیہ کے پایۂ تخت بغداد میں شیعیت کا ایک مرکز موجود تھا۔ بارہویں امامؑ کے چاروں مخصوص نائب (مع وکلائے اربعہ) اسی بغداد میں تھے اور شیعی علم حدیث کی سب سے پہلی اور سب سے مستند کتاب کافی اسی بغداد میں لکھی گئی۔

مراکز علمیہ

اس کے بعد شیعیت کے دو علمی مرکز مستقل تھے ایک قم جس کے آخری ممتاز نمائندے شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمی تھے اور دوسرے عراق میں بغداد و کاظمین۔ رفتہ رفتہ عراق کے مرکز نے اتنی قوت حاصل کی کہ قم اس کے مقابلہ میں ماند پڑ گیا۔ پانچویں صدی میں بغداد ہی خاص مرکز شیعیت ہو گیا۔

شیعی سلطنتیں

اس وقت دنیا میں شیعی سلطنتیں بھی قائم ہو گئی تھیں ایران وعراق میں سلاطین آل بویہ بہاء الدولہ، عز الدولہ اور سب سے بڑھ کر عضد الدولہ دیلمی اپنا سکہ چلا رہے تھے۔ حلب میں آل حمدان جن میں مشہور حکمران سیف الدولہ تھا اور مصر میں فاطمی سلطنت جس کی یادگار جامع ازہر کی ایسی عظیم

یونیورسٹی کی شکل میں جب سے اب تک قائم ہے۔یہی دور وہ تھا جس میں بغداد میں پہلی بار عشرۂ محرم میں علانیہ عزاداری ہوئی اور سب سے پہلا ماتمی جلوس نکلا اور مصر کے مناروں سے حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلْ اور اَشْهَدُ اَنَّ عَلِیاً وَلِیُّ اللهِ کی صدائیں بلند ہوئیں۔دارالسلطنت بغداد میں شیخ مفید، سید مرتضیٰ علم الہدیٰ اور سید رضی کے ایسے علماء پیدا ہوئے جن کے حلقۂ درس سے ہزاروں طلاب مستفید ہوتے تھے۔

نجف میں علمی مرکز کا قیام

اس شیعیت کی ترقی سے مخالف عناصر کا ''نعل در آتش'' (آگ بگولا) ہونا ظاہر ہے۔ چنانچہ پانچویں صدی کے وسط میں بغداد میں محلۂ کرخ کے شیعوں پر دھاوا بول دیا گیا۔اتنے شیعہ قتل کئے گئے کہ کئی دن تک دجلہ(Tigris River) کا پانی دور تک خون سے رنگین رہا۔ شیخ الطائفہ شیخ طوسی رحمہ اللہ جو اس وقت تک بغداد میں مقیم تھے ان کی درسگاہ اور مسجد پر حملہ کیا گیا۔وہ منبر جس پر بیٹھ کر وہ درس کہتے تھے آگ سے جلا دیا گیا جس کے نتیجہ میں انھوں نے بغداد سے نجف اشرف کی طرف ہجرت کی۔اس کے بعد نجف مرکز علم ہو گیا۔

مخالف حکومت کا زوال اور شیعیت کی عظیم فتح

شیعوں کے اس قتل عام کا نتیجہ مخالف جماعت کے لئے اچھا نہیں ہوا۔سلطنت بنی عباس میں ضعف پیدا ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد تاتاریوں کے ہاتھوں اس حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

لطف یہ ہے کہ عین اس وقت جب تاتاری حکومت جمہور مسلمین کی خلافت کے پرخچے اُڑا کر مادی حیثیت سے فاتح بنی ہوئی تھی وہ روحانی طور پر شیعیت سے مفتوح ہو گئی، اس طرح کہ اُسی ہلاکو کی نسل میں سلطان الجائتو خدابندہ نے تمام مذاہب وملل کا مطالعہ کرنے کے بعد اسلام قبول کر لیا اور فرق اسلام (اسلامی فرقوں) میں اپنے سامنے مناظرہ کرا کے مذہب شیعہ کی حقانیت کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔

ایک اور علمی مرکز

اب عراق میں ایک اور شیعی مرکز حلہ میں قائم تھا جہاں سے فقہ کی وہ کتاب جس پر آج تک دارومدار ہے یعنی شرائع الاسلام تصنیف ہوئی۔ پھر علامۂ حلی، ان کے بیٹے اور فخر المحققین اور ابن فہد حلی ایسے علماء پیدا ہوئے۔

ایران اور ہندوستان میں شیعیت کا فروغ

دسویں صدی میں شیعیت کا اثر اتنا بڑھا کہ ہندوستان میں شیعی سلطنت قائم ہوگئی۔ دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی اور نیز احمد نگر میں شیعیت نے قدم جما لیے۔

غیر شیعی سلطنت مغلیہ میں بھی بیرم خاں، مولانا ابوالفتح، فیضی، ابوالفضل اور قاضی نوراللہ شوستری ایسے ملت شیعہ کے ممتاز اشخاص اقتدار قائم کئے ہوئے تھے۔ اور ایران میں صفوی سلاطین نے تمام مملکت کو شیعی رنگ میں ایسا رنگ دیا کہ وہاں غیر شیعی عنصر کی پیداوار ہی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔ یہ وہ ان کی فتح ہے جو تاریخ عالم میں یادگار رہے اور جو ظلم وتشدد کا نتیجہ فطرۃً ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تبدیلی ذہنیت کبھی تلوار کے وسیلہ سے ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

گیارہویں صدی ہجری میں شیعہ سلطنتیں عرب میں یمن، عجم میں ایران اور ہندوستان میں دکن میں قائم تھیں۔ اودھ میں جونپور سلاطین شرقیہ کی وجہ سے مرکز شیعیت بنا ہوا تھا اور علمائے شیعہ میں سے ایران میں علامہ مجلسی نے شیعیت کی وہ خدمت انجام دی جو اپنی نوعیت میں بے مثال تھی۔

بارہویں صدی میں جونپور کی کمی کو فیض آباد نے پورا کیا اور تیرہویں صدی کا آغاز ہوتے ہوئے جب غفران مآب مولانا سید دلدار علی طاب ثراہ نے عراق سے تکمیل علم کرنے کے بعد لکھنؤ کو مستقر بنایا تو ان کی اور ان کی نسل کے اکابر علماء کی زیر ہدایت سلاطین اودھ نے شیعیت کی وہ ابدی خدمت انجام دی جس کے آثار اب تک جیتی جاگتی شکل میں موجود ہیں۔

۱۳؍رجب ۱۲۰۰ھ کو ہندوستان میں شیعوں کی سب سے پہلی نماز جماعت جناب غفران مآبؒ کی اقتداء میں لکھنؤ ہی میں ہوئی اور ۲۷؍رجب ۱۲۰۰ھ میں سب سے پہلی نماز جمعہ منعقد ہوئی۔ اس دور میں غفران مآبؒ نے شیعہ علم کلام کی سب سے بڑی کتاب ''عمادالاسلام'' لکھی۔ اسی صدی کے وسط میں عراق میں شیعہ فقہ کی سب سے بڑی کتاب ''جواہرالکلام'' لکھی گئی۔ اور اسی کے بعد اصول فقہ کی اہم ترین کتاب ''رسائل'' تصنیف ہوئی۔

اب سلطنت اودھ کے علاوہ شیعوں کی کئی حکومتیں بنگال میں قائم تھیں اور سندھ میں تالپر خاندان کی حیدرآباد اور خیر پور میں حکومت تھی۔ چودھویں صدی کے آتے آتے اگرچہ حکومت اودھ ختم ہوگئی مگر خودمختار ریاستیں رام پور، مرشدآباد، بنگن پلی، کھمبات اور خیر پور سندھ وغیرہ پھر بھی قائم رہیں۔

اب تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کی تمام ریاستوں کے ساتھ سوا خیر پور کے جو پاکستان میں ہے، ملک کی شیعہ ریاستیں بھی ختم ہوگئیں، تاہم اثرات ان کے برقرار ہیں۔ یمن اور ایران کی شیعہ سلطنتیں اب بھی بحمداللہ موجود ہیں اور علمی مراکز ایران میں قم، عراق میں نجف اشرف اور ہندوستان میں لکھنؤ کسی نہ کسی حالت میں اب بھی قائم ہیں۔ اس کے علاوہ کم ایسی جگہیں ہوں گی جہاں مسلمان ہوں اور وہاں فرقۂ شیعہ کے افراد موجود نہ ہوں۔

یہ ہے اس شیعہ قوم کی مختصر تاریخ جس کے مٹانے کے لئے سلطنتوں کی طاقت صرف ہوتی رہی مگر وہ اپنی حقانیت اور حسینی قربانی کی بدولت دنیا میں اس صورت سے لازوال حیات کی مالک ہے۔

❁❁❁

شیعیت کی تاریخ اور شیعی عقائد کی تفصیل

مصنف

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمس، لکھنوی، کراچی، پاکستان

شیعیت کی تاریخ اور شیعی عقائد کی تفصیل

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمسؔ لکھنوی، کراچی، پاکستان

تمہید

مولوی عبدالحئی صاحب لکھنؤ کے علمائے اہلسنت میں صاحب ذوق ادیب کامل، طبیب اور وسیع النظر مورخ تھے۔ ان کا تذکرہ گل رعنا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے اس تذکرہ میں، ان کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ہندوستان میں شیعیت کے عروج کا یہ سبب بتایا ہے کہ غفرانمآب دلدار علی صاحب نصیرآبادی عراق سے تحصیل علم کر کے لکھنؤ میں قیام پذیر ہوئے اور آصف الدولہ اور ان کے وزیر سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں کو جو مذہبی آدمی تھے آمادہ کر کے اپنی جمعہ و جماعت سنیوں سے الگ کر لی اور بجبر خاندان کے خاندان شیعہ بنا لیے۔

اس میں پہلا جزو ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ یعنی غفران مآبؒ کے قیام لکھنؤ کے بعد سے شیعہ جمعہ و جماعت شروع ہوئی اور خاندان کے خاندان شیعہ ہو گئے۔

لیکن اس کا سبب جبر نہ تھا۔ یہ بالکل وہی بات ہے جو غیر مسلم اسلام کے بارے میں کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلام اپنی حقانیت سے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستان میں شیعیت کے زوال و عروج کے اسباب بتائے جائیں اور شیعی عقائد کی بنیادوں کی استواری کی تفصیل بیان کی جائے جس سے اندازہ ہو کہ ہندوستان میں شیعیت کے عروج کا سبب خود اس کے اصول کی معقولیت ہے اور اس کو زندہ کرنے کے لئے

غفران مآبؒ نے کون سی تحریک شروع کی تھی اور اس تحریک کو پھر سے زندہ کرنے کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ اور اس دن کی یاد تازہ کرنا قومی شیرازہ بندی کے لئے کتنا ضروری ہے۔ اس مناسبت سے یہ کتاب اسی دن (۱۳/رجب) کو شائع کی جارہی ہے جس دن غفران مآبؒ نے اس تحریک کو شروع کیا تھا۔

شیعیت کی تاریخ اور شیعی عقائد کی تفصیل

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمدورفت بہت پہلے سے تھی۔ مگر ان کا بسنا فتوحات کے ساتھ شروع ہوا۔ محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کے زمانہ سے آباد ہونے والے خاندان اب تک موجود ہیں۔ تسلط واقتدار کے ساتھ آبادی بھی بڑھتی گئی۔ عرب، ایران، ترکستان اور افغانستان کے بے شمار خاندان آباد ہوگئے۔ ان میں شیعہ بھی تھے اور سنی بھی۔

حکومتیں اگرچہ سنی تھیں لیکن انھوں نے قابل اور لائق شیعوں اور ہندوؤں کو اعلیٰ عہدوں پر سرفراز کیا جس سے ان کی حکومت مضبوط ہوگئی۔ یہی ان کے پیش نظر تھا۔ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے نہیں بلکہ اپنی حکومت قائم کرنے آئے تھے۔ اس حیثیت سے ان کی حکومت غیر مذہبی تھی مگر اس لحاظ سے کہ ان کا بھی ایک مذہب تھا جس کا وہ دوسروں کو بجبر پابند نہیں بناتے تھے لیکن خود اس پر عامل تھے اور اس مذہب کے دو جزو ہیں۔

(۱) حقوق اللہ (۲) حقوق الناس

حقوق اللہ یعنی عبادات، اس کے جاننے اور بتانے والے علماء تھے۔ اس وجہ سے عبادت کے تمام ارکان ان کے ذریعہ سے انجام پاتے تھے۔ اور **حقوق الناس** یعنی ان کا برتاؤ رعایا سے اس ذیل میں ان کے مذہب کے تمام قوانین دیوانی وفوجداری آجاتے تھے جس کے جاننے اور نافذ کرنے والے بھی علماء تھے۔ اس طرح ان کے آئین حکومت کا بڑا حصہ ان کے

مذہب کے موافق تھا اور ان کے علماء حکومت کے بڑے حصہ دار تھے جو مفتی، قاضی، صدر اور صدر الصدور کی حیثیت سے تمام ملک پر چھائے ہوئے تھے۔ ان میں بعض جگہ شیعہ قاضی بھی مقرر ہو جاتے تھے مگر وہ فیصلہ سنی فقہ کی رو سے کرتے تھے اور مفتی تو سوائے سنی عالم کے کوئی ہوتا ہی نہ تھا۔

دارالسلطنت میں نماز جمعہ سنی علماء کی امامت میں ہوتی تھی۔ بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور سب نمازیں بھی جماعت کے ساتھ سنی طریقہ پر ہوتی تھیں۔ عیدین کی نماز میں بادشاہ اور امراء بڑے تزک و احتشام سے عیدگاہ جاتے تھے اور کوئی دوسری جماعت نہیں ہوتی تھی۔

صوبوں میں عمال و حکام جہاں نماز پڑھتے تھے وہیں شہر کی بڑی جماعت ہوتی تھی۔ دوسرے شہروں میں قاضی و مفتی اور چھوٹے حکام کی موجودگی شہر کی نماز کو سرکاری حیثیت دے دیتی تھی۔ اس طرح ایک شہر میں متعدد جماعتوں کے مواقع کم تھے۔

ابتداء میں جو شیعہ سپاہی یا رکن سلطنت کی حیثیت سے سنی سلاطین کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے انھیں اپنی جماعت الگ قائم کرنا اس لئے ممکن نہ ہوا کہ امامت کے لئے کوئی شخص نہ ملتا تھا۔ چونکہ شیعہ فقہ میں مسئلہ ہے کہ اسلامی شوکت بڑھانے کے لئے اہلسنت کے ساتھ ان کی جماعت میں فرادیٰ کی نیت سے شریک ہو کر اپنے طور پر نماز پڑھ سکتے ہیں، اس لئے اس میں زیادہ آسانی نظر آئی اور شیعہ اہلسنت کے ساتھ نماز جماعت میں شریک ہونے لگے۔ یہ ایک رسم قائم ہوگئی اور مذہبی رواسم عام مسلمانوں کے ساتھ انجام دینے لگے رفتہ رفتہ نماز، روزہ، نکاح، طلاق، دفن، کفن سب انھیں کے ہاتھوں سے ان کے طریقہ پر ہونے لگا۔

جن مقامات میں پڑھے لکھے شیعہ اور سنی ساتھ رہتے تھے وہاں شیعوں کے طریقہ کا لحاظ

رکھا جاتا تھا۔مثلاً نماز میں شیعہ ہاتھ کھول کر جماعت میں شریک ہوتے تھے۔دفن،کفن شیعوں کے طریقہ پر ہوتا تھا۔بعض ایسی جگہیں بھی تھیں کہ پڑھے لکھے شیعوں کی آبادی ہونے کے باوجود تمام رواسم عام مسلمانوں کے ہاتھ سے انجام پاتے تھے۔اسی طرح محرم کے رواسم میں سب شریک تھے۔ان حالات میں شیعوں کی انفرادی حیثیت کوئی نہ رہی اور وہ عام مسلمانوں میں گم ہوگئے باہر سے آئے ہوئے شیعہ تو شیعہ رہے مگران کی اولاد اپنے اعمال وعقائد سے بے خبر ہوتی اور عام مسلمانوں کے اعمال وعقائداور رسم ورواج اختیار کرتی گئی۔

پیری مریدی عرس،قوالی، چادر، شیخ سدو کا بکرا، میراں جی کے گلگلے، سید احمد کبیر کی گائے، سید سالار کی بیرق، مدار صاحب کی کندوری، باباشکر گنج کا کونڈا، بڑے پیر کا فاتحہ ایسے رواسم عام طور پر شیعوں میں مروج ہوگئے اوران کے متعلق ایسے خیالات وابستہ ہوگئے جن سے ان کا ترک ناممکن ہوگیا،مثلاً شیخ سدّو کی کڑھائی چڑھتی تھی اور گلگلے تلے جاتے تھے اسے لوگ اپنی مراد پوری ہونے کے لئے کھاتے اورایک دفعہ کھانے کے بعد ہرسال اس کا کرنا ضروری تھا اور نہ مشہور تھا کہ اس کے ترک سے آنکھوں میں درد شروع ہوتا ہے اور جب تک کڑھائی نہ چڑھے شدت بڑھتی رہتی ہے۔

یہاں تک کہ آنکھیں باہر نکل آتی ہیں اور ادھر کڑھائی چڑھی اُدھر صحت ہوئی۔اسی طرح کے خیالات ان میں سے ہرایک رسم کے ساتھ وابستہ تھے۔اس لئے انھیں توڑنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

بھنگ نوشی کا عام دستور تھا۔ ہرگھر میں ایک چبوترہ ہوتا تھا جس پر بھنگ گھونٹی جاتی تھی اور سب مل کے پیتے تھے۔ ہرشہر میں حقہ اور بھنگ کی سیکڑوں دوکانیں تھیں جن میں ہروقت بھنگ گھونٹی ہوئی تیار ملتی تھی،حقہ کی دوکان پر حقہ بھرا موجود رہتا تھا،سڑکوں پر بھی لوگ حقہ اور بھنگ

پلاتے پھرتے تھے۔

سفر کی دشواریوں اور رسل ورسائل کے فقدان نے عراق سے کوئی ربط پیدا نہیں ہونے دیا اور شیعہ مجتہدین کے فیوض سے محروم ہوکر اجتہاد وتقلید کے مفہوم سے بے خبر ہو گئے۔ پڑھے لکھے لوگوں نے اخباریت اختیار کر لی۔

ایران سے فقط شاعرانہ ربط قائم رہا۔ ان حالات میں شیعیت کا دھندلا سا مفہوم ذہنوں میں رہ گیا اور برابر شیعہ سنی ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اور سب سے بڑی اخلاقی کمزوری یہ پیدا ہوگئی کہ اکثر لوگ طمع جاہ میں، بعض مروت میں، بعض خوف بیجا میں مبتلا ہو کے اپنے مذہب کو چھپانے لگے۔ کسی اور کا کیا ذکر صاحب تاریخ العلماء جو خود بھی ایک عالم تھے لکھتے ہیں کہ قاضی نوراللہ شوستری زندگی بھر اپنے مذہب کو چھپاتے رہے ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں بہت سے لوگوں کی اولاد کا ترک مذہب کر دینا یقینی ہے۔

اس طرح ایک ایسا ماحول بن گیا تھا جس میں شیعیت سنیت میں جذب ہوتی رہی۔ خاندان کے خاندان سنی ہو گئے۔ آج جو سید سنّی نظر آتے ہیں یہ اسی دور کی پیداوار ہیں۔ جب ان کا شجرہ نسب دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اجداد فلاں زمانہ میں عراق یا ایران سے آئے تھے اور شیعہ تھے خود مولوی سید سلیمان ندوی بھی ایسے ہی سنیوں میں تھے۔

آخر زمانہ میں جب شیعوں کی خود مختار ریاستیں قائم ہوئیں تو ان میں بھی شیعیت کا وہی حال رہا جو ڈھرّا بندھ گیا تھا وہ چلتا رہا اس کو توڑ ناممکن بھی نہ تھا کیونکہ شیعہ مجتہدین موجود نہ تھے وہی مفتی، وہی قاضی، وہی سنی فقہ، وہی سنی جمعہ و جماعت بدستور جاری رہی۔

اس زوال میں شیعیت حساس دلوں کو اپنی فریاد سے بلاتی رہتی اور وہ بے بسی کے عالم میں دل مسوس کے رہ جاتے تھے۔ قدرت نے یہ کارنامہ سادات جائس اور نصیرآباد کے علمی خاندان

کی ایک فرد(۱) سید دلدار علی کے نام لکھ رکھا تھا جنھیں حساس دل، دقیق نظر، روشن دماغ، انقلابی ذہن، آہنی عزم اور پُر تاثیر زبان عطا کر کے تجدید مذہب، تعمیر قوم اور تنظیم ملت کی ذمہ داری سونپی اور ۱۱۶۶ھ جمعہ کی رات کو یہ آفتاب ہدایت افق نصیر آباد سے طالع ہوا۔ دیہات کی زندگی نے کھیتی باڑی کا مشغلہ بھی لازم کر دیا تھا۔ وہ بچپنے سے نہایت متین، سنجیدہ اور غور و فکر کے عادی تھے۔ اس مشغلہ نے آبادی سے باہر کھیتوں کی منڈیروں کو ان کا مکتب فکر بنا دیا جہاں وہ شیعیت کی اس گمنامی کو غور کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے اور بار بار ان کے دل میں علم دین حاصل کر کے تبلیغ مذہب کا جوش پیدا ہوتا تھا۔ تاریخ وسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ اپنے کھیتوں کے کنارے ایک درخت کے نیچے کھڑے تھے کہ یکا یک روشنی پیدا ہوئی اور آواز آئی کہ ''دلدار علی جا اور علم دین حاصل کر۔'' حقیقت میں یہی تو ان کے ضمیر کی آواز تھی جسے وہ سوتے جاگتے برابر سنا کرتے تھے۔ آخر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے اور ہندوستان کے مشہور علماء سے فلسفہ، منطق، ہیئت و ریاضی میں کمال حاصل کر کے لکھنؤ آئے۔ اس وقت آصف الدولہ حکمراں اور سرفراز الدولہ وزیر اعظم تھے۔

---

(۱) جس طرح خاندان بنی امیہ کی ایک فرد (عبدالرحمن) نے بنی عباس کے خوف سے بھاگ کر اسپین میں ایک شاندار حکومت قائم کر کے قیصر و کسریٰ کے شان و شکوہ کو گرد کر دیا جس کی یادگاریں آسمان کی گردشیں آج تک نہ مٹا سکیں۔ اسی طرح خاندان رسالت کی ایک فرد (ابوطالب حمزہ) نے بنی عباس کی سخت گیریوں سے تنگ آ کے اپنے پردادا امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کے مدفن کو چھوڑ کر ایران کا رُخ کیا۔ جہاں وہ دوسری ربیع الاول ۲۹۲ھ کو شیراز میں انتقال کر گئے۔ ان کے بیٹے (سید ابوالعلیٰ محمد) سبزوار میں جا کر مقیم ہوئے اور وہاں علوم اہلبیتؑ کی اشاعت اس طرح کی کہ وہ دارالایمان مشہور ہو گیا۔ ۲۸/صفر ۳۳۰ھ کو انھوں نے وفات پائی مگر ان کی اولاد نے وہاں علمی و روحانی مرکزیت حاصل کر لی۔ سبکتگین کا نامور بیٹا محمود جس وقت ہندوستان پر حملے کر رہا تھا اس زمانہ میں سید ابوالعلیٰ محمد کے پوتے سید نجم الدین اپنے متبعین کی ایک جماعت کے ساتھ ہندوستان آئے اور وڈّیانگر کو فتح کر کے جائے عیش نام رکھا جو کثرت استعمال سے جائس ہو گیا۔ اس وقت سے یہ قصبہ سادات نقویہ کا مسکن ہوا۔ چند سالوں کے بعد ان کی اولاد قریب کی ایک ریاست پٹاک پور کو فتح کر کے نصیر آباد میں علمی و روحانی مسند بچھا کے بیٹھی جس کی روشنی دور دور پہنچی حکومت وقت نے بھی اس خاندان کے افراد کو اتالیقی، معلمی، قضا اور صدارت کے عہدوں پر سرفراز کیا اور علمی حیثیت سے جائس کا بھی ایک درجہ سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ اس خاندان کی ایک فرد سید عبدالقادر کو اورنگ زیب نے ولی عہد کی معلمی پر مامور کیا تھا اور انھوں نے شہزادے کو شیعیت سے روشناس کیا یہاں تک کہ بہادر شاہ بننے کے بعد انھوں نے اپنے تشیع کا اعلان کر دیا جس پر ہنگامہ برپا ہوا تفصیلات تاریخ میں موجود ہیں۔

انھوں نے وزیراعظم کے یہاں رسائی حاصل کی اور ایک دن موقع پا کے اپنا سارا دردِدل بیان کر دیا۔حسن اتفاق کہ وہ بھی اس درد میں ان کے شریک نکلے اور کہا کہ آپ تبلیغ کیجئے میں سہولتیں پیدا کروں گا انھوں نے کہا کہ پہلے میں خود تو علم دین حاصل کروں اس کے بعد تبلیغ کا موقع ہے۔ چنانچہ طے پایا کہ نجف اشرف جا کر جتنے دنوں وہاں ضرورت ہو قیام کر کے علم دین حاصل کریں۔نواب نے پانچ ہزار روپے اپنی جیب سے دیئے اور ہندوستان کا یہ فلسفی دین کا طالب علم بن کر باب مدینہ علم کی طرف روانہ ہوا۔مشہور ہے کہ کئی ماہ میں بادبانی جہاز نے بصرہ کے قریب پہنچایا تھا کہ بادمخالف کے طوفان نے پندرہویں دن بمبئی کے ساحل پر لا کھڑا کیا۔مگر دلیرانہ[1] ہمت اور جواں مردانہ عزم کف دہاں سمندر کو للکار کے پھر اس کے سینہ پر سوار ہو گیا۔اب کی سمندر مغلوب اور بیڑا پار تھا۔نجف پہنچ کر کسی بچے نے نہیں ایک مفکر اور فلسفی نے وہاں کے اکابر علماء سے مذہب کے اصول کی گہرائیوں اور فروع کی بلندیوں کو سمجھا۔ اس میں پانچ برس کامل صرف کئے۔ اب ہندوستان واپس ہوئے اور وہ مقصد جس کی تکمیل کے لئے ان کی روح بے چین تھی بیس برس کامل مشقت کے بعد اس کو پورا کرنے کے لئے عمل کا میدان سامنے آیا اور ان کا وہ عملی کارنامہ شروع ہوا جس نے دنیائے اسلام میں ان کو مجدد اعظم تسلیم کرالیا اور وہی ہمارا اصل موضوع ہے جسے ہم تفصیل سے بیان کریں گے۔اس کے متعلق ہمیں دو باتیں بیان کرنا ہیں۔ایک ان کا ذوق تبلیغ دوسرے علمی منزلت۔

(۱) بعض تاریخوں میں ہے کہ وہ سندھ کے راستے سے کربلا گئے مگر یہ صحیح نہیں۔

ذوق تبلیغ

ذوق تبلیغ کے بارے میں آپ سن چکے ہیں کہ وہ ایک غیبی آواز سے بے چین ہو کے گھر سے نکلے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں کے اکابر علماء سے علوم عقلیہ کی تکمیل کر کے عراق گئے۔ وہاں پانچ برس قیام کیا مگر کسی وقت وہ ذوق تبلیغ سے خالی نہ تھے۔ انھیں اس مقصد میں اپنی پوری زندگی کا صرف ہو جانا کافی نہ معلوم ہوتا تھا اور بار بار یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ میرے بعد کہیں یہ کام رک نہ جائے۔ اس لئے وہ بے چین ہو ہو کے دعائیں (۲) مانگتے تھے کہ بارالہا میری اولاد میں تا قیامت علم دین باقی رہے۔ اس طرح انھوں نے تڑپ تڑپ کے اپنے دنوں کو رات اور راتوں کو دن کیا۔ اور جب وہ وقت آیا کہ ان کی دعا کی قبولیت کا اثر ظاہر ہوا اور ان کے بیٹے ان کے سامنے علم و فضل، درس و تدریس تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت مذہب میں ان کے برابر کے شریک ہو گئے تو انھوں نے اس پر اکتفا نہیں کی اور تین وصیت نامے لکھے جن میں سے ہر ایک میں عزاداری کی ترویج اور مذہب کی تبلیغ کی وصیت کی ہے۔

---

(۲) علامہ کنتوری لکھتے ہیں کہ میرے ایک بزرگ رسول پور کے جناب غفران مآبؒ کے ہم سفر تھے۔ نجف میں شب قدر کے اعمال کئے اور ان کو بھی شریک کیا اور فرمایا کہ جب ایک عمود نور، قبہ مبارکہ سے آسمان تک نظر آئے تو وہی استجابتِ دعا کا وقت ہے تم دعا میں مصروف ہو جانا۔ چنانچہ جب وہ وقت آیا تو جناب غفران مآبؒ نے دعا کی ''خداوندا بحق صاحب قبر میری اولاد سے قیامت تک علم دین نہ جائے۔'' سید صاحب نے دعا کی ''خداوندا رسولؐ پور کی بارہ پٹی میں سوائے میرے اور کوئی میرا شریک نہ ہو۔'' جناب غفران مآبؒ نے ایک دوہتّھڑ ان کو مارا کہ اے کمبخت یہ کیا دعا مانگی۔ سید صاحب نے کہا تم زمینداری کا مزہ کیا جانو۔ مُلا آدمی لڑکے پڑھانے کا تو تم کو مزہ ہے۔ زمینداری کی جڑ پاتال میں ہوتی ہے جیسے دوب کی جڑ۔ تاریخ العلماء ص ۱۵۰

علمی کارنامہ

علمی کارنامہ کے بارے میں آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں معقولات کی اور نجف میں علوم اہلبیتؑ کی تکمیل کی اور وہ درجہ حاصل کیا کہ متقدمین فلاسفہ کی صف اول میں شمار کئے گئے۔

علامہ عبدالحیؒ فرنگی محلی جو اپنے وقت کے مشہور فلسفی تھے ان کا یہ قول علامہ سید مرتضیٰ فلسفی نے معراج العقول میں لکھا ہے کہ جب میں جناب غفران مآبؒ کے حاشیہ صدرا کو دیکھتا ہوں تو بعض اکابر فلاسفہ پر ان کو ترجیح دیتا ہوں۔

ذہنی صلاحیت

ذہنی صلاحیت کا اس سے اندازہ کیجئے کہ وہ اپنے اساتذہ کی مجلس درس میں ترجمان کی حیثیت رکھتے تھے اور استاد کے اُلجھے ہوئے مطلب کو اس طرح سلجھا دیتے تھے کہ طالب علم کے ذہن میں اتر جاتا تھا اور چند دن میں وہ اپنے استاد پر بار ہوجاتے تھے۔فیض آباد کا واقعہ مشہور ہے کہ اقلیدس کا ایک مسئلہ شاگرد نہیں سمجھ رہے تھے اور استاد کی طرف سے بار بار کوشش جاری تھی آخر میں جناب غفران مآبؒ نے قلم کا ایک سرا زمین پر اور ایک دیوار پر رکھ کر مثلث بنایا اور مسئلہ سمجھا دیا یہ بات استاد کے دل میں کھٹک گئی اور وہ دشمن ہو گئے۔نواب حسن رضا خاں سے تقریب ملاقات بھی اسی طرح ہوئی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا نے ان کو وہ تقریری صلاحیت دی تھی جس سے وہ اپنی بات دل و دماغ میں اتار دیتے تھے۔

ان کے بیٹے سلطان العلماء کی مشہور کتاب بوارق موبقہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فلسفہ کی تکمیل کے بعد ہندوستان کی سیاحت بھی کی اور مشہور فلاسفہ سے معرکہ آراء مباحثے بھی ہوئے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالعلی صاحب سے شاہجہانپور کی مسجد میں ملاقات ہوئی۔

انھوں نے اپنی مشہور شرح سلّم میں جوملا حمداللہ پر اعتراضات کئے ہیں کا جواب جناب غفران مآبؒ نے دیا تو وہ کوئی شافی جواب نہ دے سکے۔

ملا حسن سے دہلی کی جامع مسجد میں ملاقات ہوئی اور مسئلہ انجرار وتر پر بحث ہوئی تو ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ یہ علمی درجہ حاصل کرنے کے بعد وہ عراق گئے وہاں جس ذوق اور کاوش سے علم حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب کبھی گھر سے کوئی خط آیا تو اسے پڑھا نہیں کہ نہ معلوم کیا خبر ہو اور کتنی دیر تک دل ودماغ کو متاثر رکھ کے تحصیل علم سے مانع رہے۔ خط جمع کرتے رہے، چلتے وقت سب کو نکال کے پڑھا، اس کاوش سے علم حاصل کرکے اس ذوق تبلیغ کو ساتھ لے کے وہ ہندوستان پلٹے، وعدہ کے موافق نواب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی کتابیں مختلف مذاہب کی دو دفعہ منگوا کے دیں اور وہ سیاسی توڑ جوڑ سے اپنے کو علیحدہ کرکے صرف ایک مقصد کو سامنے رکھ کے بیک وقت تصنیف وتالیف، درس وتدریس اور تبلیغ میں مشغول ہو گئے جس میں سے ہر ایک کی تفصیل ایک کارنامہ ہے۔

تصنیف وتالیف

تصنیف وتالیف کے میدان میں قدم رکھا تو سب سے پہلے ''عمادالاسلام'' کی پہلی جلد الٰہیات سے شروع کی جس میں حکمائے یونان، فلاسفۂ اسلام اور علمائے امت کے اقوال کے ردوابطال میں جو معرکے دکھلائے ہیں اس نے علمائے سابقین ولاحقین کے کارنامے محو کر دیئے۔

علامہ عبدالحسین صاحب استاد فلسفہ (جامعہ سلطانیہ لکھنؤ) اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''یہ ایک ایسی جامع اور حاوی کتاب ہے جس کی نظیر مذہب امامیہ کے کتب خانہ بلکہ اسلامی کتاب خانہ میں ناپید ہے۔ اس کی تعریف کے لئے میدان قلم کوتاہ اور جولانیٔ دماغ

ناکافی ہے۔اس میں ایسے مطالب عالیہ بیان کئے گئے ہیں جن کا سمجھنا خالی از اشکال نہیں، چہ جائے کہ ان کی توضیح وتقریر کرنا۔مرحوم اَعْلَی اللّٰہُ دَرَجَتَہٗ نے یہ کتاب نہیں لکھی بلکہ درسگاہِ تحقیق اور بزمِ قدس منعقد کی ہے، جس میں تمام علماء، حکماء اور متکلمین اسلام کو مدعو کرلیا ہے۔اس میں اگرایک طرف افلاطون الٰہی مع اپنی تحقیقات کے، ارسطو مع اپنی آراء کے جلوہ افروز ہیں۔تو دوسری طرف ابوالنصر فارابی، شیخ الرئیس ابوعلی بن سینا مع شفاء واشارات کے زیب دہِ انجمن ہیں۔ایک طرف اگر بہمن یار مع تجرید کے، میر باقر داماد ؒ مع اپنی تصنیفات کے زینت افزائے بزم ہیں، تو دوسری طرف علامہ حلّی ؒ مع ''نہایت المرام'' کے، قوشجی ؒ مع شرح تجرید کے، شیخ مفید ؒ مع مقالات کے، سید مرتضیٰ علیہ الرحمہ، مع شافی کے، سید علی بن طاؤس ؒ مع طرائف کے، رونق افزائے محفل ہیں۔وسط میں اشاعرہ اور معتزلہ کا گروہ مع اپنے تلامذہ اور اتباع کے جن میں حافظ نظام، ابوالہذیل علاف بلخی وغیرہ وغیرہ موجود ہیں۔ایک گوشہ میں ملا صدرالدین شیرازی ؒ مع اسفار اور شارح مواقف مع اپنی تصنیفات کے تشریف فرما ہیں، دوسرے گوشہ میں شہید ثالث قاضی نوراللہ شوستری اور علامہ فضل بن روزبہان ؒ مع احقاق الحق اور ابطال الباطل کے حاضر ہیں۔

صدر نشین بزم قدس جناب غفران مآب علیہ الرحمہ ہیں، آپ کے ہاتھوں میں عنانِ کمیت قلم ہے اور وہ اس کو میدان تحقیق میں جولان کررہے ہیں۔آپ کی تحقیق اتنی کامل، آپ کی نظر اتنی وسیع ہے کہ آپ کے فیصلہ کو تمام علماء مانے ہوئے ہیں، آپ پر مجال نہیں کہ کوئی اعتراض کرسکے اور آپ کی تحقیق کو رد کرسکے۔

عراق کے مشہور عالم شیخ الفقہاء شیخ محمد حسن نجفی صاحبِ 'جواہر الکلام' لکھتے ہیں:

''مرأۃُ العقول (الملقب بعماد الاسلام) جس کے مصنف ہیں اسلام کے رکن اعظم اور خلق خدا پر خدا کی حجت، جنھوں نے عقول کو اپنی موشگافیوں سے حیران کر دیا اور عقلی شبہوں کو اپنی فکر ونظر کے ستاروں سے روشن کر دیا، جن کے انواع علوم کی حدیں معین کرنے سے اجناس وفصول قاصر ہیں اور جنھوں نے تحریر کی مشکل شکلوں کو اپنے بیان کے منطوق کے ذریعہ سے واضح کیا، تمام خلق خدا کے مرکز اور عقول عشرہ[1] کے مدمقابل گیارہویں عقل'

(ظل ممدود از مفتی میر عباس صاحب)

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:

بلند مرتبہ علامہ، خدا کی بولتی ہوئی کتاب، جن کی ذات پر اجتہاد ختم ہو گیا۔۔۔۔۔۔خدا کی سب سے بڑی آیت اولین وآخرین کے اندر۔ (ظل ممدود)

علامہ شیخ احمد یمنی صاحب نفحۃ الیمن لکھتے ہیں:

آپ کی مہارت علم اصول میں جعفری، آپ کا احاطہ فروع مسائل میں یوسفی، آپ کی درایت فہم حدیث میں باقری، آپ کی تحریر وتقریر حقائق کی پردہ در اور دقیق نکتوں کو واضح کرنے والی ہے۔ کون آپ کی ہمسری کر سکتا ہے؟ اگر علامہ حلّی ہوتے تو آپ کی اقتدا کرتے، اگر مجلسیؒ اور مفیدؒ آپ کے مفید مجالس درس میں، حاضر ہوتے تو بحارُ الانوار کو آپ کے دریائے علم کے پہلو میں حقیر سمجھتے۔ اللہ اکبر کس قدر علوم وفنون میں آپ کا حصہ بلند اور مقام رفیع ہے۔

(ظل ممدود مرتبہ جناب مفتی میر عباس صاحب)

---

(۱) فلاسفہ یونان قائل ہیں کہ اللہ کی مخلوق بلاواسطہ عقل اوّل ہے اور عقل اوّل نے عقل ثانی کو پیدا کیا اور عقلِ ثانی نے عقل ثالث کو، یوں ہی دس عقول تک سلسلہ پہنچا اور نو فلک پیدا ہوئے، پھر انھیں عقول وافلاک کی شرکت سے تمام کائنات وجود میں آئی۔

مولانا اعجاز حسین صاحب اور برادر مولانا میر حامد حسین صاحب مرحوم شذور العقیان فی تراجم الاعیان میں اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ

انھوں نے تلمذ حاصل کیا خدا کی اس نشانی سے جو تمام عالموں کا رب ہے۔ وہ ایسے بزرگ ہیں جنھوں نے مملکت ہندوستان میں دین کو زندہ کیا اور بدعت وجاہلیت کے آثار کو محو (باطل) کیا۔ یعنی علاّمہ مولانا سید دلدار علی نصیر آبادیؒ۔

(منقول از حیات فردوس مکاں)

حقیقت میں خدا کو ان سے جو اہم کام لینا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ ان کا علم، ان کا عزم، ان کی ہمت اور ان کی سیرت ائمہ اہلبیتؑ کا پرتو ہو۔ یہی اوصاف ان کے علمی کارنامے کی جان ہیں۔ اگر ان کا علم، ان کی بلند نظر، ان کی تعمق فکر فوق البشر نہ ہوتی تو ہندوستان کی شیعیت کی تاریخ کچھ اور ہوتی ان کی بلندیٔ نظر ہر خامی کو دیکھتی تھی خواہ وہ کہیں ہو۔

جس طرح انھوں نے ہندوستان کے اکابر علما سے مختبرانہ ملاقات کی اسی طرح وہ عراق جا کر وہاں کے علماء سے مرعوب نہیں ہوئے اور وہاں سے واپس آئے تو ان کی نقل نہیں اتاری۔ بلکہ ہندوستان میں ان طریقوں سے شیعیت کی ترویج کی جو یہاں کے حالات کے لحاظ سے مناسب تھے۔

ہندوستان میں شیعوں کی پہلی نماز جماعت

آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ شیعوں کی نماز جماعت ہندوستان میں کہیں نہیں ہوتی تھی اور ایک نئی بات کی ابتداء کرنے کی نہ کسی کو جرأت تھی اور نہ کوئی نماز پڑھانے والا میسّر تھا۔ پڑھے لکھے شیعہ عموماً اخباری تھے جن کے نزدیک جمعہ وجماعت درست نہیں۔ اس طرح شیعوں کی الگ کوئی اجتماعی زندگی نہ تھی اور بحیثیت شیعہ ایک قوم ہونے کا کوئی تصور کسی کے دماغ میں نہ تھا

بلکہ عام طور پر لوگ اس کے اظہار سے کتراتے تھے جس کے نتائج کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

شیعہ قومیت کی تشکیل

اس وقت ضرورت اس کی تھی کہ شیعوں کے مذہبی عقائد انھیں بتائے جائیں ان کی نماز، ان کے مذہبی رواسم الگ قائم ہوں اوران میں اتنی جرأت پیدا کی جائے کہ وہ بحیثیت شیعہ ایک اجتماعی زندگی اختیار کرکے ایک قوم بن جائیں۔ اس کے لئے جناب غفران مآبؒ نے جو صورتیں اختیار کیں ان کی تفصیل یہ ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے نواب حسن رضا خان کوآمادہ کیا کہ شیعوں کی نماز جماعت شروع ہو۔لیکن نواب کو جرأت نہ ہوئی جس کا ثبوت یہ ہے کہ جب اصرار بڑھا تو پھر بھی اس کا اعلان نہیں کیا گیا اور نہ کسی مسجد میں اعلان کرنے کی ہمت کی گئی۔ نواب کے گھر میں ملا محمد علی فیض آبادی اور شیخ اکبر علی چشتی مودودی نے غفران مآبؒ کی اقتدا میں چند مخصوصین کے ساتھ نماز پڑھی۔ یہ ۱۳/رجب ۱۲۰۰ھ کی مبارک تاریخ تھی۔قدسی جائسی کا شعر ہے ؎

شیعیانِ ہند کی پہلی جماعت کی نماز
جس سے عہدِ آصف الدولہ کو ہے خاص امتیاز

یہ مبارک تاریخ ہندوستان میں شیعہ قوم کی تشکیل کا نوروز ہے جس کی یادکوتازہ رکھنا ہر فرد کا قومی فریضہ ہے۔

نماز جمعہ کی ابتداء

اس کے بعد انھوں نے بڑی جرأت سے کام لیا اور مذہب میں گویا نئی بات کی ابتدا کی یعنی ۲۷/رجب کو جمعہ کی نماز قائم کی جو عراق وایران میں بھی نہ ہوتی تھی، البتہ اب چند سال سے کہیں کہیں ہونے لگی ہے۔اس کے وجوب پر ایک استدلالی کتاب لکھی۔ اس طرح انھوں

نے عراق وایران کی بھی ایک کمی کو یہاں پورا کیا۔

موعظہ کی ابتداء

نماز کے بعد موعظہ شروع ہوا جس میں رفتہ رفتہ مجمع بڑھتا گیا۔سرفراز الدولہ،آصف الدولہ کو بھی ایک دن کھینچ لائے مگر غفران مآبؒ سے کہہ دیا کہ نواب بھنگ کے عادی ہیں،اس کے متعلق کچھ نہ کہئے گا،لیکن اس دن کا موعظہ مسکرات ہی کی حرمت پر تھا نواب کا ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔رہ رہ کے اپنی لمبی لمبی موچھوں کو بل دیتے تھے۔وزیر اعظم کی نظر نواب پر تھی۔دل میں پنکھے لگے تھے کہ دیکھئے خدا آج کیا دکھاتا ہے۔ابھی موعظہ تمام نہ ہوا تھا کہ نواب نے بلند آواز سے کہا کہ باواجان کے سر کی قسم جو آج سے بھنگ کو منھ لگایا ہو،اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زبان میں خدا نے وہ اثر دیا تھا کہ جو قلوب کو پھیر سکتا تھا اور سینہ میں وہ دل دیا تھا جو سوا خدا کے کسی اور سے نہ ڈرتا تھا۔

اصلاحی کوششیں

تحریر کے ذریعہ جو انھوں نے اصلاحی کوششیں کیں،وہ اگرچہ ہندوستان کی ضرورت کے مطابق تھیں مگر چونکہ وہ تقلیدی نہ تھیں بلکہ خود ان کی قوتِ اجتہاد کا نتیجہ تھیں،اس لئے ان کی اہمیت اور افادیت ہندوستان تک محدود نہیں رہی۔

تصوف کی مخالفت

ہندوستان میں تصوف کا بڑا زور تھا۔علمائے عراق نے اس پر شیعی نقطہ نظر کی وضاحت نہیں کی۔علمائے ایران میں علامہ مجلسیؒ نے ایک ہلکی سی روشنی ڈالی۔اس وجہ سے اکثر علمائے شیعہ کو اس بارے میں مسامحہ ہوتا رہا۔علامہ محسن کاشانی صاحب تفسیر صافی نے سماع (قوالی) کو جائز قرار دیا۔شہید ثالث قاضی نور اللہ شوستریؒ نے اکابر صوفیہ کی تعریف میں اتنی خامہ فرسائی کی

کہ ان کی مذہبی حیثیت مشکوک ہوگئی اور صاحب تاریخ العلماء کو لکھنا پڑا کہ ان کو بدمذہب سمجھنا درست نہیں کیوں کہ انھوں نے صوفیہ کی تعریف کے ساتھ ان کے اقوال کی تاویل کی ہے اور اس کا کچھ اور مطلب بیان کیا ہے۔ بہر حال اس وقت تک کوئی واضح خط صوفیت اور شیعیت کے درمیان نہ تھا۔ جناب غفران مآبؒ نے ایک معرکہ آراء کتاب ''شہاب ثاقب'' صوفیت کی رد میں لکھ کر ان کے فلسفہ اور عمل وقول کی دھجّیاں اُڑا دیں اور ایسا قلع قمع کیا کہ شیعوں سے اس کا استیصال ہو گیا۔

اخباریت کی رد

ہندوستان کے شیعوں میں عام طور سے اخباریت پھیلی ہوئی تھی، وہ اجتہاد وتقلید کو ناجائز سمجھتے تھے۔ غفران مآبؒ نے اس موضوع پر ''اساس الاصول'' لکھ کے اخباریت کی جڑ اُکھاڑ دی۔ اب ہندوستان میں اخباری نہ ہونے کے برابر ہیں۔

علم کلام میں انھوں نے توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت پر مستقل کتابیں لکھیں اور بڑے شدومد سے جبر وقدر، رویت باری، معصیت انبیاء اور خلافت غیر منصوص کی رد کر کے مذہب اہل بیت کو ثابت کیا۔ اس سے پہلے عقلی ونقلی حیثیت سے اتنی مدلل، اتنی مفصل، اتنی مکمل بحث کسی نے نہیں کی تھی۔ اس سے ہندوستان میں ایک ہلچل مچ گئی اور شیعہ سنی دونوں نے ان کے خلاف محاذ قائم کر دیا۔

چنانچہ اخباریوں کی طرف سے ''اساس الاصول'' کی رد لکھی گئی۔ تفضّل حسین خان علامہ نے عماد الاسلام پر اعتراضات کئے۔ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی نے تحفہ اثناعشریہ میں توحید سے لے کر معاد تک شیعہ نقطۂ نظر کی رد کی۔ اس طرح ایک میدانِ کارزار گرم ہو گیا۔ ایک ایک موضوع پر کتابوں کے انبار لگ گئے اور ایک ایسا ذخیرہ فراہم ہو گیا جو عراق وایران کو بھی آج تک نصیب نہیں ہوا۔

تعزیہ داری

تعزیہ داری کا وجود ہندوستان میں بہت پہلے سے تھا۔ دکن کے عاشور خانے، سندھ کے امام بارگاہ، یو۔ پی۔ کے امام باڑے قدیم زمانے سے چلے آرہے ہیں ان میں علم، پنجے اور تعزیے رکھے جاتے تھے۔ مُبکی نظمیں تنہا اور چند آدمی مل کے راگ سے پڑھتے تھے۔ موجودہ زمانہ کی سوزخوانی اور نوحہ خوانی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ اس سے بجز حصول ثواب اور کوئی افادیت نہ تھی، وہ بھی جب کہ حدود شرع میں ہو۔ جلوس بھی نکلتے تھے جن میں شہنائی، روشن چوکی، طبل، تاشہ، جھانجھ بجتے اور ماہی مراتب (مچھلی اور چوپاؤں کے سر چاندی اور پیتل کے بانسوں پر لگے ہوئے) کے ساتھ براق اور گنبد تعزیوں کی جگہ ہوتے تھے، کچھ کچھ دور پر ٹھہر ٹھہر کے بانک اور پٹے کا فن دکھاتے اور یا حسینؑ کی آواز بلند کرتے جاتے، ان رواسم کی بجا آوری میں سب مسلمان یکساں طور پر شریک تھے، البتہ عاشور خانے اور اماماڑے شیعہ ہی تعمیر کرتے تھے مگر اس میں مرثیہ کہنے اور پڑھنے میں کوئی تخصیص نہ تھی۔

غفران مآبؒ نے روشن چوکی اور شہنائی کو آلات غنا ہونے کی وجہ سے حرام اور طبل، تاشہ کو جنگی باجا ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا، جھنڈیوں، ماہی مراتب کے بدلے علم، گنبد کی جگہ تعزیئے اور براق کے بدلے ذوالجناح کو بانک اور پٹے کا فن دکھانے کے عوض نوحہ خوانی اور سینہ کوبی کو رواج دیا۔ حاضری، مہندی اور نذر و نیاز ایسے رواسم قائم کئے۔ محرم کے دس دن میں ہر دن ایک شہید کے ذکر سے مخصوص کیا۔ مجلسوں میں عراق کی روضہ خوانی کے طرز پر ذاکری شروع کی جس میں اہلبیتؑ کے فضائل میں حدیثیں بھی مصائب کے ساتھ بیان کی جانے لگیں۔ اس طرح مجلس کی افادیت بڑھ گئی اور اس میں تبلیغی پہلو پیدا ہوگیا اور ان رواسم کو اتنا عام کردیا کہ گھر گھر مجلس اور گلی گلی تعزیئے اٹھنے لگے۔ اس طرح انھوں نے شیعوں کی تعزیہ داری کو ایک نئی

شکل دے کر عام مسلمانوں سے علٰحدہ کر دیا اور اس سے مذہبی تبلیغ، قومی تنظیم اور شیعی تمدن کی تشکیل کی۔

اس سلسلہ میں ایک کمی جو عراق وایران میں ہے، انھوں نے یہاں اس کو پورا کیا۔ علمائے عراق وایران مجلسیں پڑھنا اپنی شان اور مرتبہ کے خلاف سمجھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذاکری جسے وہاں روضہ خوانی کہتے ہیں کم پڑھے لکھے لوگوں کا کام رہ گیا اور اس میں کوئی ترقی نہ ہوسکی۔ لیکن جناب غفران مآبؒ نے واقعات کربلا کے متعلق معتبر روایتوں کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کرکے ''اثارۃ الاحزان'' کے نام سے پیش کیا، عاشورہ کے دن عصر کے بعد خود مجلس پڑھنے کی ابتداء کی، سروپا برہنہ گریبان کھلا آستین چڑھی ہوئی سراپا تصویر غم بنے ہوئے گھر سے اپنے امام باڑے میں آئے اور اسی شان سے منبر پر تشریف لے جاتے تھے۔ اس طرح ہندوستان کے علماء میں انھوں نے یہ سنت قائم کی کہ ان کے بعد ان کے جانشین یہ مجلس پڑھتے رہے۔ آج بھی یہ مجلس اسی وقت ان کے امام باڑے میں ہوتی ہے۔ اب یہاں کے علماء کو جو حقیقت میں انھیں کے ذرّیات تھے اس پر اعتراض اور اس سے احتراز کی کیا ہمت ہوسکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت سے علماء مجلسیں پرھنے لگے، یہاں تک کہ ان کی چوتھی پشت میں بحر العلوم جناب محمد حسین عرف علن صاحب پیدا ہوئے جنھوں نے ذاکری کے فن میں انقلاب پیدا کیا اور کلام مناظرہ، حدیث وتفسیر سے تقریر کو علمی بنا کر موجودہ طرز ذاکری کے موجد ہوئے۔ اس طرز کو سید جواد ہندی نے عراق میں جا کے پیش کیا اور اتنی مقبولیت حاصل کی کہ ہر شخص ان کا گرویدہ ہوگیا۔ آج تک ان کا نام عربوں کی زبان پر ہے۔ ۱۹۲۴ء میں جب میں عراق گیا تو ان کے صاحبزادے وہاں چوٹی کے ذاکروں میں تھے۔ عرب بڑے شوق سے ان کی مجلس میں شریک ہوتے تھے میں نے بھی ان کی مجلسیں سنیں، ہندوستان کے ذاکروں سے کوئی نسبت نہ تھی۔

درس وتدریس

ساتھ ہی ساتھ انھوں نے مجلس درس قائم کی جس میں بقول حضرت سید العلماءؒ وہ ایک یونیورسٹی کی حیثیت رکھتے تھے جو تنہا اپنے شاگردوں کو تمام علوم کی تعلیم دے کے جید عالم بنا دیتے تھے اور سب سے بڑا کارنامہ ان کا یہ ہے کہ انھوں نے اپنی سیرت وکردار اور تعلیم سے اپنے شاگردوں کو اتنا متاثر کیا اور ایسی اسپرٹ پیدا کردی کہ وہ کار تبلیغ میں ان کے شریک ہو گئے اور ہندوستان کے جس گوشہ میں جس کو بھیج دیا وہ خدا پر بھروسہ کر کے گھر بار چھوڑ کے روانہ ہو گیا۔ اس طرح ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان کے مبلغین ہتھیلی پر سر رکھ کر پہنچ گئے۔ وہاں کے شیعوں کو عقائد کی تعلیم دی اور ان کے دلوں سے خوف وہراس دور کر کے اپنے اعمال کو عام مسلمانوں سے علیحدہ بجالانے کی جرأت پیدا کی۔ جمعہ وجماعت قائم کی۔ مسجد وامام باڑہ بنوایا، عزاداری کو رواج دیا، بدعتوں سے روکا، دفن، کفن، نکاح، طلاق سب شیعوں کے طریقہ پر ہونے لگا۔ اس طرح سارے ہندوستان میں بغیر کسی منصوبے اور سرمایہ کے انھوں نے تبلیغ کر کے پیغمبری کا کام انجام دیا۔ چونکہ ان کی تحریک کا تعلق صرف شیعوں سے تھا کسی اور کو وہ دعوت نہیں دیتے تھے اس وجہ سے دوسروں کو کچھ بولنے کی گنجائش نظر نہ آئی بعض جگہ ان مولویوں کو جو شیعوں کے یہاں نکاح طلاق، تجہیز وتکفین کی خدمت انجام دیتے تھے اور ہر ایک کے لئے ان کا ایک حق معین تھا اس کے لئے طے کیا کہ ہر موقع کے لئے جو حق ان کا معین ہے ان کو دیا جائے اور خدمت ہم سے لی جائے اس طرح یہ انتظام کیا کہ ان کا بھی مالی نقصان نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ صدیوں سے خوف دلوں میں بیٹھا تھا وہ دور ہو گیا اور سارے ہندوستان میں شیعیت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہر جگہ شیعہ بحیثیت ایک قوم کے نظر آنے لگے جن کے نام، مذہبی رواسم، اخلاق، طرز معاشرت، معیار فکر، زاویہ نظر، تعلیم اور لٹریچر سب الگ ہو کر ایک مستقل قوم

بن گئے اور ہندوستان کی قوموں میں اپنی علمی اور تمدنی حیثیت سے ایک ممتاز درجہ حاصل کرلیا۔

مذہبی معاملات میں ان کے نقطۂ نظر اور اندازِ فکر میں تبدیلی ہوگئی وہ رسولؐ کی تعلیم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے انھیں افراد کے دامن سے وابستہ ہوگئے جن کا تعارف رسولؐ کی زندگی کا مستقل مشن تھا اور وہ اوروں کی مذہبی اور روحانی سیادت وقیادت کے قائل نہ رہے جس کے نتیجہ میں شیخ سدّو، میران جی، سید احمد کبیر، سید سالار مدار صاحب، پیران پیر خود بخود ساقط ہوگئے۔ اور جب اہل بیتؑ رسول کے فضائل ومناقب بیان کئے جانے لگے اور عزاداری نے ایک انقلابی کروٹ بدلی اور دوسروں کی طرف سے اس پر بدعت کے فتوے لگنے لگے تو حاضری، نذر ونیاز اور علم وتعزیہ کو بدعت کہنے والوں کو چارہ نہ رہا کہ وہ شیخ سدّو کے گلگلے، سید احمد کبیر کی گائے اور سید سالار کے جھنڈے کو بھی بند کرائیں۔ اس طرح اہل سنت کو بھی فائدہ پہنچا چنانچہ غفران مآبؒ کی تحریک کی اتنی غیر معمولی کامیابی کو تائید خدا سمجھا گیا۔ حجۃ الاسلام مولانا احمد علی صاحب محمد آبادی لکھتے ہیں کہ:

''چشم فلک نے ایسا مجدد مذہب نہیں دیکھا۔''

شیخ الفقہاء شیخ محمد حسن نجفی صاحب جواہر لکھتے ہیں:

''زندہ کرنے والے مذہبی رسوم کے، آباد کرنے والے اس کی منزلوں کے، وہ ماہتاب جس کا طلوع گمراہوں کی ہدایت، وہ شہسوار جن کے ہاتھ میں اسلام کا رایت، جن کی نگہداری میں اسلام کے ستون سربلند ہوئے۔''

مفتی میر عباس صاحب جناب غفران مآبؒ کے صاحبزادوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

''اے رفعت وبلندی کے مالک، اے ورع وتقویٰ کی جائے پناہ، اے ہدایت کے نور، اے آفتاب روز! آپ کے سبب سے ہماری سرزمین پر شریعت حضرت محمد مصطفیؐ ظاہر ہوئی۔ اگر آپ نہ ہوتے، اے میرے سرداران ملّت، تو ہمیں خبر بھی نہ ہوتی کہ ہمارا دین ومذہب کیا

ہے۔کیا کہنا آپ لوگوں کا کہ جو شخص آپ کی زیارت کرے وہ ہدایت پا جائے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے آپ کو کثیر علم کا مالک بنایا، ناک رگڑ دینے کو دشمنوں کی۔ میرا فخر ہے کہ میں ہدایت حاصل کرنے والا ہوں، اس یگانۂ عصر، امام سے''

(رطب العرب ص۔۸۲)

علامہ کنتوری لکھتے ہیں:

بلا تشبیہ ہمارے اس ہادئ دین نے ہندوستان میں وہی کام کیا جو مدینہ میں ان کے جدنامدار نے۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس خاندان ہدایت کے دشمن بدخواہ ہمیشہ روسیاہ رہیں گے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔تمہارے گھروں میں جو چبوترے بھنگ نوشی کے تھے، ان پر سجّادے بچھوا دیئے، تمہاری نذر و نیاز میں جو شیخ سدّو کا بکرا، شیخ فرید کی شیرینی، باباشکر گنج کا کونڈا، شاہ مدار کی کندوری، سید سالار کی بیرق جاری تھی، اب عمل گوسفند اور حضرت عباسؑ کی حاضری اور علم وتعزیئے بنام شہدائے کربلا جاری کرائے۔

مولانا محمد حسین صاحب قبلہ تاریخ العلماء میں لکھتے ہیں:

آپ کا فضل وکمال، علوئے مرتبت واجلال بیان سے باہر ہے۔ فقط یہی کافی ہے کہ ہندوستان میں دین اسلام آپ ہی کے وجود سے پایا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔اہل علم پر کیا جہلاء پر بھی آپ کا احسان ہے۔ جیسے حضرت علیؑ کی تلوار آبدار نے سرکشان عرب کو زیر کر دیا اور لات، عزّیٰ اور منات تینوں کو طاقہائے حرم سے منھ کے بل گرا دیا، ایسے ہی ہندوستان میں اگر چہ برائے نام تشیع تھا مگر کہیں نشۂ بھنگ نوشی، کہیں احمد کبیر کی گائے۔ کہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہاں بھی دلدار علی کے سیفِ قلم نے ہندوستان کو جو کفرستان تھا دارالایمان بنا دیا۔ یہ آپ کے خلوص کا اثر ہے جو جا بجا اس زمانہ پرآشوب میں پھر کر، دشمنوں میں رہ کر، عرب وعجم کا سفر

دور دراز کر کے، علوم دینیہ حاصل کر کے تحت قبہ ابی عبداللہ الحسینؑ جو دعا مانگی تھی کہ میری اولاد میں تا قیامت علم دین باقی رہے سو بحمداللہ اب تک ہے اور انشاء اللہ باقی رہے گا اور آپ کا خاندان، خاندانِ اجتہاد کے نام سے قائم ہو گیا۔

(تاریخ العلماء ص ۱۴۷)

مولانا اعجاز حسین صاحب برادر مولانا حامد حسین صاحب لکھتے ہیں:

انھوں نے ہندوستان کے شہروں میں دین کو زندہ کیا اور بدعت وجاہلیت کے آثار کو محو و باطل کر دیا۔

اس سے بڑھ کر ان کی خوش قسمتی اور کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے سامنے ہندوستان بھر میں شیعیت سر اٹھا کے کھڑی ہو گئی اور لکھنؤ اس کا مرکز بن گیا جس کے در و دیوار پر شیعیت چھا گئی اور اس طرف عام میلان ہو گیا۔ ہندو تک تعزیہ داری کرنے لگے اور کثرت سے علماء، فضلاء، اطباء، شعراء اور بافہم افراد شیعہ ہو گئے۔ مرزا جعفر علی فصیح مثنوی نان ونمک میں فرماتے ہیں: ؎

حامئ دیں، ماحئ کفر وضلال
سرگروہِ عالمان باکمال
علم سے جس کے عمل توام ہوا
دین جس کے زور سے محکم ہوا
لکھنؤ اب سبز وار[1] ہند ہے
دم بدم افزوں بہار ہند ہے

---

(۱) سبز وار سے اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح ان کے بزرگوں نے سبزاوار کو دارالایمان بنایا اسی طرح انھوں نے لکھنؤ کو دارالایمان بنایا۔

لیکن وہ حالت پیدا نہ ہونے پائی جو سنّی حکومتوں میں شیعوں کی تھی۔ خاص لکھنؤ میں علمائے فرنگی محل کا ہندوستان میں سب سے بڑا علمی خاندان اور سب سے بڑی درس گاہ (مدرسۂ نظامیہ) اور کثرت سے علماء موجود تھے، جمعہ و جماعت وموعظہ سبھی کچھ ہوتا تھا۔

حکومت میں ان کا اتنا اثر تھا کہ اس زمانہ میں بھی اس کے مفتی قضا اور افتاء کی مسند پر وہی متمکن تھے۔ غفران مآبؒ نے حکومت سے اپنے کو علاحدہ رکھا۔ ان کا خیال تھا کہ نائبِ امام کا حکومت کے سامنے جھکنا اور اس کی دربارداری کرنا منصب نیابت کی توہین اور ان مشاغل میں کمی واقع ہونے کا سبب ہے جو اس عہدہ کے فرائض میں داخل ہیں۔ ان کی اس علاحدگی اور بے نیازی کی وجہ سے آصف الدولہ کو ان سے اور ان کی تحریکوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ معمولی معمولی آدمی خطابات سے سرفراز ہوئے۔ مگر غفران مآبؒ زندگی بھر مولوی صاحب کہے گئے۔

شعراء کے وظائف معین ہوئے، صوفیوں اور ولیوں پر عنایتیں ہوئیں۔ گورکھپور شکار کھیلنے گئے وہاں محرم کا چاند نکل آیا۔ ایک صوفی کو (جو میاں صاحب مشہور تھے) تعزیہ رکھے ہوئے دیکھا، ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر دے آئے، جواب تک موجود ہے، مگر غفران مآبؒ ان کے شہر میں تعزیہ داری اور اس کی تبلیغ کرتے رہے اور آصف الدولہ وہیں بیٹھے لکھ لٹاتے رہے لیکن غفران مآبؒ پر ان کی چشمِ کرم [1] کبھی نہ پڑی۔ البتہ آصف الدولہ کو ان کے علمی وروحانی فیوض وبرکات .... کے بڑھنے سے خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کی طرح اپنی حکومت کے لئے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا اور ان پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کی، بلکہ خود بھی تعزیہ داری وغیرہ بڑے انہماک سے کرتے رہے۔

---

(۱) اگرچہ سرفراز الدولہ کے ذریعہ سے وہ بادشاہ سے جو چاہتے کرا سکتے تھے مگر غفران مآبؒ نے کبھی ان موقعوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ چنانچہ ایک دفعہ آصف الدولہ نے کئی لاکھ روپیہ امورِ خیر میں صرف (بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۷۷ پر)

اتنا موقع میسر آتے ہی ایک حقیقی نائبِ امام نے دنیا کے سامنے ائمہ اہلبیتؑ کی سیرت، علمی وروحانی منزلت اور صحیح اسلامی تعلیمات کا اپنے اور اپنے گھر والوں[1] کو ایک ایسا نمونہ بنا کے پیش کیا کہ سرنہیں دل جھک گئے اور ایک تازہ انقلاب پیدا ہوگیا۔ دنیا نے مان لیا کہ وہ اپنے علمی تبحر اور سیرت وکردار کی بلندی سے آفتاب ہدایت بن کے طالع ہوئے اور اپنی علمی موشگافیوں سے عقول کو حیران کر دیا۔ دین خدا میں گروہ در گروہ لوگ داخل ہوئے جس میں جبر کا کوئی دخل نہ تھا، بلکہ آپ سن چکے ہیں کہ حکومت کے معاملات میں علمائے فرنگی محلی دخیل تھے یہاں تک کہ آصف الدولہ کا زمانہ ختم ہوا اور نواب سعادت علی کا دور ہوا۔ اس وقت بھی حکومت کے حاشیہ پر علمائے فرنگی محل ہی نظر آتے ہیں اور غفران مآبؒ کہیں دکھائی نہیں دیتے۔

(**صفحہ نمبر ۷٦ کا باقی حاشیہ**) کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سرفراز الدولہ نے غفران مآبؒ کو وہ رقم دلوانا چاہی اور آصف الدولہ سے کہا کہ مولوی دلدار علی صاحب سے مشورہ کیا جائے۔ آصف الدولہ نے بلا کے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ اس رقم سے کربلا و نجف کے درمیان ایک نہر کھدوا دیجئے وہاں کے لوگوں کو پانی کی بہت تکلیف ہے چنانچہ اس روپیہ سے نہر آصفی کھدوائی گئی۔

ایک دفعہ آصف الدولہ نے کہا میرا ولی عہد سید زادہ ہے اس کی شادی کسی سید زادی سے کرنا چاہتا ہوں۔ سرفراز الدولہ جھٹ بول اٹھے کہ مولوی صاحب کی صاحبزادی سے بہتر کون سید زادی ملے گی یہ سن کے آصف الدولہ اچھل پڑے اور کہا باوا جان کے سر کی قسم بے مثل تجویز ہے، تم ہی پیام لے کے جاؤ اور اسی وقت تاریخ معین ہوگئی۔ سرفراز الدولہ دربار سے پلٹتے ہی غفران مآبؒ کے پاس آئے اور خوشی خوشی ماجرا بیان کیا انھیں امید تھی کہ غفران مآبؒ بھی خوش ہو جائیں گے اور واقعی دوسرا ہوتا تو اسے تخت شاہی زیر قدم نظر آنے لگتا

مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب غفران مآبؒ نے ناگواری کا اظہار کیا اور کہا کہ اہل دنیا سے ہمارا پیوند مناسب نہیں نواب نے کہا اب تو میں کہہ چکا اور وہ بہت پسند کر چکے غفران مآبؒ نے ان سے ایک سانڈنی سوار لے کے اسی وقت نصیر آباد بھیجا اور اپنے ایک قریبی عزیز کے لڑکے کو بلوا کے دوسرے دن نکاح کر دیا۔ جب وہاں سے پیام آیا تو کہہ دیا کہ لڑکی کا عقد ہو چکا۔ اس سے آصف الدولہ بہت کبیدہ ہوئے۔۔۔۔۔

(۱) ان کے پانچ بیٹے محمد، علی، حسن، مہدی اور حسین تھے۔

ہاں اس زمانہ میں نواب آصف الدولہ بہادر کی والدہ (بہوبیگم صاحبہ) نے غفران مآبؒ کو تقریباً ایک ہزار روپیہ ماہوار کی جائیداد معافی میں دی اب ان کے قوائے مضمحل ہو چکے تھے مگر ان کے پانچ بیٹے علم وفضل کی سند پر ان کے سامنے متمکن اور اسی طرح درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور مبلغین کے بھیجنے میں مشغول تھے۔ ان میں سب سے بڑے بیٹے محمد (سید محمد سلطان العلماء رضوان مآبؒ) اور سب سے چھوٹے بیٹے حسین (سید حسین سید العلماء علیین مکانؒ) نے باپ کی طرح علمی وروحانی مرجعیت حاصل کی۔

محمد جو تاریخ میں سید محمد سلطان العلماء بڑے قبلہ وکعبہ اور رضوان مآب کے خطابات والقاب کے ساتھ مشہور ہیں۔ ۱۱۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ صاحب تاریخ العلماء نے لکھا ہے کہ بظاہر انھوں نے غفران مآبؒ سے تعلیم پائی لیکن باطنی تلمذ حضرت صاحب الامر سے تھا۔ غفران مآبؒ کو حضرت نے بشارت دی تھی کہ تمہارا یہ بچہ میری تعلیم وحضانت میں ہے۔ چنانچہ سلطان العلماء بھی بفخر فرماتے: اَنَا اَفْتَخِرُ بِصَاحِبِ الزَّمَانِ وَالْحُجَّةُ الْمُنْتَظَرِ الرَبَّانِي قَدْ تَكَفَّلَ حِضَانَتِيْ وَرَبَّانِي۔

مفتی میر عباس صاحب اوراق الذہب میں لکھتے ہیں کہ یہ حکمت الٰہیہ جاننے والوں کے مقتدا اور مجتہدین کے نقطۂ آخر میں، ان کی نشوونما کے ساتھ دین نے نشوونما پائی اور ان کی سربلندی کے ساتھ ساتھ دین الٰہی سربلند ہوا۔ خدا نے ان کے چہرہ میں، حسن کلام میں، نمک الفاظ میں فصاحت عطا کی ہے۔ ان کی صحبتیں بہشت میں جہاں لغو اور غیر مشروع باتوں کا گذر نہیں۔ ان کی عادت میں حسن اخلاق ومزاج ہے۔ تلخ کلامی کرنے والوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ لیکن جب مقدمات کے فیصلہ کے لئے اجلاس فرماتے ہیں تو کوئی شخص دم نہیں مار سکتا۔ ان میں سختی اور نرمی دونوں جوہر خدا نے ودیعت کئے ان میں تن تنہا قیام وقعود میں وہ ہیئت ہے جو بادشاہوں کو فوج

ولشکر کے ساتھ بھی میسر نہیں۔ وہ جناب باوجود قوت قلب کے رحم دل اور بندوں پر مہربان ہیں۔ شجاعت میں شیر ان کے سامنے سے فرار کرتا ہے۔ موعظہ کے وقت پتھر اگر احساس کرے تو ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے۔ بالخصوص جب وہ جناب منبر پر موت اور قبر کا تذکرہ کرتے اور ابر بارندہ کی طرح روتے ہیں۔ خدا کے راستہ میں کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہیں کرتے صرف خدا کی رضا کے طالب رہتے ہیں۔

رطب العرب میں لکھتے ہیں کہ ان کے مرتبہ کی بلندی ان کی تحریروں اور عمدہ تصنیفوں سے ظاہر ہے۔ انھوں نے شریعت رسولؐ کی مدد کی اور ان کی وجہ سے ان کی تجدید ہوئی۔

مولانا حامد حسین صاحب مصنف عبقات رسالہ تقیہ میں لکھتے ہیں:

''علمائے متکلمین میں سب سے افضل، فقہاء و مجتہدین میں سب سے اکمل ہمارے اور تمام مومنین کے مولا و آقا، زمانہ میں یکتا اور وقت کے فرد خدا کی تائید ان کے ساتھ ہے۔ عراق کے علماء بھی ان کی علمی اور روحانی عظمت کے معترف ہیں۔''

حجۃ الاسلام علی نقی طباطبائی لکھتے ہیں:

''دائرہ عقل کے مرکز، آسمان علم کے قطب، ارباب فضل کے راس و رئیس اپنے زمانہ میں یکتا اور وحید۔''

حجۃ الاسلام سید ابراہیم حائری صاحب ضوابط لکھتے ہیں:

''فلک اسلام کے قطب، دائرہ عزت و احترام کے نقطہ، بدر تمام، احکام شرعیہ کا مدار ان کی ذات پر ہے اور مسائل حکمیہ کو انھوں نے زندہ کردیا اور علم و کمال میں روح پھونک دی۔ شریعت کی بنیادوں کو قائم کیا۔ اور ہدایت کے راستوں میں چراغ روشن کردیئے۔

شیخ الفقہاء شیخ محمد حسن نجفی صاحب جواہر لکھتے ہیں:

ایسے علامہ جن کا نظیر نہیں۔ معقول اور منقول، فروع و اصول، جن کی ذات میں جمع ہیں۔ فقہا و مجتہدین کے فخر اسلام کے مددگار، عراق و ایران و ہندوستان کے مومنین کے آقائے اعظم نے ۱۲۸۴ھ میں انتقال کیا۔ (ظل ممدود مرتبہ مفتی میر عباس صاحب)

دوسرے بیٹے علی جو سید علی کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔

صاحب نجوم السما لکھتے ہیں:

عابد، زاہد، اتقی، اکثر علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

مولانا اعجاز حسین صاحب شذور العقیان میں لکھتے ہیں:

"اَلْاِمَامُ الْهُمَامُ سَيِّدُ السَّنَدُ مَوْلَانَا سَيِّد عَلِي كَانَ عَالِمًا فَاضِلًا خَبِيْرًا بِالْمَعَانِي وَالْبَيَانِ وَاقِفًا عَلَى الْفُرُوع وَالتَّفْسِيْرِ وَالْقُرآنِ۔" اردو میں سب سے پہلے تفسیر قرآن آپ نے لکھی۔ ذوق عبادت کی وجہ سے ہجرت کر کے عراق چلے گئے۔ صاحب تاریخ العلماء لکھتے ہیں کہ علمائے عراق آپ کی بے حد تعظیم کرتے تھے ۱۲۵۹ھ میں وہیں انتقال کیا۔

تیسرے بیٹے سن ۱۲۰۵ھ میں پیدا ہوئے اپنے والد اور بھائی سے تحصیل علم کی، بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ صاحب تاریخ العلماء لکھتے ہیں:

''اکثر قائم اللیل و صائم النہار رہتے تھے۔''

مفتی میر عباس صاحب لکھتے ہیں:

"مُتَوَرِّعاً مُتَوَاضِعًا مَصْرُوفًا اِلَى الْعِبَادَةِ۔ نہایت قوی تھے مگر کثرت عبادت سے قویٰ ضعیف ہو گئے تھے۔

تذکرۃ العلماء کے مصنف نے ایک خواب لکھا ہے کہ کسی شخص نے یہ خیال کیا کہ ان کے

پیچھے نماز پڑھنے کا زیادہ ثواب ہے یا ان کے چھوٹے بھائی حسینؒ کے پیچھے۔ اسی رات کو خواب میں ایک بزرگ کو بار بار فرماتے سنا۔ اَلْحَسَنُ فِی الْجِنَانِ وَالْحُسَیْنُ فِی الْجِنَانِ ۱۲۵۹ھ میں انتقال کیا۔

چوتھے بیٹے مہدی ۱۲۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ صاحب نجوم السماء لکھتے ہیں:

''باوجود حداثت سن کے جودت طبع اور علم وتقویٰ اور ذکاوت میں کوئی برابری نہیں کرسکتا۔ آپ کی تحقیقات اور حواشی سے آپ کے فضائل معلوم ہوسکتے ہیں۔ راتیں بیداری میں بسر کرتے، تحقیق مسائل میں ایسا اجتہاد فرماتے تھے کہ ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تنہائی پسند، لذات وشہوات سے دور رہتے اور موت کو ہر وقت یاد کرتے رہتے تھے۔ آپ کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ یہ علم وفضل، یہ تحقیق واجتہاد، یہ تصنیف وتالیف یہ زہد وورع سب کچھ ۲۳ ربرس کے سن کے اندر کی داستان جو اسی سال ختم ہوگئی۔ پانچویں بیٹے حسین جو سید العلماء سید حسین میرن صاحب، چھوٹے قبلہ وکعبہ علیین مکانؒ کے القاب وخطاب سے مشہور ہیں ۱۲۱۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ولادت سے پہلے غفرانمآبؒ نے خواب میں امام حسین علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ فرماتے ہیں تم اپنے بیٹوں کا نام رکھنے میں مجھے بھول گئے۔ انھوں نے عرض کی مولا میں ضعیف ہوگیا ہوں، اولاد کی امید نہیں، اس لئے میں نے آپ کے آخری فرزند کے نام پر اپنے آخری کا نام رکھ کے اس سلسلہ کو پورا کردیا۔ فرمایا نہیں! اب کی تمہارے یہاں لڑکا ہوگا اس کا نام حسین رکھنا۔ ان کے علم وفضل، زہد وورع کے متعلق مفتی میر عباس صاحب نے ایک پوری کتاب اوراق الذہب کے نام سے لکھی ہے۔ جس کا ترجمہ ہم شائع کریں گے۔ ان کے علمی اور روحانی کمالات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے تاریخ العلماء کی ایک عبارت نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں: ''ایک بزرگوار زائر ائمہ اظہار فرماتے تھے کہ آپ کو اور علماء سے وہی نسبت

ہے جو بشر کو فرشتہ سے۔ زائرین کا قول ہے کہ اگر کوئی بلاد وامصار کی سیر کرے اور علماء کی صحبت میں رہے تو آپ کی قدر معلوم ہو۔ اگر (۱) آپ عہد رسول میں ہوتے تو آپ کے فضائل میں کوئی آیت ضرور اُترتی اور ابوذر وسلمان پر آپ کو فضیلت دیتے۔ آپ کے تمام افعال وعادات طاعت وعبادت تھے۔ بعض فضلائے اہلسنت جب شیعہ ہو گئے اور آپ کی خدمت میں حاضر رہ کر آپ کے حالات دیکھے تو حیران ہو کر کہتے تھے کہ آپ طاعت وعبادت میں مثل علی (۲) بن ابی طالبؑ کے ہیں۔ مفتی میر عباس صاحب اور مولوی حامد حسین صاحب وغیرہ سب انھیں کے شاگرد تھے۔ اپنی بلند پایہ تصنیفات کے علاوہ حضرت مسلم وہانی کے روضہ کی تعمیر، مسجد کوفہ کے مینار وغیرہ آپ ہی کی سعی کی یادگار ہیں ۱۲۷۳ھ کو انتقال کیا۔

ایں ریاضت بر علی ختم است وبس
پرتو آن نیست الا در وکس
سالکانِ راہ تسلیم ورضا
وارثان مصطفی ومرتضا
نیّرین آسمان اجتہاد
آیتینِ قدرت رب عباد

(۱) یہ جناب مفتی میر عباس کی عبارت کا بالکل ترجمہ ہے۔ وہ اوراق الذہب میں لکھتے ہیں لَوْ کَانَ فِیْ زَمَنِ جَدِّہٖ سَیِّدِ الْاِنْسِ وَالْجَانِّ لَاَنْزَلَ اللّٰہُ فِیْ مَدْحِہٖ شَیْئاً مِنَ الْقُرآن وَفَضَّلَہُ جَدُّہُ عَلٰی اَبِیْ ذَرٍ وَسَلْمَانَ۔

(۲) صاحب تاریخ العلماء خود بھی عالم تھے اس لئے کیا کہوں ورنہ مثل کی لفظ مجھے اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ اگرچہ مفتی میر عباس صاحب بھی اسی کے قریب قریب مثنوی من وسلویٰ میں ان دونوں حضرات کے متعلق لکھ گئے ہیں۔

سیدین عاملین کاملین

طاعت شان برخلائق فرض عین

آں یکے ہم نام ختم الانبیاؐ

ویں سمی خامس آل عباعلیہ السلام

ہوش از سر برد طاعت ہائے شاں

سر نہادم بر نشاں پائے نشاں

سعادت علی خاں کا دور ختم ہوا اور غازی الدین حیدر سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ اس زمانے میں بھی حکومت کے مقنن علمائے فرنگی محل تھے اگر چہ شیعیت کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ سے لے کے وزراء اور امراء کی بنا کردہ کربلائیں اور امام باڑے شہر میں کثرت سے تھے جن میں ہندوؤں کے امام باڑے بھی تھے۔ گھر گھر مجلسیں ہوتیں اور گلی گلی تعزیئے نظر آتے۔ غفران مآبؒ اور ان کے صاحبزادوں کے شاگرد، سیکڑوں جید علماء موجود تھے جن میں ہر ایک تصنیف وتالیف اور درس وتدریس میں مشغول تھا۔ اوران کے چھوٹے بڑے ہزاروں شاگرد موجود تھے۔ مگر غفران مآبؒ نے اپنی سیرت وکردار سے ان میں وہ علمی خودداری پیدا کردی تھی کہ ان میں سے کسی نے حکومت اور ارکان حکومت کی طرف توجہ نہیں کی۔ لکھنؤ کے کسی عالم کے متعلق یہ نہیں معلوم کہ وہ کس رئیس کی سرکار سے وابستہ رہا ہو۔ چونکہ بادشاہ مذہباً شیعہ تھے مسجد وامام باڑہ کی تعمیر اور عزاداری میں انہاک باعث نجات سمجھتے تھے اور ان امور کی انجام دہی میں علماء کے محتاج تھے۔ شاہانہ مزاج کا تقاضا تھا کہ ان کی مسجد میں وہی نماز پڑھائے جو سب سے بڑا عالم ہو، اس لئے وہ مجبور تھے کہ اپنی مسجد میں جمعہ وعیدین کی نماز اور دوسرے مذہبی امور میں غفران مآبؒ اور ان کے صاحبزادوں کی طرف رجوع کریں

اوران لوگوں نے بھی اسی حد تک اپنا تعلق حکومت سے قائم رکھا۔ مسجد میں بادشاہ کے آگے اور مسجد سے نکل کے بادشاہ کے پیچھے نہیں ہوئے اور اپنے منصب کے وقار کا ہر موقع پر لحاظ رکھا۔ اس زمانہ میں غفران مآبؒ کا انتقال ہوگیا۔ اورتمام ذمہ داریاں سلطان العلماءؒ کے سر آ پڑیں۔ سوءِ اتفاق سے ایسے بادشاہوں کا دور پایا جن کی کج دماغی مشہور ہے ان سے اپنے کوعلیحدہ رکھنا ممکن نہ ہوا۔ انھوں نے اپنی مرضی پر چلانا اور اپنے ناجائز مقاصد کے حصول میں ان کی شرکت چاہی اور سلطان العلماء نے صاف انکار کر دیا۔ اب حکومت سے مستقل مخالفت شروع ہوگئی۔ اس میں سختیاں جھیلیں جان کی بازی لگائی مگر ثابت قدم رہے۔ تمام کتب سیر وتاریخ میں یہ واقعہ موجود ہے کہ غازی الدین حیدر نے اپنے بیٹے نصیر الدین حیدر کو تخت وتاج سے محروم کرنا چاہا اور ایک محضر پر دستخط کرائے جس میں ان کی ابنیت سے انکار تھا۔ تمام علمائے اسلام، ارکان سلطنت اور روسائے شہر نے دستخط کر دیئے۔ مگر سلطان العلماء نے لکھ دیا اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ اس میں نصیر الدین حیدر کی عملی نااہلی کا تو اظہار تھا مگر ابنیت کی تصدیق تھی اور ضمناً بادشاہ کے عملی انکار ابنیت کو غیر صالح بھی قرار دینے کا اشارہ تھا۔ اس پر بادشاہ بہت برہم ہوئے اور زندگی بھر کبیدہ رہے۔

غازی الدین حیدر کے بعد نصیر الدین حیدر تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ سلطان العلماء کی بڑی آؤ بھگت کی ولی عہدی کے زمانے سے اپنی طرف مائل سمجھ کے مگر تخت پر بیٹھتے ہی ان سے ٹکر ہوگئی ایک عورت سے (جسے اس کا شوہر چھوڑ چکا تھا مگر شرعی طور پر طلاق نہیں ہوا تھا) نکاح پڑھنے کے لئے طلب کیا۔ انھوں نے صاف کہہ دیا کہ شوہر اول سے افتراق شرعی طور پر ثابت نہیں، اس لئے میں نکاح نہیں پڑھوں گا۔ بادشاہ کا چہرہ غصہ سے متغیر ہوگیا اور آپ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کہہ کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اس کے بعد شراب کے جواز کا فتویٰ اس صورت سے چاہا کہ طبیب حاذق نے بادشاہ کی زندگی کا انحصار شراب پینے میں تجویز کیا ہے، اس صورت میں حکم شرع کیا ہے؟ تمام علمائے اسلام نے جواز کا فتویٰ دیا۔ سلطان العلماء جانتے تھے کہ اس بہانے سے شراب نوشی مقصود ہے جس طرح جان بوجھ کے طبیب حاذق کی غلط تجویز ہے۔ اسی طرح مفتی کا فتویٰ غلط ہوگا۔ حقیقت تو یہی تھی مگر صورت مسئلہ میں طبیب حاذق کی رائے سے مخالفت مفتی کے لئے بے معنی ہے۔ اس لئے انھوں نے اپنی خداداد ذہانت سے کام لیا اور لکھ دیا لَا شِفَاءَ فِي الْحَرَامِ۔ ان سے پہلے کسی نے اس محل پر اس حدیث کو پیش نہیں کیا تھا۔ نصیر الدین حیدر کی تند مزاجی مشہور ہے۔ یہ دوسری جھڑپ تھی۔ اب رعب شاہی سے کام لینا چاہا اور ایک مسئلہ پوچھنے کے بہانے سے سلطان العلماء کو بلوایا۔ ایک کرسی پر خود بیٹھے اور ایک کرسی سامنے رکھوا کے اس پر قلمدان رکھ دیا اور ارادہ کیا کہ جب سلطان العلماء آئیں گے تو تعظیم نہ کروں گا۔ سلطان العلماء نے دروازے کے پاس پہنچتے ہی عربی قاعدے[1] کے موافق بلند آواز سے یا اللہ کہا اور اندر داخل ہو گئے۔ بے اختیار بادشاہ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے اور وہ قلمدان اٹھا کے بیٹھ گئے۔ بادشاہ دیر تک سناٹے میں رہے۔ آخر میں یوں ہی ایک مسئلہ پوچھ کے رخصت کر دیا۔ جب مصاحبین خاص نے پوچھا، تو کہا جب وہ کمرے میں آئے معلوم ہوا کسی نے بغلوں میں ہاتھ دے کر کھڑا کر دیا۔ مفتی میر عباس صاحب نے اوراق الذہب میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے چہرے میں تنہا وہ رعب وجلال تھا جو بادشاہوں کو لشکروں کے ساتھ نصیب نہ تھا۔ اس واقعہ سے سلطان العلماء سمجھ گئے کہ بادشاہ کو مخالفت پیدا ہوگئی ہے اور وہ توہین پر آمادہ ہیں دوسری

(۱) عرب میں دستور ہے کہ کسی کے مکان میں داخل ہونے کی اجازت کے لئے یا اللہ کہتے ہیں۔

دفعہ جب بلائے گئے تو جانے سے انکار کر دیا۔نصیرالدین حیدر اس کی تاب کہاں لا سکتے تھے، آگ بگولا ہو گئے۔حکم دیا کہ مکان توپ سے اُڑا دیا جائے شہر میں ہل چل مچ گئی۔رات کو یہ حکم ہوا تھا کہ بجلی کی طرح سارے شہر میں خبر دوڑ گئی۔امرائے دربار دوڑے آئے کہ سلطان العلماء معافی مانگ لیں۔انھوں نے صاف انکار کر دیا۔رات لوگوں نے آنکھوں میں کاٹی۔صبح ہوئی شاہی فوج کے کپتان نواب مقبول الدولہ نے توپ خانے سے دو توپیں نکلوائیں۔ایک سلطان العلماء کے مکان پر چڑھ گئی۔دوسری محل سرائے شاہی پر۔صبح کو بادشاہ کی آنکھ کھلی، معلوم ہوا شاہی محل پر توپ چڑھ گئی، حواس جاتے رہے۔پوچھا یہ توپ کیوں اور کس نے چڑھائی ہے؟ معلوم ہوا کہ شاہی فوج کے کپتان نے۔وہ کہتے ہیں میری غیرت قبول نہیں کرتی کہ بادشاہ دین کا مکان توپ سے اُڑا دوں اور بادشاہ دنیا کا محل کھڑا رہے۔اس لئے میں اپنی دین ودنیا دونوں آج ختم کئے دیتا ہوں۔احساس مذہبی نے بادشاہ کو چونکا دیا، اور شرمندہ ہو کر اپنا حکم منسوخ کیا۔کپتان کو ان کے جوش ایمانی پر گراں بہا خلعت عنایت کیا، مگر سلطان العلماء سے زندگی بھر صفائی نہ رہی۔اگر چہ مذہبی امور کی انجام دہی انھیں کے ہاتھوں ہوتی رہی۔

(تاریخ العلماء)

نصیرالدین حیدر کے بعد محمد علی شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔انھوں نے جامع مسجد بنوائی اور سلطان العلماء سے نماز پڑھانے کی استدعا کی۔انھوں نے کہا اس میں کچھ زمین نعیم خان کی شامل ہوگئی ہے، اس لئے میں نماز نہیں پڑھاؤں گا۔یہ بادشاہ نہایت متدین اور بیدار مغز تھے، انھوں نے سلطان العلماء ہی کے سپرد اس کی تحقیقات کی اور کہا کہ شرعی حیثیت سے جواز کی صورت آپ نکال دیں۔انھوں نے نعیم خان کو بلوا کے زمین کے معاوضے پر راضی کر لیا اور بادشاہ سے معاوضہ دلوا کے نماز پڑھائی۔

اس وقت شیعیت کا یہ عالم تھا کہ غفران مآبؒ کے چار بیٹے اور تیرہ پوتے یعنی سترہ آدمی ایک گھر میں علم وفضل کی مسند پر بیٹھے تھے۔ ان تیرہ پوتوں میں آٹھ مجتہد اور علامہ تھے۔ گھر کیا ایک یونیورسٹی تھا جہاں اپنے وقت کے کامل ترین اساتذہ محنتی طلباء کو درس دینے اور تصنیف وتالیف میں مشغول تھے۔ (۱)

کثرت سے افاضل اور علماء ان لوگوں کی مجلس درس میں حاضر ہوتے تھے اور چند دن میں شیعہ ہوجاتے تھے جس میں جبر یا طمع کا دخل نہ تھا بلکہ اس علم وعمل کا نتیجہ تھا جس کا ذکر صاحب تاریخ العلماء نے کیا ہے کہ اکثر افاضل اہلسنت آپ کی خدمت میں حاضر رہ کر شیعہ ہو گئے اور کہتے تھے کہ (بلاشبہ) زہد وورع میں علی بن ابی طالبؑ ایسے ہی ہوں گے۔

محمد علی شاہ کے بعد ان کے بیٹے امجد علی شاہ سریر سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہ ایک متقی وپرہیزگار شخص تھے۔ مجتہد العصر سے اتنی عقیدت تھی کہ نام نہ لیتے تھے قبلہ وکعبہ کہتے تھے اور حکم تھا کہ کوئی نام نہ لے خود گھر پر ملنے آتے تھے اور یہ خطاب (۲) دیا تھا۔

''مجمع علوم دین، مرجع سادات ومومنین، حافظ احکام الٰہ، مورد اعتقادات امجد علی شاہ سلطان العلماء مجتہد العصر مولانا سید محمد صاحب''

(ورثۃ الانبیاء)

---

(۱) سلطان العلماء کے نو بیٹے اور سب عالم۔ ان میں چار بڑے پایہ کے مجتہد تھے سب سے بڑے بیٹے محمد باقر علوم عقلیہ ونقلیہ میں بحر ناپیدا کنار تشیید مبانی الایمان علم کلام میں اور رد منتہی الکلام مناظرہ میں ان کی معرکہ آرا کتابیں ہیں۔ سخاوت وعزاداری میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ہر مذہب کے تعزیہ خانوں میں جاکے چاندی سونے کے پھول چڑھاتے تھے جس سے غربا کثرت سے تعزیہ داری کرنے لگے۔ مہدی گنج میں روضۂ امام حسینؑ کی نقل اور ایک مسجد وکنواں بھی ان کی یادگار ہے۔

(نوٹ: ۱ نمبر کا بقیہ حاشیہ وحاشیہ نمبر ۲ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔)

(**گذشتہ صفحہ کا حاشیہ**) دوسرے بیٹے خلاصۃ العلماء سید مرتضیٰ جنھوں نے بہتوں کو مجتہد بنایا۔ تاج العلماء نے ثانی علم الہدیٰ لکھا ہے۔ سلطان العلماء کو بھی ان پر ناز تھا۔ تاریخ العلماء کے مصنف کا بیان ہے کہ اتنے ذہین تھے کہ بچپنے میں کتاب کے مطلب پر جو ایراد کرتے تھے وہ وارد ہوتا تھا۔ شرح لمعہ پر اس زمانے کا حاشیہ ان کی ایک معرکہ آرا تصنیف ہے۔ فنون سپہ گری میں بھی کمال رکھتے تھے۔ زہد وورع اور سخاوت ضرب المثل تھی۔ مولانا حامد حسین مصنف عبقات وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔

مرنے کے بعد تین دن تک قبر سے تلاوت قرآن کی آواز آتی رہی۔ تیسرے بیٹے بندہ حسین صاحب فلسفہ ومنطق میں اپنے وقت کے ارسطو سمجھے جاتے تھے۔ ہندوستان کے مشہور فلسفی انھیں کے شاگرد ہیں۔ زہد واتقا کا یہ عالم تھا کہ لوگ نام لینا بے ادبی سمجھتے تھے۔ قبلہ وکعبہ، سلطان العلماء اور سید العلماء کے لئے مخصوص تھا۔ یہ پہلے مجتہد ہیں جنھیں لوگوں نے جناب کہنا شروع کیا اور ان لوگوں کی زندگی تک کوئی دوسرا عالم قبلہ وکعبہ یا جناب نہیں کہا گیا۔

ان کے بعد یہ الفاظ اور کوئی خطاب بہت دن تک خاندان اجتہاد کے مجتہدین کے ساتھ مخصوص رہا مگر کچھ عرصہ کے بعد یہ خصوصیت باقی نہیں رہی۔ چوتھے بیٹے تاج العلماء علی محمد مجتہد اعلم عبرانی اور سریانی زبانوں میں بھی اتنی دستگاہ رکھتے تھے کہ سورۂ یوسف کی ضخیم تفسیر میں صفحے کے صفحے عبرانی کے درج ہیں۔

غفران مآبؒ کے چوتھے بیٹے سید مہدی صاحب کے بیٹے سید محمد ہادی صاحب ایک زبردست مجتہد تھے۔ مولانا اعجاز حسین صاحب نے شذور العقیان میں فقیہ محقق اور بہت کچھ لکھا ہے۔ زہد وورع کا یہ عالم تھا کہ راستہ میں فنس بند کر دیتے تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف اور جید علماء کے استاد تھے۔ غفران مآبؒ کے پانچویں بیٹے سید العلماء سید حسین کے چار بیٹے چاروں عالم ان میں دو بیٹے ممتاز العلماء سید تقی صاحب اور زبدۃ العلماء سید نقی صاحب زبردست مجتہد تھے۔

مفتی میر عباس صاحب نے اوراق الذہب میں سید تقی صاحب کی علمی جلالت کا بہت گرانقدر لفظوں میں اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ سن میں مجھ سے چھوٹے ہیں مگر علم وفضل میں ہم سب سے مقدم ہیں۔ صاحب تاریخ العلماء نے باقر العلوم جناب سید باقر صاحب کے والد (جناب ابو صاحب کا جو خود بھی بڑے پایہ کے مجتہد تھے) قول لکھا ہے کہ وہ فقہ واصول میں علمائے عراق سے کم نہ تھے۔ علامہ کنتوری وغیرہ سب انھیں کے شاگرد تھے۔ فقہ واصول میں تصنیفیں بہ کثرت ہیں۔ ایک تفسیر بھی لکھی ہے جو معرکہ آرا سمجھی جاتی ہے۔

دوسرے جناب سید نقی صاحب جن کی مدح وثنا مفتی میر عباس صاحب نے اوراق الذہب میں اور صاحب تاریخ العلماء اور تذکرۃ العلماء نے بہت کی ہے۔ طول کے خوف سے ہم ترک کرتے ہیں۔

(۲) مجتہد کے لئے قبلہ وکعبہ کا استعمال پہلے پہل امجد علی شاہ نے شروع کیا۔

بقول مولانا عبدالحلیم شرؔر ان کی خواہش تھی کہ مجتہد العصر جس طرح اٹھائیں اس طرح اٹھیں اور جس طرح بٹھائیں اس طرح بیٹھیں۔

انھوں نے سلطان العلماء سے حکومت میں اصلاح کی خواہش کی۔ سلطان العلماء نے اس شرط پر محکمۂ شرعیہ کے قیام کی تجویز پیش کی کہ اس پر حکومت کی بالادستی نہ ہو کیونکہ شرع حکومت کے ماتحت نہیں ہوسکتی۔ بادشاہ نے یہ بہ خوشی منظور کیا اور محکمۂ شرعیہ قائم ہوا۔ مالیہ فوج کمپنی سے معاملت بادشاہ کے تحت میں رہی اور عدلیہ پولیس آبکاری اور تعلیم امور خیر حکومت سے کٹ کے محکمۂ شرعیہ میں آ گئے جیسے مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ اب حکومت کا مقنن خاندان اجتہاد ہوا۔ آبکاری اور دیوانی سلطان العلماء کے بڑے صاحبزادے مولانا سید محمد باقر صاحب کے سپرد ہوئی اور صفوۃ العلماء منصف الدولہ شریف الملک خطاب ہوا۔ انھوں نے تمام ممالک محروسہ میں مسکرات کے استعمال کو جرم قرار دیا۔ شراب کی ایک دوکان محکمۂ شرعیہ سے قائم ہوئی کہ جس کے لئے طبیب حاذق بطور انحصار دوا تجویز کرے اور سرٹیفکٹ دکھائے اسے اتنی ہی مقدار میں دی جائے۔ اس پر مشیرؔ مرحوم نے شعر کہا تھا ؎

شراب جو نہ پئے آج کل وہ ناری[1] ہے
جناب قبلہ وکعبہ کو آبکاری[2] ہے

بدکاری جرم قرار پائی ایسی عورتوں کو نکاح کرنے کی تاکید ہوئی۔

---

(۱) اس شعر پر بادشاہ نے مشیرؔ کی زبان کھینچ لینے کا حکم دیا۔ قبلہ وکعبہ نے یہ کہہ کے منسوخ کرایا کہ یہ مشیرؔ کی ہجوگوئی کا نتیجہ قرار دیا جائے گا۔

(۲) قدیم محاورہ ہے فلاں کو کوتوالی ہے، یعنی ان کے سپرد کوتوالی ہے۔

فوجداری و پولیس سلطان العلماء کے دوسرے صاحبزادے مولانا السید مرتضیٰ صاحب کے سپرد ہوئی اور خلاصۃ العلماء خطاب ہوا۔

مفتیوں اور قاضیوں کا تقرر اور ان کی دیکھ بھال سلطان العلماء کے بھتیجے سید ہادی صاحب کے سپرد ہوئی۔ اور عمدۃ العلماء خطاب ملا۔ اب تمام مملکت میں شیعہ مفتی و قاضی مقرر ہوئے۔ مفتی محمد قلی صاحب، مفتی میر عباس صاحب، مفتی دلدار حسین صاحب وغیرہ مختلف مقامات پر مفتی بنا کے بھیجے گئے۔ لیکن اہلسنت کے مذہبی معاملات کے تصفیہ کے لئے سنی مفتی اور اہل ہنود کے لئے ہندو مفتی بھی محکمہ شرعیہ نے مقرر کئے۔ چنانچہ ایک پرانے کاغذ میں ہم نے مفتی دیا شنکر کا نام بھی دیکھا تھا۔

تعلیم سلطان العلماء کے دوسرے بھتیجے سید تقی صاحب کے سپرد ہوئی اور ممتاز العلماء فخر المدرسین خطاب ملا۔ مولانا حامد حسین صاحب مصنف عبقات اور مولانا احمد علی صاحب مجتہد (محمد آبادی) وغیرہ ان کی ماتحتی میں مدرسی کے فرائض انجام دینے کے لئے مقرر ہوئے۔

خزانہ پر زکوۃ عائد ہوئی اس کی تقسیم سلطان العلماء کے دوسرے بھتیجے سید نقی صاحب کے سپرد ہوئی اور زبدۃ العلماء معین المومنین خطاب ملا۔

ان تمام محکموں کے نگرانِ اعلیٰ سلطان العلماء تھے اور اہم مقدمات کا فیصلہ، قتل اور پھانسی انھیں کے حکم سے ہوتی تھی۔ ان کی عدالت کے حدود سے بادشاہ بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ لوگوں نے وزرا پر، بادشاہ پر، ولی عہد پر اس عدالت میں مقدمات دائر کئے اور کامیابی حاصل کی صاحب تاریخ العلماء لکھتے ہیں کہ امجد علی شاہ نے کسی تاجر سے تیرہ لاکھ روپیہ کا مسند، تکیہ خریدا تھا۔ عمال نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ روک لیا۔ وہ کچھ دنوں دوڑتا پھرا جب مایوس ہوا تو سلطان العلماء کے اجلاس پر بادشاہ پر مقدمہ دائر کر دیا سلطان العلماء نے ثبوت لے کے اس کی ڈگری دے دی اور حکم ہوا

کہ بادشاہ فوراً روپیہ ادا کردیں۔ چنانچہ انھوں نے روپیہ ادا کردیا اس سے سلطان العلماء کے انصاف کی دھوم مچ گئی۔

ولی عہد واجد علی شاہ پر ایک زنِ بازاری نے دعویٰ دائر کیا کہ وہ میری حضانت سے ایک لڑکی کو زبردستی لے گئے۔مقدمہ کی سماعت ہوئی اور فریقین کے ثبوت و بیان کے بعد فیصلہ ہوا کہ اس کی رقیت شرعی نہج سے ثابت ہوئی لہٰذا ولی عہد بہادر کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ فوراً اس لڑکی کو مدعیہ کے سپرد کریں اور مدعیہ کو حکم ہوتا ہے کہ وہ اس کا نکاح مرد صالح سے کردے۔واجد علی شاہ نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔اسی طرح کا ایک واقعہ یہ بھی تاریخوں میں موجود ہے کہ واجد علی شاہ نے ولی عہدی کے زمانے میں کسی عورت کو اپنے تاہل میں لانا چاہا جو اُن پر حرام تھی۔فتویٰ پوچھا۔ جواب نفی میں ملا۔جب بادشاہ ہوئے تو خیال ہوا کہ شاید اب مرعوب ہوجائیں کہلوایا کہ کیا اس حکم پر نظرثانی کی گنجائش ہے؟ سلطان العلماء نے جواب دیا حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ وَحَرَامُ مُحَمَّدٍ حَرَامٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ۔

(سلطان العلماء کا اصلی نام محمد تھا)

سلطان العلماء کے ایک فیصلہ کی اپیل کسی نے بادشاہ کے یہاں کی تو اس پر حکم صادر ہوا کہ ’’فیصلۂ مجتہد ناطق است واپیل ندارد بدون امام‘‘

راجہ درگا پرشاد بوستان اودھ میں لکھتے ہیں کہ سلطان العلماء کا حکم آب و باد پر جاری تھا۔ اس اقتدار کو دیکھ کر کسی نے ایک درخواست میں خطابی الفاظ ’’مجمع علوم دین۔۔۔۔۔۔سلطان العلماء مجتہد العصر کے ساتھ صاحب بہادر لکھ دیا یہ دیکھ کر مسکرائے اور درخواست پر حکم صادر کرنے کے بعد لکھا سید محمد بے بہادر۔

اس وقت حقیقت میں ایک شیعہ عالم دین کی حکومت تھی مگر حضرات اہلسنت کو مذہبی امور

میں اتنی آزادی تھی کہ جمعہ و جماعت اور درس وتدریس کا کیا ذکر، مناظرہ اور مباحثہ میں شیعوں کے خلاف دل کھول کے جو چاہتے تھے کہتے تھے۔خود سلطان العلماء کی تصنیفات کے جواب میں کتابیں لکھی گئیں جن میں ان کو نہایت سخت و درشت الفاظ لکھے گئے۔لیکن باوجود اس کے کہ وہ خود اس کے جواب میں قید کر سکتے تھے۔ زبان کھینچ سکتے، گردن مار سکتے تھے۔ گھر بار ضبط کر سکتے تھے مگر ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا کہ انھوں نے کسی پر اس کے مذہب کی تبلیغ وحمایت میں سختی کی ہو اور تحریر وتقریر کا جواب کسی اور طرح دیا ہو۔ بلکہ جس نوعیت کا اعتراض ہوتا تھا، اسی نوعیت کا ان کی طرف سے جواب ہوتا تھا۔

ان کے تحریری مباحثے کتابی صورت میں کتب خانوں کی زینت اور زبانی گفتگوئیں تاریخوں میں موجود ہیں، اس پر جبر کا شکوہ کہاں تک دیانت اور صدق پر مبنی ہو سکتا ہے۔

امجد علی شاہ کا دور ختم ہوا اور فرشتہ خصلت باپ کا فرشتہ سیرت بیٹا واجد علی شاہ مسند شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔ یہ تقویٰ اور پرہیز گاری میں باپ کے قدم بہ قدم تھے۔مولانا عبدالحلیم شررؔ نے لکھا ہے کہ میں مٹیا برج کے واجد علی شاہ کو تو جانتا ہوں وہ نہایت متقی و پرہیز گار تہجد گزار پابند شریعت مجسمۂ اخلاق تھے۔ ولی عہدی اور بادشاہی کے واجد علی شاہ کے متعلق سرورؔ نے ترجمہ شیر خانی میں لکھا ہے:

''بادشاہ شب زندہ دار اس کم سنی میں مشغول روزہ ونماز ہے۔''

اگر یہ صحیح ہے کہ ان سلاطین نے لوگوں کو بہ جبر شیعہ بنالیا تو نہایت تعجب ہے کہ غیر متعلق شہری عوام پر جبر کیا گیا اور خاص نمک خوار و خانہ زاد سنیت پر باقی رہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحلیم شررؔ کے نانا منشی قمر الدین خان زندگی بھر بادشاہ کے میر منشی رہے۔ ان ہی کے ساتھ مولانا عبدالحلیم شررؔ کا بچپنا اور جوانی گذری۔ اس لئے انھوں نے بادشاہ کے حالات چشم دید لکھے

ہیں اور لکھا ہے کہ باوجود اپنے مذہب کے سخت پابند ہونے کے وہ سنی شیعہ ہندو سب کو برابر سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ میری ایک آنکھ سُنی ہے، ایک شیعہ۔ اور ہر زمانے میں ایک کثیر تعداد اہلسنت کی حکومت سے متعلق رہی۔ اسے بھی جانے دیجئے۔

واجد علی شاہ کے زمانہ میں انتزاع سلطنت ہوگیا مگر شیعہ ہونے کا سلسلہ اب تک جاری ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ شیعیت کا عروج کسی جبر یا طمع کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کے اصول کی معقولیت کا تھا۔ چنانچہ غیر معروف لوگوں کا ذکر نہیں صاحب اقتدار اور ذی علم لوگوں میں، جن کو ہم نے دیکھا ہے، نواب رام پور، شمس العلماء نواب امداد امام اثرؔ (مصنف مصباح الظلم)، سرعلی امام، مسٹر حسن امام بارایٹ لا، خان بہادر نواب احمد حسین خان صاحب رئیس پریانواں (مصنف تاریخ احمدی)، علماء میں مولانا مقبول احمد دہلوی، مولانا عبدالغفور بنارسی۔ ابھی حال میں مولانا محمد اسمٰعیل دیوبندی، مولانا سیف اللہ امام جمعہ شیعہ ہوگئے۔ اور اس سلسلہ میں برابر اضافہ ہوتا جاتا ہے اس کی کوئی وجہ ہے۔

ہمارا یہ دعویٰ مبالغہ کی آمیزش سے بالکل ہی خالی ہے کہ جناب غفران مآبؒ کے ہندوستان میں تشریف لانے کے بعد سے اودھ کی شاہی کے اختتام تک اور اس وقت سے اس وقت تک بعض گنے چنے علماء کے علاوہ تمام علماء تمام واعظین کل مبلغین کا سلسلہ تلمذ قلیل یا کثیر واسطوں سے جناب غفران مآبؒ اور ان کی اولاد اطیاب ہی تک منتہی ہوتا ہے انھیں علماء وواعظین کی کوششوں سے آج بھی ہدایت کے چراغ روشن اور علم وعمل کی راہیں کشادہ ہیں۔ اس خانوادۂ محترم کی خصوصیت ہے کہ زمانے کی نبض شناسی کرتے ہوئے جس انداز میں تبلیغ وہدایت کو مضمر دیکھا وہی انداز اختیار کر کے شیعیت کو چار چاند لگا دیئے۔

ہم بیان کر چکے کہ اغیار کے اثرات کو زائل کرنا۔ شیعیت کے صحیح اصول وفروع کی تعلیم

دینا، تبلیغ کے اور ذرائع مہیا کرنا، تا حال اودھ کی ہر ہر فرد کو خیر وخیرات کی طرف مائل کرنا، صاحبان دولت وثروت میں نشر تعلیمات ربّانی کے جذبات کو ابھارنا، مدرسے قائم کرنا، اوقاف کی طرف مائل کرنا اور سب سے زائد عزاداری کو، جو شیعیت کا اعلیٰ ترین مشن ہے، نقائص سے پاک کر کے مفید اور ضروری اصلاحات کے ساتھ عام کر دینا، سب کچھ اسی خاندان کا فیض عام تھا۔ انداز خیالات بدلنے کے ساتھ ہی جمہوریت کو حدود شریعت کے اندر برسر کار لانا بھی اس خاندان کا فیض ہے۔ ہر فرد شیعہ کو معلوم ہے کہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس جس کا پہلا نام انجمن صدر الصدور کانفرنس امامیۂ اثنا عشریہ تھا وہ پہلا واحد ادارہ تھا جس کی بنیاد ۱۹۰۷ء میں خاندان اجتہاد کے رکن رکین جناب قدوۃ العلماء مولانا سید آقا حسن صاحب قبلہ طاب ثراہ نے رکھی اور انتہائی محنت وجانفشانی سے اس کی آبیاری کر کے اس درجہ پر پہنچایا کہ آج بھی وہی صرف ایک جمہوری شیعہ ادارہ ہے جس کو آل انڈیا مرکز تعلیم کیا جانا ناگزیر ہے۔

آل پاکستان شیعہ کانفرنس بھی اسی کا ایک شعبہ تھا جو تقسیم ہند سے پہلے پراونشل اور اب آل پاکستان ہو گیا۔ اس شیعہ کانفرنس کی بیدار کن تحریکوں کا نتیجہ مدرسۃ الواعظین، شیعہ کالج، یتیم خانہ، شیعہ اخبارات، دار المطالعہ، سرفراز پریس اور بے شمار مذہبی اور قومی شکلوں میں ظاہر ہوا۔ اس وقت بھی خدا کے فضل سے خاندان اجتہاد میں بہ کثرت علماء ومجتہدین وواعظین موجود ہیں جن کی آبیاری سے بہار شیعیت قائم ہے۔ جناب قدوۃ العلماء ہی کی یہ ذات تھی کہ آپ نے شیعوں کے افلاس اور بے کاری پر نظر کرتے ہوئے خاندان اجتہاد ہی کے بعض افراد کو کسب معاش کے معمولی معمولی ذرائع جیسے آٹے دال وغیرہ اور کپڑے کی معمولی معمولی تجارتوں کی طرف مائل کیا اور بعض اوقات دوکانوں پر بیٹھ کر خود سودا بیچا۔ ابھی ۵۷ء کا ذکر ہے کہ خاندان اجتہاد کے ہی طبقہ علماء نے بازاروں میں پھیری لگا کر سودا بیچنے کے عیب کو مٹانے

کے واسطے ٹھیلہ پر معمولی سامان رکھ کر لکھنؤ کے مختلف محلوں میں گردش کی تاکہ شیعوں کے دل سے اس انداز کی حقارت ختم ہوجائے۔ یوں تو مواعظ اور بیان فضائل ومصائب سید الشہداء میں بہت سے واعظین وذاکرین انتہائی بلند درجوں پر فائز تھے اور فائز ہیں۔مگر دورحاضر میں جناب سید العلماء مولانا علی نقی نقوی صاحب قبلہ اور جناب عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ مدظلہما نے جو اصلاحی انداز میں موعظہ اختیار کیا ہے وہ تمام عالم اسلامی میں خاص طور سے جاذب نظر ہوگیا ہے۔ان حضرات کے مواعظ میں ضروریات زمانہ کی مطابقت سے ہر موضوع مواعظ کی صورت میں پیش نظر ہوجاتا ہے۔ جمہوریت وشخصیت، معاشیات، سیاسیات، فلسفہ، سائنس، ضرورت مذہب، حقوق نساء، غیر مسلم کے اعتراضات کا جواب، بہرحال کوئی موضوع ایسا نہ ملے گا جس پر جناب عمدۃ العلماء اور سید العلماء نے اپنے سلسلۂ بیان میں روشنی نہ ڈالی ہو۔ یہ ہیں خاندان اجتہاد کے خدمات جو عروج شیعیت کے واحد ذمہ دار ہیں اور جن کی کوششوں سے شیعیت نے وہ بلندی حاصل کی جو آج کسی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ جناب غفران مآبؒ کی وہ دعا جس کا ذکر ہم صفحات گذشتہ میں کر چکے ہیں یقینا قبول ہوچکی ہے لہٰذا آئندہ بھی اس خاندان کا علمی سلسلہ قائم رہے گا۔ اور شیعیت کی تبلیغ وحمایت اسی سلسلۂ علم واجتہاد کی کوششوں سے قائم رہے گی۔

شیعہ سنی اختلاف کی بنیاد

عام طور سے مشہور ہے کہ شیعہ سنی اختلاف مسئلہ خلافت میں ہے لیکن یہ صحیح نہیں اصل اختلاف عقل ونقل کا ہے۔ حضرات اہلسنت کے نزدیک معتقدات میں عقل سے کام لینا شبہات وساوس پیدا کرکے ایمان کو متزلزل کردینا ہے لہٰذا جو بات نقل درنقل جس طرح پہنچی اس پر ایمان لانا چاہئے۔ مثلاً یہ سنا کہ قرآن خدا کا کلام ہے لہٰذا ماننا چاہئے کہ وہ کلام کرتا ہے، اس

پر غور کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس سے کلام کیونکر صادر ہوسکتا ہے۔

جبر واختیار

اسی طرح دیکھا جائے کہ دنیا میں خیر وشر دونوں ہیں اور قرآن میں ہے کہ خدا ہر چیز کا خالق ہے تو مان لیا کہ خدا خیر وشر دونوں کا فاعل ہے اور چونکہ ہر چیز کا خالق ہے، اس لئے بندوں کے اعمال کا بھی وہ خالق ہے اب انسان کا کوئی فعل ذاتی نہیں رہا، وہ مجبور ہوگیا اب اس کے کئے پر سزا خلاف عدل ہے لہٰذا کہہ دیا جائے کہ خدا کے لئے عدل ضروری نہیں، ایک گروہ نے اس کو کفر بتایا اور کہا کہ انسان اپنے فعل کا مختار ہے۔ اس طرح حضرات اہلسنت میں دو فرقے ہوگئے اشعری ومعتزلی۔ جس طرح فقہ کے چار امام ہیں، اسی طرح عقائد میں دو امام ہیں اور تمام اہلسنت ان ہی دو میں سے کسی ایک کے پیرو ہیں۔ ایک ابوالحسن اشعری دوسرے ابوالمنصور ماتریدی یعنی حضرات اہلسنت میں دو طرح کے لوگ ملیں گے۔ ایک کا یہ عقیدہ ہوگا کہ بے حکم خدا پتہ نہیں ہلتا جسے مقدر کہا جاتا ہے اس کی تہہ میں یہ بات ہے کہ جو کچھ ہوا تقدیر الٰہی کی بنا پر ہوا۔ خلفاء پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ مولانا شبلی نے بھی یہی لکھا ہے کہ خلفاء کو الزام سے بری کرنے کے لئے یہ عقیدہ گڑھا گیا ؎

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآں در زبان پہلوی

میں یہ راز آشکار نظر آتا ہے۔ انھوں نے خلفاء کے ظلم وجور کے واقعات لکھ کے یہ لکھا ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ یہ خلیفہ نے کیا، ایسا نہیں خدا نے مقدر ہی کیا تھا۔

دوسرا گروہ تدبیر کا قائل ہے جس نے جو کچھ حاصل کیا وہ اس کے حسن تدبیر کا نتیجہ تھا۔

رویت باری

اسی طرح انھوں نے بعض آیات دیکھے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کا دیدار ہوگا تو دیدار کے قائل ہو گئے، اس سے بحث نہیں کہ اس کا دیدار عقلاً ممکن بھی ہے یا نہیں۔

عصمت انبیاء میں اختلاف

قرآن وحدیث میں معصیت کی قسم کے الفاظ دیکھ کر انبیاء کو غیر معصوم مانا اور آدم سے خاتم تک انبیاء اولوالعزم کے گناہ میں مبتلا ہونے کا ثبوت قرآن وحدیث سے پیش کیا۔

پیغمبر ختمی مرتبت نے فرمایا کہ میں تمہاری طرح کا انسان ہوں۔ لہٰذا وہ تمام خصوصیات بشری خطا ونسیان، گناہ اور رائے کی غلطی کے امکان کے قائل ہو گئے اور بہت سے موقعوں پر ان کی رائے کی غلطی قرآن وحدیث سے پیش کی۔ دوسری طرف نزول وحی کا ذکر سنا تو یہ عقیدہ اختیار کیا کہ نبی کی دو حیثیتیں ہیں: ایک بشری، دوسری الہامی۔ ان کے کچھ اقوال واعمال ذاتی حیثیت رکھتے ہیں اور کچھ الہامی۔

خلافت میں اختلاف کی بنیاد

مسئلہ خلافت میں انھوں نے دیکھا کہ چند آدمیوں نے فلتۃً (بے سمجھے بوجھے اچانک) حضرت ابوبکر کو خلیفہ بنایا۔ اس سے یہ اصول بنا کہ اجماع سے خلیفہ ہوتا ہے، خواہ چند افراد ہی کا اجماع ہو۔ دوسری خلافت استخلاف سے ہوئی۔ اس سے استخلاف کا طریقہ ثابت ہوا۔ حضرت عمر نے اپنے بعد کے لئے خلیفہ کا انتخاب ایک کمیٹی کے سپرد کیا۔ اس سے شوریٰ کا اصول بنا۔ امیر معاویہ نے بزور خلافت پر قبضہ کیا، اس سے قہر وغلبہ سے خلافت حاصل کرنے کا اصول قائم ہوا۔ بعد کے خلفاء نے فسق وفجور کیا، اس سے معلوم ہوا کہ خلیفہ کے لئے نیک چلنی ضروری نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ واقعات اور حالات کی رفتار پر اسلامی معتقدات کی عمارت بنتی رہی

اوران معتقدات کی صحت وعدم صحت پر گفتگو اصولاً غلط قرار پائی۔علامہ تفتازانی نے شرح عقائد نسفی میں لکھا ہے کہ اجماع سقیفہ کو باطل نہ کہو کیونکہ اس سے صحابہ پر الزام آئے گا۔دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ چونکہ بعد کے خلفاء سے فسق وفجور ظاہر ہوا، اس سے خلیفہ کے واسطے فسق وفجور بطلان خلافت کا سبب نہیں بن سکتا۔یہ اسی اصول پر ہے کہ جو بات ہوگئی اور اسے لوگ نسلاً بعد نسلٍ مانتے چلے آئے، وہی صحیح ہے اور اسی پر ایمان لانا چاہئے اس میں عقل آرائی درست نہیں۔شیعوں کے چیلنج پر ان معتقدات کی صحت پر قرآن وحدیث رجال ودرایت کی رو سے زور دیا جانے لگا۔اجماع، استخلاف اور شوریٰ کا حکم زبردستی قرآن وحدیث سے پیش کیا گیا۔خلافت کا منہاج نبوت سے ہٹ کر ملوکیت میں بدل جانا یوں صحیح ہے کہ خود رسولؐ خدا نے فرمایا تھا کہ میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی اس کے بعد ملوکیت ہوجائے گی لہٰذا یہ ملوکیت منشائے خدا اور رسولؐ کے موافق اور امیر معاویہ کی خلافت صحیح وجائز ہوئی اس لئے بعد کے خلفاء بھی اپنے تمام تزک واحتشام اور اعمال کے ساتھ جانشین رسول قرار پائے اور ان کی اطاعت مذہبی حیثیت سے ہر مسلمان پر واجب رہی۔فلسفی اور مفکر اقبالؔ بغداد شریف کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

سر زمیں تیری نہ ہو کس طرح ہمدوش ارم
جس نے چومے جانشینانِ پیمبرؐ کے قدم

باوجودیکہ ان کے زمانہ میں ان کے بڑے عالم وفاضل اور متقی وپرہیزگار لوگ موجود تھے مثلاً امام ابوحنیفہ، امام مالک، قاضی ابو یوسف وغیرہ۔ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ جو واقعہ جس طرح ہوگیا اسے سنی مسلمان صحیح تسلیم کرتے چلے آئے اور اس میں عقل کے دخل کو غلط اور ایمان کے تزلزل کا باعث سمجھتے رہے۔

شیعہ اپنے عقائد کی بنیاد عقل پر قرار دیتے ہیں، اس لئے وہ عقلی مسلمان ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل خود رسول باطن ہے۔ ہر چیز کی بھلائی برائی خود سمجھ سکتی ہے۔ اس میں سننے کو دخل نہیں۔ خدا کو کسی نے دیکھا نہیں، عقل سے پہچانا ہے۔ رسولؐ نے خدا کے وجود کی خبر دیکھ کے نہیں دی۔ فرشتہ کو فرشتہ اور وحی کو وحی سمجھا عقل سے۔ اور خدا نے یہی چیز انسان کو بھی دی ہے جس نے اسے انسان بنا دیا۔ اور اس سے کام نہ لینا کتنا غلط ہے۔ اگر انسان غور کرے تو خود بخود ہر چیز اپنے وجود کو سمجھا دے گی۔ حالانکہ بہت سی چیزوں کو اس نے نہ دیکھا اور نہ سنا ہوگا۔ کسی جنگل میں ایک گھڑی ملے تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ کسی مسافر کے ہاتھ سے گر گئی۔ حالانکہ اس نے یہ نہ دیکھا اور نہ کسی سے سنا۔ اسی طرح کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز ایک خاص نظام اور ترتیب کے ساتھ مصروف عمل ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لئے کوئی چیز اپنے عمل کو چھوڑ دے تو نظام کائنات برہم ہوجائے۔ اس سے انسان یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے جو ہر وقت دیکھتا اور خبر رکھتا ہے اور کسی کو عمل سے غافل نہیں ہونے دیتا۔ یہیں سے اس کے صفات معین ہوتے ہیں کہ وہ: (۱) عالم ہے (۲) قادر ہے (۳) مرید ہے (۴) حیّ ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اب عقل نے خود سوال کیا کہ وہ کیا ہے۔ اگر جسم رکھتا ہے تو کوئی جسم بغیر جگہ کے ٹک نہیں سکتا۔ اس سے پہلے جگہ ہونا چاہئے۔ اگر اس سے پہلے جگہ تھی تو اس کو کس نے پیدا کیا وہی اس کا بھی خالق قرار پائے گا۔ لہٰذا عقل یہ ماننے پر مجبور ہوئی کہ جسم نہیں رکھتا۔ پھر عقل نے سوچا کہ جب وہ جسم نہیں تو دیکھنے میں کیونکر آ سکتا ہے اس لئے یہ طے کیا کہ وہ مرئی نہیں ہے۔ اس طرح صفات سلبیہ قائم ہوئے۔ عقل یہ سب منزلیں خود طے کرتی چلی گئی اور اس نے تسلیم کرلیا کہ ان اوصاف کے خالق نے دنیا کو پیدا کیا۔

مخلوقات کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ انسان میں ذہنی اور دماغی اور لسانی صلاحیتیں ایسی ہیں جو کسی اور مخلوق میں نہیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کی اس میں صلاحیت ودیعت کی گئی ہے تو ضروری ہوا کہ اس اجتماعی زندگی کے لئے کوئی قانون ہو اور اس قانون کو بتانے اور عمل کر کے دکھانے کے لئے ایک آدمی ہو جو عمل کر کے دکھائے۔ اس کے لئے انبیاء ورسل کی ضرورت ہوئی جو ایک طرف تو انسان تھے مگر اتنے کامل کہ بھول چوک گناہ اور رائے کی غلطی سے بری۔ اگر ان میں بھول چوک ہے تو خدا کے حکم کو بھول سکتے ہیں۔ گناہگار ہیں تو عمل کا نمونہ اور اعتماد کا محل نہیں بن سکتے۔ اگر غلطی کرتے ہیں اور دوسروں کی رائے کے محتاج ہیں تو رائے دہندہ ان سے بہتر ہے، تو نبی کی امت پر فضیلت کیا ہوئی اور ایسی غلط رائے قائم کرنے والا منشائے خداوندی سمجھنے میں بھی غلطی کرسکتا ہے۔ شیطان کو فرشتہ اور وساوس کو وحی قرار دے سکتا ہے۔

اگر کچھ ذاتی اور کچھ الہامی حیثیت سے کہتا ہے تو پوری شریعت مشکوک ہوجاتی ہے۔ اس لئے عقلاً ضروری ہے کہ وہ ایسی تمام کمزوریوں سے بری یعنی معصوم ہو۔ اور جن آیات واحادیث سے ان کے گناہ کا صدور سمجھ میں آتا ہے ان کا مطلب یقینا کچھ اور ہونا چاہئے اور ائمہ اہلبیتؑ نے کچھ اور بتایا بھی ہے وہی ائمہ اہلبیتؑ جن کے متعلق مولانا شبلی نے فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہ لاکھ مجتہد اور فقیہ ہوں مگر امام جعفر صادقؑ سے ان کو کیا نسبت تمام اسلامی علوم اہلبیتؑ کے گھر سے نکلے اور وہ اَدْرٰی بِمَا فِی الْبَیْتِ ہیں۔ مگر نقلی طور پر مولانا شبلی، مقلد امام ابوحنیفہ صاحب ہی کے تھے۔ اور امام جعفر صادقؑ کے قول پر امام ابوحنیفہ کے قول کو ترجیح دیتے تھے۔ نقل کی بنا پر۔

مسئلہ خلافت شیعی نقطہ نظر سے

قرآن اسلامی قانون ہے جس میں تین سو مجمل احکام، کچھ قصص وعمرانیات اور کچھ متشابہات ہیں اور یہ سب وحی متلو ہے جو رسولؐ کی طرف نازل ہوئی۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ صلوٰۃ قائم کرو۔ صلوٰۃ کے کیا معنی ہیں۔ کیونکر قائم کی جائے یہ رسولؐ کو معلوم ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ۔

اے رسولؐ پہنچا دو وہ چیز جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوئی ہے۔ وہ کون بات ہے۔ بس رسولؐ کو معلوم ہے وحی غیر متلو کے ذریعہ سے جسے علم رسالت کہتے ہیں۔ یا خاصہ رسالت۔

اب قرآن کو رسولؐ سے الگ کر لیجئے تو اس کے معنی معلوم نہیں ہو سکتے اسی طرح قرآن سے الگ رسول کی کوئی حیثیت نہیں جسے مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی کہہ کے بتایا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن رسولؐ کے ساتھ اور رسولؐ قرآن کے ساتھ ہے اور اسلامی قانون کوئی مکتوبی نہیں۔ بلکہ عمل رسولؐ ہے۔

رسولؐ کے بعد رسولؐ کا جانشین وہی ہو سکتا ہے جسے اس تمام وحی غیر متلو کا بھی علم ہو جو رسولؐ کے سینہ میں محفوظ تھی۔ جب کہ اسلام کا قانون صرف مکتوبی نہیں۔ بلکہ عملی زندگی ہے تو رسولؐ کے بعد بھی ایسا شخص ہونا چاہیئے جس کی زندگی قرآن کے ساتھ اور قرآن اس کے ساتھ ہو اور رسولؐ کا فریضہ ہے کہ وہ ایسے اشخاص کا نام بتا جائیں۔ رسولؐ نے اس فرض کو پوری طرح ادا کر دیا اور اپنے بعد کے لئے امت کے واسطے ایسے افراد بتا دیئے جن کا علم رسولؐ کا علم اور عمل رسولؐ کا عمل تھا۔

اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا ۔ اَنَا دَارُ الْحِکْمَۃِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا ۔ عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْآن وَالْقُرْآن مَعَ عَلِی اَقْضَاکُمْ عَلِیٌّ ۔ اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقْلَیْنِ ۔

عہد رسولؐ سے آج تک کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکا کہ علیؑ سے بڑھ کے کوئی عالم قرآن اور عامل قرآن ہے۔ اور چونکہ رسولؐ کے مشن کی بقا کا دارومدار اسی پر تھا، اس لئے وہ بھی زندگی بھر علیؑ کا تعارف امت سے کراتے رہے اور اپنی زندگی کے آخری سال حج سے واپسی پر مقام غدیر میں پہنچ کے منادی کرائی کہ جو لوگ آگے بڑھ گئے ہیں پلٹ آئیں اور جو پیچھے رہ گئے ہیں وہ آگے بڑھ آئیں۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو پالان شتر کا ایک منبر بنوایا اور اس پر بلند ہو کے ایک فصیح وبلیغ خطبہ فرمایا جس میں اپنے ارتحال کی خبر دی۔ پھر پوچھا کہ کیا میں تمہارے نفسوں کا تم سے زیادہ حاکم نہیں ہوں؟ لوگوں نے کہا بیشک! تو فرمایا کہ جس کا میں حاکم ہوں اس کا یہ علیؑ بھی حاکم ہے۔ اے خدا جو علیؑ کو دوست رکھے اس کو تو دوست رکھ اور جو علیؑ کو دشمن رکھے اس کو تو دشمن رکھ۔ حضرت عمر نے سب سے پہلے مبارکباد دی اور کہا کہ اے علیؑ مبارک ہو کہ تم سب مومنین ومومنات کے حاکم قرار دیئے گئے۔ علمائے اہلسنت اس میں سے کسی بات کے منکر نہیں کیونکہ یہ واقعہ مستند طرق سے تمام معتبر کتابوں میں درج ہے۔ مگر وہ اسے جانشینی کا اعلان نہیں قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ کو آنحضرت نے تبلیغ کے لئے یمن بھیجا تھا۔ وہاں سے واپسی پر خالد بن ولید وغیرہ نے اموال مسلمین میں علیؑ کی خیانت کی شکایت کی۔ اس پر رسولؐ نے یہ فرمایا جس کا میں دوست ہوں اس کا علیؑ بھی دوست ہے۔ افصح العرب نے کاش یہی فرمایا ہوتا کہ جو مجھے دوست رکھتا ہے وہ علی کو بھی دوست رکھے، یہ بے تکی بات شان رسالت کے قطعی منافی ہے۔ خود الفاظ بتاتے ہیں کہ ان کا محل استعمال کچھ اور ہے پہلے اپنی حاکمیت کا اقرار لینے کے بعد یہ کہا کہ جس کا میں مولا ہوں یعنی جس کا حاکم ہوں اس کا یہ علیؑ بھی حاکم ہے۔ لہٰذا یہ اعلان تھا اپنے بعد

کے لئے خلافت کا اور سقیفہ میں خلافت کی تشکیل ناجائز ہوئی اور خلافت ایسے ہاتھوں میں پہنچ گئی جو علم و فضل، تقویٰ و دیانت، فہم و فراست اور اسلامی تدبر و سیاست میں علیؑ کے مقابلہ میں کوئی درجہ نہیں رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روح اسلامی کو زوال شروع ہوا۔ رسولؐ نے ایک معاشرہ کی تشکیل کی تھی جس کے تمام افراد میں برابری اور برادری تھی۔ کوئی طبقہ حاکم اور کوئی محکوم نہ تھا اور ایک کو دوسرے پر تسلط و اقتدار قائم کرنے کی ضرورت نہ تھی تو فوج اور خزانہ کی ضرورت باقی نہ رہی۔ ہر مسلمان سپاہی اور اس کی جیب خزانہ تھی اور پیغمبرؐ خدا نے بغیر فوج اور خزانہ کے ایک ملک کو ایسا بنا دیا کہ دشمنوں کے اسّی بیاسی حملے بیکار ہو گئے۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ فوج اور خزانہ اہل ملک پر حکومت کرنے کے لئے ہوتا ہے اور جب کسی بڑے دشمن کا مقابلہ ہوتا ہے تو فوج اور خزانہ بیکار ثابت ہوتا ہے اور عام بھرتی اور تحصیل زر شروع ہو جاتی ہے۔ آج بھی یہی صورت موجود ہے۔ اسی کو دنیا سے مٹانے کے لئے رسولؐ نے ایک نئے معاشرے کی تشکیل کی تھی لیکن غلط ہاتھوں میں خلافت کے چلے جانے سے وہ معاشرہ ختم ہو گیا۔ اور اسلام میں قیصر و کسریٰ پھر پلٹ آئے۔ آج بھی اگر منہاج نبوت پر کوئی حکومت قائم کی جائے تو وہ دنیا کی سب سے مضبوط حکومت ہو گی۔ بغیر فوج اور خزانہ کی۔ بظاہر تو یہ ناممکن بات معلوم ہوتی ہے لیکن ایسا نہیں۔

عہد رسالت میں ہر شخص بطور خود فن حرب میں مہارت حاصل کرتا تھا۔ اس لئے ہر شخص سپاہی تھا اور وقت پر ایک آواز میں ٹرینڈ سپاہی ایک منظم فوج بن جاتے تھے۔

رسولؐ نے لوگوں کو تعلیم پر مامور کیا اور وہ لوگوں کو پڑھاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم اسلامی معاشرہ کا جزو ہے۔ اس زمانے میں اگر فوجی تعلیم، مدارس کی تعلیم کا جزو بنا دی جائے، شہر کو حلقوں میں بانٹ دیا جائے اور ہر حلقہ میں ایک مدرسہ قائم ہو جو اس حلقہ کے تمام

افراد کو اتنی سخت ٹریننگ دے جو فوجی مراکز میں ہوتی ہے تو ہمارے مدارس فوجی ٹریننگ کا سنٹر بھی بن جائیں اوران کو یہ اہمیت حاصل ہو کہ مستقل فوجی مراکز کی ضرورت نہ رہے۔ اس طرح بجائے ایک محدود فوج کے پورا ملک ایک ایسی تربیت یافتہ فوج بن جائے جو دنیا کے کسی ملک کو حاصل نہ ہو اور فوج پر جو کروروں روپیہ صرف ہوتا ہے وہ بچت میں آجائے۔ اسی طرح عدلیہ کا انتظام ہو۔ ہر محلہ میں جو واقعہ ہوتا ہے اس کی اصلیت سے اہل محلہ واقف ہوتے ہیں۔ اور آج کل کی عدالتوں میں جب فیصلہ ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ فلاں مجرم چھوٹ گیا اور فلاں بے گناہ سزایاب ہوگیا۔ اگر متشرع اور متقی حاکم اور گواہوں کا معیار اسلامی ہو، سزائیں اسلامی ہوں تو جرائم کا فقدان ہوجائے اور معاشرہ خود ان فیصلوں پر مطمئن ہو۔ اہل محلہ خود مجرم کو حاضر کریں۔ ظالم کی حمایت کی کسی کو جرأت نہ ہو۔ جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان کا فرض ہے تو کسی اور قوت کو جرائم سے روکنے کے لئے معین کرنا بے معنی ہے۔ اس طرح پولیس کا وجود ختم ہوجائے گا۔ اسی طرح اسلامی مالیہ ہے اور سب سے پہلے رسولؐ کر کے دکھا گئے جس کے لئے ہمیں کسی دستور سازی کی ضرورت نہیں۔

یہ ہے اسلامی نظام معاشرت وتمدن جسے حکومت کہنا اسلام کی روح کے منافی ہے۔ یہ اسلامی معاشرہ رسولؐ کے بعد باقی نہیں رہا اور اس میں ملوکیت داخل ہوگئی۔ اس لئے شیعہ اس خلافت کو مخرب اسلام کہتے ہیں جس نے اس اسلامی معاشرہ کو درہم و برہم کردیا۔ جن لوگوں کو اس خیال میں حقیقت اور معقولیت نظر آتی ہے، وہ ہم خیال ہوجاتے ہیں۔

غفران مآبؒ سے پہلے اس حقیقت کو بتانے اور سمجھانے کی کسی میں جرأت نہ تھی انھوں نے جو تحریک شروع کی اس کے تین جزو تھے۔

غفران مآب کی تحریک

(۱) اپنے عقائد کو سمجھو (۲) اپنے مذہبی اعمال بجالاؤ (۳) اپنی مذہبی حیثیت کے اظہار میں تامل نہ کرو۔

یہ ایک ایسی تحریک ہے جسے ہر وقت زندہ رکھنے کی ضرورت ہے اوراسی تحریک نے ہندوستان میں شیعوں کے وجود کو ظاہر کیا۔ آج بھی ضرورت اس کی ہے کہ ہم تیرہ رجب کو شیعہ نیشن ڈے منائیں اوراس تحریک کو زندہ کریں۔ غفران مآبؒ کی تحریک میں دوسرے مذاہب سے تخاطب نہیں تھا۔ آج بھی اسی طرح اس تحریک کو چلانے کی ضرورت ہے اسی لئے اس موقع پر یہ کتاب شائع اور یہ اپیل کی جاتی ہے کہ قوم اس کی طرف متوجہ ہو۔

❁❁❁

اردو میں قرآن مجید کی پہلی (شیعہ) تفسیر

مصنف
ادیب لبیب شاعر اہلبیت مولوی سید قائم مہدی نقوی ساحرؔ اجتہادی، کراچی

اردو میں قرآن مجید کی پہلی (شیعہ) تفسیر

ادیب لبیب شاعر اہلبیت مولوی سید قائم مہدی نقوی ساحر اجتہادی، کراچی

گذشتہ دنوں لاہور کے ایک ملی جریدہ میں جناب عمار علی طاب ثراہ کی تفسیر ''عمدۃ البیان'' کا اشتہار نظر سے گذرا جس میں اسے اردو میں قرآن مجید کی پہلی (شیعہ) تفسیر لکھا گیا تھا۔ مجھ کو اس دعوے کی صداقت میں شک تھا اس لئے میں نے مذکورہ جریدہ کے محترم مدیر اعلیٰ سے بذریعہ خط دریافت کیا کہ یہ تفسیر کب لکھی گئی تھی اور کس زمانہ میں شائع ہوئی۔ میرے لئے یہ معلومات بہت اہم تھیں مگر مجھ کو میرے استفسار کا جواب نہیں ملا۔ مجبوراً خود تحقیق کرنے کی ضرورت پیش آئی اس لئے کہ میرے علم و اطلاع کے مطابق اردو میں قرآن مجید کی پہلی تفسیر عمدۃ البیان نہیں، کوئی اور تھی۔ کوئی اور سے مراد حضرت غفران مآب علیہ الرحمہ کے فرزند ارجمند مولانا سید علی صاحب قبلہ کی تفسیر ''توضیح المجید'' ہے۔ مگر عمدۃ البیان کے متعلق اس دعوے کے بعد ضروری ہو گیا تھا کہ تحقیقی طور سے اپنے اس خیال کی تصدیق یا تردید کروں۔ پہلے یہ ضروری ہے کہ میں حضرت غفران مآب علیہ الرحمہ کا مختصر سا تعارف کرادوں۔

''جناب مولانا سید دلدار علی صاحب غفران مآبؒ'' برصغیر کے پہلے شیعہ مجتہد تھے۔ ان سے پہلے پورے برصغیر میں کوئی شیعہ مجتہد نہیں ہوا۔ اس وجہ سے برصغیر میں شیعوں کی دینی رہنمائی کرنے اور ان کو فقہی مسائل سے آگاہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ شیعہ یا تو صوفیت سے متاثر تھے یا اخباریت سے۔ ان کے سارے اعمال مثلاً نماز، روزہ اور دفن و کفن وغیرہ سب اہلسنت

کے مطابق ہوتے تھے۔ بحیثیت ایک قوم کے شیعوں کا کوئی وجود نہ تھا نہ ان کی کوئی علٰحدہ شناخت تھی۔ بس نام کے شیعہ تھے۔ حضرت غفران مآبؒ جب نجف اشرف اور مشہد وقم اور کربلائے معلّٰی سے علوم دینی کی تکمیل کرکے واپس تشریف لائے تو لکھنؤ میں قیام کیا اور شیعوں کی مذہبی تعلیم وتربیت اور تنظیم کا کام شروع کیا جس کے لئے انھوں نے سینکڑوں لوگوں کو فقہ جعفریہ کی بنیادی اور ضروری تعلیم دے کر برصغیر کے گوشے گوشے میں بھیجا تا کہ مقامی شیعوں کو فقہی مسائل سے آگاہ کریں اور نماز، روزہ، کفن دفن وغیرہ کے امور فقہ جعفریہ کے اصولوں کے مطابق انجام دینا سکھائیں۔ اس طرح مسلسل کوششوں سے انھوں نے برصغیر کے شیعوں کو ایک منظم اور اپنی شناخت رکھنے والی قوم بنا دیا۔ پہلی مرتبہ نماز جمعہ وجماعت قائم کی امام بارگاہیں تعمیر کیں اور شاہان اودھ کے دلوں میں مذہب کا جوش وجذبہ پیدا کر دیا۔ اس کے علاوہ علمی محاذ پر صوفیت، اخباریت، اہلسنت کے نظریات کے خلاف زبردست قلمی جہاد کیا اور بے نظیر کتابیں لکھیں جس کے نتیجہ میں پورے برصغیر سے اخباریت کا قلع قمع ہوگیا اور سندھ اور پنجاب کے کچھ دور دراز علاقوں کو چھوڑ کر جہاں تک پیغام نہیں پہنچ سکا، صوفیت کا چراغ بھی گل کر دیا۔ علم کلام میں ''مرآۃ العقول'' المعروف بہ عمادالاسلام ایسی بے نظیر کتاب لکھی جس کا پورے عالم اسلام میں کوئی جواب نہیں ہے۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی کی کتاب تحفہ اثناعشریہ کے ہر باب کا جواب درایت کے اصولوں پر عقلی دلائل کے ساتھ لکھا۔ چونکہ حضرت غفران مآبؒ برصغیر کے پہلے فقیہ تھے اس لئے ان کا خاندان ''خاندان اجتہاد'' کہلایا۔

اردو کی خدمت

حضرت غفران مآبؒ کے عہد بلکہ اس کے بعد تک علماء اردو میں کتابیں لکھنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ خود حضرت غفران مآبؒ کی بیشتر کتابیں عربی میں ہیں۔ چند ایک فارسی

میں بھی ہیں۔لیکن ان کے فرزندان ارجمند نے اس سلسلہ میں پہلا قدم اٹھایا۔ چنانچہ ان کے فرزند دوم مفسر قرآن مولانا سید علی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ نے ''توضیح المجید'' کے نام سے اردو میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی اور فرزند سوم فقیہ اہلبیت مولانا سید حسن صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ نے اردو میں علم کلام کی پہلی کتاب ''باقیات الصالحات'' کے نام سے تحریر فرمائی۔ یہ دونوں بزرگوار حضرت سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب طاب ثراہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ سلطان العلماء وہی ہیں جن کو غالبؔ نے اپنے خطوط میں مجتہد العصر لکھنؤ کے نام سے یاد کیا ہے۔ غالبؔ ان کے زبردست معتقد تھے۔ انھیں جناب سلطان العلماء کے فرزند ارجمند تاج العلماء علاّمہ سید علی محمد صاحب طاب ثراہ نے بھی اردو میں چند کتابیں تحریر فرمائیں۔ جن کا ذکر میر افضل حسین ثابتؔ لکھنوی نے اپنی معروف تصنیف ''دربار حسینؑ'' میں کیا ہے۔

اردو میں پہلی تفسیر

اس مضمون کا اصل موضوع یہی تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ تفسیر ''توضیح المجید'' اردو میں قرآن مجید کی پہلی تفسیر ہے یا ''تفسیر عمدۃ البیان''۔

اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ زمانی اعتبار سے کس کو کس پر اولیت حاصل ہے۔ یعنی ان دونوں تفسیروں میں سے پہلے کون سی تفسیر لکھی گئی۔ اس کے لئے دونوں مفسرین عالی مرتبت کے دورِ حیات کا تعین کرنا ہوگا۔

چنانچہ جناب مولانا سید علی صاحب قبلہ طاب ثراہ خلف حضرت غفران مآبؒ اور صاحب تفسیر ''توضیح المجید'' کے دورِ حیات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ان کی ولادت باسعادت ۱۸؍شوال ۱۲۰۰ھ میں ہوئی تھی۔

یہ تاریخ جناب مولانا سید ہدایت حسین صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ کی قلمی کتاب ''نجوم تواریخ''

سے ملی جو جناب غفران مآبؒ کے پرپوتے تھے۔ یہ کتاب انھوں نے خاندان اجتہاد کے بارے میں لکھی تھی اور غیر مطبوعہ ہے۔ اس قلمی کتاب کا یہ نام تاریخی ہے جس سے اس کا سن تصنیف ۱۳۱۶ھ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سن عیسوی تقویم کے حساب سے ۱۸۹۸ء کے مطابق ہے۔

اسی کتاب سے مولانا سید علی صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ کا سن وفات بھی دستیاب ہوا۔ مولانائے موصوف کے انتقال پر مفتی محمد عباس صاحب شوستری اعلیٰ اللہ مقامہ نے جو اپنے وقت کے نہایت جید عالم اور حضرت سلطان العلماء کے کاتب اور ان کے سب سے چھوٹے بھائی حضرت سید العلماء سید حسین صاحب علیین مکانؒ کے شاگرد تھے، جناب مولانا سید علی صاحب طاب ثراہ کی بے مثال تاریخ انتقال کہی جو یہ ہے ''مہمان حسینؑ ابن علیؑ گشت علی''۔ اس سے ۱۲۵۹/عدد برآمد ہوتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جناب سید علی صاحب قبلہ کا انتقال ۱۲۵۹ھ میں ہوا جو عیسوی تقویم کے اعتبار سے ۱۸۴۳ء کے مطابق ہے۔

جناب مولانا عمار علی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ صاحب تفسیر ''عمدۃ البیان'' کی ولادت ووفات کی تاریخیں جناب مولانا مرتضیٰ صاحب فاضل اعلیٰ اللہ مقامہ کی معروف تصنیف ''مطلع انوار'' سے ملیں جو حسب ذیل ہیں۔

تاریخ ولادت: ۱۸۲۸ء جو ہجری تقویم کے اعتبار سے ۱۲۴۳-۴۴ھ کے مطابق ہے۔

تاریخ وفات: ۱۸۸۶ء جو ہجری تقویم کے اعتبار سے ۱۳۰۳-۴ھ کے مطابق ہے۔

دونوں بزرگواروں کے دور حیات کا موازنہ کرنے سے حسب ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ ولادت: مولانا سید علی صاحب طاب ثراہ ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۶ء

مولانا عمار علی صاحب طاب ثراہ: ۱۲۴۳-۴۴ھ مطابق ۱۸۲۸ء

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا عمار علی صاحب قبلہ جناب مولانا سید علی صاحب قبلہ کی ولادت

سے تقریباً تینتالیس (۴۳) سال کے بعد اس دنیا میں تشریف لائے۔

۲۔ وفات: مولانا سید علی صاحب قبلہ طاب ثراہ: ۹؍۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء

مولانا عمار علی صاحب قبلہ طاب ثراہ: ۱۳۰۳-۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مولانا عمار علی صاحب کا انتقال جناب مولانا سید علی صاحب قبلہ کے انتقال کے تینتالیس یا چوالیس (۴۳/۴۴) سال کے بعد ہوا۔

اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ مولانا سید علی صاحب قبلہ طاب ثراہ کے انتقال کے وقت جناب مولانا عمار علی صاحب قبلہ کی عمر صرف پندرہ سال یا زیادہ سے زیادہ سولہ سال کی تھی۔

ظاہر ہے کہ عمار علی صاحب قبلہ نے تفسیر عمدۃ البیان پندرہ یا سولہ سال کی عمر میں نہیں لکھی ہوگی۔ جب کہ مولانا سید علی صاحب قبلہ نے تفسیر توضیح المجید اپنے انتقال سے بہت پہلے لکھی ہوگی۔ یعنی توضیح المجید کی تصنیف کے وقت مولانا عمار علی صاحب قبلہ کی شاید ولادت بھی نہ ہوئی ہو یا وہ زیادہ سے زیادہ ایام رضاعت میں ہوں۔

مندرجہ بالا حقائق سے یہ بات بے شک وشبہ ثابت ہوگئی کہ اردو میں قرآن مجید، فرقان حمید کی پہلی (شیعہ) تفسیر جناب مولانا سید علی صاحب قبلہ علیہ الرحمہ خلف حضرت غفران مآبؒ کی ''توضیح المجید'' ہے۔ ''عمدۃ البیان'' کو اردو میں پہلی تفسیر کہنا سراسر غلط اور حقائق کے خلاف ہے۔

توضیح المجید اودھ کے زمانہ شاہی میں مطبع شاہی سے غالباً سات جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ بعد میں دو ضخیم جلدوں میں شائع کی گئی جن کا ایک ایک نسخہ ''مکتبۃ العلوم'' (لائبریری) ناظم آباد، کراچی میں محفوظ ہے۔ کچھ نسخے برصغیر کے اور کتب خانوں میں بھی شاید محفوظ ہوں۔ یہ بڑی بے مثل تفسیر ہے۔ میری خواہش تھی کہ میں اس سے ایک ایک پارہ کی تفسیر علٰیحدہ علٰیحدہ آثار وافکار اکادمی (پاکستان) کی طرف سے شائع کرتا مگر زمانہ حال کے مطابق اس کی زبان کو

عام فہم بنانے کا کام بے حد محنت طلب ہے اوراس کے لئے طویل وقت درکار ہے۔مگر افسوس ہے کہ میری صحت اس کی اجازت نہیں دیتی۔اگر یہ کام ہوجاتا تو ملت جعفریہ کے موجودہ افراد خصوصاً نوجوانوں کوایک بے مثال تفسیر کے مطالعہ اوراس سے رموز قرآن کو سمجھنے اوران کے پس منظر میں فضائل محمدؑ وآل محمدؑ سے اپنے دل ودماغ کومنور کرنے اور ایمان کوجلا اور تازگی بخشنے کی سعادت حاصل ہوتی۔

اس موضوع پر میرا پہلا مضمون ماہنامہ''خیر العمل'' لاہور اور پندرہ روزہ''ذوالفقار'' پشاور میں شائع ہوا تھا۔ یہ بہت مسرت واطمینان کی بات ہے کہ اس موضوع نے صاحبان علم وقلم کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔ چنانچہ اگلے مہینہ جناب محترم ڈاکٹر عسکری بن احمد صاحب قبلہ کا مضمون خیر العمل میں شائع ہوگیا۔ اب تک اس کی تین قسطیں شائع ہوچکی ہیں۔اس موضوع پر میرا دوسرا مضمون بھی خیر العمل اور ذوالفقار میں شائع ہوا۔جس کے بعد محترم میاں سعید الرحمن صاحب کا خط ذوالفقار پشاور میں شائع ہوا جس میں انھوں نے ماخذ کے حوالے کے ساتھ میرے نقطۂ نظر کی تائید فرمائی اس کے بعد''تنظیم الاسلام'' لاہور کے نومبر ۲۰۰۱ء کے شمارہ میں اس کے مدیر اعلیٰ جناب محترم مظاہر حسین نقوی صاحب نے میرے مضمون کے حوالے سے اداریہ لکھا اور تحلیل زمانی کے سلسلہ میں جناب محترم سید المفسرین مولانا سید علی صاحب قبلہ طاب ثراہ کی ولادت اور وفات کی جو تاریخیں میں نے درج کی تھیں ان کو غیر معتبر قرار دے دیا۔اس پورے عرصے میں تفسیر''توضیح المجید'' کے بارے میں بھی کچھ شکوک یا کچھ ایسے خیالات سامنے آئے جن سے اس کا اعتبار اور وقار مجروح ہوتا ہے۔ مجھے ان کے تحقیق مزید کے بعد صحیح صورت حال کے بارے میں لکھنا تھا مگر کچھ ذاتی وجوہ کی بنا پر اس میں تاخیر ہورہی تھی۔اب حضرت مظاہر حسین نقوی صاحب قبلہ

کے اداریہ کے بعد اپنے مسائل کو نظرانداز کر کے مجھے یہ مضمون جلد لکھنا ضروری ہو گیا۔

میں ''توضیح المجید'' اور ''عمدۃ البیان'' میں اولیت کو تحلیل زمانی سے قابل اطمینان دلیلوں سے ثابت کر چکا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ جناب محترم ڈاکٹر عسکری بن احمد صاحب قبلہ نے بھی اسے درست قرار دیا اور جناب محترم میاں سعید الرحمن صاحب قبلہ نے اس کی تائید مزید کی۔ جناب محترم مظاہر حسین صاحب قبلہ نے میری دلیلوں کو رد کرنے کے لئے علمی تاریخی یا منطقی دلائل دینے کے بجائے کچھ مفروضات اور کچھ جذباتیت سے کام لیا اور اپنی جانب سے کوئی تحقیقی بات پیش نہیں کی۔ اس لئے مجھے ان کی تحریر سے صرف نظر کرنا چاہئے تھا مگر میں نہیں چاہتا کہ کسی قسم کا شبہ باقی رہ جائے۔ اس لئے اس کا جواب دینا ضروری ہے جو اس مضمون میں مناسب جگہوں پر ان کو مل جائے گا انشاءاللہ۔ ملاحظہ ہو:

توضیح المجید کے متعلق شکوک ومنفی آرا

توضیح المجید کے بارے میں جو منفی آراء اب تک سامنے آئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

الف۔ عمدۃ البیان کے مقابلہ میں توضیح المجید کی اولیت کو تسلیم نہ کرنا۔

ب۔ اس تفسیر کو مولانا سید علی صاحب قبلہ خلف حضرت غفران مآبؒ کی تصنیف کے بجائے فارسی تفسیر ''منہاج القرآن'' کا ترجمہ اور وہ بھی خلاصہ قرار دینا۔

ج۔ غیر پریس میں اس کی طباعت ہونے کی وجہ سے اس میں تحریف ہونا کیونکہ سید المفسرین کی غیر موجودگی میں طبع ہوئی ہے۔

د۔ بقول جناب مظاہر حسین نقوی صاحب شاید ہی کوئی شخص توضیح المجید سے واقف ہو۔

اب میں ان نکات کے بارے میں اپنی تحقیق کے نتائج اور تبصرہ پیش کروں گا۔ ملاحظہ ہو:

۱ اولیت کا مسئلہ:

تحلیل زمانی کرتے ہوئے میں نے سید المفسرین جناب مولانا سید علی صاحب قبلہ کی تاریخ ولادت ووفات، مآخذ کے حوالوں سے لکھی تھیں۔

ا۔تاریخ ولادت: ۱۸رشوال ۱۲۰۰ھ۔بحوالہ ''نجوم تواریخ'' از مولانا سید ہدایت حسین صاحب قبلہ طاب ثراہ جو سید المفسرین کے پوتے ہیں۔

تاریخ وفات: ۱۲۵۹ھ۔بحوالہ قطعہ تاریخ وفات سید المفسرین از مفتی سید محمد عباس صاحب شوستری اعلیٰ اللہ مقامہ۔

اب مزید مآخذ کے حوالے ملاحظہ ہوں:

۲۔ تاریخ وفات: ۱۲۵۹ھ۔بحوالہ ''کتابیات'' جو اردو تراجم وتفاسیر پر ایک محققانہ کتاب مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کی شائع کی ہوئی ہے جس کا حوالہ جناب میاں سعید الرحمن صاحب قبلہ نے ''ذوالفقار'' پشاور (۱/۱۶،نومبر ۲۰۰۱ء) میں دیا ہے۔

۳۔تاریخ وفات: ۱۲۵۹ھ بحوالہ قرآن نمبر (سیارہ ڈائجسٹ) فہرست ۸۲ جو محترم ڈاکٹر عسکری بن احمد صاحب قبلہ نے اپنے مضمون کی قسط نمبر ۲رخیر العمل اکتوبر ۲۰۰۱ء میں دیا ہے۔

۴۔تاریخ ولادت: ۱۸رشوال ۱۲۰۰ھ تاریخ وفات: ۱۲۵۹ھ بحوالہ مطلع انوار بصفحہ ۳۳۶ از مولانا مرتضیٰ حسین فاضل صاحب قبلہ مرحوم۔

اقتباس: ''مولانا سید علی ولد دلدار علی ۱۸رشوال ۱۲۰۰ھ کو پیدا ہوئے ـــــــــــ۔کربلائے معلیٰ پہنچ کر ۱۲۵۹ھ میں رحلت فرمائی''۔

۵۔تاریخ ولادت: ۱۸رشوال ۱۲۰۰ھ۔ـــــ۔تاریخ وفات: ۱۸رمضان ۱۲۵۹ھ بحوالہ نجوم السماء۔

اقتباس: السید علی بن السید دلدار علی النصیرآبادی اللکھنوی

طاب مرقدہما ولادتش در لکھنؤ ہیجدہم شوال سنه یکہزارودو صد
هجری واقع شد........بتاریخ هیجدهم ماه مبارك رمضان تسع
وخمسین بعد الالف والمأتین برحمت حق پیوست"۔
(ص ۴۰۲-۴۰۳)۔

۶۔تاریخ ولادت: ۱۸رشوال ۱۲۰۰ھ بحوالہ ''تذکرہ بے بہا'' صفحہ ۲۱۴راز مولانا محمد حسین نوگانوی۔اس کا حوالہ ڈاکٹر عسکری بن احمد صاحب قبلہ نے بھی دیا ہے۔

۷۔تاریخ ولادت: ۱۸رشوال ۱۲۰۰ھ وفات: ۱۹رمضان ۱۲۵۹ھ۔ یہ تاریخیں اس عہد کے ماہر علم الرجال آیۃ اللہ العظمیٰ السید محسن الامین جبلی عاملی نے اپنی معروف کتاب ''اعیان الشیعۃ'' کے صفحہ ۲۵۴ پر درج فرمائی ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

اقتباس: اَلسَّیِّدُ عَلِیُ ابْنُ السَّیِّدِ دِلْدَارِ عَلِیٍّ۔ وُلِدَ فِیْ ۱۸ رشوال سنہ ۱۲۰۰ھ فِیْ لَکْنَوٴ وَتُوُفِّیَ ۱۹ ررمضان سنہ ۱۲۵۹ھ دُفِنَ بِجَنْبِ قَبْرِ السَّیِّدِ الْمُجَاهِدِ۔

۸۔جناب محترم ڈاکٹر عسکری صاحب قبلہ نے اپنے مضمون قسط اول میں عربی میں مادہ تاریخ وفات بھی درج کیا ہے۔

اتنے مستند اور معتبر حوالوں میں سید المفسرین آیۃ اللہ سید علی صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ کی تاریخ ہائے ولادت ووفات میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ نجوم السماء میں تاریخ وفات ۱۸ررمضان ہے اور اعیان الشیعۃ میں ۱۹ررمضان ہے۔اب کون جناب مولانا سید ہدایت حسین صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ کی لکھی ہوئی تاریخ ولادت اور جناب مفتی میر محمد عباس شوستری صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ کی کہی ہوئی تاریخ وفات مولانا سید علی صاحب طاب ثراہ کے صحیح ہونے میں شک کرسکتا ہے۔

۹۔ جناب محترم مولانا عمار علی صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ صاحبِ تفسیر عمدة البیان کے تاریخ ہائے ولادت ووفات۔ اب مولانا عمار علی صاحب قبلہ طاب ثراہ کی ولادت ووفات کی تاریخ کے اسناد ملاحظہ ہوں۔

ا۔ تاریخ ولادت: ۱۲۴۴ھ، ۱۸۲۸ء،

تاریخ وفات: ۱۳۰۴ھ بحوالہ مطلع انوار۔

۲۔ تاریخ وفات: ۱۳۰۴ھ۔ بحوالہ ''کتابیات'' مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۳۔ تاریخ وفات: ۱۳۱۲ھ بحوالہ مجلہ فکر ونظر شمارہ ۴ / ۳، ۱۹۹۹ء جناب محترم ڈاکٹر عسکری بن احمد صاحب قبلہ نے اپنے مضمون کی پہلی قسط ستمبر ۲۰۰۱ء میں اس حوالہ سے درج کی ہے۔

۴۔ تاریخ ولادت: ۱۲۴۴ھ تاریخ وفات: یکشنبہ ۴ رصفر ۱۳۰۴ھ بحوالہ ''تذکرہ بے بہا''۔

یہ حوالہ جناب محترم ڈاکٹر عسکری بن احمد صاحب قبلہ نے اپنے پہلے مضمون (خیر العمل ستمبر ۲۰۰۱ء) میں دیا ہے۔ کسی شاعر کا قطعہ تاریخ بھی درج ہے۔ مادہ تاریخ یہ ہے۔"

قبلہ من مولوی عمار علی جنت مکان"

یہ مصرع عروضی اعتبار سے ساقط الوزن ہے مگر یہ اس مضمون کا موضوع نہیں ہے۔

۵۔ تاریخ وفات: ۱۳۰۴ھ بحوالہ سیارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر (شمارہ ۱۲۹)۔ یہ حوالہ ڈاکٹر عسکری ابن احمد صاحب نے اپنے مضمون (قسط نمبر ۲ / اکتوبر ۲۰۰۱ء) میں درج کیا ہے۔

مندرجہ بالا تمام حوالوں میں تاریخ ولادت ووفات ایک ہی ہے سوائے مجلہ فکر ونظر کی تاریخ وفات کے جو ۱۳۱۲ھ ہے۔ اور یقینا کتابت کی یا کسی اور غلطی کا نتیجہ ہے۔

مندرجہ بالا حوالوں کے تجزیہ سے حسب ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں:

ولادت: جناب مولانا سید علی صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ۔ ۱۸ر شوال ۱۲۰۰ھ

جناب مولانا سید عمار علی صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ ۱۲۴۴ھ

وفات: جناب مولانا سید علی صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ ۱۹ / ۱۸ ر مضان ۱۲۵۹ھ

جناب مولانا عمار علی صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ۔ ۴ر صفر ۱۳۰۴ھ

اس سے ثابت ہوا کہ جناب مولانا عمار علی صاحب قبلہ جناب مولانا سید علی صاحب قبلہ طاب ثراہ کی ولادت کے تقریباً چوالیس سال بعد پیدا ہوئے اوران کی وفات کے تقریباً چوالیس سال بعد ہی مولانا عمار علی صاحب قبلہ نے رحلت فرمائی۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مولانا سید علی صاحب قبلہ طاب ثراہ کی وفات کے وقت مولانا عمار علی صاحب قبلہ کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔

۱۔ تاریخ ہائے تصنیف واشاعت ہر دو تفاسیر

اب توضیح المجید اور عمدۃ البیان کی تصنیف واشاعت کا زمانہ دیکھتے ہیں۔

تاریخ اشاعت: توضیح المجید۔ ۱۲۵۷ھ بحوالہ ''اردو تراجم وتفاسیر'' ص ۴۲، دو جلدوں میں از مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی صاحب قبلہ۔

اشاعت: ۱۲۵۳ھ دو جلدوں میں بحوالہ ''مطلع انوار'' ص ۳۳۶، از مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی صاحب قبلہ۔

۱۳۱۳ھ۔ اعجاز محمدی پریس آگرہ ۳، جلدیں بحوالہ مجلہ فکر ونظر۔

۱۲۵۲ھ چار جلدوں میں سیارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر۔ بحوالہ مضمون ڈاکٹر عسکری بن احمد صاحب قبلہ قسط ۲۔

تاریخ اشاعت: عمدۃ البیان ۱۲۸۸ھ مطبع پنجابی۔ لاہور ۳ جلد بحوالہ مجلہ فکر ونظر (خیر العمل ستمبر ۲۰۰۱ء)

۱۳۰۷ھ دہلی بحوالہ سیارہ ڈائجسٹ (خیر العمل اکتوبر ۲۰۰۱ء) نتیجہ: توضیح المجید کی اشاعت اول ۱۲۵۲ھ میں چار جلدوں میں بمبئی سے اور وقتاً فوقتاً مختلف جگہوں سے مختلف جلدوں میں ہوئی۔

عمدۃ البیان کی اشاعت اول: ۱۲۸۸ھ میں لاہور سے۔ تین جلدوں میں اور اس کے بعد دوسری جگہوں سے بھی ہوئی۔ اس سے ثابت ہوا کہ توضیح المجید کی اشاعت عمدۃ البیان سے چھتیس (۳۶) سال پہلے ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ توضیح المجید کی اشاعت کے وقت جناب مولانا عمار علی صاحب قبلہ کی عمر مبارک محض آٹھ سال تھی۔

تاریخ تصنیف: ہر دو تفاسیر کی تصنیف کا آغاز کب ہوا، یہ محقق نہیں ہے۔ جناب محترم ڈاکٹر عسکری صاحب قبلہ نے اپنے مضمون قسط اول میں **ورثۃ الانبیاء** کے حوالے سے توضیح المجید کا سنہ تصنیف ۱۲۵۳ھ لکھا ہے جو قرین قیاس نہیں ہے اس لئے کہ اس کی اشاعت اول ۱۲۵۲ھ میں ہو چکی تھی۔ یہ اس اعتبار سے بھی غلط ہے کہ محمد علی شاہ ۱۲۵۲ھ میں بادشاہ اودھ کی حیثیت سے تخت نشین ہوئے تھے۔ امجد علی شاہ جن کے حکم سے توضیح المجید لکھے جانے کا ذکر ہے وہ ۱۲۵۲ھ میں بادشاہ تھے ہی نہیں۔ ان کی تخت نشینی ۱۲۵۹ھ میں ہوئی۔ بہر حال اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ توضیح المجید کی تصنیف تین سال میں مکمل ہوئی ہوگی جس طرح ایک جگہ عمدۃ البیان کے لئے لکھا ہوا ہے تو اس کی تصنیف کا آغاز تقریباً ۱۲۴۹ھ میں ہوا ہوگا جس وقت مولانا عمار علی صاحب قبلہ طاب ثراہ کی عمر صرف پانچ سال کی ہوگی۔ میں نے اپنے پہلے مضمون میں لکھا تھا کہ شاید توضیح المجید کی تصنیف کے زمانے میں جناب مولانا عمار علی صاحب قبلہ عالم رضاعت

میں ہوں۔ جناب محترم مظاہر حسین نقوی صاحب نے اسے مولانائے محترم کی سخت درجہ کی توہین قرار دیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کسی کا عالم رضاعت میں ہونا اس کی توہین کیسے ہوسکتا ہے۔ ہرفرد بشر پیدا ہونے کے بعد عالم رضاعت میں ہوتا ہے۔ انبیاءؑ واوصیاء ومعصومینؑ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اب مکمل تحقیق سے یہ ثابت ہوگیا کہ وہ عالم رضاعت میں نہیں تھے بلکہ تقریباً پانچ سال کے تھے۔

دوسری بات میں نے یہ لکھی تھی کہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں مولانا عمار علی صاحب قبلہ کا تفسیر قرآن لکھنا بظاہر ممکن نہیں نقوی صاحب قبلہ نے اس کے امکان کی تائید میں ایران اور الجیریا کے ان بچوں کی مثالیں دیں جن کو خداوند تعالیٰ نے عطائے خاص سے وہ صلاحیتیں بخشی ہیں جن کو معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح جناب سید رضی وغیرہ کے بچپن میں تصنیف وتالیف کی مثال بھی دی ہے۔ اس عمر میں اول تو ان میں سے کسی نے تفسیر قرآن نہیں لکھی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ سب مستثنیات ہیں اور نقوی صاحب قبلہ یہ بخوبی جانتے ہوں گے کہ مستثنیات کو کلیہ کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) توضیح المجید کی اولیت تمام فرق اسلامیہ کی تفاسیر کے مقابلہ میں:

میں نے اپنے دوسرے مضمون میں یہ ثابت کیا تھا کہ توضیح المجید سے پہلے اسلام کے کسی فرقہ میں اردو میں تفسیر نہیں لکھی گئی۔ جناب محترم ڈاکٹر عسکری بن احمد صاحب قبلہ نے اپنے تیسرے مضمون (خیر العمل دسمبر ۲۰۰۱ء) میں تحریر فرمایا ہے کہ شاہ ولی اللہ کے تینوں بیٹوں نے اردو میں تفاسیر لکھیں اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ ساحر لکھنوی کی تحقیق یہ ہے توضیح المجید ان سے بھی پہلے لکھی گئی ہے۔ اس بارے میں پہلے میں ایک غلطی کا اعتراف کرلوں کہ میں نے اپنے دوسرے مضمون میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کو شاہ عبدالعزیز کے فرزند لکھ دیا تھا حالانکہ

وہ ان کے بھائی اور شاہ ولی اللہ کے بیٹے تھے۔ یہ سہو قلم تھا شکر گزار ہوں اپنے کرم فرما جناب ڈاکٹر عسکری صاحب قبلہ کا جنھوں نے اس غلطی کی نشاندہی کی۔

اب جناب محترم ڈاکٹر صاحب قبلہ کے ارشاد کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ میں نے ہرگز یہ نہیں لکھا کہ توضیح المجید شاہ عبدالقادر اوران کے بھائیوں کی تفاسیر سے پہلے شائع ہوئی۔ میں نے تو یہ لکھا تھا کہ شاہ ولی اللہ کے کسی بیٹے نے اردو میں کوئی تفسیر نہیں لکھی۔ اگر یہ بات ثابت ہوجائے کہ ان میں سے کسی نے اردو میں کوئی تفسیر لکھی ہے تو میں اسے قبول کرلوں گا۔ مجھ سے جب ایک صاحب علم جناب محترم مظفر حسین سومرو صاحب نے فرمایا کہ موضح القرآن شاہ عبدالقادر کی تفسیر ہے تو میں نے اپنے مضمون (خیر العمل نومبر ۲۰۰۱ء) میں اس پر بحث کی تھی کہ ''موضح القرآن'' صرف ایک بامحاورہ ترجمہ ہے جس پر بعض حواشی اور وضاحتی نوٹس ہونے کے باوجود تفسیر کا اطلاق نہیں ہوتا۔ وضاحتی نوٹ اور حواشی کی بناء پر جناب مولانا فرمان علی صاحب قبلہ طاب ثراہ کے ترجمہ پر بھی تفسیر کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ نے اس کو بھی تفسیر کہا ہے۔ میں موضح القرآن کے بارے میں جو دلائل اپنے دوسرے مضمون میں دے چکا ہوں ان پر اب بھی قائم ہوں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے ''رود کوثر'' میں جو اسلامیان ہندو پاکستان کی تحقیقی تاریخ ہے، جہاں انھوں نے مختلف علماء کی لکھی ہوئی تفاسیر کا ذکر کیا ہے وہاں موضح القرآن کو صرف ایک بامحاورہ ترجمہ کہا ہے اور شاہ رفیع الدین کے ترجمہ پر اس کو ترجیح دی ہے مگر اس کو تفسیر نہیں کہا ہے شاہ رفیع الدین کے ترجمہ کو تو اچھا ترجمہ بھی نہیں کہا ہے۔ ان دونوں کے ترجمے تو اردو کے پہلے ترجمہ ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن مجید اردو کے ترجمہ سے پہلے ہی تفسیر لکھ دی گئی ہو، جہاں تک شاہ عبدالعزیز کی تفسیر عزیزی کا تعلق ہے۔ اول تو وہ اردو میں نہیں ہے۔ میرے علم کی حد تک یہی ہے۔ دوسرے وہ صرف تین

پاروں کی تفسیر ہے۔ پہلے پارہ اور آخری دو پاروں کی۔ پھر بھی اگر وہ اردو کی تفسیر ہے تو بھی اسے توضیح المجید پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے کہ وہ پورے قرآن کی تفسیر ہے۔ جہاں تک جناب مولانا فرمان علی صاحب قبلہ کے مترجم قرآن مجید کا تعلق ہے اسے بھی موضح القرآن کے متعلق میرے دلائل کی بنا پر تفسیر نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے علاوہ اس کے بارے میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ پانچ جید علمائے کرام کی تقریظیں اس میں شامل ہیں جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ (۱) نجم الملت جناب مولانا نجم الحسن صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ (۲) باقر العلوم جناب مولانا السید محمد باقر صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ (۳) جناب مولانا ظہور حسین صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ (۴) جناب عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ اور (۵) جناب مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ۔ ان میں سے ہر ایک نے اس کو ترجمہ کہا ہے اور ترجمہ کی حیثیت ہی سے اس کی تعریف کی ہے۔ البتہ سرکار عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ نے بحیثیت ترجمہ اس کی تعریف کے ساتھ ایک جگہ ترجمہ مع تفسیر ضروری لکھا ہے اور ناصر الملت نے ترجمہ حاشیہ پر تفسیر کہا ہے۔ جیسا کہ سرکار عمدۃ العلماء نے ترجمہ مع تفسیر ضروری تحریر فرمایا ہے وہ اپنی جگہ صحیح ہے مگر یہ ایسی تفسیر نہیں ہے کہ اس کو باقاعدہ یا مکمل تفسیر کہا جا سکے۔ اس کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہر آیت پر حاشیہ بھی نہیں ہے نہ خاص الفاظ پر کوئی بحث ہے جس سے غیروں کے مقابلہ میں ہم اپنے ترجمہ کا جواز پیش کر سکیں۔ بس ضرورت بھر اطلاق آیت اور شان نزول وغیرہ کے بارے میں وضاحتیں ہیں۔ اسی وجہ سے کسی نے اس کو تفسیر کی لفظ سے یاد نہیں کیا ہے۔ حتیٰ کہ خود مترجم موصوف اعلیٰ اللہ مقامہ نے اسے ترجمہ ہی کہا۔ اپنے پیش لفظ میں کہیں بھی اس کو تفسیر نہیں کہا ہے۔ حواشی کے متعلق لکھا کہ ''قصص، واقعات اور شان نزول پر مستند تفاسیر سے اور فضائل ومناقب خاص علمائے اہلسنت کی معتبر

کتابوں سے۔۔۔مندرج ہیں''۔ان حقائق کے پیش نظر اس ترجمہ کو تفسیر کیسے کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح موضح القرآن کو بھی تفسیر نہیں کہا جاسکتا۔

پھر عرض کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر موضح القرآن بھی تفسیر نہیں ہے۔اگر اس بات کو تسلیم کرلیا جائے تو یقینا توضیح المجید تمام فرق اسلامیہ میں اردو کی سب سے پہلی تفسیر قرار پائے گی۔

(۳) کیا توضیح المجید کبھی قابل توجہ نہیں سمجھی گئی اور شاید ہی کوئی اس سے واقف ہو؟

''اردو تراجم وتفاسیر''میں جناب محترم مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی اعلی اللہ مقامہ نے یہ لکھا ہے کہ''کتابت،طباعت،اغلاط کی وجہ سے یہ تفسیر کبھی قابل توجہ نہیں سمجھی گئی۔اور جناب محترم مظاہر حسین نقوی صاحب قبلہ نے اپنے اداریہ میں لکھا ہے کہ بمشکل ہی کوئی اور توضیح المجید سے واقف ہوگا۔

ان دونوں باتوں کا سیدھا سادا سا جواب یہ ہے کہ جناب مولانا سید علی صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ صاحب توضیح المجید کی ولادت اور وفات کی تاریخوں کے سلسلے میں جن مآخذ کے میں نے حوالے دیئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ لکھنؤ سے لے کر ایران وعراق تک کے علمائے کرام نے اپنے تذکروں اور کتابوں میں توضیح المجید کے بارے میں لکھا ہے۔اگر یہ کتاب قابل توجہ نہ ہوتی تو یہ علمائے کرام اس کی طرف متوجہ کیوں ہوتے۔

دوسرے یہ کہ مختلف اوقات میں مختلف مقامات مثلاً لکھنؤ،آگرہ اور بمبئ وغیرہ سے مختلف جلدوں میں یہ کیوں شائع کی جاتی۔پبلشر وہ کتاب نہیں چھاپتے جس سے عوام واقف نہ ہوں اور اس کی فروخت کے امکانات نہ ہوں۔

تیسرے جناب مولانا مرتضیٰ حسین فاضل صاحب قبلہ نے اپنے آخری دور کی معروف کتاب ''مطلع انوار'' میں توضیح المجید کے بارے میں یہ نہیں لکھا کہ وہ کبھی قابل توجہ نہیں سمجھی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اگر ان کو اس قسم کا کوئی تاثر ہوگا بھی تو وہ بعد میں زائل ہوگیا۔

چوتھی بات یہ کہ نقوی صاحب قبلہ یقینا یہ جانتے ہوں گے کہ تفاسیر ایسی کتابیں نہیں ہیں جو عموماً عوام کے مطالعہ میں رہتی ہوں۔ یہ اہل علم کے لئے ہوتی ہیں اور وہی ان سے واقف ہوتے ہیں۔

پانچویں بات نقوی صاحب قبلہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میں اگر ایک شئے سے لاعلم ہوں یا مجھے اس کے بارے میں واقفیت نہ ہوتو میرے لئے یہ کہنے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ شاید ہی کوئی اور اس سے واقف ہو۔

۴ کیا توضیح المجید میں کسی نے تحریف کی ہے؟

مکرم ومحترم ڈاکٹر عسکری صاحب قبلہ مدظلہ نے تیسری قسط (خیر العمل، دسمبر ۲۰۰۱ء) میں جناب زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ طاب ثراہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ غیر شیعہ پریس میں چھپنے سے یہ تفسیر تحریف کی زد میں آ گئی۔

اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ یہ رائے خود مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ کی نہیں ہے۔ انھوں نے یہ بات ''تذکرۃ العلماء'' کے حوالہ سے لکھی ہے۔ اگر خود ان کی رائے ہوتی تو سر آنکھوں پر اس لئے کہ وہ حضرت سید المفسرین کے اخلاف میں تھے۔ اس رائے پر یقین کرنے میں مجھے تردد ہے۔ گذشتہ سطور میں توضیح المجید کے سنین اشاعت کی جو تفصیل دی گئی ہے اس کے آئینہ میں یہ رائے درست نہیں معلوم ہوتی۔ زبدۃ العلماء نے تحریف کا سبب یہ لکھا ہے کہ مفسر علام کی عدم موجودگی، وفات اور غیر شیعہ پریس میں چھپنے سے تحریف ہوئی۔ یہ بات

ہی غلط ہے۔ سید المفسرین کا انتقال ۱۲۵۹ھ میں ہوا۔ جب کہ تفسیر مذکورہ کی تین اشاعتیں ان کی زندگی ہی میں ہوئیں۔ ایک ۱۲۵۲ھ میں، دوسری ۱۲۵۳ھ میں اور تیسری ۱۲۵۷ھ میں یہیں سے یہ بات غلط ثابت ہوجاتی ہے کہ تفسیر مفسر علام کی وفات کے بعد چھپی۔ جہاں تک ان کی عدم موجودگی کا تعلق ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ مولانا سید علی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ پہلی مرتبہ ۱۲۴۵ھ میں کربلائے معلیٰ تشریف لے گئے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک انھوں نے تفسیر مذکور نہیں لکھی تھی۔ وہاں سے مراجعت کے بعد لکھی گئی ہوگی۔ دوسری مرتبہ وہ ۱۲۵۶ھ میں خراسان تشریف لے گئے وہاں سے کربلائے معلیٰ گئے اور وہیں ۱۲۵۹ھ میں انتقال کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تفسیر مذکورہ دو مرتبہ ان کی موجودگی میں چھپی۔ اس کے علاوہ جناب زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ نے ''سوانح حیات حضرت غفران مآبؒ'' میں جس کا حوالہ ڈاکٹر عسکری بن احمد صاحب قبلہ مدظلہ نے اسی مفروضہ تحریف کے ذکر میں دیا ہے، یہ لکھا ہے کہ توضیح المجید عہد شاہی میں دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔ یوں بھی اس کی اشاعت مفسر علام کی زندگی ہی میں ثابت ہے۔ اس اعتبار سے صاحب تذکرۃ العلماء کا قول غلط ثابت ہوجاتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ تفسیر کا تفصیلی مطالعہ کرنے والے ہی محسوس کرسکتے ہیں کہ اس میں کہیں تحریف ہوئی ہے یا نہیں۔ حقیقتاً تو اصل مسودہ سے مطابقت کرنے کے بعد ہی تحریف کے بارے میں کچھ کہا جاسکتا ہے جو بہرحال ممکن نہیں ہے۔ جناب محترم مولانا مرزا محمد جعفر صاحب قبلہ مدظلہ مہتمم اعلیٰ مکتبۃ العلوم، کراچی نے اس تفسیر کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے اس میں کسی تحریف کی بات نہیں کی بلکہ وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔

۵ کیا توضیح المجید جناب مولانا سید علی صاحب قبلہؒ کی تصنیف نہیں بلکہ فارسی منہاج القرآن کا نامکمل ترجمہ ہے؟

اس تفسیر کے متعلق سب سے اہم اعتراض یا قول یہ ہے کہ یہ جناب مولانا سید علی صاحب قبلہ طاب ثراہ کی تصنیف نہیں ہے بلکہ علامہ فتح اللہ کاشانی اعلیٰ اللہ مقامہ کی فارسی تفسیر منہاج القرآن کا ترجمہ ہے اور وہ بھی نامکمل۔ یہ اتنا سنگین الزام یا قول ہے جس سے تفسیر اور مفسر دونوں کا اعتبار اور وقار مجروح ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے خود تلاش وجستجو کے علاوہ اپنے ایک عزیز جناب محترم مولانا محسن مظفر صاحب قبلہ سے بھی رجوع کیا جو اس وقت خاندان اجتہاد کے ایک صاحب علم وجواں سال اجازہ یافتہ عالم دین ہیں۔ ان کا کتب خانہ بہت وسیع ہے جس میں مذہبی کتب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے اس میں ملا فتح علی کاشانیؒ کی فارسی تفسیر منہج الصادقین (نہ کہ منہاج القرآن) دس جلدوں میں شامل ہے۔ اس تفسیر کا خلاصہ خلاصۃ المنہج کے نام سے بھی موجود ہے۔ اس لئے میں نے ان سے اس تحقیق میں مدد لی۔

جناب محترم ڈاکٹر عسکری بن احمد صاحب قبلہ مدظلہ العالی نے اپنے مضمون کی پہلی قسط میں ''مجلہ فکر ونظر'' کے حوالہ سے توضیح المجید کو ''خلاصۃ المنہج'' کا ترجمہ لکھا ہے اور دوسرے مضمون میں سیارہ ڈائجسٹ کے قرآن نمبر کے حوالہ سے ملا کاشانی کی تفسیر منہاج القرآن کا ترجمہ لکھا ہے حالانکہ ان کی تفسیر کا نام منہج الصادقین ہے۔

اس مسئلہ کی تحقیق دو پہلوؤں سے کی جاسکتی ہے۔ (۱) ایک تو یہ کہ تذکرہ نویسوں نے توضیح المجید کو سید المفسرین مولانا سید علی صاحب قبلہ کی تصانیف میں شمار کیا ہے یا تراجم میں۔ اور (۲) اس کے کسی حصہ کا فارسی تفسیر سے تقابلی مطالعہ کر کے دیکھ لیا جائے۔ اس کے علاوہ اور کوئی تیسرا طریقہ نہیں ہے۔

۱۔ تذکرہ نویس حضرات کی تحریریں:

اس پہلو کے متعلق تحقیق ملاحظہ ہو۔

ا۔اس عہد کے ماہر علم رجال آیۃ اللہ العظمیٰ السید محسن الامین جبلی عاملی اپنی معروف کتاب ''اعیان الشیعہ'' میں جناب مولانا السید علی صاحب قبلہ کے بارے میں لکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔

لَهٗ مِنَ التَّصَانِيْفِ (۱)بَحْثٌ فِي فِدَكٍ، (۳-۲) رِسَالَتَانِ فِي الْمُتْعَةِ (۴)رِسَالَةُ التَّجْوِيْدِ (۵)رِسَالَةُ إِقَامَةِ الْعَزَاءِ فِي الْحُسَيْنِ عليه السلام (۶)اَلتَّوْضِيْحُ الْمَجِيْدُ فِي تَفْسِيْرِ كَلَامِ اللهِ الْحَمِيْدِ مُجَلَّدَانِ''۔ یعنی آپ کی تصانیف میں یہ ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔التوضیح المجید جس کی دو جلدیں ہیں۔(ص ۲۵۴)

(ب)صاحب نجوم السماء نے جلد اول میں سید المفسرین کے تذکرہ میں تحریر فرمایا ہے۔

''از جملہ تصانیف اوست رسالہ در مبحث فدک ودو رسالہ در باب متعہ ورسالہ در علم قرأت ورسالہ در رد اقوال اخباریین ورسالہ در جواز تعزیہ داریٔ جناب سید الشہداء علیہ السلام وتفسیر کلام مجید بعبارت ہندی در دومجلد''۔ (ص ۴۰۳)

(ج) ماضی قریب کے محقق محترم مرتضیٰ حسین فاضلؒ کے زمانہ آخر کی وقیع تصنیف ''مطلع انوار'' میں وہ صفحہ ۳۳۶ پر مولانا سید علی صاحب قبلہ کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

''تصانیف''۔ترجمہ وتفسیر قرآن مجید ''التوضیح المجید'' دو جلدوں میں۔مطبوعہ ۱۲۵۳ھ''

(د) مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کی ایک محققانہ کتاب ''کتابیات اردو تفاسیر'' کے ص ۴۶ پر ''پہلا اردو ترجمہ بقلم ایک شیعہ عالم بمبئی، مطبع حیدری ترجمہ وتفسیر ۱۲۵۲ھ چار جلد'' تحریر کیا ہے۔

نتیجہ:

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بھی تذکرہ نویس نے توضیح المجید کو ترجمہ نہیں قرار دیا ہے۔ سب نے اسے جناب سید علی صاحب قبلہ کی تصانیف میں شمار کر کے اسے بھی ان کی تصنیف قرار دیا ہے۔ ترجمہ نہیں۔ اس اعتبار سے یہ قول غلط ہو جاتا ہے کہ توضیح المجید ملا فتح اللہ کاشانی کی تفسیر منہج الصادقین (منہاج القرآن نہیں) یا خلاصۃ المنہج کا ترجمہ ہے۔ اب دوسرے پہلو کو دیکھتے ہیں۔

۶ ''توضیح المجید'' اور ''منہج الصادقین'' کا تقابلی مطالعہ

یہ کام میری گزارش پر محترم مولانا سید محسن مظفر صاحب قبلہ نے انجام دیا۔ تفاسیر کے تقابلی مطالعہ کے بارے میں انھوں نے بعض امور کو مدنظر رکھنے کی ضرورت پر زور دیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(الف) مکتب اہلبیتؑ میں چونکہ تفسیر بالرائے حرام ہے اس لئے قرآن مجید کی تفسیر میں آیات قرآنی ہی سے مدد لینی چاہئے۔ یا پھر ان روایات پر اعتماد کرنا چاہئے جو ائمہ اہلبیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ اس کے بہترین نمونے تفسیر المیزان از علامہ محمد حسین طباطبائی اور تفسیر تبیان طوسی ہیں جب کہ روایات سے تفسیر کی بہترین مثالیں تفسیر البرہان نور الثقلین اور تفسیر قمی وغیرہ ہیں۔

تفسیر مجمع البیان لغت اور روایات سے بحث کرتی ہے جب کہ تفسیر منہج الصادقین میں لغت پر کم اور روایات و مطالب پر زور زیادہ ہے۔ اسی طرح تفسیر ابوالفتوح رازی اقوال مفسرین کی جامع ہے۔

(ب) صحیح روایات کی بنیاد پر کی گئی تفسیر کو مکتب امامیہ میں فوقیت حاصل ہے اور علماء پابند ہیں ان روایات کو اخذ کرنے کے جن کے مآخذ دو ہیں (۱) کتب تفسیر (۲) کتب

احادیث۔

اس لئے ہرایک اس تفسیر میں جس میں نقل روایات کا اہتمام کیا گیا ہواوراس کے مطالب پر بنیادرکھی گئی ہوان میں روایات ومطالب کی تکرار مل جائے گی۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمام تفاسیر ایک دوسرے کا چربہ یا ترجمہ ہیں۔

(ج) آیۃ اللہ مولانا سید علی صاحب نے توضیح المجید میں روایات ائمہ علیہم السلام پر نہ صرف یہ کہ اعتماد کیا ہے بلکہ وہی ان کا مدار الہام ہیں اور ان روایات کو بالالتزام درج فرماتے ہیں۔جب کہ مولانا عمار علی صاحب قبلہؒ نے مطالب تو ظاہر ہے کہ تفاسیر سے ہی لئے ہیں لیکن کسی روایت کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے نمونہ کے طور پر سورہ والناس کی تفسیر کا توضیح المجید اور منہج الصادقین کے تقابلی مطالعہ سے جناب مولانا محسن مظفر صاحب قبلہ نے جو نتائج اخذ کئے ان کے متعلق وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

''ہمارے سامنے منہج الصادقین کا جو مطبوعہ نسخہ موجود ہے'' وہ کتاب فروشی اسلامیہ، چاپ دوم ۱۳۴۴ شمسی کا مطبوعہ ہے اور آیۃ اللہ مرزا ابوالحسن شعرانی کے حواشی وتصحیح کے ساتھ شائع ہوا ہے۔اس سورہ (والناس) کی تفسیر میں پہلی روایت علامہ کاشانی نے حضرت عیسیٰؑ کی دی ہے۔دوسری روایت اثنائے تفسیر آنحضرتؐ کی بروایت انس بن مالک دی ہے تیسری روایت حضور ابوذر غفاری سے ہے۔ایک تفسیری نکتہ کاشفی سے لیا ہے۔تفسیر عیاشی کے حوالہ سے ابان بن تغلب کی روایت از امام محمد باقرؑ از رسول خدا درج کی ہے۔

جب کہ توضیح المجید میں پہلی روایت فضل بن یسار کی ہے جو منہج میں موجود نہیں۔البتہ حضرت مالک بن انس، کاشفی کا نکتہ اور ابان بن تغلب کی روایت کچھ بھی توضیح میں موجود نہیں۔

نہج میں حکیم سنائی کے شعر پر تفسیرِ والناس ختم ہو جاتی ہے جب کہ توضیح میں اس کے بعد تقریباً دو صفحے مزید ہیں جو منہج سے بالکل مختلف ہیں۔

ان واضح حقائق کے بعد کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ''التوضیح'' ترجمہ ہے منہج کا۔

ایک عجیب بات

اس مطالعہ کے دوران ایک عجب بات یہ سامنے آئی کہ جناب مولانا سید علی صاحب قبلہ کے علاوہ سیارہ ڈائجسٹ کے ''قرآن نمبر'' کے مطابق بحر العلوم آیۃ اللہ سید محمد حسین عرف مولانا علّن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ جو خاندان اجتہاد کے جید ترین علماء و مجتہدین میں شامل ہیں۔ ان کی تفسیر تنویر البیان بھی خلاصۃ المنہج از ملا فتح اللہ کاشانی کا ترجمہ ہے جو ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ ایک اور عالم دین مولوی امداد علی صاحب قبلہ نے ''ثابت نامہ نوطرز'' کے قلمی نسخے کے دیباچہ میں اپنے تعارف میں یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے ''منہج الصادقین'' کا ہندی ترجمہ کیا۔ ہندی سے ان کی مراد یقیناً اردو ہوگی۔ یہ ذکر ایک کتاب کے ایک عکسی ورق سے ملا جو میرے نہایت کرم فرما حضرت مظفر حسین سومرو صاحب نے مجھ کو عنایت فرمایا اور بتایا کہ وہ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل صاحب قبلہ کی کتاب ''اردو تراجم و تفاسیر'' کا ایک ورق ہے۔ اس میں مصنف محترم نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ امداد حسین صاحب قبلہ کے ''ثابت نامہ نوطرز'' کے متعلق جناب مسعود حسن صاحب رضوی ادیبؔ نے معلومات فراہم کی تھیں۔

اس میں مجھے حیرت کی بات یہ معلوم ہوئی کہ ساری تفاسیر منہج الصادقین ہی کا ترجمہ کیوں کہی جاتی ہیں۔ بہر حال سید علی صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ کی تفسیر کو تو میں نے ثابت کر دیا ہے کہ اس کا ترجمہ نہیں ہے۔ جناب بحر العلومؒ کی تفسیر تنویر البیان کے بارے میں میری معلومات اتنی نہیں ہے کہ ان پر تبصرہ کر سکوں۔ البتہ امداد حسین صاحب قبلہ نے خود لکھا ہے کہ انھوں نے منہج الصادقین

کا ترجمہ کیا ہے۔

ایک بات اور۔ جناب محترم ڈاکٹر عسکری بن احمد صاحب قبلہ نے اپنے مضمون کی دوسری قسط میں یہ لکھا ہے کہ تنویر البیان ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی لہٰذا وہ پہلا ترجمہ ہے۔ اس سے دو تین سطر پہلے وہ یہ لکھ چکے ہیں کہ توضیح المجید ہی پہلا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ شاید کتابت میں کچھ غلطی ہوگئی ہو۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ زحمت فرما کے اپنی اگلی قسط میں اس کی وضاحت فرما دیں تو شکر گزار رہوں گا۔

جناب محترم مظاہر حسین نقوی صاحب قبلہ کے اداریہ سے متعلق چند معروضات

حضرت نقوی صاحب نے جو شکوک وشبہات اور اعتراضات میری تحلیل زمانی کے بارے میں فرمائے الحمدللہ میں نے مندرجہ بالا سطور میں ان کا تفصیلی اور نا قابل تردید دلائل کے ساتھ جواب دے دیا ہے۔ امید ہے کہ میرے تحریر کئے ہوئے جوابات کے مآخذ میں سے کوئی نہ کوئی نقوی صاحب قبلہ کے نزدیک قابل اعتبار ہوگا اور کوئی محترم مصنف ان کی نظر میں ایسا ضرور ہوگا جس کو نجم العلماء مولانا سید ہدایت حسین صاحب قبلہ آل غفران مآبؒ کی طرح وہ معاذ اللہ بد دیانت، جھوٹا اور اقربا نواز نہ کہیں گے۔ ان کے بعض دوسرے ارشادات کا جواب بھی اوپر آچکا ہے۔

نقوی صاحب قبلہ نے اپنے اداریہ میں چند باتیں ایسی لکھی ہیں جن پر تبصرہ کرنا اس لئے ضروری ہے کہ ریکارڈ کو درست کیا جا سکے۔ اس سلسلہ میں پہلے ان کی عبارت درج کر دوں تا کہ قارئین محترم کے پیش نظر رہے۔ ملاحظہ ہو۔

۱۔ سو برس کے بعد ولادت سید علی صاحب اعلی اللہ مقامہ ہدایت حسین صاحب کا

کسی قلمی نسخہ میں سید علی صاحب قبلہ کی ولادت ووفات کا لکھ دینا ان معنوں میں یقین نہیں ہوسکتا کہ

۲۔ ہمارے اکثر گھرانوں میں بعض شوقیہ حضرات اپنے خاندانوں کے جو کوائف لکھتے ہیں انھیں بڑھا چڑھا کر لکھتے ہیں اور اپنے پاس سے جس فرد کو چاہتے ہیں جس سے خاص ان کی پیڑھی کا تعلق ہوتا ہے اسے تو اور زیادہ آسمان سے جا لگاتے ہیں۔

۳۔ اس لئے ان قلمی نسخوں کا جو محض ذاتی ہوں، ان کی تشہیر وتصدیق عام نہ ہو، علم تحقیق کے اعتبار سے ساقط الاعتبار قرار پاتا ہے۔

اس عبارت میں خط کشیدہ الفاظ قابل غور ہیں۔

(ا) سو برس کے بعد: عرض ہے کہ کسی شخصیت اور اس کا تذکرہ لکھنے والے کے درمیان وقت کا زمانہ شخصیت کی وفات سے شمار کیا جاتا ہے نہ کہ ولادت سے۔ مولانا ہدایت حسین صاحب قبلہ طاب ثراہ نے نجوم تواریخ سید علی صاحب قبلہ طاب ثراہ کی وفات کے صرف پچپن چھپّن سال کے بعد لکھی جو اتنی بڑی مدت نہیں ہے کہ لکھنے والے کی بات پر اعتبار نہیں کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اپنے ہی قریب ترین عزیزوں اور بزرگوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے کہیں دور نہیں جانا پڑتا۔ اپنے ہی بزرگوں سے حالات معلوم ہوجاتے ہیں۔ ہدایت حسین صاحب قبلہ کے والد بزرگوار زبدۃ العلماء معین المومنین مولانا سید علی نقی صاحب طاب ثراہ سید المفسرین کے سگے بھتیجے تھے جو ایک مدت تک اپنے عم محترم کی زندگی میں ان کی خدمت میں حاضر رہتے ہوں گے۔ اس لئے مولانا سید علی صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ کے بارے میں مولانا ہدایت حسین صاحب کی تحریر سے زیادہ اور کس کی تحریر مستند ومعتبر ہوسکتی ہے اور خاندانی ریکارڈ سے زیادہ اہل خاندان کے بارے میں اور کون سی چیز مستند ہوسکتی ہے۔

بڑھا چڑھا کے لکھنے کے بارے میں عرض ہے کہ ولادت ووفات کی تاریخوں میں

بڑھانے چڑھانے کا کیا محل ہے اور اس مہمل اور بے بنیاد الزام کی کیا تُک ہے۔

(ب) پیڑھی کے تعلق سے آسمان سے جا لگانا: ایک عالم دین پر اس قدر قبیح اور کریہہ الزام افسوسناک ہی نہیں قابل مذمت بھی ہے۔ اب اگر معزز علمائے کرام کی تحریروں پر بھی اعتبار نہیں کیا جائے تو کس کا اعتبار کیا جائے۔ بغیر دلیل وثبوت کے ایک عام صاحب قلم کے بارے میں بھی یہ الزام اخلاقی اور قانونی ہر اعتبار سے کھلی ہوئی توہین ہے نہ کہ ایک مجتہد ابن مجتہد ابن مجتہد، مجدد مذہب شیعہ کے بارے میں اس طرح کے اقربا نوازی کے الزام کی مثال وہ ہے جس میں رسولؐ مقبول پر خود مسلمانوں نے یہ الزام لگایا تھا جس سے نقوی صاحب قبلہ خوب واقف ہوں گے کہ جب آنحضرتؐ اپنے دونوں نواسوں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے فضائل بیان فرماتے تھے جیسے جوانان جنت کے سردار وغیرہ تو اس وقت کے مسلمان یہ کہتے تھے کہ نواسوں کی محبت میں کہہ دیتے ہیں۔ یعنی معاذ اللہ یہ فضائل ان شہزادوں میں تھے نہیں مگر......اب نقوی صاحب قبلہ کے لفظ لکھوں تو میرے ہاتھ ٹوٹ جائیں نقوی صاحب قبلہ نے اپنے اداریہ کے آغاز میں یہ لکھا ہے کہ علمائے اعلان (اعلام) کے لئے ایسے طعن وتشنیع سے ہمیں گریز لازم ہے۔ میں ان کا یہ معقول ارشاد بصد ادب انھیں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اوپر لکھ چکا ہوں کہ میں نے جو مولانا عمار علی صاحب کے بارے میں یہ لکھا تھا کہ عالم رضاعت میں شاید ہوں۔ اس کو نقوی صاحب نے ان کی سخت ترین توہین قرار دیا تھا اس کا جواب میں اوپر دے چکا ہوں۔ یہاں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں علماء ومجتہدین عظام کے ادب واحترام کو واجب سمجھتا ہوں۔ اس لئے بھی کہ میری پشت پر عظیم المرتبت اور جلیل القدر علماء وفقہاء کرام کا ایک عظیم الشان سلسلہ ہے جن کی علمی، دینی اور روحانی عظمتوں سے اہل علم واہل نظر خوف واقف ہیں۔ مولانا عمار علی صاحب قبلہ طاب ثراہ میرے ہی ایک جد جناب ممتاز العلماء سید محمد تقی

صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ کے شاگرد تھے اس لئے بھی میری نظروں میں ان کی اتنی ہی عظمت ہے جتنی اپنے خاندان کے کسی عالم دین کی ہوسکتی ہے۔

(ج) قلمی نسخوں کا جو محض ذاتی ہوں جن کی تشہیر وتصدیق عام نہ ہو علم تحقیق کے اعتبار سے ساقط الاعتبار قرار پاتا ہے۔

حیرت ہے کہ نقوی صاحب قبلہ کو علم تحقیق اور اس کا یہ اصول کہاں سے ملا ہے۔ اہل علم واہل تحقیق کی نظروں میں تو یہ اصول بالکل متضاد ہے۔ یعنی تحقیق کے سلسلہ میں قلمی نسخوں کا جنہیں مخطوطات کہتے ہیں پایہ اعتبار اور بلند ہوتا ہے۔ ان کی تشہیر وتصدیق ایک لایعنی بات ہے اس لئے کہ یہ عام لوگوں کی دسترس میں ہوتے ہی نہیں۔ بعض نجی کتب خانوں میں کوئی ایک آدھ نسخہ مل جاتا ہے۔ ورنہ عموماً بڑے بڑے کتب خانوں مثلاً پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری، لیاقت نیشنل لائبریری کراچی، اور نیشنل لائبریری اسلام آباد اور زیادہ اہم کتب خانوں میں خدابخش لائبریری پٹنہ، سالار جنگ لائبریری حیدرآباد دکن، آزاد لائبریری علی گڑھ یونیورسٹی، کتب خانہ راجہ صاحب محمود آباد، ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی نیز ایشیا ٹک سوسائٹی وغیرہ مخطوطات کے بڑے مراکز ہیں جن میں مخطوطات کے علٰحدہ شعبے قائم کئے گئے ہیں جو محققین کے لئے تحقیق کے نہایت اہم مراکز ہیں۔ اگر کسی تحقیقی مقالہ کو دیکھئے تو اس میں مآخذ کی فہرست میں مخطوطات کے عنوان سے مآخذ کے نام ملیں گے جن سے تحقیق کا اعتبار بڑھتا ہے۔ ممکن ہے کہ نقوی صاحب نے علم تحقیق پر بھی کوئی کتاب پڑھی ہو اور اس میں مخطوطات کو ساقط الاعتبار بھی لکھا ہو۔

جناب مظاہر حسین نقوی صاحب قبلہ کی دو تحقیقیں

نقوی صاحب قبلہ نے دو تحقیقی انکشافات بھی کئے ہیں (۱) ایک یہ کہ عمدۃ البیان پر تقریظ

حضرت غفران مآبؒ کے صاحبزادے سید حسین صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ کی ہے۔ ۱۲۸۸ھ تحریر کے دستخط ہیں۔ غالباً نقوی صاحب قبلہ کو یہ علم نہیں ہے کہ سید العلماء جناب مولانا سید حسین صاحب علیین مکان خلف حضرت غفران مآبؒ شب شنبہ ۱۷ رصفر ۱۲۷۳ھ مطابق ۲۶ رجنوری ۱۸۵۶ء کو انتقال فرما چکے تھے۔ مرزا غالب نے بھی ان کے مرثیہ کے طور پر ایک حزنیہ نظم لکھی تھی اور بالکل نئے طریقے سے تخرجہ کر کے ان کی تاریخ انتقال کہی تھی مگر میں اس کو درج نہیں کروں گا ورنہ اندیشہ ہے کہ غالبؔ بے چارہ کی بھی وہی گت بنے گی جو جناب مولانا مفتی میر محمد عباس صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ کی بنائی گئی ہے۔ بہرحال اپنی وفات کے پندرہ سال بعد ان کا تقریظ لکھنا نقوی صاحب ہی کی تحقیق کا کمال ہوسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب عمار علی صاحب قبلہ حضرت سید العلماء سید حسین صاحب قبلہ طاب ثراہ کے فرزند ارجمند ممتاز العلماء سید محمد تقی صاحب قبلہ کے شاگرد رشید تھے اور میرے علم کے مطابق عمدۃ البیان پر انھیں کی تقریظ ہے۔ مولانا ہدایت حسین صاحب قبلہ انھیں ممتاز العلماء کے سگے بھتیجے تھے۔

دوسری تحقیق: میں نے سید المفسرین کے انتقال کی تاریخ جناب مفتی محمد عباس صاحب قبلہ فارسی میں تاریخ انتقال سے اخذ کر کے لکھی تھی۔ اس کو بھی نقوی صاحب قبلہ نے بے اعتبار قرار دے کر مسترد کر دیا۔ دلیل یہ دی کہ مفتی صاحب قبلہ نے ایک کبابی کی دکان کی تاریخ یوں کہی تھی۔ "هٰذا بَيْتٌ كَبَابِ بَيْتِ اللهِ" ترجمہ: یہ بھی لکھا ہے کہ بیت اللہ پر جب علماء نے شور مچایا تو حضرت عالی نے فرمایا یہ تاریخ بہ اعتبار سجع ہے بہ اعتبار تخرجہ نہیں۔ اللہ اکبر علماء نے شور مچایا! کس کس بات پر گفتگو کی جائے۔ آج کے علماء بھی شور نہیں مچاتے۔ اس وقت کے علماء جو ایک نہایت مہذب معاشرہ میں رہتے اور مفتی صاحب قبلہ کی جلالت علمی سے بھی بخوبی واقف تھے وہ بھی شور مچاتے۔ معلوم نہیں نقوی صاحب نے یہ تحقیق کہاں سے کی ہے۔

دوسرا رخ یہ کہ پھر مفتی صاحب کی طرف سے جواب کہ یہ تاریخ بہ اعتبار سجع ہے بہ اعتبار تخرجہ نہیں۔ اس سے یا تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مفتی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ فن تاریخ گوئی سے واقف نہ تھے یا پھر خاکم بدہن نقوی صاحب قبلہ کو اس سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ سجع کا تخرجہ سے کیا تعلق ہے یہ کچھ وہ کچھ۔ دوسرے خیال کو اس امر سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ مفتی صاحب قبلہ سے منسوب مصرعے درج کرنے سے پہلے نقوی صاحب قبلہ نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس مصرع کی حیثیت کیا ہے۔ اگر وہ تاریخ کا مصرع ہے بھی تو کیا وہ مفتی صاحب کا کہا ہوا ہوسکتا ہے۔ فن تاریخ گوئی کا کوئی طالب علم بھی حساب جمل سے مصرع کے اعداد جانچ کر یہ دیکھ لیتا کہ یہ تاریخ ہے تو اس کے اعداد تو ۱۶۲۱ء ہوتے ہیں تو سترہویں صدی کے کسی شاعر نے یہ مصرع کہا ہوگا جب کہ مفتی صاحب قبلہ تو انیسویں صدی کے انسان تھے۔ لہٰذا اس کو ان سے منسوب کرنا مفتی صاحب قبلہ پر اتہام اور الزام ہے۔ جناب کاظمی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ کسی صناع تاریخ گو کے مصرعوں سے کوئی درست عدد مطلوبہ نکالنا فی الحقیقت ثابت نہیں سمجھا جاسکتا۔ نقوی صاحب کے ایسے ارشادات سے محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ گوئی کے فن سے ان کی کبھی شناسائی نہیں رہی۔ درحقیقت تاریخ گوئی کا فن اسی لئے معرض وجود میں آیا تا کہ مختلف واقعات کے وقوعہ کی تاریخیں حساب جمل کے اعتبار سے ایک چھوٹے سے فقرہ، مصرع، شعر یا اس کے جزو میں محفوظ کر لی جایا کریں تو آگے چل کر سینکڑوں برس بعد بھی تحقیق کا ایک اہم اور معتبر ذریعہ ثابت ہوں۔ اگر حساب جمل سے محفوظ کی ہوئی مطلوبہ تاریخ مل جائے تو درجنوں کتابیں کھنگالنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جہاں تک تاریخ گوئی میں صناعی کا تعلق ہے، صناعی تو تاریخ گو شعراء کا کمال ہوتا ہے۔ یہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ شاعرانہ حسن کے ایسے تاریخی مادوں کو نا قابل اعتبار کہنا نقوی صاحب ہی کا حق ہے۔ اگر وہ مجھ حقیر فقیر کی کتاب ''فن تاریخ

گوئی کا تنقیدی جائزہ‘‘ ہی ملاحظہ فرما لیتے تو اس کے بارے میں ایسی گفتگو ہرگز نہ فرماتے جواُن کی شان کے خلاف ہے۔

میں نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ اردو میں قرآن مجید کی پہلی تفسیر کے مسئلہ پر گفتگو کرنے اور تحقیق وتدقیق سے اس موضوع کے سلسلہ میں بعض غلطیوں یا غلط نقطہ ہائے نظر کی نشاندہی کر کے انھیں دور کرنے کے لئے کیا ہے۔ کسی پر نکتہ چینی کرنے کے لئے نہیں۔ اس لئے کہ ایک تو میں خود جاہل محض ہونے کی وجہ سے کسی پر نکتہ چینی کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ دوسرے یہ ایک علمی اور ادبی گفتگو تھی۔ اس کو اسی کے تقاضوں کے مطابق پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا جو بحمداللہ مکمل ہوگئی۔ میں نے اس آخری مضمون میں اردو میں قرآن مجید کی تفسیر کی اولیت اور اس پر مختلف الزام یا اعتراض اور شکوک وشبہات کو حتی الامکان تحقیق کر کے مضبوط دلائل سے رد کر دیا ہے۔ اس کے لئے اللہ کے کرم اور مولاؑ کی عنایت کا شکر ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ البتہ اگر میرے اس سلسلہ مضامین میں کہیں پر بھی کسی طرح کی کوئی ایسی لفظ یا جملہ آ گیا ہو جو کسی کے وقار کے منافی ہو یا شان کے شایان نہ ہو تو میں اس سے دست بستہ معذرت طلب ہوں۔ خدا کرے کہ اب یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہو گیا ہو اور مزید کسی مضمون کی ضرورت نہ ہو۔

❁❁❁

تاریخ شیعہ کا ایک ورق

مصنف

حکیم الامت علامہٴ ہندی آیۃ اللہ العظمیٰ سید احمد نقویؒ

تاریخ شیعہ کا ایک ورق

حکیم الامت علامۂ ہندی آیۃ اللہ العظمٰی سید احمد نقویؒ

دنیا میں کوئی صداقت قربانی کے بغیر قائم نہیں ہوئی، بلکہ بعض حقائق کا انکشاف تو محض انسانی خوف سے ہوا ہے تاریخ کا جب سے پتہ لگتا ہے ہمیشہ صادقوں کو کم وبیش قربانی دینا پڑی ہے۔

اسلام کی ہر شاخ ایک نہ ایک قربانی کی داستان ہے۔ اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ تہذیب کا بڑا کام افراد انسانی سے ناجائز چیزوں کا چھڑانا ہے۔ لیکن اسلام نے ناجائز امور سے الگ رہنے کے لئے جائز امور کو بھی ترک کرنے کا حکم دیا ہے اور ناجائز چیزوں کے ترک کو تقویٰ کہا ہے جو محض خدا کی راہ میں ہو (وَ اتَّقُوا اللہ) ظاہر ہے کہ جائز چیزوں کے چھوڑنے ہی کا نام قربانی ہے اور یہی دونوں میں فرق ہے۔

قرآن نے نیکی قائم رکھنے کے لئے یہی راستہ تجویز کیا ہے اسی لئے بتایا ہے کہ ''تم اس وقت تک، اعلیٰ نیکی تک نہیں پہنچ سکتے جب تک محبوب سے محبوب تر چیز کو اپنی نہ چھوڑ دو (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ سورہ آل عمران آیت ۹۲)۔ اس فلسفہ ربانی کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم خوشنودی خدا کے لئے جائز طریق پر اپنی حاصل کردہ اشیاء کو خود دے دیں تو پھر انھیں چیزوں کو خلاف خوشنودی خدا حاصل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے جس مال کو ہم خدا کی خوشنودی کے لئے صدقہ کر دیں گے تو عقل سلیم اسی مال کو ناجائز طریقہ سے حاصل کرنے سے نفرت کرے گی۔

اگر ارکان اسلام کو دیکھا جائے تو ان کی بجا آوری میں ہم ان تمام چیزوں کی قربانی کر دیتے ہیں جو ہمیں محبوب ہیں اور جنھیں ہم نے محنت سے حاصل کیا ہے۔ ہماری رائے یا عقائد، ہمارا وقت، مصروفیت، کاروبار، اکل وشرب کی چیزیں، صنف نازک کی ہم جلیس، زر ومال، وطن، ذاتی آسائش، اولاد، یہی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ہم طرح طرح کے جرائم کرتے ہیں، اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کو ہم خدا کی خوشنودی کے لئے ارکان اسلام میں چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی کی تعلیم کے لئے ارکان اسلام نے ان تمام چیزوں کا احاطہ کرلیا ہے جو ہر قسم کی بدی کا باعث ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے ہر رکن اسلام کی پابندی اور ادائی کا نام تقویٰ اس لئے رکھا ہے کہ اس کی بجا آوری میں ایک نہ ایک چیز چھوڑنا پڑتی ہے۔

اسلام نے دنیا میں آکر سیکڑوں حقائق قائم کئے ہیں۔ مذہبی، اخلاقی، سیاسی، اقتصادی، مجلسی، معاشرتی۔ غرض کہ انسان کے ہر شعبہ زندگی کو بدل دیا، لیکن ان میں ایک بھی صداقت ایسی نہ تھی جس نے سلف صالحین سے طرح طرح کی قربانیاں اور شہادتیں نہ طلب کی ہوں، سب سے بڑی قربانی کا نام شہادت اس لئے رکھا گیا ہے کہ شہید کسی امر حق کی صداقت میں اپنی جان دے کر شہادت دیتا ہے کہ جس امر کے لئے اس نے جان دی ہے وہ صحیح ہے۔ اور جن باتوں کے خلاف اس نے جانی قربانی پیش کی ہے وہ باطل ہیں۔

اسلام کے شہیدوں کی طولانی فہرست کو دیکھو کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اور وہ کس اصول کی حمایت میں دل ملول ہیں، اور پھر بمقابل ان کے ان لوگوں کو دیکھو جو شہید کرنے والے تھے، اور ان اصولوں کو دیکھو جو کہ شہیدوں کے اصول کی ضد پر قائم تھے تو آسانی سے سمجھ لوگے کہ صداقت کس کے ساتھ تھی، اور کون اصول سچا تھا۔ تقویٰ اور قربانی کرنے والا یا اس کا مخالف۔ صداقت کی کسوٹی بس یہی ہے رسولؐ نے جس دین کو قائم کیا اس کی تصدیق میں

رسولؐ نے جو جو قربانیاں دیں ان کے بعد صرف ان کی اولاد نے ان کی نسل نے، اسی دین کی حمایت وتحفظ پر ہر قسم کی وہ محیر العقول قربانیاں دیں، جن کو تاریخیں نہیں مٹا سکتیں۔ ان شہیدوں کے تقوے اور قربانیوں کی تفصیل تو تاریخیں ہی بتا دیں گی ان کے اصول مذہبی جن پر وہ مرمٹے ان کی جانچ بھی تاریخ ہی کے ذمہ ہے۔ ہم کو تو اس کتاب میں صرف یہ دکھانا ہے کہ اسلام کے تمام فرقوں میں صرف شیعہ ہی وہ فرقہ ہے جس نے حمایت اصول میں اپنی مکمل قربانی دی جو کسی قوم نے نہیں دی۔ ہم تاریخی واقعات کو مستند علماء ومورخین اہلسنت کی کتابوں سے لکھنے پر مجبور ہیں۔ ہماری خطا صرف تاریخی واقعات کا دُہرانا ہے جو سبھی مورخین نے لکھے ہیں کسی کے دل کو ٹھیس لگانا منظور نہیں ہے۔ اگر ہماری ان چند سطروں سے کسی کے دل نازک کو ٹھیس لگتی ہو تو ہمیں وہ معاف کرے۔ اس کے مجرم خود وہ مؤرخ ہیں جن کے حوالوں سے ہم نے یہ واقعات لکھے ہیں۔

تاریخی واقعات تو تاریخ ہی کی نظر سے دیکھنے ہوں گے خواہ سیاسی مصالح وماحول کی تبدیلی ان کی تاویل وتنقید کر کے رنگ آمیزی کر دے یا واقعات سے انکار ہی کر دے۔ لیکن آج سے دوصدی پیشتر تک مورخین ومحدثین ومحققین اہلسنت نے بیشک بنی ہاشم اور ذریت رسولؐ کو مجرم ہی سمجھا اور ان کے جرائم کی تاریخی سزاؤں کو حق بجانب سمجھتے ہوئے بلا انکار تاریخوں میں درج بھی کیا۔ ان کی نظر میں خلافتیں اپنی مجوزہ سزاؤں کو حق بجانب سمجھتی رہیں اور سزا یافتہ لوگوں کو مستحق انھیں سزاؤں کا قرار دیتی رہیں۔

اسی نظریہ کے ماتحت بلا جھجک تمام مصنفین واقعات کو تاریخوں میں درج کر گئے۔ لیکن سیاست نے پلٹا کھایا اور ماحول میں عظیم تبدیلی ہوئی، اس لئے جب متاخرین اہلسنت نے واقعات تاریخی سے انکار اور ان کی توڑ مروڑ یا غیر مستند واقعات پیش کر کے تاویل شروع

کردی۔ زائدتر دوصدی کے اندر اندر یہ سب کچھ ہوا ہے۔لیکن تاریخ اس بات کی ذمہ دار ہے۔ وہ تو بلا پس وپیش واقعات کو واقعات کی نظر سے درج تاریخ کرچکی ہے۔شیعوں کا مسلک اس معاملہ میں اب تک واضح رہا کہ انھیں تاریخوں پر اپنی مذہبی بنیادیں محکم کرتے رہتے ہیں اگر شیعوں کا قصور ہے تو اتنا ہی ہے۔

اگر تمام شہداء ومقتولین شیعہ کی مفصل تاریخ لکھی جائے تو ضخیم جلدیں ہوجائیں شیعہ مورخین کولازم ہے کہ اپنے شہیدوں کی مفصل تاریخ پیش کریں۔ہم ایک ابتدائی فہرست صرف خاندان رسالت کے شہیدوں کی پیش کررہے ہیں، اور تاریخ مذہب شیعہ کی ابتدائی منزل طے کرتے ہیں۔ان کے تابعین کی فہرست کسی آنے والے زمانے میں انشاءاللہ پیش کریں گے بشرطیکہ عمر نے اور بھی وفا کی اور خدا کی توفیق اور مدد بھی شامل حال ہوئی۔

تاریخوں کی ورق گردانی کرو دیکھو شیعوں کے ہادی اور پیروان کی جانیں ان کے اعتقاد ومذہب کی حمایت پر تلف ہوئیں۔ان کا صرف یہ قصور تھا کہ وہ اپنے کو وارث علوم نبیؐ اور تعلیمات رسولؐ کا خود کو معلم سمجھتے تھے۔ان کا نصب العین یہ تھا کہ اسلام ملک گیری وفتوحات کے لئے نہیں آیا ہے۔وہ ایک خالص روحانی تحریک ہے جس کا منشاء دنیا میں استبداد وملوکیت کو فنا کرنا اور عالمگیر مساوات کی اشاعت سمجھے نہیں وہ اپنے کو روحانی پیشوا سمجھتے اوراس عہدے کے لئے انتخاب شوریٰ، قہر وغلبہ، شمشیر زنی کو بے معنی سمجھتے تھے۔اس لئے کہ یہ اصول موضوعہ تو مادی نشوونما کے لئے بنائے گئے ہیں جس میں روحانیت کا شائبہ بھی نہیں ہے اور حقیقۃً روحانیت کو انتخاب ومشورہ اور شمشیر زنی سے کیا لگاؤ ہے، وہ تو فیض ربانی اور اپنے تذکیۂ نفس وتقویٰ وقربانی سے حاصل ہوتی ہے۔

رسولؐ بھی اسی دعوت کے واسطے آئے تھے۔ان کی اولاد اور خاص پیروان نے بھی اسی

اصول کی حفاظت میں قربانیاں پیش کیں۔غرض کہ شیعہ اوران کے پیشواؤں کا یہی جرم تھا کہ وہ بعد رسولؐ موجودہ خلافتوں اور سلطنتوں کے اصول واحکام کی نافرمانی کرتے تھے۔ وہ صرف خدا ورسولؐ کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تھے، اوران احکام کے پہنچنے کا ذریعہ صرف اولاد رسولؐ کوقرار دیتے تھے جو کہ مظہر صفات رسولؐ اور نمونۂ اخلاق رسولؐ بن کر آئے تھے اور دنیا کے سامنے اسی تعلیم کو پیش کرتے تھے۔

ہم ان شہیدوں کی فہرست کو جو خاندان رسالت سے ہیں اور پیشوایان قوم شیعہ کہلاتے تھے اور جن کا نام و پتہ معلوم ہوسکا ہے خاندان اموی کے سربرآوردہ اور محدث جلیل علامہ ابوالفرج اصفہانی المتوفی ۳۵۶ھ کی کتاب ''مقاتل الطالبین'' سے پیش کرتے ہیں۔علامہ مذکور خلفائے بنی امیہ اور خلیفہ محمد بن مروان بن حکم کی اولاد سے ہیں اور ظاہر ہے کہ اپنے بزرگ خاندان کے اوپر افتراء و بہتان ایسے شخص سے ناممکن ہے۔ دیگر واقعات دیگر مستند ومعتبر مورخین اہلسنت سے لئے گئے ہیں، اوراس کا سلسلہ خلافت اولیٰ سے شروع کیا گیا ہے تاکہ اصول شیعہ اور غیر شیعہ میں فرق وامتیاز ہو۔

ساتھ ہی اس کے اصحابی عقائد واحکام مذہب شیعہ کو بھی بیان کردیا ہے جس کی بنا پر شیعہ قابل گردن زدنی ہوئے۔ وباللہ التوفیق

احمد النقوی، ۱۳رمئی ۱۹۳۶ء

(۱)
شیعہ کے معنی

شیعہ عربی لفظ ہے جس کے معنی دوست کے ہیں، قرآن مجید نے سورۂ صافات میں

حضرت ابراہیمؑ کو شیعہ کا لقب دیا ہے، اور سورۂ قصص میں حضرت موسیٰؑ کے دوست کو جس کے لئے مصری کو قتل کیا تھا شیعہ کہا ہے۔

رسولؐ خدا نے علیؑ کے دوستوں کا نام شیعہ رکھا تھا، اور متعدد موقعوں پر فرمایا تھا:

۱۔ رسولؐ خدا نے فرمایا میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے سب جہنم میں جائیں گے بجز ایک فرقہ کے جو جنتی ہے اور وہ شیعہ علیؑ ہیں۔ (مناقب اخطب خوارزمی)

۲۔ رسولؐ خدا نے فرمایا یا علیؑ تم اور شیعہ تمہارے جنت میں جائیں گے۔ (تفسیر درمنثور سیوطی، فردوس الاخبار دیلمی، حلیۃ الاولیا ابونعیم، مناقب خوارزمی، مناقب ابن مفازلی، ریاض نضرہ محب طبری، مناقب صحابہ نجم الدین ابوبکر، دررالسمطین، معجم کبیر طبرانی، کفایۃ الطالب، ینابیع المودۃ، مودۃ القربیٰ) لہٰذا شیعیان علیؑ نہ جدید فرقہ ہے نہ دوستان علیؑ کو شیعہ کہنا کوئی جدید بات ہے۔

(۲)
عہد رسولؐ میں دو فرقے

عہد رسولؐ میں دو فرقے تھے، ایک مومن دوسرے منافق۔ شیعوں کو مومن کہتے تھے، اور منافق مسلم بھی کہلاتے تھے مسلمان جب اپنے کو مومن کہتے تو خدا ان کو مومن کہنے سے روکتا (قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا بَلْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا۔ سورہ حجرات آیت ۱۴)

رسولؐ خدا کے دو صحابی جابر انصاری اور ابودجّانہ فرماتے ہیں کہ "عہد رسولؐ میں منافق عداوت علیؑ سے پہچانے جاتے تھے۔

(ترمذی)

اس تصریح سے معلوم ہوا کہ عہد رسولؐ میں دشمن علیؑ کا نام مُسلم ومنافق تھا اور دوست علیؑ

مومن کہلاتے تھے۔ رسولؐ خدا نے فرمایا تھا:

۱۔ محبانِ علیؑ جنت میں جائیں گے، اور تکمیل ایمان کی حُبِ علیؑ سے ہوتی ہے اور علیؑ کی محبت رسولؐ کی محبت ہے اور علیؑ کی دشمنی رسولؐ کی دشمن ہے۔ (مسند احمد بن حنبل، جمع بین الصحیحین، جمع بین الصحاح الستہ، سنن ابوداؤد، مناقب ابن مغازلی، مناقب اخطب خوارزمی، معجم طبرانی، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، کتاب الفردوس دیلمی، فرائد السمطین حموینی)

—۲ بار بار رسولؐ خدا نے فرمایا تھا: دوست علیؑ مومن اور دشمن علی کافر ہے اور منافق ہے۔'' (مسند احمد بن حنبل، جمع بین الصحیحین، جمع بین الصحاح الستہ، صحیح بخاری، سنن ابوداؤد، صحیح مسلم، صحیح ترمذی)

خوب سمجھ لو دوست علیؑ و رسولؐ مومن و شیعہ ہے اور دشمن علیؑ و رسولؐ کافر و منافق ہے۔ زمانہ رسولؐ خدا ہی سے یہ فرق رہا ہے۔ اور انھیں منافقین نے اپنے کو مسلم کہنا شروع کیا اور بعد میں اہلسنت والجماعت کہلانے لگے۔ شیعہ مسلم بھی کہلاتا ہے، اور قرآن و حدیث میں جہاں کہیں مسلم کی تعریف کی گئی ہے اس سے مومن مسلم ہی مراد ہے نہ کہ مسلم منافق۔

(۳)
عداوت علیؑ کے اسباب

عہد رسولؐ ہی سے مسلم منافقوں کو علیؑ سے شدید عداوت تھی، ان کا ایمان صرف ظاہری یا خوف سے تھا یا بطمع ریاست و حب جاہ۔ لیکن فی نفسہ وہ کافر تھے۔ منجملہ کثیر وجوہ وعداوت کے چند قوی وجہیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ علیؑ سے رسولؐ خدا کی افراط محبت اور ہر امر میں علیؑ کو تمام اصحاب پر فوق دینا موجب رشک و حسد تھا، ان لوگوں کے لئے جو بطمع دنیا مسلمان ہوئے تھے۔ (سر العالمین غزالی، جامع

المقاصد تفتازانی)

۲۔ رسولؐ خدا کا ابوبکر صحابی کو سورۂ برات کی تبلیغ کے لئے ایام حج میں مکہ معظّمہ بھیجنا، اور پھر اس عہدے سے معزول کر کے علی مرتضیٰؑ کو یہ عہدہ عطا کرنا، جس کا ابوبکر کو بے حد صدمہ رہا۔

(ترمذی شریف)

۳۔ بی بی عائشہ کا قصہ افک ۵ رہجری میں رسولؐ خدا کا قبیلہ بنی مصطلق سے جنگ کے لئے جانا اور ام المومنین کا راستہ میں چھوٹ جانا، اور رات بھر ایک کم سن عورت کا صحرا میں ایک جوان سپاہی صفوان بن معطل کے ساتھ رہنا۔ عربوں کے دلوں میں شک پیدا ہوا۔ اس کو عبداللہ بن سلول ''دشمن رسولؐ'' نے زاید مشہور کیا جس سے رسولؐ کو نہایت صدمہ تھا۔ حضرت علیؑ نے ایک تحقیقاتی کمیشن کی رسولؐ کو رائے دی۔ بی بی عائشہ کو خود ابوبکر اور ''ام رومان'' کے سامنے بیان دینا پڑا۔ تمام اسلامی مورخین نے اس واقعہ کو لکھا ہے ''مسٹر جان ڈیونپورٹ'' نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔ اسی وقت سے بی بی عائشہ اور ان کا تمام خاندان علیؑ کا دشمن ہو گیا تھا۔

۴۔ ایک روز رسولؐ خدا مال غنیمت اصحاب و ازواج میں تقسیم کر رہے تھے۔ بی بی عائشہ سب سے زائد حصہ لینے کے لئے مچلی ہوئی تھیں۔ علیؑ نے بی بی عائشہ کو ترش روئی سے روکا اور رسولؐ خدا کو قرآن کی وہ آیت یاد دلائی جس میں خدا نے فرمایا ہے ''اپنی بی بیوں میں جس کو چاہے طلاق دے دو، خدا اس کے عوض میں اس سے اچھی بی بی تم کو دے گا (پارہ ۲۸، رکوع) یہ مشورہ بی بی عائشہ کو بہت گراں گذرا۔ رسولؐ خدا نے علیؑ مرتضیٰ سے فرمایا اے علیؑ تم کو اختیار ہے میں نے تم کو اپنا وکیل کیا جس عورت کو چاہو طلاق دے دو، میں اس کا نام دفتر ازدواج سے کاٹ دوں گا۔ خود ام المومنین کہتی ہیں، اس روز سے میں علیؑ سے خائف رہتی تھی، ایسا نہ ہو علیؑ مجھ کو طلاق دے دیں۔ (روضۃ الاحباب، ج ۳)

۵۔ فتح مکہ کے بعد علیؑ کو رسولؐ نے کاندھے پر کھڑا کر کے خانہ کعبہ کے بت توڑے۔ یہ امر ظاہری اسلام لانے والوں پر انتہائی گراں تھا۔

۶۔ بحکم رسولؐ خدا علیؑ نے اشہب کی بلندی پر چڑھ کر مجمع عام میں کفار کے سورۂ برأت سنایا جس میں کفار مکہ کو آتش جہنم سے ڈرایا گیا تھا، تمام اہل مکہ علیؑ کے قتل پر آمادہ ہو کر آئے لیکن کسی کو علیؑ کے مقابلے کی جرأت نہ ہوئی، اور آتش بغض بھڑکتی رہی۔ (تفسیر ثعلبی، تفسیر درمنثور، صحیح ترمذی، عمدۃ القاری، فتح الباری، جمع الجوامع، خصائص نسائی، مستدرک حاکم، مناقب خوارزمی، تاریخ ابن خلدون، تاریخ ابوالفداء، معالم التنزیل بغوی، تاریخ ابن سعود کارزانی، ذخائر العقبیٰ، تاریخ ابن کثیر، تذکرۂ خواص الامہ)

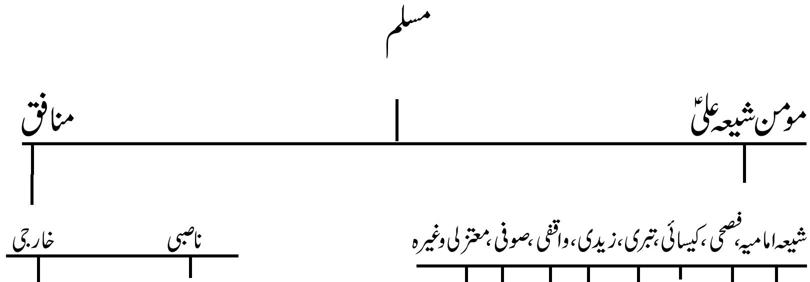
۷۔ ابتدائے حکم جہاد سے آخر وقت تک ہزاروں مشرکین دست علیؑ سے قتل ہوئے جس کا تخمینہ اہل تاریخ نے دس ہزار نفوس تک کیا ہے۔ ان مقتولین میں اکثر ابوبکر، عمر و عثمان، خلفاء کے قریبی رشتہ دار بھی تھے اور دیگر اصحاب رسول کے بھی اعزاء تھے، اس لئے تمام قبائل عرب اور اصحاب رسول بجز چند اصحاب کے علیؑ کے جانی دشمن تھے، اور منتظر وقت تھے بالخصوص تمام بنی امیہ، اس لئے کہ ان کے بڑے بڑے سردار دست علی سے قتل ہوئے تھے۔ لہٰذا بنی امیہ، بنی تیم، بنی عدی، بنی نوفل، بنی عبدالدار، بنی مخزوم، بنی حجح، بنی عامر بن لوی وغیرہ وغیرہ، اپنے سرداروں کے قتل ہونے کی وجہ سے علیؑ کے بدترین دشمن تھے اور بخوف رسولؐ اسلام لائے تھے۔ تاریخ عرب کے جاننے والے جانتے ہیں کہ عربوں میں نسلاً بعد نسل انتقامی جذبہ کارفرما رہتا ہے، اور وقت کے جویا رہتے ہیں۔ چنانچہ ۲۹ رصفر ۱۱ رہجری مطابق ۶۳۲ء رسولؐ خدا کی وفات ہوئی تو یہ سب قبیلہ بی بی عائشہ کی کمک سے علیؑ کے خلاف بنی ساعدہ کے چھتے میں جمع ہو گئے اور علیؑ کے خلاف رسولؐ کے بوڑھے صحابی اور خسر بی بی عائشہ کے باپ

ابوبکر کو خلیفہ بنا دیا۔اس وقت علیؑ اور ان کے ساتھی رسولؐ کے دفن وکفن میں مشغول تھے۔

جب علیؑ کو اس پنچائت کی خبر ہوئی تو یہ دیکھتے ہوئے کہ ان کے روحانی مشن کی جگہ قیصریت لے لے گی اور علیؑ کا جنگ کرنا رہی سہی علوی مشن کو اور بھی کمزور کردے گا، روحانیت رخصت ہوجائے گی مادیت وسرمایہ داری چھا جائے گی، خاموش اور خانہ نشین ہو گئے اور بار بار اپنے حقوق کا اعلان کرتے رہے اور روحانیت کے پرچار میں مشغول ہو گئے۔اسی وقت سے علیؑ اور ان کے ساتھیوں کی ایک جماعت ہوگئی، اور ابوبکر اور ان کے ساتھی دوسری جماعت۔ایک شیعہ کہلائے اور دوسرے اپنے کو مسلمان کہنے لگے، اور منافقیت کا نام ترک ہوکر عیب قرار پایا۔لیکن پیروانِ علیؑ ان کو منافق ہی کہتے رہے۔

(۴)

مسلمانوں کے بڑے شعبے



شجرے کی مذکورہ چند بڑی اصلیں مسلم طبقہ کی لکھی گئی ہیں، جن کی عقاید کی رو سے سیکڑوں فرعیں ہیں۔شیعہ امامیہ کو شیعہ اثنا عشری (بارہ اماموں والے) اور جعفری بھی کہتے ہیں۔اس لئے کہ مذہب شیعہ امامیہ کو امام جعفر صادقؑ کی ذات سے بہت ترقی ہوئی، اور اصول وفروع احکام کثرت سے شیعوں کو امام جعفر صادق علیہ السلام ہی سے ملے ہیں۔

فرقوں کے اعتبار سے تو خوب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ کون کس شاخ میں ہے۔لیکن اس بات کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے کہ یہ تفریق خلافت کی علیؑ اورابوبکر سے ہوکر کس نے کس کو یکے بعد دیگرے خلیفہ سمجھا۔شیعہ امامیہ کا اپنے اماموں پر اتفاق ہے۔ البتہ اہلسنت اور منافقین میں خلافت کے متعلق اختلاف ہے۔کوئی حضرت علیؑ کے بعد کسی کو خلیفہ کہتا ہے اور کوئی کسی کو۔لیکن ہم ''شرح فقہ اکبر'' سے خلافت کو بیان کرتے ہیں۔دیکھو شجرۂ ذیل کو:

حضرت عبدالمطلبؑ

حضرت عبداللہ (ازروئے اعتقاد اہلسنت)	ابوطالب عم رسول (ازروئے اعتقاد شیعہ)
محمد مصطفی نبیؐ	امام اول علیؑ برادر و داماد رسولؐ
خسر رسول، ابوبکر	امام حسنؑ امام حسینؑ
خسر رسول، عمر	امام زین العابدینؑ
عثمان (بہ اعتقاد اہلسنت داماد رسول شیعوں کو انکار ہے)	امام محمد باقرؑ
علیؑ برادر و داماد رسولؐ	امام جعفر صادقؑ
خلیفہ معاویہ	امام موسیٰ کاظمؑ
یزید بن معاویہ	امام علی رضاؑ
مروان	امام محمد تقیؑ

عبدالملک	امام علی نقیؑ
سلیمان	امام حسن عسکریؑ
ہشام	امام محمد مہدیؑ
ولید	
عمر بن عبدالعزیز	

شیعہ سلسلہ امامت کو (جو خالص روحانی ہے) اولاد رسولؐ میں منحصر سمجھتے ہیں، اور تمام منافق مسلم فرقہ خلافت میں اولاد رسولؐ کا کوئی حق نہیں قرار دیتے، صرف علیؑ کو چوتھا خلیفہ کہتے ہیں (بر بناء خلافت ظاہری و سلطنت ان کا معیار روحانیت نہیں ہے) بہت سے اسلامی فرقہ معاویہ کو اور یزید کو خلیفہ نہیں سمجھتے، بلکہ کافر وملعون (ہم کو مسلم منافق) اہلسنت کے اختلافات سے کوئی بحث نہیں ہے۔

(۵)

تفریق شیعہ و مسلم منافق صدر اسلام سے

ابن ابی الحدید جنگ صفین میں پیروان علیؑ کو شیعہ علیؑ اور پیروان عثمان کو شیعہ عثمان لکھتے ہیں۔ یہی امتیاز جنگ مختار و مصعب بن زبیر میں رہا۔ شیعیان علیؑ کا نام رافضی عمر بن سعد سپہ سالار لشکر یزید نے رکھا۔ جیسا کہ محمد بن احمد ثقفی نے اپنی تاریخ میں ابومخنف سے نقل کیا ہے۔

یہی مورخ جنگ ابراہیم بن مالک اشتر و مصعب میں لکھتا ہے کہ ''ابراہیم نے مصعب کو شکست دی۔ واپسی میں ایک شخص کو دیکھا، جا کر سلام کیا، اس نے پوچھا، یہ خیمے کیسے ہیں۔ ابراہیم نے کہا معلوم نہیں، وہ بولا مجھ کو اس جماعت سے ڈر لگتا ہے۔ اس وقت ابراہیم نے کہا یہ

لوگ اہل حق ہیں، حق کے واسطےلڑتے ہیں اس نے جواب دیا جس نے تم سے یہ کہا ہے وہ رافضی ہے۔ جیسے ابراہیم و مالک اشتر اوراس کی قوم، ہم ان پر لعنت کرتے ہیں۔ابراہیم نے پوچھا رافضی کیا ہوتا ہے اور کیوں رافضی کہتے ہیں۔اس نے جواب دیا اس وجہ سے کہ یہ لوگ علیؑ کوامام برحق جانتے ہیں، اوراذان میں "حَيَّ عَلَى خَيْرِ الْعَمَل" کہتے ہیں اوردن رات میں اکاون رکعت نماز پڑھتے ہیں۔ سترہ رکعت فرض، سترہ رکعت سنت اور سترہ رکعت نوافل، اور ہاتھ کھول کرنماز پڑھتے ہیں، اور معاویہ ویزید پر لعنت کرتے ہیں اور اب انتقام خون اولادعلیؑ کے واسطے کھڑے ہوئے ہیں۔" اہلسنت اب تک شیعیان علی کو بہ پیروی عمر سعد رافضی کہتے ہیں۔اورشیعہ ان اسلامی فرقوں کوناصبی وخوارجی کہتے ہیں۔

بعدوفات رسولؐ مسلمانوں کے دوفرقے ہوگئے، ایک محب علیؑ دوسرا دشمنان علیؑ جس کوسنی کہتے ہیں (یعنی مسلم منافق) علاوہ شیعوں کے اہلسنت دوستان علیؑ وآل علیؑ نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر اپنے کوسنی کہلانا پسند کیا اور تبدیل اسم کی ضرورت نہ سمجھی۔ حالانکہ حقیقتہً وہ محب علیؑ وآل علیؑ ہونے کی وجہ سے سنی نہیں ہیں بلکہ شیعوں کا ایک فرقہ ہیں۔ (تاریخ مارشن حصہ دوم، تاریخ سرجان ڈیونپورٹ) تمام مورخین یورپ جوبھی تاریخ اسلام لکھے گا اس فرق کوضرور لکھے گا۔

(۲)
شیعوں میں فرقہ بندی

شیعوں میں جوفرقے پیدا ہوئے وہ محض سیاسی تھے، چونکہ عہد رسولؐ کے شیعوں کے اصول مذہب میں یہ تھا کہ ملکی لڑائی حرام ہے اور بغیر شرکت امام یا بغیر اجازت امام جو جہاد ہو وہ حرام ہے، اورکسی کی خوں ریزی جائز نہیں ہے۔

قتل امام حسینؑ کے بعد شیعوں اوران کے اماموں نے باوجود سخت ترین مظالم بنی امیہ

و بنی عباس کے کسی جنگ وخوں ریزی میں حصہ نہیں لیا، نہ اماموں نے ان کی کسی سازش میں شرکت کی۔خاص شیعوں نے جنگلوں، بیابانوں میں بھاگ بھاگ کر جانیں بچائیں۔غیر ملکوں میں پناہ لی اور مذہب چھپاتے رہے اوراس کا نام تقیہ رکھا۔شہید ہوئے، اسیر ہوئے، قید ہوئے،صبر کیا۔لیکن جن شیعوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور کچھ قوت بھی حاصل ہوگئی،انھوں نے بغیر اجازت امام دشمنوں سے جنگ شروع کردی اور کسی امام زادے کے ہاتھ پر بیعت کرلی اوراسے اپنے ساتھ لے لیا۔وہ فرقہ شیعوں کے نام سے تو مشہور رہا لیکن درحقیقت وہ شیعہ اثنا عشری نہیں کہلایا،اس لئے کہ علیؑ کی گیارہ اولادیں جوامام کہلاتی ہیں،اور بعدرسولؐ ان کے خلیفہ اور جانشین کہلاتے ہیں ان کی بغیر اجازت دوسروں کے ہاتھ پر بیعت کرکے جنگ ہوئی۔ اوران کواپنا امام بنالیا وہ اُسی امام زادے کوامام سمجھنے لگے،اوراپنا ایک نام رکھ لیا،وہ گروہ شیعہ اسی نام سے مشہور ہوگیا۔جیسے محمد حنفیہ ابن علی مرتضیٰؑ کے پیرو''کیسائی'' کہلائے اورزید شہید کے پیرو''زیدی'' کہلائے۔عقائد واصول ان تمام گروہوں کے بجز خفیف اختلاف کے یکساں رہے۔لیکن سیاسی ضرورتوں سے انھوں نے بھی کثرت سے حدیثیں بنالیں،جن پر شیعہ اثناعشری کا نہ عمل ہے نہ ان پر اعتبار ہے۔ان روایات سے بچنے کے لئے انھوں نے روایت کی جانچ کے طریقہ میں یہ قرار دیا:

۱۔ وہ روایت ایسے راوی سے نہ لیں گے جو شیعہ اثناعشری نہیں۔

۲۔ بجز بارہ اماموں کے کسی دوسرے سلسلہ سے روایت نہ ہو۔

۳۔ ہر روایت قرآن مجید کی کسی آیت سے مخالف نہ ہونے پائے۔

۴۔ اصول عقائد اثناعشری کے خلاف نہ ہو۔

اوراس جانچ کے لئے شیعوں نے نہایت احتیاط سے روایت کی جانچ کے لئے فن رجال

کی تدوین کی اور احادیث کی جانچ کے لئے فن درایت الحدیث اور اصول فقہ کی تدوین کی۔

شیعوں کا ایک گروہ یہ خیال کرتے ہوئے کہ منافقین مسلمین سے مل کر اپنی جان بچائیں اور داخلی طور پر فضائل اہلبیتؑ رسولؐ کی نشر و اشاعت کر کے دشمنی وعداوت آل رسولؐ کا خاتمہ کردیں ان لوگوں نے فروع میں مسلم منافقین کا کھُلم کھُلا ساتھ دیا۔ خلفائے ثلٰثہ (ابوبکر، عمر، عثمان) کی خلافت ظاہری کو بھی مان لیا۔ ان کے عیوب و مطاعن کے ذکر سے بھی پرہیز کیا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے جو ایمان کی خدمت کی وہ یہ تھی کہ دشمنان آل رسولؐ کو کافر کہنا شروع کیا، اور نجات و بخشش کو منحصر کردیا علیؑ و آل علیؑ میں۔ اور فضائل اہلبیتؑ کی نشر و اشاعت شروع کردی۔

معتزلی، اور صوفی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شیعوں کے ہر فرقہ سے یہ گروہ زاید کامیاب رہا۔ جان و عزت بھی محفوظ رہی اور ہر قسم کی ترقی بلا مزاحمت کی۔ اس امر میں صوفیوں کو خصوصیت سے امتیاز حاصل رہا۔ لیکن یہ دونوں فرقے شیعوں کے ہر فرقہ سے علیحدہ رہے، اور شیعوں نے بھی ان دونوں فرقوں کو اپنے سے علیحدہ سمجھا اور یہ عام فرق اسلامی میں شامل ہو کر ان کی اکثریت کا باعث ہوگئے اور اب تک اُنھیں میں شامل ہیں۔ اور بعد کے رکھے ہوئے نام اہلسنت والجماعت سے اپنے کو بھی موسوم کرلیا لیکن درحقیقت وہ سنی نہیں ہیں۔ سنی تو وہی ہے جو دشمن آل رسولؐ ہو اور جو محب آل رسولؐ ہے وہ شیعہ ہے۔ لہٰذا صوفی اور معتزلی سیاسی شیعہ فرقے ہیں جو اپنے کو اہلسنت کہتے ہیں، اور شیعہ بھی ان کو سنی ہی سمجھتے ہیں اور یہ انتہائی سیاسی غلطی ہے۔

بیشک ان دونوں فرقوں کے علاوہ دوستی آل رسولؐ کے اور تمام اصول و فروع اہلسنت کے موافق ہیں اور اب وہ اسی گروہ میں شامل ہوسکتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے پھر بھی محبت آل رسولؐ ایک ایسی چیز ہے جس میں اتحاد و اشتراک عمل شیعوں سے کیا جاسکتا ہے۔

(۷)

منافقوں میں فرقہ بندی

رسولؐ خدا نے اپنی زندگی ہی میں فرمایا تھا کہ ''علیؑ میرا وصی ہے۔ جو علیؑ سے لڑا وہ مجھ سے لڑا اور جس نے علیؑ سے صلح رکھی اس نے مجھ سے صلح کی۔ (مناقب اخطب خوارزم، ینابیع المودۃ) ''جو علیؑ سے خلافت کے بارے میں لڑے اسے قتل کر دو کوئی بھی ہو''

(ینابیع المودۃ، ص ۱۴۹)

اور فرمایا تھا کہ ناکثین، مارقین، قاسطین، باغین میرے بعد پیدا ہو کر علیؑ سے لڑیں گے۔ (طبقات ابن سعد، صحیح بخاری، صحیح مسلم)

شیعوں کا مذکورہ حدیثوں کی بنا پر اعتقاد ہے کہ رسولؐ کی وفات ہوتے ہی جو رسولؐ نے اپنی زندگی میں مکرر اصحاب سے علیؑ کی خلافت پر بیعت لی تھی توڑ ڈالی۔ اور بجائے علیؑ کے جناب ابوبکر ان کے بعد عمر ان کے بعد عثمان سے بیعت ہوتی رہی۔ یہ سب ناکثین (علیؑ کی بیعت توڑنے والے) ہیں۔ یہ پورا گروہ اپنے کو مسلمان ہی کہتا رہا۔

باغیین علیؑ کے خلاف جنگ جمل اور جنگ صفین میں لڑنے والے علیؑ کی خلافت ظاہری کے بعد اور بیعت کر لینے کے بعد بغاوت کرنے والے باغین کہے گئے اور خارجی بھی کہے گئے۔

مارقین وہ گروہ جو نہروانیوں کا جنگ صفین سے علیؑ سے جدا ہو گیا، اور نہروان میں لڑا اور مارا گیا اور جس کی ایک فرد نے ۴۰ھ ہجری میں علیؑ کو شہید کیا، وہ ''مارقین'' ہے اور خارجی بھی۔ اس لئے کہ جو بھی امام وقت پر خروج کرے اس کو خارجی کہتے ہیں، خواہ صفینی ہوں خواہ نہروانی، خواہ یزیدی ہوں۔

ناصبی علیؑ وآل علیؑ سے دشمنی رکھنے والے ناصبی کہے جاتے ہیں۔

شیعہ ان تمام فرقوں کو کافر سمجھتے ہیں۔منافقوں کے تمام فرقے دشمنی آل رسولؐ کی وجہ سے ملے جلے ہیں اور مسلمان ہی کہے جاتے ہیں، اور سب اپنے کو اہلسنت والجماعت کہتے ہیں۔اس لئے اب اسلام کے صرف دوفرقے ہو گئے ہیں۔شیعہ اور اہلسنت والجماعت۔

اھلسنت والجماعت ۴۱ رہجری میں معاویہ اور امام حسنؑ سے جب صلح ہوئی تو اس سال کا نام سنت رکھا گیا، اور مسلمان سنی کہلائے، اور جس سال یزید نے امام حسینؑ کو کربلا میں قتل کیا ۶۱ رہجری میں اس سال کا نام جماعت رکھا گیا۔اس لئے یہ فرقہ قتل امام حسین سے اہلسنت والجماعت کہلایا۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی)

غالی وعلی اللّٰھی یہ بالکل علیحدہ فرقہ ہے جس کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ فرقہ عہد امیر المومنینؑ میں پیدا ہوا تھا، جس کا بانی عبداللہ بن سبا ہے۔اس کا اعتقاد تھا کہ علی بن ابی طالبؑ نعوذ باللہ خدا ہیں، اور وہ خود نبی ہے علیؑ کو جب خبر ہوئی عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کو بلا کر سمجھایا آخر میں قید کیا، پھر بھی توبہ نہ کی تو اس کو مع ساتھیوں کے قتل کر کے جلوا دیا۔لیکن یہ گروہ آج تک مختلف بلاد ایمان کرمان شاہ قصر شیریں کے شمال کردستان میں موجود ہے اور خود طہران میں صوفیوں کے بھیس میں ہے۔یہ نصیری اور علی اللّٰہی کہلاتے ہیں شیعہ ان کو کافر سمجھتے ہیں اور یہ گروہ اپنے سوا سب کو کافر سمجھتا ہے۔

(۸)

آلِ رسولؐ پر مظالم کا ذمہ دار شیعوں کے نقطۂ نظر سے

شیعہ تاریخی سندوں سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ علیؑ کی خلافت لینے والے اور دشمنان اہلبیت کی کمک کرنے والے خود جناب ابوبکر وعمر وعثمان تھے، جنھوں نے من حیث القوم اولاد

رسولؐ کو تباہ و برباد کر دیا۔

وہ بنی امیہ جو سخت ترین دشمن بنی ہاشم تھے وہ ابوسفیان جو رسولؐ سے کئی لڑائیاں لڑے جس کی بیوی ''ہندہ'' نے رسولؐ کے چچا حمزہ کا پیٹ چاک کر کے جگر نکال کر چبایا، اور انگلیاں کاٹ کر ہار بنا کر گلے میں پہنا۔ اُسی کے بیٹے یزید کو ابوبکر نے شام کا گورنر مقرر کیا، اور خاندان رسولؐ کے ایسے جانی دشمن کو اس طرح سے شان وشوکت کا مالک بنا دیا۔ خلیفہ عمر نے یزید بن سفیان کی وفات پر اس کے بھائی معاویہ بن سفیان کو شام کا گورنر کر دیا۔

دفعتاً خلیفہ عمر کی وفات پر جناب عثمان کو جو خاندان بنی امیہ کے چشم و چراغ تھے خلیفہ رسول کر دیا۔ ان خلیفہ نے بنی امیہ کی مال و دولت وحکومت کو اتنی قوت دی کہ رسولؐ کے حقیقی رشتہ داروں کے مقابل میں یہ لوگ دعوے دار سلطنت ہو گئے اور خود کو مذہبی سلطنت کا حقدار سمجھنے لگے۔ خلیفہ عثمان کے مرنے کے بعد معاویہ نے علیؑ کے مقابلے میں علم بغاوت بلند کیا اور ستر لڑائیاں صفین میں لڑا۔ یہاں تک نتائج جنگ سے علیؑ کی سجدے میں شہادت واقع ہوئی۔ معاویہ کی خلافت وسلطنت مذہبی تسلیم ہوگئی۔ رسولؐ کے نواسہ امام حسنؑ نے علیؑ کے پڑھائے ہوئے سبق کو دُہرایا، اور معاویہ کی قوت وشوکت سے نہ ٹکرا کر اپنے روحانی مشن کو محفوظ کر لیا۔ اگر جنگ کرتے تو علانیہ شکست ہوتی، اور کسرویت وقیصریت کی محبت کا الزام فرزند رسولؐ پر عاید ہوتا۔ لہٰذا معاویہ سے صلح پر مجبور ہوئے۔ اس وقت بھی دو گروہ تھے۔ ایک پیروان امام حسنؑ یعنی شیعہ دوسرے پیروان معاویہ یعنی سنی۔

باوجود صلح معاویہ نے فرزند رسولؐ امام حسنؑ کو زہر سے شہید کیا، اور ۶۰ ھ/ہجری میں جب معاویہ مرنے لگا تو اپنے بیٹے یزید کو وصیت کی۔ ''اے فرزند میں نے تیرے واسطے بہت سے ملک فتح کئے، بڑے بڑے گردن کشوں کو سرنگوں کیا، لیکن مجھ کو حسینؑ بن علیؑ سے سخت اندیشہ

ہے، کیونکہ وہ تیری کبھی بیعت نہ کریں گے (مقتل ابومخنف، ینابیع المودۃ)۔

یزید بن معاویہ نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنے باپ کی وصیت پر غور سے نظر کی، اور اپنے ناخداترس ماتحتوں کی معرفت امام حسینؑ کو کربلا کے جنگل میں بھوکا پیاسا شہید کر دیا۔

شیعوں کا اعتقاد ہے کہ شہادت امام حسنؑ اور واقعۂ کربلا اور اس کے بعد کے آنے والے مظالم ایک کڑی اس سلسلہ کی ہیں جو خلافت جناب ابوبکر کے وقت سے شروع ہوئی تھی اور تصدیق اس کی تحریری تاریخی شہادتیں ہیں۔

(۱) ایک وہ خط جو معاویہ نے محمد بن ابوبکر کے جواب میں لکھا تھا۔ ''اے محمد جو کچھ تم نے مجھ کو لعنت ملامت دربارہ علیؑ کی ہے، یہ سب اپنے باپ ابوبکر کی درحقیقت عیب جوئی ہے۔ واضح ہو کہ درحقیقت ہم اور تمہارے باپ ابوبکر ایک تھے اس وقت ہم حق علیؑ کو واجب جانتے تھے۔ جب وفات رسولؐ ہوئی اس وقت تمہارے باپ اور عمر پہلے اس گروہ کے ہیں جنھوں نے حق علیؑ کو غصب کیا، اور اتفاق کر کے جبریہ بیعت لینا چاہی۔ جب علیؑ نے انکار کیا تو قتل کے درپے ہوئے۔ آخر مجبوراً علیؑ نے بیعت کی۔ عثمان تک یہی حالت رہی۔ عثمان نے بھی حق علیؑ کا خیال نہ کیا، اور اپنے پچھلے دو خلفاء کی پیروی کی یہاں تک کہ وہ بھی قتل ہوئے۔

پس اصل میں تمہارے باپ نے عنان سلطنت میرے ہاتھ میں دی ہے جو کچھ اچھا یا بُرا میں علیؑ کے ساتھ کر رہا ہوں تمہارے باپ کی پیروی ہے، اور میرا ہر کام اُنھیں کی امداد سے انجام پایا ہے۔ میں نے تمہارے باپ کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ انھیں کے قدم بہ قدم ہوں، پس یا تو اپنے باپ کی عیب جوئی کرو یا سکوت کرو، اور مجھ کو سرزنش نہ کرو۔'' (مروج الذہب مسعودی، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید از کتاب نصر بن مزاحم)

(۲) وہ جواب خط جو یزید بن معاویہ نے دوسرے خلیفہ زادے عبداللہ بن عمر کو لکھا تھا۔

جب امام حسینؑ شہید ہوئے اور عبداللہ نے یزید کو لعنت ملامت کا خط لکھا تو یزید نے جواب دیا ''اے عبداللہ جو کچھ میں نے حق اولادعلیؑ میں کیا یہ پیروی ہے تمہارے پدر نامدار کی سنت کی جس نے جبر وظلم سے حق کو علی واولادعلی ورسولؐ سے چھینا تھا۔ پھر اگر میں نے ظلم کیا تو کیا نئی بات کی جس سے تم مجھ پر اعتراض کرتے ہو''

(تاریخ بلاذری، کتاب ابطال الباطل ابن روزبہان)

(۳) عبداللہ بن عمر بعد شہادت امام حسینؑ یزید کے پاس گئے، اور لعنت ملامت کی۔ یزید عبداللہ بن عمر کو تخلیہ میں لے گیا، اور ایک طولانی خط جناب عمر کا جو معاویہ کے نام آیا تھا نکال کر دکھایا جس میں عمر نے معاویہ کو وصیت لکھی تھی کہ اولاد رسولؐ کو زندہ نہ چھوڑنا۔ یہ خط عبداللہ دیکھ کر واپس آئے۔ (دلائل طبری)

(۴) وہ خط جو ابوبکر خوارزمی نے اہل نیشاپور کو لکھا ہے جو مصر واستنبول میں مکرر علماء کی تقریظوں کے ساتھ چھپا ہے یہ خط نہایت طولانی ہے۔ اس خط میں مظالم تیمیہ، عدویہ، امویہ، عباسیہ کو لکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں ابوبکر کی خلافت نے فاطمہؑ زہراء کو اپنے باپ کی میراث سے محروم کیا۔ اسی کے ان کے اجتماع نے علیؑ کی خلافت چھنوائی۔ وہی اجتماع سبب شہادت امام حسنؑ ہوا۔ وہی سقیفہ امام حسینؑ کا مع اعوان وانصار کربلا میں شہادت کا باعث ہوا۔

(۵) علماء ومحدثین وائمہ اہلسنت کے مجمع میں خلیفہ مامون رشید کا مناظرہ ہے۔ علیؑ کے حقدار خلافت ہونے کے بارے میں اور خلفاء کی ناحق کوشی میں۔

(کتاب الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ کاتب دینوری)

(۶) معاویہ بن یزید بن معاویہ کا خطبہ شاہی تخت خلافت پر بیٹھ کر اور مظالم وغدر امویہ کا

تذکرہ کرنا اور تخت خلافت سے دست برداری۔

(صواعق محرقہ،خمیس دیار بکری، حیوۃ الحیوان دمیری)

(۷) خلیفہ عبدالعزیز کا اعلان در بارہ خلافت علیؑ وآل علیؑ۔

یہ سب وہ واقعات ہیں جو محققین اہلسنت اور ائمہ اہل حدیث نے لکھے ہیں۔اس لئے شیعہ محض انھیں تاریخوں کے حوالے سے تباہی خاندان رسالت کا اصلی سبب سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع کو قرار دیتے ہیں۔آیندہ حالات خلفاء کے اجمالی ذکر میں ہم مستند تاریخوں سے بتائیں گے کہ محققین اہلسنت کے در بارہ آل رسولؐ کیا عقاید تھے اور پیروان خلفاء کا آل رسولؐ کے متعلق کیا اعتقاد تھا۔

(۹)

مسلمین منافقین کا اعتقاد آل رسولؐ کی نسبت

(۱) امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ علیؑ نے سترہ باتوں میں خطا کی جو مخالف قرآن مجید تھیں۔

(درر کامنہ ابن حجر)

(۲) کوئی شخص بغض علیؑ کے بغیر مومن نہیں ہوسکتا اگر چہ تھوڑا سا ہی ہو۔(مسند احمد بن حنبل)

(۳) جب تک عبداللہ بن مسعود تصدیق نہ کرتے علیؑ کی ہر روایت نامقبول ہوتی۔(صحیح مسلم)

(۴) علی بن جہم شاعر علیؑ کی مذمت کرتا ہے اور اپنے باپ پر خفا ہوتا ہے کہ اس نے اس کا نام علیؑ کے نام پر کیوں رکھا۔ (وفیات الاعیان ابن خلکان)

(۵) امام حسینؑ خارجی تھے، جنھوں نے امام مفترض الاطاعۃ یزید پر خروج کیا جس سے ان کا قتل واجب ہوگیا تھا۔ (رسالہ منع لعن یزید عبدالمغیث بغدادی)

(۶) یزید پر رحم کرنا مستحب ہے اور بعد ہر نماز اس کے لئے دعائے مغفرت لازم ہے، کیونکہ

وہ مومن ہے۔ (احیاء العلوم غزالی)

(۷) حسینؑ اپنے نانا کی تلوار سے قتل ہوئے۔ (یعنی حکم شرع کی رو سے) صواعق محرقہ ابن حجر

(۸) امام ابوحنیفہ نے بہت سے مسائل میں ائمہ سے اختلاف فرمایا ہے۔

(تحفہ شاہ عبدالعزیز)

(۹) عہد شیخین کے برکات ربانی عہد علیؑ میں سلب و منقطع ہو گئے تھے۔ مذاہب اہلسنت میں علیؑ کی کوئی حدیث صحیح نہیں ہے، نہ کوئی مسئلہ اصول سے مستخرج ہوا ہے۔ ابو ہریرہ سے پانچ ہزار حدیثیں نقل ہوئی ہیں اور علیؑ سے صرف پانچ سو وہ بھی غیر منظم و مختل۔ مسئلہ تصوف میں بھی علیؑ پیشوا نہ تھے۔ حسن بصری کا خرقہ درویشی لینا بالکل غلط ہے، جملہ مسائل اصول شیخین سے ہیں۔ پہلے جس نے کلیہ مذہب اصول کا قائم کیا وہ امام شافعی ہیں۔ (ازالۃ الخفا شاہ ولی اللہ)

(۱۰) علیؑ کے ہاتھوں کوئی جنگ فتح نہیں ہوئی۔ فنون شرعیہ میں سے کسی فن میں اعتماد کلی اقوال وآثار مرتضوی پر ظاہر نہیں ہوتا۔ علیؑ مرتضیٰ مسائل فقہیہ میں غلطی کیا کرتے تھے۔

(قرۃ العین شاہ ولی اللہ)

(۱۱) اہلسنت جن دشمنان اہلبیت کو دوست رکھتے ہیں بحیثیت دشمنی اہلبیت دوست نہیں رکھتے جس سے معذوری درپیش ہو۔ (تحفہ شاہ عبدالعزیز)

(۱۲) امام زین العابدینؑ بت پرست تھے۔ (اعلام الناس محمد امین بھوپالی)

(۱۳) امام محمد باقرؑ کاذب تھے۔ (دراسات اللبیب)

(۱۴) امام جعفر صادقؑ کی باتیں معتبر نہ تھیں۔ (میزان الاعتدال، ج ۱)

(۱۵) اسلام کی گمراہی کا سبب صرف آل محمدؐ ہیں۔ فنون شرعیہ میں سے علیؑ کسی فن میں کامل نہ تھے۔ (قرۃ العین محدث دہلوی)

یہ چند اقوال اکابر علمائے اہلسنت کے لکھے گئے ہیں جس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اہلبیت رسولؐ کی نسبت ان کا کیا عقیدہ ہے اور بنیاد مذہب مسلمین منافقین کا اساس دشمنی آل رسولؐ ہے۔

شیعہ علاوہ سیکڑوں حدیثوں اور قرآنی صریح آیتوں کے سب علماء مذکورین کے مقابل میں آیت مودت کو پیش کرتے ہیں ''قُلْ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی'' خدائی حکم ہے کہ رسولؐ تمام امت سے محبت کو اپنی قرابت داروں کے رسالت کا اجر قرار دے کر ''مانگ لیں''۔

مذکورہ تمام عقائد اس صریح حکم کی بنا پر قرآن کی تکذیب، خدا کی نافرمانی، رسولؐ خدا کی رسالت سے انکار ہونے کی وجہ سے کفر ہے، اور اسلام سے بالکل بے تعلق ہے۔ کیا خدا ان قرابتداران رسولؐ کی محبت فرض قرار دے سکتا ہے جو نعوذ باللہ امور شرعیہ میں خطا کریں، جو نعوذ باللہ خارجی ہوں، فنون شرعیہ میں بے اعتبار و جاہل ہوں۔ کاذب، اور سبب گمراہی مخلوق ہوں یا نعوذ باللہ خدا خود گمراہ ہے جو ایسوں کی محبت فرض قرار دیتا ہے۔ اور یا یہ لوگ گمراہ ہیں جو ایسے عقائد رکھتے ہیں۔ آئندہ حالات خلفاء اہلسنت و حالات ائمہ شیعہ میں معلوم ہوگا کہ ہر دو فریق کے رہبر کس اصول و عقائد کے مبلغ تھے اور ہر ایک کے پیرو کس اصول و اعتقاد کے پرستار تھے۔

(۱۰)
تمدّن شیعہ

ہر تمدن کی اساس اور سنگ بنیاد چار چیزیں ہوتی ہیں: عقائد و ایمانیات، عبادات و ریاضات، مالیات، اخلاقیات۔

جس تمدن کا ایک رکن بھی کمزور و ناقص ہو بے شک وہ تمدن پست اور عمرانیات،

وحیاتیات میں اس تمدن کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور جس تمدن کے ہر چار ارکان ہر طرح سے مضبوط ومحکم ہوں سمجھ لو وہ تمدن تمام تمدنوں سے فائق وافضل ہے۔

ہر تمدن میں چاروں ارکان میں صرف ایک بات کی تلاش لازم ہے۔ اگر خصوصیت سے وہ ہر چہار رکنوں میں موجود ہو تو سمجھ لو کہ وہ تمدن بیشک تمام تمدنوں سے افضل واعلیٰ ہے اور وہ بات انسانی وحدت اور اطمینان وتسلی وامن وسکون ہے۔ حیاتیات وسوشیالوجی کی اساس بس یہی ایک چیز ہے اور تمام قوانین وضوابط عالم ہمیشہ اسی لئے بنے اور ہمیشہ اسی لئے بنائے جائیں گے۔ شیعہ تمدن کے ہر چہار ارکان میں صرف یہی ایک چیز ہے یعنی اطمینان کامل، سکون وتسلّی وامن وامان اور وحدت انسانی۔ اب اجمالاً ہر ایک رکن کو شیعہ مذہب کے ہم بیان کرتے ہیں۔

(۱۱)

ایمانیات واعتقادات

عقائد میں اساس شیعوں کا توحید ہے۔ یعنی تمام خداؤں کی نفی کر کے ایک خدا پر ایمان لانا، اور تمام دنیا کو ایک خدا کا پرستار بنا دینا، اور وحدت انسانی پیدا کر کے تمام مناقشات واختلافات کو مٹا دینا ہے۔ خدا ایک ہے اس کا کوئی ساتھی سنگی نہیں، نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، نہ اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی شئے کا جز ہوسکتا ہے، نہ اس کا کوئی جز بن سکتا ہے۔ نہ وہ کسی شے سے مشابہ ہے نہ کوئی اس کے مشابہ ہے۔ نہ وہ جسم ہے نہ جسم والی چیز ہے۔ نہ اس کا کوئی رنگ روپ ہے۔ ہر شئے اس کی مخلوق ہے، اور خدا کی محتاج ہے۔ نہ خدا کسی شئے سے بنا ہے نہ کسی کا محتاج ہے۔ وہ محیط کل ہے، ہر جگہ ہے، اور ہر جگہ اس سے خالی ہے یعنی اس کا گھر نہیں ہے۔ ہر شئے کا بغیر فکر وغور کئے خالق ہے۔ صرف اس کا ارادہ ہر شے کے پیدا کرنے اور مٹا دینے کو کافی ہے۔ وہ دیکھنے والی چیز نہیں ہے۔ کوئی آنکھ اس کو نہیں دیکھ سکتی، صرف عقل سے پہچانا جاتا ہے کوئی شئے

خدا میں نہیں سما سکتی نہ وہ کسی شئے میں سما سکتا ہے۔ اس کی بزرگی و کبریائی کے لئے عالم کوتاہ ہے۔ وہ حکمت والا ہے، کوئی کام بے کار وفضول نہیں کرتا، نہ کوئی کام کر کے پچھتاتا ہے۔ اس کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ وہ ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا، لازوال ہے، کوئی شئے اس سے پہلے نہ تھی نہ اس کے بعد رہ سکتی ہے، اس لئے کہ خدا تو ہمیشہ رہنے والا ہے۔ وہ بھول چوک، جہالت وغفلت سے برتر ہے۔ وہ عالم کے ذرّے ذرّے کو پہلے سے جانتا ہے، دیکھتا اور سنتا ہے۔ بغیر آنکھ وکان کے۔ وہ قدرت والا ہے، اختیار والا ہے، جو چاہے کرے، اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔

یہ توحید وحدت انسانی کا پُرزور آلہ ہے۔ ایک خدا کی جملہ مخلوق پرستار بن کر وحدت کا رنگ چڑھا دیتی ہے۔ تفوق وتعلّٰی مٹا کر ایک رشتہ میں منسلک کر کے، محبت والفت پیدا کر کے امن وامان کا پیغام سناتی ہے۔

(۱۲)
عدل

خدا بدی نہیں کرتا، نہ کسی کی بدی کو پسند کرتا ہے۔ وہ عادل ہے ظلم نہیں کرتا ہے، وہ رحیم وکریم، مہربان محبت والا ہے۔ نیکی کا طلبگار ہے، ہر شے کا سہارا ہے، مظلوموں کا مددگار ہے ظالموں کا سزا دینے والا ہے، بدکار اور شریروں سے نفرت کرنے والا ہے، اور مجرموں کو سزا دینے والا ہے۔ انسانی کمزوریوں سے درگذر کرنے والا ہے۔ شرمندہ اور تائب بندوں کو بخشنے والا ہے۔ خدا ماں باپ سے زائد مہربان ہے بندوں کو بیکاری وسستی میں پڑا نہیں رکھنا چاہتا۔ خدا نے انسان کو دنیا میں ہر قسم کی جدوجہد کے لئے پیدا کیا ہے۔ وہ ہر شخص کو اس کی محنت کی مرنے کے بعد پوری مزدوری دے گا۔

اس عدالت کا تعلق عام انسانوں سے ہے۔ کسی نسل وقوم سے تعلق نہیں ہے، اور عدالت

الٰہیہ سے خوفزدہ انسان کو مطمئن کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ انسان کو الٰہی عدالت کا مظہر قرار دے کر انسانی حیات کے ہر شعبہ کو عدالت کا ماتحت کر دیا ہے۔ شیعہ مذہب خصوصیت سے عدالت کی زندگی پر مجبور ہے، وہ جنت نہ پائے گا، وہ بغیر عدالت نماز نہیں پڑھا سکتا، بغیر عدالت قاضی نہیں بن سکتا، بغیر عدالت گواہ نہیں بن سکتا۔ شیعہ مذہب کی عدالت کی زندگی کو اقوام عالم کے لئے اطمینان وسکون وامن کا پیغام دیا ہے۔

(۱۳)

قیامت

مرنے کے بعد ایک وقت ضرور آنے والا ہے جس میں تمام مردے زندہ ہوں گے۔ کسی قوم وقبیلہ، کسی مذہب کے ہوں، کبھی مرے ہوں۔ ہر ایک اپنی نیک اعمالی کی وجہ سے جنت میں جائے گا، اور شریر وبدکار کو جہنم میں ڈالا جائے گا اس روز وحدت انسانی کا کامل مظاہرہ ہو کر ہر انسان کو اس کے نیک اعمال کا صلہ ملے گا یہ تسلی واطمینان دائمی کا مکمل پیغام ہے، اور نیک وبد کو علیحدہ کر کے پُرسکون حیات جاودانی کا مالک بنایا گیا ہے۔

(۱۴)

ایمان بالانبیاء

کل رسولوں پر ایمان، اس کا ماحصل بھی وہی سکون واطمینان ہے، اور وحدت انسانی وصلح کل ہے۔ تمام انبیاء کے پرستاروں سے اتحاد میل جول پیدا کرنا ہے۔

چاند ہو یا سورج، ہوا، پانی، نباتات، جمادات، حیوانات غرض کہ ہر مخلوق جو بھی زمین وآسمان کے درمیان ہے سب کو خدا نے انسان کے مصرف کے لئے پیدا کیا ہے۔ (وَسَخَّرَ لَکُمْ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض) اور انسان کو تمام مخلوقات میں اشرف قرار دیا ہے۔ اس لئے

عالم کی کوئی شئے اس قابل نہیں ہے کہ انسان اس کی طرف جھکے یا اس شئے کو اپنے اوپر خدا کے درمیان ذریعہ نجات قرار دے۔ بلکہ تمام مخلوقات کو خدا نے انسان کی طرف جھکا یا ہے جن میں سے کوئی اس قابل نہیں ہے کہ ذریعہ نجات بنے، اس لئے کہ بجز انسان کسی شئے میں روح عمل نہیں، اور اسلام کا دارومدار روح عمل پر ہے۔ عام انسانوں میں خدا نے انبیاء ومرسلینؑ کو بلند ورفیع قرار دے کر ان کو اپنے اور عام مخلوق کے درمیان واسطہ وذریعہ نجات قرار دیا ہے، نہ بطور انسان پرستی کے بلکہ اس صورت سے کہ گروہ انبیاء اپنی کمال طاعت اور کمال روحانیت کی وجہ سے خدائی وحی والہام کے ذریعہ دین ودنیا کے علوم پر حاوی تھے جن کے ذریعہ سے خدائی مرضی اوران علوم کو عام انسانوں کی طرف پہنچا دیتے تھے، اوران کی اطاعت اور فرمانبرداری سے عام مخلوق خدائی فرمانبرداری حاصل کرتی تھی اوراسی لئے یہ گروہ وسیلہ وذریعہ نجات سے خالق ومخلوق کے مابین ہے اس لئے ان کی اطاعت خدا کی اطاعت، ان کی عزت وتعظیم وتوقیر خدا کا نمائندہ اور خلیفۃ اللہ ہونے کی وجہ سے ہر انسان پر فرض ہے، نہ بطور پرستش وعبادت اس لئے کہ گروہ انبیاء خود خدا کی طاعت وعبادت کرتے اور دنیاوی ہر کام کو خدا ہی کی مرضی اوراس کی لاشریک ویکتا ہستی کی خوشنودی کے لئے بجالائے تھے اور بھولے چوکے بھی خدا کی نافرمانی نہ کرتے تھے۔ وہ معصوم ذاتیں ہیں اس لئے کہ ہر وقت خدا ان کے ساتھ ہے اور خدا ان کا معلم ہے۔ وہ خطا ونسیان حکم الٰہی میں کب کرسکتے ہیں۔ دین ودنیا شیعہ اعتقاد میں ایک ہی شئے ہے اور جدا نہیں ہے، لہٰذا انبیاء کی دین ودنیا سب برابر ہے ایسے بندے اپنے اعمال وافعال سے اور خدائی وحیوں اور الہام سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ خود اپنے نبی مرسل ہونے کے مدعی ہوتے ہیں، اور اقرار کرتے ہیں کہ ان پر وحی آتی ہے، اوراپنی شناخت کے لئے معجزات پیش کرتے ہیں یعنی وحیوں کو خدا کی مخلوق کے سامنے عملی پریکٹس کے طور پر اس طرح پیش کرتے

ہیں کہ جس سے عقلیں حیران ہوجاتی ہیں اور معجزے، کرتب وشعبدہ وسحر وفلسفی وحکمی وقیاسی وتجربی کرتبوں سے ممتاز وبالاتر ہوتے ہیں، اس لئے کہ معجزہ تو محض قوت روحانی وعلم الٰہی کے زیر اثر واقع ہوتا ہے۔ وہ دین ودنیا کے علوم جو وحی کے ذریعہ نبی کو ملتے ہیں انھیں کے مجموعوں کا نام کتاب الٰہی ہے۔ جیسے توریت جو حضرت موسیٰ نبی کو ملی، زبور حضرت داوٗدؑ کو، انجیل حضرت عیسیٰؑ نبی کو، قرآن حضرت محمد مصطفی نبیؐ کو۔ یہ آسمانی کتابیں وحی والہام کے ذریعہ آئیں اور سب قابل بزرگی واحترام ہیں۔ خدا کے سب نبی برابر ہیں، کسی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بغیر سب نبیوں کے اقرار ان کی کتابوں کے احترام واقرار کے کوئی شخص مومن نہیں کہا جاسکتا۔ اسلام بس کل نبیوں اور ان کی کتابوں کے اقرار واعتقاد کا نام ہے۔

(۱۵)

نبی آخرالزّماں اور قرآن

جس وقت قومیں اپنی طبع زاد باتوں کو شریعت میں داخل کردیں، کفروالحاد اختیار کریں۔ کتاب خدا کو بگاڑ دیں، اس کو اپنی طرف سے کم وزائد کردیں، روحانیت کو چھوڑ کر صرف مادیت کے پرستار بن جائیں، کتاب الٰہی دنیا میں اصل حالت میں موجود نہ رہے، اس وقت خدا نبی ورسولؐ کو بھیجتا ہے، تاکہ وہ نبی خدا کی طرف قوم کو بلائے، اور کتاب خدا پیش کرے۔

اسی لئے موسیٰؑ نبی توریت لے کر آئے، اور ایسے ہی وقت پر داوٗد نبیؑ زبور لے کر آئے، اور ایسے ہی وقت پر عیسیٰؑ نبی انجیل لے کر آئے، اور ایسے ہی وقت پر محمدؐ نبی قرآن لے کر آئے، جو تیرہ سو سال سے بے کمی وزیادتی موجود ہے، اور قرآنی دعوے کے مطابق خدا اس کا قیامت تک کے لئے حافظ ہے یہی اس کا معجزہ ہے۔ اس لئے محمد رسول اللہ خاتم النبیینؐ ہیں نہ اب کسی نبی کے آنے کی ضرورت ہے، نہ کسی الٰہی کتاب کے آنے کی ضرورت ہے۔

دنیا سب گمراہ ہوجائے۔ جب تک قرآن مجید عالم میں موجود ہے کسی نبی کی ضرورت نہ ہوگی۔ نہ ظلی نہ بروزی وہ قرآن سے علیحدہ کون سی نئی بات بتادے گا۔

نبی کی شناخت یہ ہے کہ ''خدا نے بنی آدم پر اگر رسول (کبھی) بھیجے اُنھیں میں سے تو وہ خدائی نشانیوں کو قوموں پر پیش کریں گے، جو پرہیزگار بنے گا اور اپنی اصلاح کرلے گا، ان کے لئے نہ خوف ہوگا نہ غم، اور جنھوں نے خدائی نشانیوں کو جھٹلایا، اور تکبر کیا، وہ لوگ جہنم والے ہیں اور ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ (سورۂ اعراف)

خدائی نشانی لانے کے لئے ضرورت رسول کی ہوتی ہے رسول خدائی نشان قرآن لا چکا اور وہ موجود ہے۔ پھر رسول جدید آنے کی ضرورت کیا ہے۔ خود خدا اسی آیت کے ذریعہ سلسلۂ نبوت کو ختم کرتا ہے۔ جب تک قرآن کا دنیا میں وجود ہے اس وقت تک کے لئے نہ نبی آئے گا نہ کوئی کتاب آئے گی۔

حضرت عیسیٰؑ کے بعد دنیا ظلم وتشدد، جبر واستبداد وجہالت وضلالت پر اُتر آئی تھی۔ کشت وکشتار، خوں ریزی جنگ وجدال سے عالم کا امن وامان معدوم تھا، بداعمالی وبداخلاقی، جرائم وفسق وفجور کا دور دورہ تھا، خدائی نشانی جو جناب مسیح لے کر آئے تھے، انجیل تھی، جس کو وہ خود پیش کرتے تھے، اس کو تلف کرکے چار حواریوں کے نام سے چار انجیلیں پیش ہوئیں، اور ان میں بھی تحریفیں ہوتی رہیں۔ اگر اصلی انجیل موجود ہوتی تو پھر بعثت نبی آخر الزماں کی ضرورت نہ ہوتی۔ اصلی کتاب اللہ نہ رہی، اس لئے ایک نبی اور نئی کتاب کی ضرورت ہوئی۔

محمد مصطفیٰؐ قرآن مجید لے کر تشریف لائے، اور اصل ہادی قرآن مجید موجود ہے، اور جب تک دنیا کے پردے پر قرآن رہے گا، کوئی نبی نہ آئے گا۔ آنے والے کل انبیا ملکی فتوحات قیصریت وکسراویت کے پرچار کے لئے نہ آئے تھے بلکہ خالص روحانیت واخلاق کے لئے۔

اب خواہ نخواہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی عربیؐ اس ظلمت کدہ میں فتنہ وفساد کی تائید کے لئے آئے تھے؟ قرآن مجید امن سوزی اور جنگجوئی کے لئے آیا تھا یا صلح وآشتی، رفع فساد، قیام امن وامان کی غرض سے۔ انجیل متی کا تسلی دینے والا بعد مسیح تو وہی ہوسکتا ہے جو دنیا میں امن وامان قائم کرے۔ تسلی واطمینان ووحدت انسانی کا باعث ہو۔ رسولی زندگی کو دیکھو قرآنی آئین کو غور سے پڑھو، جو کام سب نبیوں کا تھا وہی تو رسول کا تھا۔

لیکن رسولؐ کی وفات کے بعد نام نہاد اسلام نے وہی تو کیا جو دنیا میں رسولؐ کے بیشتر صدیوں سے اودھم مچا ہوا تھا جس کا نتیجہ ہوا کہ مورخین ومحققین مسیحی نے فیصلہ کرلیا کہ اسلام تلوار کا مذہب ہے۔ اسلام تشدد وظلم کا مذہب ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے غلط رویہ سے یہ رائے قائم کرلی۔ لیکن قرآن جو نبیؐ کی اصلی کتاب ہے اس کو غور سے نہ دیکھا۔ سیرت رسولؐ کو نہ دیکھا۔ ''مسٹر متھو آرنالڈ'' نے ''کاونٹ گوبنیو'' کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اسلام رحم وہمدردی کا مذہب نہیں ہے۔ کوئی شخص اس کا ادعا نہیں کرسکتا کہ اسلام کے محاسن میں نرم دلی، بردباری، قربانی بھی داخل ہیں۔ اسلام جس قدر آگے بڑھتا گیا، اس کی تنگ خیالی پر مبنی جو نقائص تھے وہ روز بروز زاید واضح ہوتے گئے، اس کی خوفناک ہیبتنا کی اور عسکریت میں برابر اضافہ ہوتا گیا اور اس کی نرم مزاجی میں کمی ہوتی گئی۔

بیشک رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی قیصریت وکسراویت نے اسلام حقیقی کو مسخ کردیا۔ بدقسمتی سے رسولؐ کے بعد جن ہاتھوں سے اسلام کے نام سے اسلام کو شہرت ہوئی، ان کا خاکہ تو وہی ہے جو محققین یورپ کے پیش نظر ہے۔ اسلام کا حقیقی حافظ ونگہبان تو وہی تھا۔ جو خلافت سے محروم گوشہ نشین تھا، اور نہایت خاموشی سے رسولی مشن چلا رہا تھا۔ یعنی علیؑ واولاد علیؑ۔ ہم آئندہ دکھائیں گے کہ امن وتسلی واطمینان ووحدت انسانی کے یہ دیوتا کس طرح سے ظلم وتشدد

ومصائب کی چتا پر قربان ہو گئے۔سلف سے کسی مذہب اور قوم نے اتنی قربانیاں نہیں پیش کیں جو علیؑ وخاندان علیؑ نے پیش کیں۔اور اس وقت عالم خود دیکھ لے گا کہ اسلام کا ہیرو درحقیقت کون تھا؟ اور سچا اسلام کیا تھا؟

(۱۶)

فرائض نبوت

تمام انبیاءؑ ہمیشہ قوموں کے انتہائی تنزل وپستی اخلاق کے وقت آئے۔ اخلاقی بداعمالیوں، روحانی گندگیوں کے مٹانے کی غرض سے، نہ کہ ملک گیری وفتوحات کے لئے۔ ہمارے رسولؐ کی ضرورت بھی یہی تھی۔قرآن مجید میں ہے،''وہ خدا ہی تو ہے جس نے ان پڑھ عربوں میں انھیں میں سے ایک رسول بھیجا تا کہ لوگوں کو خدا کی نشانیاں دکھائے اور ان کو پاک کرے،اور قرآن وحکمت کی تعلیم دے۔''(سورۂ جمعہ)اور خود رسولؐ نے فرمایا:''میری بعثت کی غرض مکارم اخلاق کی تعلیم وتکمیل ہے۔'' (حدیث)

نتیجہ صاف واضح ہے کہ رسولؐ نہ سرمایہ داری کے لئے آئے تھے، نہ شمشیر زنی اور فتوحات کے لئے، نہ سلطنت وبادشاہی کے لئے، بلکہ ان کا فرض صرف تبلیغ رسالت تھا اور امت کا فرض اطاعت وفرمانبرداری تھا۔اس کے سوا کچھ نہ تھا۔جیسا کہ قرآن میں بہ تصریح موجود ہے''رسولؐ کے ذمہ تو صرف کھلی ہوئی تبلیغ ورسالت ہے۔'' (سورۂ عنکبوت)

اور امت کے لئے خدائی فرمان ہے''اے رسولؐ امت سے کہہ دو اللہ ورسولؐ کی اطاعت کرو،اگر ایسا نہ کیا تو جو ذمہ داری رسولؐ کے اوپر ہے اس کے جواب دہ وہ خود ہیں،اور جو تم پر ہے اس کے جواب دہ تم ہو۔'' (سورۂ نور)

معلوم ہوا ہے کہ نبی محض پیغامبر خدا کا ہے۔رسالہ کے تو معنی بھی یہی ہیں، وہ ایک مبلغ

ہوتا ہے، اس کو جبر وتشدد، جنگ وجدل کا اختیار بھی نہیں۔ جنگجوئی وغارتگری نہ رسولؐ کا کام ہے، نہ اس کے حقیقی جانشینوں کا رسولؐ کی کون سی جنگ ایسی تھی جو دفاعی نہ ہو، امت بھی آزادوخود مختار ہے، چاہے تبلیغ رسولؐ قبول کرے چاہے گمراہ رہے کوئی جبر وتشدد نہیں ہے قرآنی احکام کو دیکھو۔

۱۔ دین میں کسی قسم کا جبر واکراہ نہیں ہے۔ (سورۂ بقرہ)

۲۔ اے رسول تم کب لوگوں پر جبر کر سکتے ہو، یہاں تک کہ وہ ایمان لا دیں؟ (سورۂ یونس)

۳۔ کہد واے رسولؐ حق بات اللہ کی طرف ہے جو چاہے مانے جو چاہے انکار کرے (سورہ کہف)

معلوم ہوا کہ دین کے بارے میں جو جبر وظلم کرے وہ بھی گناہگار اور مخالف حکم خدا ہے اور جو جبر یہ ایمان لائے وہ بھی درحقیقت مومن نہیں ہے۔ خوف ودہشت کی وجہ سے جو زبانی کلمہ پڑھے وہ بھی درحقیقت کافر ومنافق ہے۔

رسولؐ توصرف معلم ومربی واستاد تھے، اور ان کی امت متعلم وشاگرد جیسا کہ جابجا قرآن میں ہے (اے رسولؐ) نہ تو ہم نے تم کو (امت کا) محافظ بنایا ہے نہ تم ان پر وکیل ہو (سورۂ انعام) اے رسول آپ لوگوں کو سمجھا دیجئے اس لئے کہ آپ صرف سمجھا دینے والے ہیں۔

(سورۂ غاشیہ)

جب کہ رسولؐ صرف ایک معلم کی حیثیت رکھتا ہے اور امت متعلم وشاگرد کی شان رکھتی ہے تو ظاہر ہے کہ مذہب کو تلوار و جبر وتشدد سے پھیلانے والے نہ خود مسلمان ہیں نہ اسلام کے حقیقی پیرو ہیں۔ اس لئے کہ جو رسولؐ نے نہیں کیا، جس کا خدا نے رسولؐ کو حکم نہیں دیا، امت کو اس کے خلاف کرنے کا کیا حق ہے۔ اسلام تو سکون واطمینان اور عام تسلی اور امن وامان کا نام ہے۔ اس لئے شیعوں کا اعتقاد ہے کہ جو خفیف شئے بھی امن وتسلی کی مزاحم ہو وہ خلاف دین

اسلام ہے، نہ اس کو خدا سے تعلق ہے نہ اسلام سے۔

(۱۷)

ایمان بالامامت

جب یہ ثابت ہوا کہ نبی صرف معلم ومبلغ خدا کی طرف سے ہوتا ہے اورامت متعلم، تو اب دیکھنا یہ ہے کہ معلم اپنے ہٹنے کے بعد تعلیم کو شاگردوں اور متعلموں کے ہاتھ میں دے دے گا جس سے چاہے تعلیم کرو، جس کو چاہے اپنے لئے مبلغ بنالو، خصوص ان علوم میں جو خدا سے پہنچے ہیں نبیؐ کے ذریعہ سے ایسا کب ہوسکتا ہے۔ عالم میں کسی معلم نے اپنی تعلیم کا اختیار شاگردوں اور متعلموں کی مرضی پر نہیں چھوڑا ہے، یہ حق اپنے ہی لئے محفوظ رکھا ہے جس کا انتخاب وہ خود کرے جس کی قابلیت واہلیت کو وہ خود جانچ لے، اسی کو اپنے ہٹنے پر تعلیم وتدریس وتبلیغ سپرد کی جاتی ہے۔ یہی تو انبیاءؑ نے کیا۔ کار تعلیم وتبلیغ ہر نبی نے اپنے بعد کے لئے امت پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ خود وصی وجانشین وقائم مقام بنایا ہے۔ دنیا کے کالج، یونیورسٹیاں اسی اصول پر چلتی ہیں کہ ایک پروفیسر ایک ٹیچر کے ہٹنے پر انتخاب متعلمین پر نہیں چھوڑا جاتا ہے بلکہ محکمۂ تعلیم کے اعلیٰ منتظمین اس کا انتظام کرتے ہیں، یا پروفیسر خود اپنا قائم مقام پیش کرتا ہے، اوروہ وہی شخص ہوتا ہے جو ریٹائر پروفیسر ومعلم کی قابلیت کے مساوی ہو۔

رسولؐ کے بعد کے لئے حق انتخاب ان سے چھین لینا یا اس محکمۂ تعلیم کے افسر (خدا) سے رسول کی قائم مقامی کا حق چھین لینا ایک ایسا منطقی اصول ہے جو سمجھ سے باہر ہے۔

خود رسولؐ نے زندگی میں ہر موقع پر علیؑ ہی کو قائم مقام کیا۔ جنگ تبوک میں خود گئے، علیؑ کو بجائے اپنے حاکم کر گئے۔ ابوبکر کو سورۂ برأت لے کر مکہ بھیجا، پھر معزول کر کے علیؑ سے تبلیغ

کرائی، یمن میں خالد بن ولید کو بھیج کر واپس بلایا، اور علیؑ کو اس مہم پر بھیجا۔

خود رسولؐ نے اپنے ظاہری تعلقات مکہ سے قطع کر کے ابوبکر کو بھی ساتھ لیا، اوران کے تعلقات کو بھی قطع کرا دیا لیکن علیؑ کو شب ہجرت مکہ کا سردار بنا کر اپنی جگہ چھوڑا۔ اپنی وفات کے قریب تمام اصحاب کو اسامہ کی ماتحتی میں مدینہ سے نکالنا چاہا، اور زندگی ہی میں اپنی نافرمانی کرنے کا اس طرح سے اعلان کیا، اور علیؑ کو آخر وقت بھی جدا نہ کیا علیؑ کو زندگی میں قاضی امت بنایا۔

باب مدینہ علم وحکمت مقرر کیا، مذکورہ کھلے ہوئے واقعات وحالات میں علیؑ کے سوا کسی دوسرے کو خلیفہ رسول بنا دینا شیعوں کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اسی طرح یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ جب رسالت کی شان معلوم ہوگئی کہ وہ ایک مبلغ اور معلم الٰہی ہے تو اس کو مادیت، عسکریت، سرمایہ داری، ملک گیری، قیصریت وکسرویت سے کوئی لگاؤ نہیں ہوسکتا۔ وہ تو خالص روحانیت واخلاق وتہذیب کا معلم ومدرس ہے۔ اس کے وہی شاگرد ہوں گے جو کہ فتوحات وملک گیری وبدامنی وفساد سے دور رہیں۔ تہذیب واخلاق وروحانیت میں اپنے معلم واستاد کے نمونے ہوں۔

مثالاً ایک ریاضی کے طالب علم کو ریاضی کے سوالات کے حل کے لئے تیار رہنا چاہئے، یہ کب صحیح ہے کہ ریاضی کے سوالات کے جواب میں وہ فوجی قابلیت وعسکریت کی نمائش کرنا شروع کردے۔ نبوت روحانی منصب ہے، مادی وعسکری نہیں ہے۔ اسی لئے شیعہ مذہب نبوت ورسالت کے بعد امامت کو رکن دین سمجھتے ہیں، اور اماموں کو روحانیت وتہذیب واخلاق اور علوم الٰہی کا معلم ومبلغ ومدرس سمجھتے ہیں اور تمام عقائد کو قرآن وحدیث رسول وائمہ سے اخذ کرتے ہیں، اور کسی کی ملک گیری فتوحات وسرمایہ داری وقیصریت وکسرویت کو معیار خلافت نہیں قرار دیتے بلکہ منافی اور مخالف منصب خلافت شیعوں کو انھیں اماموں کی سیرت وتعلیم میں

تہذیب واخلاق وروحانیت کے سبق ملتے ہیں، اور دوسری جگہ عسکریت وقیصریت ومادیت کے جس کی شیعہ مذہب میں قطعی گنجائش نہیں ہے۔ ائمہ روحانیت میں نبیوں کے برابر ہیں۔ وارث علوم انبیاء ہیں۔ اور بعد رسول اشرف خلائق ہیں اور شریعت رسولؐ کے حافظ ومبلغ ہیں، ان کی سیرت، ان کے اعمال، ان کی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے۔ وہ مظہر ذات نبوی ہوتے ہیں، اور مثل نبی ہر بھول چوک سے معصوم ہوتے ہیں، ان کی تمام تعلیم رسول سے ہوتی ہے۔ وہ اسرار الٰہیہ سے خبردار ہوتے ہیں۔ ان کی تائید بوقت ضرورت الہام سے ہوتی ہے۔ معجزات وکرامات اور علم ان کا انبیاء کے مانند ہوتا ہے۔

تاریخوں کو دیکھو، مختلف حکماء وفلاسفہ اکثر مذاہب کے آئے اور سوالات کئے اور آنحضرت سے تسلی بخش جواب لئے ائمہ ہدیٰ کے تقدس ذاتی اور زہد اور علمی فوق العادت طاقت سے بنی امیہ وبنی عباس نے آنحضرتؐ کو ساحر مشہور کیا، جس طرح سے رسولؐ خدا کو کفار ومشرکین ساحر کہتے تھے۔ باوجود آنحضرتؐ کا محیر العقول تقدس وزہد وعلم لوگوں کو گرویدہ بنائے رہا۔ اس لئے تمام حکومتیں ان سے خائف تھیں اور قید وقتل کرتی رہیں۔ ان مقدس ہستیوں کے علم وفضل سے ڈر کر بنی عباس نے ہندوستان، افریقہ، یونان وغیرہ سے حکماء وعلماء جمع کئے اور لاکھوں روپیہ صرف کر کے ہر علم وفن کی کتابیں ترجمہ کرائیں تاکہ خاندان رسالت کی علمی فوقیت کو مٹا دیں اور ہر فن کے علماء کی ہمت افزائی کر کے ائمہ معصومینؑ کو علمی زک دینا چاہا۔ باوجود اس کد وکاوش کے بنی عباس ناکام رہے۔ ان کے درباروں، صحبتوں کے مناظرے تاریخوں میں پڑھو۔ ہماری فلسفۃ الاسلام کی اٹھارہ جلدیں دیکھو جو اٹھارہ علموں میں لکھی گئی ہیں، اور فلسفۂ جدید وسائنس کی روشنی میں علوم الائمہ کو جمع کیا ہے۔ غرض کہ شیعہ اماموں کے علوم کو قیاسی وتجربی نہیں سمجھتے بلکہ عالم بحقائق الاشیاء اور خدائی علم کے پڑھے اور سیکھے ہوئے سمجھتے ہیں، ان علوم سے رسولؐ خدا نے علیؑ مرتضیٰ کو آخر وقت تک تعلیم دیا، پھر ایک امام نے دوسرے امام کو وہ اسرار امامت تعلیم کئے، اس لئے بارہ اماموں کا علم علم

رسولؐ ہے اور علم الٰہی ہے، اور ہر ایک سیرت میں اخلاق وآداب میں یکساں ہے۔

(۱۸)
علیؑ خلیفہ بلافصل ہیں

شیعہ بعد رسولؐ خدا علی مرتضیٰؑ کو خلیفہ بلافصل سمجھتے ہیں، اور ثابت کرتے ہیں کہ خلافت وامامت منصب الٰہی ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ رسولؐ ہی معین کریں، جس طرح سے تمام انبیاء نے اپنا وصی وخلیفہ مقرر کیا ہے، رسولؐ نے بھی بعد کے لئے خلیفہ اپنا علیؑ کو بنایا۔

(۱) سب سے پہلے ۶۱۱ء میں بموجب حکم خدا رسولؐ نے کنبہ والوں کو دعوت دی، اور تبلیغ رسالت کر کے ہر ایک سے کہا، جو ایمان لائے اور میرے مشن میں میری مدد کرے وہی میرا وزیر ووصی وجانشین ہے۔ نہ کوئی ایمان لایا نہ وعدہ امداد کیا۔ علیؑ نے باوجود کمسنی ایمان کا اقرار کیا اور تین مرتبہ رسولی مشن کی تائید کا وعدہ کیا، اور اسی وقت سے بار خلافت اٹھالیا، ولی عہد وخلیفہ قرار پاگئے۔ (تاریخ سرجان ڈیونپورٹ)

تمدن اسلام مسیو لیبان، امپیریل ڈکشنری آف یونیورسل، بیاگرفی ولیم میکنزی جلد اول، تاریخ گبن، اسٹوری آف دی نیشن مصنفہ مسٹر گلمن، ہیرو ورشپ مصنفہ ٹامن کارلائل، تاریخ طبری، تاریخ ابوالفداء، تاریخ کامل وغیرہ وغیرہ)

(۲) رسول خدا نے علی مرتضیٰؑ سے فرمایا ''کیا تم راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ نبی سے (خلافت کی) تھی، مگر یہ کہ میرے بعد نبوت نہ ہوگی۔'' سو معتبر سندوں سے یہ روایت ہے (مسند احمد بن حنبل، صحیح مسلم، جمع بین الصحاح الستہ، مناقب ابن مغازلی، کتاب المغازلت محمد بن اسحاق، کتاب الفردوس دیلمی، مناقب خوارزمی، مناقب فاخرہ، فضائل

الصحابہ سمعانی، تاریخ ابن مسکویہ، فصول المہمہ مالکی، مطالب السئول طلحہ شافعی، شرح ابن ابی الحدید معتزلی، فتح الباری)

(۳) رسولؐ خدا نے فرمایا: ''میرے بعد علیؑ امام ہے اور اس کے گیارہ فرزند میرے خلفاء واوصیاء ہیں'' چھیاسٹھ سندوں سے یہ روایت ہے (مناقب ابن مغازلی، مسند احمد ابن حنبل، حلیۃ الاولیاء، مناقب خوارزمی، معجم طبرانی، تاریخ خطیب بغدادی، فصول المہمہ مالکی، شرح ابن ابی الحدید)

(۴) رسولؐ خدا نے اپنے آخر وقت میں فرمایا ''میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں، کتاب خدا (قرآن) اور اپنی عترت، جب تک دونوں کی پیروی کروگے گمراہ نہ ہوگے''، اُنتالیس سندوں سے یہ روایت ہے (مسند احمد بن حنبل، صحیح مسلم، تفسیر ثعلبی، مناقب ابن مغازلی، جمع بین الصحاح الستہ، فضائل الصحابہ سمعانی، فرائد السمطین حموینی، شرح ابن ابی الحدید)۔

(۵) رسولؐ خدا نے فرمایا ''جو شخص یہ چاہے کہ میری سی زندگی جیئے اور میری موت مرے اور جنات عدن میں جن کو خدا نے بنایا ہے اس میں رہے، اس کو لازم ہے کہ علیؑ سے تولا کرے اور پیروی کرے، میرے بعد اماموں کی جو میری اولاد سے ہیں اور میری طینت سے ان کی خلقت ہوئی ہے ان کو فہم وعلم خدا نے عطا کیا ہے۔ میری امت کے ان لوگوں پر افسوس ہے جو میرے بعد ان کے فضل وشرف سے انکار کرے، اور میرے صلۂ رحم کو قطع کرے، خدا میری شفاعت سے ان لوگوں کو محروم کرے گا'' اکیس سندوں سے بہ اختلاف الفاظ یہ روایت ہے۔ (فرائد السمطین، مناقب ابن شاذان، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید)

(۶) ۱۰ھ میں رسولؐ خدا نے ایک لاکھ چودہ ہزار کے مجمع میں غدیر خم کے مقام پر آخری حج

کے بعد لوگوں میں خطبہ فرمایا ''جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ بھی مولا ہے، خداوندا تو دوست رکھ اس کو جو علیؑ کو دوست رکھے، اور دشمن رکھ اس کو جو علیؑ کو دشمن رکھے'' تمام اسلامی مورخوں اور عیسائی مورخوں نے جس نے بھی تاریخ اسلام لکھی ہے بالاتفاق اس واقعہ کو لکھا ہے۔ یہ آخری موقع رسولؐ کے اعلان کا ہے۔ جملہ صحابی اس وقت موجود تھے۔

شاعروں نے مدحیہ قصائد پڑھے، صحابہ بالخصوص جناب ابوبکر وعمر نے علیؑ کو مبارکباد دی۔ سیکڑوں واقعات میں سے یہ چند واقعے اکابر علماء ومفسرین ومحدثین اہلسنت کی معتبر کتابوں سے نقل کئے گئے ہیں۔

یہ کہنا کہ رسولؐ نے وقت وفات مرض الموت میں اصحاب کو جمع کر کے کیوں نہ فرمایا، اس لئے علیؑ کو خلافت نہیں مل سکتی اس استدلال کی منطقی قوت تاریخی نقطۂ نظر سے معلوم ہے۔

(۱) زندگی میں بادشاہ جس کو ولی عہد کردے، ولی عہد بھی فرائض ولی عہدی پورے کرتا رہے۔ ولی عہدی سے معزولی کا کوئی واقعہ بھی نہ ہوا ہو۔ پھر بھی مرتے وقت کہنے سننے کی ضرورت باقی رہے، شیعہ اس استدلال کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

(۲) رسولؐ نے آخر وقت دوات قلم وکاغذ وصیت لکھنے کے واسطے مانگا، خلیفہ عمر نے کہا (نعوذ باللہ) یہ مرد ہذیان بکتا ہے۔ غرض کہ وہ ہنگامہ مچ گیا کہ رسولؐ نے سب کو نکلوا دیا اور وصیت حق علیؑ میں نہ لکھنے دی۔ (صحیح بخاری)

اگر علیؑ یا ان کے طرفدار رسولؐ سے آخر وقت کچھ لکھوا بھی لیتے تو کیا مفید تھا۔ خلافتی پارٹی (نعوذ باللہ) ہذیانی تحریر قرار دے کر بے اثر کردیتے اور یہ سمجھنے کے باوجود بھی اگر کوئی کتبہ ہوتا تو باغ فدک کی سند واگذاری کی طرح وہ بھی پھاڑ دیا جاتا۔

اور ان سب باتوں کے باوجود اگر یہ کہنا صحیح مان لیا جائے کہ رسولؐ نے خلافت کی تعیین کو

کوئی اہمیت نہ دی اور بے تعیین خلیفہ دنیا سے رخصت ہوئے تو ایسی غیر اہم چیز کو کوئی اہمیت نہ ہونا چاہئے۔ جس کو رسولؐ نے غیر ضروری سمجھا، امت کو مذہبی نقطۂ نظر سے اُسے اہمیت دینے کا کیا حق ہے۔ مذہبی تو وہی شئے ہوسکتی ہے جو قرآن ورسولؐ سے ملے۔ کوئی آیت یا حدیث ایسی پیش کرنا چاہئے جس میں رسولؐ نے کہا ہو کہ میرے بعد امت کو اپنے اختیار میں خلیفہ بنانا فرض یا مسنون ہے۔ اگر سیاسی ضرورتوں نے خلیفہ سازی پر مجبور کیا تو پھر ہائے واویلا کاہے کی۔ عالم بھر کے سلاطین کی سی حیثیت ان کی بھی ہوگی فرق کیا ہوگا۔

شیعوں کے اعتقاد امامت میں بھی پورا امن وسکون ووحدت انسانی وطمانیت نفس ہے۔ شیعہ ملک نہیں مانگتے کسی کی دولت وثروت وحکومت کی مزاحمت نہیں کرتے، وہ امامت کو روحانی منصب (جو تقسیم جنگ وجدل کی چیز نہیں ہے) قرار دیتے ہیں وہ روحانیت وتہذیب واخلاق میں ہر مذہب وملت کے ساتھ ہیں۔ ان کے اماموں نے عالم کے مصائب جھیلے، قتل وغارت ہوئے، قید وبند کی تکلیفیں جھیلیں، لیکن کسی پر تلوار نہ اُٹھائی۔ مظلومیت کے ہر مظاہرے میں کامیاب رہے۔ اس سے زائد دشمنوں تک کے لئے اور کون سی اطمینان بخش بات ہوسکتی ہے۔ آئندہ آرٹکلوں سے حالات مظلومی آل رسولؐ بخوبی معلوم ہوں گے۔

جب یہ معلوم ہوا کہ نبوت وامامت ایک ہے صرف نام کا فرق ہے۔ اس لئے امام نبی کی شریعت کا خود بھی پابند ہوتا ہے، اور اسی شریعت کا حافظ ومبلغ نئی شریعت نئی کتاب خدا اس کے پاس نہیں ہوتی ہے، اس لئے وہ نبی نہیں کہا جاسکتا۔ اب ہم اتحاد ووحدت انسانی کے آخری خدائی پیغام کو سناتے ہیں۔

(۱۹)

وحدت کا خدائی پیغام

قرآن مجید میں ہے ''اپنے کو ہدایت یافتہ یہودی ونصرانی کہہ کر تفرقہ نہ ڈالو، بلکہ کہو ملت ابراہیمی پاکیزہ و یک رنگ ہے، اور ہم مشرک نہیں ہیں، ہم خدا پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو خدا نے ہم کو دیا ہے احکام وشریعت اور جو ابراہیمؑ، واسماعیل واسحاق ویعقوبؑ واسباط پر خدا کی طرف سے اترے ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور کسی نبی میں ہم کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم تو خدا کے مسلمان بندے ہیں۔ (سورۂ بقر)

کوئی مذہب بھی اپنے کو مشرک نہیں کہتا۔ خصوص یہود، نصاریٰ، مسلمان پھر کیا وجہ ہے کہ ایک اپنا علیحدہ علیحدہ نام رکھے اور تفرقہ اور انتشار اقوام عالم میں پیدا کرے۔ کیوں نہ سب مل کر اپنا ایک ہی نام تجویز کرلیں جس کے لئے خدا نے اسلام کا نام پسند کیا ہے۔ یعنی سلامتی کا مذہب خدا نے ابراہیمؑ کے مذہب کا نام بتایا ہے ''وہ نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ وہ مسلمان تھے۔ **ما کان ابراھیم یھودیا ولا نصرانیا بل کان حنیفا مسلما**، دوسرا نام ابراہیم خلیل کا شیعہ بتایا ہے۔ (سورۂ قصص)

جب خلیل اللہ شیعہ مسلم تھے جو مورث اعلیٰ یہودی، نصاریٰ مسلمانوں کے ہیں تو تفرقہ کیوں ہو۔

اعتقاد وایمانیات میں دیکھ لو، کس قدر اتحاد انسانی اور امن وامان واطمینان نفس ہے۔ اور ان تمام عقائد کی اساس صرف یہی ہے۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ تمام انسان بنی آدمؑ ہیں، سب اولاد انبیاءؑ ہیں، سب برابر ہیں، کسی کو کسی پر تفوق نہیں ہے۔ لہٰذا تفرقہ وفساد، بغض ونفرت کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے، اسلام عام انسانی برادری میں لانے کے لئے آیا ہے نہ کہ تفرقہ کے لئے۔

(۲۰)

عبادات وریاضیات

دوسرا رکن تمدن شیعہ کا عبادات وریاضیات ہیں۔

(۱) نماز فواحش وبدکاریوں کی روک ہے۔ وہ نماز ہی نہیں جو خالی فحشا ومنکر سے نہ ہو "ان **الصلوۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر**" نماز جماعت میں شیخی وتکبر کہاں۔ جب شاہ وگدا دوش بدوش نماز پڑھتے ہیں۔ ہرقوم ہرنسل کا آدمی پہلو بہ پہلو ہوتا ہے جو مساوات کا بہترین مظاہرہ ہے، میل جول، محبت ومساوات وہمدردی کا ذریعہ ہے۔

(۲) روزہ تقویٰ، پرہیزگاری، نفس کشی، عام ہمدردی کے لئے ہے۔ خواہشات نفسانی کی مارک ہے۔

(۳) حج مساوات باہمی میل جول محبت ومواسات ہے، اور اسوۂ حسنہ ابراہیمی کا مظاہرہ ہے، ارکان واعمال حج سب کے سب افعال واعمال انبیاءؑ کی یادگاروں کا مجموعہ ہے اور کسی نہ کسی شکل میں ہر مذہب میں موجود ہے۔ لہٰذا ہر سہ عبادات کا اساس بھی صرف وحدت انسانی کی تعلیم ہے۔ اتحاد قومی اور اطمینان نفس تسلی کے لئے ہے۔

(۲۱)

مالیات

شیعہ تمدن کا تیسرا رکن مالیات ہیں۔

(۱) زکوٰۃ۔ یعنی ہر سال میں ایک مرتبہ دولت مندوں سے لے کر حاجت مندوں کو مساویانہ امداد پہنچانا۔

(۲) خمس عمر میں ہر ایک مال سے پانچواں حصہ لے کر غرباء ومحتاجین کو مساویانہ پہنچانا۔

(۳) مال غنیمت میں سے کفار سے جزیہ اور خراج لے کر ملکی ضروریات قومی کے لئے مساویانہ تقسیم کرنا۔

(۴) ذاتی اموال میں سرمایہ داری کی ممانعت انفاق و فی سبیل اللہ خیرات تقسیم صدقات وکفارات میں دینے کا حکم ہے۔ یہ سب باتیں کس قدر اتحاد انسانی ہمدردی واطمینان نفس وتسلی کا موجب ہیں۔

(۲۲)
اخلاقیات

چوتھا رکن تمدن شیعہ کا اخلاقیات ہیں جس کا جز جز محض اتحاد انسانی عام برادری اطمینان نفس وتسلی کا موجب ہے اور ہر ہر پہلو میں اس کے امن وامان وہمدردی انسانی بھری ہے۔ چونکہ توحید اسلام کا سنگ بنیاد ہے، اور اسی توحید نے انسانی برادری ووحدت قائم کی ہے۔ لہٰذا خدا کو وحدہٗ لاشریک سمجھنا اور زبان سے اقرار کرنا بس یہی توحید پرستی نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر ہر عمل میں انسانی زندگی کا ایک لمحہ ایسا نہ ہونا چاہئے جس میں اسلام کی یہ روح توحید نیک وبد کا فیصلہ نہ کرتی ہو۔

زندگی میں اعمال وافعال سے اس کا ثبوت دینا پڑتا ہے کہ میرا ہر عمل بجز خدا اور کسی کے لئے نہیں ہے۔ قانون الٰہی کے خلاف جو لمحہ گذرتا ہے وہ اس لمحہ کو خدا کی محبت سے خالی قرار دیتا ہے اور ایمان کو باطل سمجھتا ہے۔ تمام عبادات وریاضات واعتقادات وایمانیات ومالیات واخلاقیات شیعہ مذہب کے خالص ارکان ہیں جو خدا کی توحید کے اعلان کے لئے ماسوی اللہ سے انسان کو علیحدہ رکھنے کے لئے ہیں لیکن یہ سب اگر بندوں کے دکھانے کے لئے شیخی اور تکبر کے لئے، نام ونمود کے لئے ہوں تو خدا کے لئے نہیں ہیں۔ توحید کے خلاف شرک ہے۔

اسی طرح سے خانہ کعبہ کی طرف سجدے، حج بیت اللہ یا قبر رسولؐ خدااور قبور ائمہ ہدیٰ کی زیارت اگر عبادت و پرستش کے طریق سے ہےتو کفر ہے، اور اگر اس نیت سے ہے کہ یہ مقامات محل نزول رحمت الٰہی ہیں۔ خدا ہی سے ان کی نسبت ہے، خدا ہی کے ذریعہ محترم بنائے ہوئے ہیں، اسی نے ان کی عزت واحترام کا حکم دیا ہے، ان کا احترام خدا کے حکم وطاعت کی وجہ سے ہے۔ کعبہ کی طرف سجدہ کعبہ کو سجدہ نہیں ہے، خدا کو سجدہ ہے۔ اس کے حکم سے ہے، اس لئے ان مقامات میں خدا کی عبادت بجالانے میں قبولیت کی امید ہےتو یہ بھی خدا ہی کے لئے ہے۔ اس کی محبت میں ہے ورنہ مادہ پرستی ہے، پیر پرستی وقبر پرستی اور کفر ہے۔

اسی طرح سے جملہ اوامر ونواہی کا ایک طولانی دفتر ہے جو شیعہ اخلاقیات کے اجزاء ہیں اور قرآن و نبی کے ذریعہ رسولؐ کے برحق اوصیاء اور ائمہ ہدیٰ نے ہم کو پہنچائے ہیں وہ سب کے سب توحید کی کڑی ہیں۔ خدا ہی کے لئے ہیں اس کے حکم سے ہیں۔

(۲۳)

اوامر

سچ بولو، انصاف کرو، فیاضی سے کام لو، ایثار کرو، خوش خلقی کرو، نیک سلوک کرو، خلق اللہ کی خدمت کرو، یتیموں، ہمسایہ، بیواؤں پر مہربانی کرو۔ اصلاح ذات البین کرو، ماں باپ اور استاد کی عزت کرو، مظلوموں کی مدد کرو، حلال روزی کماؤ، محنت مزدوری کسب وکاسبی میں جدوجہد کرو وغیرہ وغیرہ۔

(۲۴)

نواہی

شراب نہ پیو، چوری نہ کرو، ظلم وناانصافی نہ کرو، بغض وحسد نہ کرو، سود نہ کھاؤ، دوسروں کے گھروں میں بلا اجازت نہ گھسو، کسی کو ذلیل نہ کرو، مکاری ودغابازی نہ کرو، فتنہ وفساد نہ کرو، گالی نہ بکو، زنا نہ کرو، غیر عورت پر نظر نہ کرو، کسی کا مال نہ چھینو، سحر وساحری وشعبدہ بازی نہ کرو، لہوولعب گانا بجانا حرام سمجھو، جوا نہ کھیلو، جو چیز یاد الٰہی کم کرے یا اس کی محبت وعظمت کم کرنے کا باعث ہو اس کو اختیار نہ کرو، وغیرہ وغیرہ

جس کسی کا قدم دنیاوی دوڑ میں اس راستہ سے ہٹا، اس کا ایمان زبانی ہے، وہ ایمان حقیقی سے محروم ہے۔ قرآن وحدیث نے صاف کہا ہے وہ مومن نہیں ہے، توحید پرست ہو اور مشرکانہ عمل کرو، اور دعویٰ اسلام وایمان کرو، غلط ہے۔

(۲۵)

جبر وتشدد وقتل مذہب میں نہیں ہے

غیر مذاہب پر دین قبول کرانے کے لئے کسی قسم کا تشدد روا نہیں ہے۔ نہ مذہب اختیار کرانے کے لئے جنگ جائز ہے، نہ ملک گیری وفتوحات کے لئے مذہب میں گنجائش ہے، نہ مسلمان بنانے کے لئے کسی کا قتل جائز ہے، نہ رسول ہی کسی کو مسلمان بنانے کے لئے لڑے، نہ ان کے بعد ان کے خلفائے برحق علیؑ واولاد علیؑ نے اس غرض سے جنگ کی، رسولؐ کی جنگیں دفاعی تھیں، اور صلح وجنگ سب خدا کے لئے تھی۔ علیؑ واولاد علیؑ کبھی کسی سے نہیں لڑے بجز دفاع وحفاظت خود اختیاری کے شیعہ مذہب میں تو اس کی سخت ممانعت ہے کہ کسی کے معبودوں اور بزرگوں کو گالی نہ دی جائے، کسی کی پرستش گاہ کو نجس نہ کیا جائے، اس کو خراب ومنہدم نہ کیا

جائے، یا کسی سے مذہبی مناظرے میں خلاف تہذیب گفتگو کی جائے۔

وہ صاف صاف کہتا ہے کہ دشمن سے مدارات کرو، اگر جنگ ہو تو پانی نہ بند کرو، پانی میں زہر نہ ملاؤ، زراعت کو دشمن کی برباد نہ کرو، عورتوں، بچوں، بوڑھوں سے مزاحمت نہ کرو، مخالف مذہب جنگ میں مارا جائے تو اس کے دست و پا نہ کاٹو، دشمن کے گھوڑوں کے پیر نہ کاٹو، غیر مذاہب کی امانتوں میں خیانت نہ کرو، ان کی نکاحی عورتوں کو مسلمان عورت کی طرح سمجھو، زنا نہ کرو، کافر کا بچہ جب تک بالغ نہ ہو اور اپنی پسند سے ایمان نہ لائے اس کو کافر رہنے دو، ہاں ماں باپ بخوشی ایمان لائیں تو ان کی اولاد کو بھی مومن بنا سکتے ہو، کفار سے لڑائی میں بچوں کو ماؤں سے جدا نہ کرو، کفار کے نرغہ اور ہجوم کو اپنی کمزوری کی وجہ سے اگر دفع نہ کر سکتے ہو تو اس شہر کو چھوڑ کر نکل جاؤ۔ اگر دین و مذہب کو دشمن کی سخت گیری کی وجہ سے ظاہر نہ کر سکتے ہو تو مذہب چھپائے بیٹھے رہو، کسی غیر مذہب حکومت میں سازش وفتنہ انگیزی برپا نہ کرو۔ لیکن کسی ظالم ومستبد و کافر کے ظلم واستبداد وکفر میں امداد بھی نہ کرو۔ عزت و مال و دولت وحکومت کی لالچ میں ظالم کے شریک کار بھی نہ بنو، اگر وہ تم سے کسی نیکی وبھلائی میں مشورہ چاہے تو نیک مشورہ دو۔ کوئی ظالم تم سے نیکی میں مدد لے تو بخل نہ کرو۔ قرآن ورسولؐ کی یہی تعلیم ہے۔ ائمہ ہدیٰ کی عملی زندگی بس یہی ہے۔

(۲۶)

حیوانات کو مژدہ حیات

انسانوں کی خونریزی کیسی حیوانات تک کو آرام وآسائش کی زندگی بسر کرنے کے لئے شرع میں احکام ہیں۔ پالو جانوروں کو ذبح کرنا منع ہے۔ آب ودانے سے سیراب رکھنے کا حکم ہے۔ شکاری اور حفاظت کرنے والے کتے تک کے مارنے پر تاوان ہے۔ خانہ کعبہ میں شکار

اور جانوروں کے مارنے کی ممانعت ہے۔سواری کے جانوروں پر رحم کرنے کا حکم ہے۔بارکش جانوروں پر زائد بار لادنے کی ممانعت ہے۔بوقت ذبح حیوانات کے اعضاء جدا کرنے کی ممانعت ہے۔شکاری جانوروں کے کھانے کو حرام بتایا ہے۔جانوروں کے پالنے اور حفاظت کرنے میں اجر وثواب ہے۔حلال جانوروں کے کھانے میں پیٹ کو مقبرہ حیوانات بنانے کی ممانعت ہے،رات کو جانوروں کے آشیانے اُجاڑنے کی ممانعت ہے۔

غرض کہ شیعہ مذہب کا اصلی مقصد یہ ہے کہ جیو اور جینے دو۔قرآن کا صاف حکم ہے کہ ''اگر کوئی کسی کو اس طرح سے قتل کرے کہ قتل کے قصاص میں نہ ہو، یا فساد برپا کرے تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا،اور جس نے ایک آدمی کو بچایا اس نے تمام لوگوں کو زندہ کرلیا۔'' (سورۂ مائدہ)

(۲۷)

دنیاوی کامیابی

شیعہ مذہب میں کامیابی اور دنیا کی کامرانی کسی قوم سے مخصوص نہیں ہے، وہ اپنے ظاہری پرستاروں کو بھی باطل قرار دے کر ذلت ورسوائی کے غار میں ڈھکیلتا ہے۔اگر ان کا عمل موافق حکم شریعت نہ ہو ہر چند زبانی اقرار ہو ایسوں کو فاسق کہہ کر پکارا جاتا ہے ان کی کوئی گواہی مذہب میں قبول نہیں۔ان کے جرائم کی وہی سزا ہے جو غیر مذاہب کے جرائم پیشہ لوگوں کی سزا ہے۔اگر کوئی مومن مرتد ہو جائے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہے، اس کا ہمیشہ کے لئے سوشل بائیکاٹ ہوتا ہے نہ وہ کسی عزیز کا وارث رہتا ہے نہ اس کی بیوی بچے اس کے بیوی بچے رہتے ہیں۔لیکن ایک مشرک ایمان لانے کے بعد مرتد ہو جائے، اور دوبارہ توبہ کرنا چاہے تو پھر وہ جماعت میں شامل ہو سکتا ہے۔

شیعہ مذہب ہر قوم کو فلاح ونجات کی خوشخبری سناتا ہے جو بھی ایمان وعمل کی دولت سے

بہرہ ور ہوجائے۔ اگر کسی غیر مذہب سے شیعوں کا کوئی معاہدہ ہوجائے تو اس معاہدے کا احترام لازم ہے۔ اس مذہب میں کسی پر ظلم واستبداد روا نہیں ہے۔ وہ کمزوروں کو طاقت داروں کے مساوی شہری حقوق دلاتا ہے۔ وہ مفلسوں فقیروں کو مالداروں کے مساوی زندگی کا حق دلاتا ہے۔

اس کی نظر میں سرمایہ داری قابل عزت نہیں ہے بلکہ پرہیزگاری وطاعت الٰہی سے انسان محترم وبزرگ بنتا ہے۔ ہر مذہب کے پیشوا کی عزت کرتا ہے۔ ہر ایک کے معبد کو جس میں خدا کی یاد ہوتی ہو احترام کرتا ہے۔

(۲۸)
شیعہ مذہب اور علم

جملہ علوم بلا استثنیٰ خواہ وہ کسی قوم اور کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، ان کی تحصیل کی تاکید ہے، اور خواہ کتنے ہی دور ودراز ملکوں میں تحصیل علم کے لئے جانا پڑے، علم دولت وسرمایہ پر مقدم سمجھا گیا ہے، مرد ہو یا عورت تحصیل علم سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔

شیعوں کو اس پر فخر ہے کہ ان کے ہادی اور رہبر رسولؐ وائمہ ہدیٰ ہر علم کے جاننے والے تھے، ان کی مذہبی کتابیں ان علوم کے ذخیروں سے بھری پڑی ہیں۔ البتہ عمل ان علموں پر جو لہو ولعب پر مشتمل ہوں، جو انسان کو سست وکاہل بنادیں، جو یاد الٰہی سے غافل کردیں، جو عیش پسند ومسرف بنا دیں، ان علوم پر عمل کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ ان تمام علوم کو حاصل کرو جن کے ذریعہ سے خدا مل سکتا ہے۔ ان علوم کو حاصل کرو جن کے ذریعہ سے مخلوق الٰہی کو باقاعدہ خدمت انسانی کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔ وہ علوم مادی ہوں یا روحانی کسی کی روک ٹوک نہیں ہے، بلکہ ان کے تحصیل کی تشویق

وترغیب وتا کید ہے۔

اپنوں اور بیگانوں سب کو اسلام برابر کی علمی دعوت دیتا ہے۔ائمہ ہدیٰ کے شاگردوں کی طولانی فہرست میں تم کو بہت سے دشمنوں اور غیر مذاہب کے نام ملیں گے۔جن کو تعلیم دینے میں ذرہ برابر اماموں نے بخل نہیں کیا ہے۔

(۲۹)
شیعہ مذہب ہر ترقی کا ضامن ہے

علمی دنیا کا کوئی گوشہ اور انسانی جدوجہد کا کوئی ایسا لمحہ نہیں ہے جس پر شیعہ مذہب کا تصرف نہ ہو۔دنیا چھوڑ وگے تو دین نہ پاؤ گے، دین چھوڑ وگے تو دنیا نہ پاؤ گے۔

شیعہ مذہب عملی زندگی کا قانون ہے اور انسانی صحیح زندگی کے لئے ایک مکمل نظام ہے۔وہ شادی بیاہ کی سخت تاکید کرتا ہے۔والدین کی اطاعت کو فرض قرار دیتا ہے، وہ بیوی بچوں سے حسن خلق کی تاکید کرتا ہے۔وہ بیوی اور بال بچوں کی جائداد کا انھیں کو مالک قرار دیتا ہے۔اس مذہب میں سیاسیات کے عقدوں کا حل ہے، وہ معاشی واقتصادی گتھیوں کو سلجھاتا ہے، وہ تجارت و پیشہ وری کی حمایت وتاکید کرتا ہے۔ اس مذہب میں زراعت وفلاحت کے قوانین ہیں۔ اس میں بین الاقوامی صلح ومفاہمت کے آئین ہیں، وہ خانگی زندگی کی بے کیفی کی اصلاح کرتا ہے، وہ اخلاقیات کا بہترین دستور العمل ہے۔اوران سے عمرانیات کا کامل نظام بنا رکھا ہے۔وہ علوم طبیعہ فلکیات وریاضیات تاریخ وسیر وعلم الالسنہ وغیرہ وغیرہ کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ رزم وبزم وجنگ وپیکار کے آداب تعلیم کرتا ہے۔

(۳۰)

شیعہ مذہب مساوات کا علمبردار ہے

تمام ایمان والے ایک برادری میں داخل ہیں۔ کسی قوم کسی ملک کسی زبان کے ہوں، علیؑ جو کھاتے پیتے اور پہنتے تھے اپنے غلاموں کو اس سے بہتر کھلاتے پہناتے تھے۔ علیؑ پشت پر بوجھ اُٹھا کر غریبوں اور مسکینوں کے گھر پہچایا کرتے تھے کمزور مزدوروں کی بوجھ اٹھانے میں کمک کرتے تھے۔ بھولے بھٹکوں کو راستہ بتاتے تھے خلافت ظاہری ملنے پر اسلامی خزانے عام فقراء پر مساوی تقسیم کردیتے تھے کوئی امام سیر ہوکر نہ کھاتا نہ اچھا کپڑا پہنتا تھا صرف اس لئے کہ دوسرے بھوکے اور برہنہ ہوں گے۔

جناب شہر بانو فارس کی شاہزادی اسیری میں آئیں، علیؑ نے شاہزادہ امام حسینؑ کے ساتھ شادی کرکے بہو بنالیا۔ جناب امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کے ازواج مطہرات زرخرید تھیں دونوں شیعوں کی شاہزادیاں، دو اماموں کی ماں جس سے نسلی امتیاز کو ہٹا کر ہر انسان کو ایک سطح پر لایا گیا ہے۔ ذات پات نسل کا کچھ امتیاز شیعہ مذہب میں نہیں ہے۔ غلام ہو یا کنیز، مالدار ہو یا فقیر، کسی قوم وقبیلہ کا ہو، شیعہ مذہب میں ایک نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ صاحب عزت صرف وہ ہے کہ جو خدا کا سب سے زائد مطیع بندہ ہو۔ جنت کا بھی وہی مستحق ہے۔ ائمہ ہدیٰ فقیروں کے پاس بیٹھتے اور فخر کرتے۔

آدم کے دو فرزند عورت وغلام ازل سے برباد کئے جارہے تھے۔ شیعہ مذہب میں دونوں کی حمایت کی گئی ہے اور برابر کا برتاؤ کیا ہے۔ علیؑ نے فاقہ پر فاقے کئے، محنت ومزدوری کی، لیکن ایک ہزار غلام آزاد کیا۔ وہ کون امام ہے جس نے سیکڑوں غلام آزاد نہیں کئے۔ عملی طور پر غلامی کا انسداد آزاد کرکے کیا ہے۔ عورتوں کی عزت وتوقیر میں صرف واقعہ

شہادت امام حسینؑ کافی ہے۔

نہرفرات پرامام پہنچے، چلو میں پانی لیا، ایک دشمن نے میدان سے دھوکا دہی کے لئے پکار کر کہا آپ تو پانی پی رہے ہیں، اورعورتیں لٹ رہی ہیں امام حسینؑ نے پانی پھینک دیا، گھوڑا اُٹھا کرخیمہ کی طرف آئے سب کومحفوظ پایااس سے زائدعورتوں کی یہ عزت کی، جوان بیٹا علی اکبرؑ سینہ پر برچھی کھائے جلتی زمین پر گرا، حسینؑ اپنے جوان بیٹے کی لاش اُٹھا رہے ہیں۔ زینبؑ خاتون خیمہ سے نکل آئیں۔ لاش فرزند کی دشمنوں میں چھوڑ کر بہن کو سمجھا کر خیمہ میں لائے۔ زیر خنجر شمر زخموں سے چور چور امام حسینؑ زمین پر پڑے ہیں، جناب زینبؑ خیمہ سے بیتاب ہوکر نکل آئیں، اشارے سے خیمہ میں پلٹنے کی بہن سے خواہش کی۔ یہ ہے عزت عورت کی۔

(۳۱)

مزدوری و پیشہ وری کی ہمت افزائی

کوئی پیشہ دنیاوالوں کی نظر میں کیساہی ذلیل ہوشیعہ مذہب میں عزت ہے۔ خودعلیؑ رسولؐ کا جوتا سیتے تھے۔ رسولؐ کے دروازے کی دربانی کو عزت سمجھتے تھے، علیؑ چکی پیستے تھے یہودیوں کے باغ سینچتے تھے، بوجھے اُٹھاتے تھے، فاطمہؑ زہرا چکی پیستی تھیں، چرخہ چلاتی تھیں۔ جب پیشوایان مذہب خودمزدوری کریں تو پھر سچے پیرو کیا عذر کر سکتے ہیں۔

غرض کہ شیعوں کے تمدن کے ارکان اربعہ کا یہ مختصر خاکہ ہے، ان کی تاریخی، ادبی، مذہبی، اخلاقی، زندگی کو بڑی کتابوں میں نہایت احتیاط سے علمائے شیعہ نے جمع کیا اورغیر مذاہب کے منصف محققین نے بھی اعتراف کیا ہے جس کے ہر ہر ورق پرانتہائی امن پسندی، رواداری، عام انسانی برادری، تسلی واطمینان وصلح وآشتی، وحدت انسانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کے خلاف میں شیعہ مذہب پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے، مذہب والے اس کے جواب دہ ہیں۔

(۳۲)

خلفاء اور ائمۂ اثنا عشر

بعد رسولؐ علیؑ و آل علیؑ کو خلافت نہ ملنا، اور ان سے دشمنی و قتل غارتی کی صرف یہی وجہ تھی کہ ان کا تمدن اور تعلیم عام مسلمانوں کے تمدن و تعلیم کے خلاف شیعوں اور ان کے پیشواؤں پر مصائب و آلام صرف مذہب کی وجہ سے تھے، وہ ہرگز ملک و دولت و ثروت و حکومت کے طالب نہ تھے۔

تاریخ شیعہ نامکمل رہتی ہے اگر ہم مختصر حالات عہد خلافت کو اور خلافتوں میں ائمہ اثنا عشر کے حالات تاریخی کو نقل نہ کریں تا کہ پوری توضیح سے غیر مذہب والے عام اسلام اور خاص شیعہ فرقہ میں تفرقہ کا باعث سمجھ سکیں۔ رسولؐ خدا کے بعد عام مسلمانوں نے۔ ابوبکر کو خلیفہ بنایا اور علیؑ محروم رہے جس کے مجمل اسباب و علل گذشتہ آرٹکلوں سے معلوم ہو چکے، اب سلسلۂ خلافت کے حالات کو اجمالاً بیان کرتے ہیں اور اہلسنت کی مستند کتب سے۔

(۳۳)

خلیفہ حضرت ابوبکر

۲۹ رصفر ۱۱ ھ ہجری کو حضرت رسولؐ کی وفات ہوئی آپ بی بی عائشہ کے مکان میں تھے۔ ابوبکر اس وقت مقام ''سخ'' میں تھے، انتقال رسولؐ کے تیسرے روز تشریف لائے۔ نعش رسولؐ پھول گئی تھی۔ (جلد ۳ طبری ص ۱۹۸) تین روز تک جو شخص کہتا کہ رسول کی وفات ہوگئی، عمر برہنہ تلوار لئے اسے قتل کی دھمکی دیتے رہے۔ (صحیح بخاری)

تیسرے روز ابوبکر نے مدینہ آکر رسولؐ کی موت کا اعلان کیا۔ اس عرصہ میں بنی ساعدہ کے چھتہ میں انصار نے سعد بن عبادہ صحابی کی خلافت پر اجماع کر لیا تھا، (صحیح بخاری) یہ معلوم

کر کے ابوبکر وعمر اس چھتہ میں تشریف لائے اور نعش رسولؐ حضرت علیؑ اور بنی ہاشم نے غسل وکفن اور نماز پڑھ کر دفن کردی۔(نہایت العقول فخر رازی، استیعاب ابن عبدالبر مغربی، صحیح بخاری، قسطلانی عینی)۔

چھتہ بنی ساعدہ میں انصار ومہاجرین میں اختلاف ہوااور سعد پیٹ کر نکال دیئے گئے۔ عمر نے ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرلی، اور ابوبکر خلیفہ ہوگئے (صحیح بخاری) سقیفہ سے واپسی پر حضرت علیؑ نے ابوبکر وعمر سے کہا: تم دونوں نے رسولؐ کے جھٹلانے میں بڑی جلدی کی، اور مسئلہ خلافت اپنے حق میں طے کرلیا۔ (کتاب الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ جلد ا ص ۲۰)

حضرت علیؑ کو خلافت کے دربار میں بجبر لایا گیا، سیدہ کے گھر میں آگ لگانے کی دھمکی دی گئی۔ (تاریخ ابوالفداء، تاریخ طبری، کامل ابن اثیر، تاریخ بلاذری، تاریخ گبن، تاریخ جان ڈیونپورٹ، تاریخ واشنگٹن ارونگ، ہسٹری آف اسلام جارج سیل اینڈ سنز لندن)

دربار خلافتی میں داخل ہوکر علیؑ نے اپنے حق خلافت پر پُرزور احتجاج کیا، اور بیعت سے انکار فرما کر خانہ نشین ہوگئے۔ (تاریخ طبری، تاریخ ابوالفداء، کتاب الامامۃ والسیاسۃ) رسولؐ خدا کا عطا کردہ باغ فدک جناب سیدہؑ سے چھین کر علیؑ واولاد علیؑ کو محتاج کردیا (صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، معجم البلدان)

رسولؐ کی بیٹی باپ کے غم میں مبتلا ہوکر پچھتر روز بعد انتقال کرگئی۔ اور وصیت کی کہ میرے جنازے پر ابوبکر وعمر نہ آنے پائیں۔ (صحیح مسلم)

علیؑ مرتضیٰ نے اپنا جمع کردہ قرآن خلافت میں پیش کیا اور فرمایا میں تم سب سے زائد قرآن کو جانتا ہوں، اور حافظ قرآن ہوں، لیکن ابوبکر وعمر نے اس قرآن کو لینے سے انکار کردیا۔

(استیعاب ص ۱۷۵، صواعق محرقہ ص ۶۲، تاریخ واقدی)

رسولؐ خدا کی پانچ سو حدیثیں جمع کی گئی تھیں۔ ابوبکر نے بی بی عائشہ سے آگ منگا کر سب کو جلا دیا۔ (تذکرۃ الحفاظ)

ابوبکر کوئی کام بغیر مشورہ عمر نہ کرتے تھے۔ (صحیح مسلم) ابوبکر جب بیمار ہوئے، عثمان کو وصیت نامہ لکھنے کو کہا۔ عثمان وصیت نامہ لکھ رہے تھے کہ ابوبکر کو غش آ گیا، عثمان نے عمر کا نام وصیت نامہ میں لکھ دیا کہ وہ خلیفہ ہوں گے۔ (تاریخ کامل) اور لفافہ میں بند کر کے مہر لگا دی۔ عمر کو وہ لفافہ دیا اور بند لفافہ پر جناب عمر نے اپنے لئے بیعت لی۔ (کتاب الامامۃ والسیاسۃ) زمانہ خلافت ابوبکر ڈھائی سال، اور زمانہ خلافت عمر دس سال ہوا، حضرت علیؑ بارہ سال چھ ماہ خانہ نشین رہے۔ (کتاب مرتضیٰ حافظ عبدالرحمن، ص ۶۳)

اس خانہ نشینی کے زمانے میں علی مرتضیٰؑ برابر لوگوں کو تعلیم علوم فرماتے رہے اور رسولی مشن علیؑ کے ہاتھوں چلتی رہی۔

(۳۴)
خلافت جناب عمر

۱۳ھ میں عمر کو ظاہری خلافت ہوئی۔ حالانکہ زمانہ ابوبکر سے خلافتی کل کام آپ ہی فرماتے رہے اور بنی ہاشم کو امور خلافتی میں دم مارنے کا موقع نہ تھا۔ یہی ایسی خصوصیت تھی جس نے خلافتوں کو کامیاب بنا دیا، تمام محکمۂ عدالتی نظام صوبوں کی گورنریاں مسجدوں کی امامتیں خطیبوں کے تقرر، سب میں ہر قسم کا آدمی ملے گا، بجز اولاد رسولؐ و بنی ہاشم کے۔ رسولؐ کی تمام حدیثیں جو لوگوں نے جمع کی تھیں جناب عمر نے جلوا دیا۔ (طبقات ابن سعد)

ابن مسعود ابودرداء ابومسعود انصاری کو اس لئے قید کیا کہ وہ رسولؐ سے بہت زائد روایت

کرتے تھے (تذکرۃ الحفاظ) تمام حکام وعمّال کو ہدایت تھی کہ قرآن کی تفسیر بیان نہ ہو اور رسولؐ کی حدیثیں کم بیان ہوں۔ (تاریخ طبری)

"**حی علیٰ خیر العمل**" اذان سے نکال دیا اور بجائے اس کے "**الصّلوۃ خیر من النوم**" کا صبح کی نماز میں اضافہ کیا۔ (شرح عقدی علامہ تفتازانی، سنن کبریٰ بیہقی) متعۃ الحج اور متعۃ النکاح کو جو عہد رسول سے جاری تھا حرام کر دیا۔

خلافت اوّلی سے عرب شمشیر بکف ہمسایہ سلطنتوں پر ٹوٹ پڑے تھے، فتوحات وملک گیری شروع ہوگئی تھی۔ فاقہ مست عرب مالا مال ہو رہے تھے۔ خزانے اڑا رہے تھے۔ ان غنیمتوں میں بھی علیؑ وآل علیؑ کا کوئی حصہ مستند تاریخوں میں نہیں ہے، بجز دو ایک گڑھی ہوئی غیر مستند روایتوں کے۔

۲۳ھ میں جب عمر کی حالت خراب ہونے لگی اور مرنے لگے، پانچ ممبروں کی کمیٹی مقرر کی، اور بعد کے لئے خلافت کے معاملہ کو اس کمیٹی پر چھوڑا۔ عبدالرحمن بن عوف کو سرپنچ مقرر کیا۔ کمیٹی نے علیؑ کے سامنے یہ شرط پیش کی کہ وہ عہد کریں کہ اگر خلیفہ کئے جائیں تو قرآن وسنت رسولؐ وسیرت خلیفہ اول ودوم پر عمل کریں۔ علیؑ نے صاف انکار کر دیا کہ وہ خلفاء کی سیرت پر عمل نہ کریں گے، بجز قرآن وسیرت رسول کے۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی، صواعق محرقہ ابن حجر، مسند احمد بن حنبل)

یہی تو اصولی اختلاف تھا کہ علیؑ سیرت خلفاء کو خلاف قرآن وخلاف سیرت رسولؐ سمجھتے تھے، اور ان کی پیروی کو گمراہ کن قرار دیتے تھے، ورنہ اس شرط کا پیش کرنا اور علیؑ کا انکار کوئی وجہ اس کی ہو ہی نہیں سکتی۔

دنیا یہ بھی جانتی تھی کہ حضرت علیؑ اور جناب سیدہؑ سے ابوبکر وعمر کو سخت دشمنی تھی (اعتصام

السنہ،ص۹۶)اور جناب سیدہؑ کی وفات کے بعد علیؑ کی عزت کرنا چھوڑ دی گئی تھی (صحیح مسلم، صحیح بخاری، تاریخ طبری) اور خود عمر نے علیؑ مرتضیٰ سے کہا تھا کہ تم مجھ کو اور ابوبکر کو گمراہ، خائن، گنہگار ومکار سمجھتے ہو، (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

ایسی حالت میں عبدالرحمن کی علیؑ کو پیش کش جانی بوجھی تھی کہ علیؑ ہرگز اس شرط کو منظور نہ کریں گے۔لیکن جب عثمان سے پوچھا گیا تو انھوں نے فوری اقرار کرلیا، لہٰذا عثمان سے بیعت کرلی گئی، اس وقت بھی حضرت علیؑ نے اپنے حق میں ایک زبردست تقریر کی اور حاضرین نے اقرار کرتے ہوئے اجماع اور بیعت ہوجانے کا عذر کیا۔حضرت علیؑ گھر واپس آئے۔

(۳۵)
خلافت حضرت عثمان

۲۳ھ میں آپ خلیفہ ہوئے۔ اپنے تمام کنبہ والوں کو امور خلافتی میں دخیل کرلیا۔ عہدے، منصب وجاگیر سب کنبہ والوں پر تقسیم کردیئے۔تمام قرآن مجید جمع کر کے جلا دیئے۔ اسلامی خزانہ عزیزوں پر لٹانا شروع کردیا۔ ہر صوبہ کی گورنری اپنے عزیزوں کو دے دیں۔ قاضی امام جماعت اپنے ہی کنبہ والوں کو مقرر کردیا۔ بی بی عائشہ آپ سے ایسی ناراض ہوئیں کہ کھلا ہوا قتل کا فتویٰ دے دیا اور نعثل یہودی سے تشبیہ دی۔خلیفہ نے اپنے بھانجے عبداللہ بن سرح کو مصر کا گورنر کردیا، جو مرتد تھا، اور رسولؐ اس کے قتل کا حکم دے چکے تھے۔ مروان بن حکم ایسے شریر کو وزیر منتخب کردیا۔معاویہ گورنر شام کو زمینداری کے بڑے بڑے حقوق دے دیئے۔

جناب ابوذر صحابی خاص کو شام سے بلا کر بھرے دربار میں اس لئے ذلیل کیا کہ وہ معاویہ کو اس کی بدچلنیوں پر ٹوکتے تھے، اور دو حدیثیں فضائل علیؑ اور دو حدیثیں مذمت بنی امیہ

میں بیان کردی تھیں۔اس کی یہ سزا دی گئی کہ بے آب وگیاہ مقام ''زبذہ'' میں شہر بدر کردیا۔ اُسی جنگل میں صحابی رسولؐ کا انتقال ہوا۔

مقام ''منا'' میں رسولؐ ہمیشہ چار رکعتیں نماز کے بجائے دو رکعت نماز پڑھتے تھے عثمان نے پوری نماز پڑھی۔یہی وہ باتیں تھیں کہ جو تمام ملک میں شورش کا باعث ہوئیں،صحابہ میں سخت بے چینی ہوئی،کوفہ،بصرہ،مصری قافلہ مدینہ منورہ عبداللہ بن سعد گورنر کی شکایت کے لئے آیا۔حضرت علیؑ نے ان لوگوں کو فہمائش کی،ادھر عثمان کو سمجھایا۔عثمان نے آئندہ احتیاط کا وعدہ کیا،اور گورنر کو واپس بلانے کا عہد کیا۔

موقع ٹل گیا،کوفی،بصری،مصری لوگ واپس گئے۔لیکن عثمان نے اپنی روش نہ بدلی۔ زمانہ حج آیا اور پھر دوہزار کے قریب مسلح مصری جمع ہوئے،اور مکرر مطالبہ کیا جناب امیرؑ اور دیگر اصحاب نے سمجھا بجھا کر مدینہ سے ان لوگوں کو باہر نکال دیا۔عثمان نے باہر سے کمک بھی مانگی، امیر معاویہ کو بار بار مدد کے لئے لکھا۔عثمان کو شامی اور بیرونجات کی کمک کا پورا بھروسہ تھا،اور اصحاب رسولؐ پر بھی کہ یہ سب کمک کریں گے مطمئن تھے اس بھروسہ پر آپ نے مسجد میں ایک جلسہ میں تقریر کردی،جس میں اپنی بے گناہی کا اظہار کرتے ہوئے مطالبات پر سختی سے احتجاج کیا،جس کی وجہ سے مدینہ میں سخت ہیجان ہوگیا۔سب سے پہلے عمروعاص صحابی نے صدا بلند کی ''عثمان توبہ کر'' جس کے جواب میں عثمان نے کہا ''تو کون ہے جو مجھ کو توبہ کا حکم دیتا ہے'' پھر تو مسجد کے گوشہ گوشہ سے آوازیں بلند ہوگئیں ''عثمان توبہ کر عثمان توبہ کر'' آخر عثمان روتے ہوئے مسجد سے نکل کر گھر چلے گئے۔

حضرت علیؑ نے پھر مکان پر جا کر عثمان کو سمجھایا،دوسرے دن پھر عام جلسہ کر کے عثمان نے توبہ کی اور اپنی خطاؤں کا اقرار کیا۔حضرت علیؑ نے بھی عام جلسہ میں لوگوں کو نصیحت کی لوگ

خاموش ہو گئے اور رفع گذشت ہو کر سب نے دوبارہ اطاعت کا وعدہ کیا، اور عثمان کے گھر اطاعت کے اقرار کے لئے گئے۔

مروان وزیر عثمان نے گالیاں دے کر سب کو گھر سے نکلوا دیا، جس کی وجہ سے حضرت علیؑ کی تمام مصالحتی کوششیں ضائع ہو گئیں۔ سب برافروختہ گھروں کو واپس گئے۔ راہ میں مصری قافلہ کو ایک شتر سوار ملا، مصری قافلہ کو اس پر شبہ ہوا۔ تلاشی لینے پر اس کے پاس سے ایک مہری خط عثمان کا ملا جس میں گورنر مصر کو ہدایت تھی کہ جب یہ لوگ مصر واپس ہوں تو سب کو بدترین طریقہ سے قتل کیا جائے یہ دیکھتے ہی مصری آگ بگولہ ہو گئے۔ خط لئے مدینہ پلٹے اور عثمان کا گھر گھیر لیا۔

اُنتالیس روز گھر کا محاصرہ رہا۔ حضرت علیؑ بار بار عثمان کو سمجھاتے رہے کہ اپنے عزیزوں کو حکومتوں سے علیحدہ کر دیں۔ دوسری طرف لوگوں کو سمجھاتے رہے، امام حسنؑ و امام حسینؑ کو حفاظت عثمان کے لئے مقرر کیا۔ لیکن عثمان نے ایک نہ سنی اور مطمئن رہے کہ معاویہ کی کمک پہنچا چاہتی ہے کسی طرف سے کوئی کمک نہ آئی۔ نہ مکہ اور مدینہ والوں نے کچھ خبر لی۔

یہ مصریوں کا کوئی عظیم الشان فوجی مظاہرہ نہ تھا جس سے عثمان محفوظ نہ کئے جا سکتے۔ ۶۵ ہجری کی یزیدی فوج سے۔

تاریخوں میں دیکھو مکہ اور مدینہ والوں نے عبداللہ بن زبیر کی نو سال تک حفاظت کی اور جانیں دیں۔ اگر جناب عثمان کی کمک کی جاتی تو ہرگز قتل نہ ہوتے اور تین روز تک نعش بے گور و کفن نہ پڑی رہتی مصر کے دو ہزار آدمی ایسے جنگجو اور سورمانہ تھے جنھوں نے چپ چپاتے خلیفہ کا خون کر دیا مکہ اور مدینہ کے اصحاب و تابعین گرد و نواح کے ہزاروں مسلمان نہ بلوائیوں کا مقابلہ کر سکے نہ خلیفہ کا دفن و کفن ضروری سمجھا، نہ معاویہ کے دل میں باوجود کافی وقت ہونے کے کوئی ٹیس اُٹھی نہ بی بی عائشہ کو جوش آیا۔

حضرت علیؑ کی کوشش سے چار آدمی فراہم ہوئے، جنھوں نے جنازہ اُٹھایا قبرستان بقیع میں کسی نے دفن نہ ہونے دیا۔ یہودیوں کے مقبرے میں دفن ہوئے۔ کس نے نماز جنازہ پڑھی، کس نے کفن ودفن کیا تاریخ کو کچھ پتہ نہیں۔

(۳۶)

امیر المومنین حضرت امام علیؑ مرتضیٰ

۳۵ھ میں قتل عثمان کے ساتویں روز حضرت علیؑ پر یورش ہوتی ہے کہ خلافت قبول کریں، ورنہ قتل کئے جائیں گے مسجد رسولؐ میں بجبر بیعت لی جاتی ہے بقول پروفیسر براؤن ''یہ آنجناب کے مضبوط و مستحکم استحقاق خلافت کا بہت دیر بعد اعتراف تھا۔'' کسی ایک نے بھی بیعت علیؑ سے انکار نہ کیا تھا۔ (تاریخ طبری)

اس بیعت میں طلحہ، زبیر، سعید بن سعد ابن وقاص عبداللہ بن عمر اور تمام صحابہ اور مسلمانوں نے بیعت کی۔ ایک نے بھی یہ عذر نہ کیا کہ علیؑ ہی تو سازشی مجرم قتل عثمان کے ہیں۔ بعد بیعت یہ الزام تراشا گیا۔ (عقدالفرید)

آج بیعت ہوتی ہے کل طلحہ وزبیر مکہ روانہ ہو کر بی بی عائشہ کو لئے بصرے پر فوج کشی فرماتے ہیں اور خون عثمان کا مطالبہ علیؑ سے کیا جاتا ہے۔ اور طلحہ وزبیر یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ ہمارے ہاتھوں نے علیؑ کی بیعت کی تھی دلوں نے بیعت نہ کی تھی۔ (کنزالعمال)

جنگ بصرہ

عجب لطف ہے، مصر کے چند شورشیوں کو مدینہ میں گھیر کر نہیں مارا جاتا۔ بصرے میں فوج کشی کی جاتی ہے۔

<u>۶۵۶ء</u> میں بی بی عائشہ اونٹ پر بیٹھ کر طلحہ وزبیر کو ساتھ لئے بصرے تشریف لاتی ہیں۔ علیؑ ہر چند سمجھاتے ہیں ایک نہیں سنتا، ایسا رن پڑتا ہے کہ دس ہزار قتل ہو جاتے ہیں۔طلحہ وزبیر بھی مارے جاتے ہیں۔ بی بی عائشہ کو شکست ہوئی ہے، امیر معاویہ نہایت خاموشی سے اب بھی بیٹھے دیکھ رہے ہیں نہ عثمان کی مدد کی، نہ بی بی عائشہ کی کمک کی، نہ خون عثمان کا جوش آتا ہے۔ دس ہزار مسلمانوں کو قتل ہوتے ٹھنڈے دلوں دیکھ رہے ہیں۔

یہ سب کھلی پولیٹکل چالیں تھیں۔ واقعہ صرف اتنا تھا کہ نہ بنی امیہ کو عثمان سے ہمدردی تھی نہ مدینہ اور مکہ والوں کو اسلام و مذہب سے کوئی لگاؤ تھا۔ ہر ایک خود غرضی اور طمع حکومت وخلافت میں دیوانہ تھا۔ نہ علیؑ کی خلافت سے مکہ اور مدینہ والے خوش تھے، نہ شام وعراق والے، یہ سب قدیمی دشمن خاندان رسالت تھے اور منافق تھے قتل عثمان کا بہانا بعد کو سوجھا جب علیؑ کی بالاتفاق بیعت ہوئی۔لیکن یہ چال ہر طرح سے کامیاب رہی۔ دیکھو ابوالطفیل اور معاویہ کا مکالمہ:

معاویہ: (ابوالطفیل سے مخاطب ہوکر) تو قتل عثمان میں شریک تھا

ابوالطفیل: ہرگز نہیں مگر قتل کے وقت البتہ موجود تھا

معاویہ: پھر تو نے مدد کیوں نہ کی،

ابوالطفیل: اس لئے کہ کسی مہاجر وانصار نے مدد نہ کی حتی کہ آپ نے بھی مدد نہ کی، باوجودیکہ بار بار آپ سے مدد مانگتے رہے۔ (عقدالفرید، ج ۲ ص ۱۰۱)

خود حضرت امیر طلحہ وزبیر وعائشہ اوران کے ساتھیوں سے بار بار فرماتے تھے کہ تم لوگوں نے عثمان کو خود قتل کر لیا اور الزام مجھ پر دھرتے ہو۔عثمان محصور ہو چکے ہیں اس وقت بی بی عائشہ بجائے کمک نرغۂ اعدا میں گھرا چھوڑ کر مکہ چل دیں اور فرماتی جاتی تھیں، قتل کرو اس نعثل کو، خدا اس نعثل کو قتل کرے (نہایہ ابن اثیر کامل بن اثیر) بعد فتح بصرہ علیؑ کوفہ میں آئے۔

جنگ صفین

۶۵۷ء میں ایک لاکھ سپاہیوں کے ساتھ معاویہ نے شام سے علیؑ پر چڑھائی کی، اور ستر لڑائیاں حضرت علیؑ سے لڑے۔ بڑے بڑے اصحاب رسولؐ قتل ہوئے، اور بہت سے اصحاب رسول نے علیؑ سے بیعت توڑ کر معاویہ کی شرکت کی جیسے سعد بن وقاص، اسامہ زید بن ثابت، ابن عمر، رافع، محمد مسلمہ، ابو ہریرہ، ابودرداء، ابومسلم اشعری، عمرو عاص اوران میں سے جو زندہ رہا اس نے یزید سے بیعت کر لی۔ (ملل ونحل شہرستانی)

علیؑ کے ساتھ اس جنگ میں آٹھ سو صحابی رسولؐ تھے جن میں بدری بھی تھے۔ ہزاروں ان لڑائیوں میں قتل ہوئے۔ عمار یاسر صحابی رسولؐ اور اویس قرنی بھی شہید ہوئے۔ اصحاب وتابعین کی اسلامیت کا اندازہ اصحاب پرستوں کے لئے ہر دو جنگ میں کافی ہے۔ خطائے اجتہادی کی نقاب مومنین واصحاب کے قتل میں قرآنی فتوؤں رسولی حدیثوں کے مقابل میں جہنمی آگ سے بچانے میں کب کامیاب ہوسکتی ہے۔

علیؑ ہر لڑائی میں فاتح تھے۔ آخری علیؑ کی جیتی ہوئی فیصلہ کن لڑائی میں عمرو عاص نے یہ چال چلی کہ قرآن نیزوں پر بلند کئے اور صلح چاہی، علیؑ کے فوجیوں نے بروقت لڑنے سے انکار کر دیا، ہتھیار ڈال دیئے، ہر چند علیؑ نے پکار پکار کر کہا کہ یہ مکاری ودھوکہ دہی ہے کسی نے نہ سنا لڑائی بند ہوگئی، اور پنچایت قائم ہوگئی۔

ابوموسیٰ اشعری دشمن علیؑ کو سرپنچ کر دیا۔ علیؑ احتجاج کرتے ہوئے کوفہ واپس ہوئے اور ۶۵۸ء میں اس ثالثی میں علیؑ کی خلافت سے برطرفی اور معاویہ کی خلافت کے تقرر کا اعلان ہوا، جس کے بعد ناامنی کی ایسی شدت ہوئی کہ بے ضرر مسافر تک قتل ہوئے۔ حاملہ عورتوں کے شکم چاک ہوتے اور علیؑ مرتضیٰ بے بس بیٹھے دیکھتے (اقتباس رائے پروفیسر براؤن) یہاں تک کہ

جنوری ۶۶۱ء میں حضرت علیؑ عین سجدے کی حالت میں مسجد کوفہ میں ایک خارجی عبدالرحمن بن ملجم مرادی کے ہاتھوں زہر آلود تلوار سے شہید ہو گئے، اور رہی سہی اولاد علیؑ اور شیعوں کی قوت فنا ہو گئی۔ شیعوں کا خون بے روک ٹوک بنی امیہ کے ہاتھوں بہنا شروع ہو گیا۔

(۳۸)
خلیفہ امیر معاویہ

علمائے اہلسنت نے خلیفہ معاویہ کی خلافت کی تصدیق کر دی۔ قاضی عیاض، ابن حجر عسقلانی، ابن حجر مکی، جلال الدین سیوطی، یزید بن معاویہ کو بالاتفاق خلیفہ اجماعی کہتے ہیں، اور امام حسینؑ کی نسبت کہتے ہیں کہ ان کا کوئی کام درست نہ ہوا بلکہ وہ اس کے قبل مارے گئے (صواعق محرقہ، تاریخ الخلفاء) یہ قوم معاویہ کی خلافت کی حقانیت کا ان کی نظر میں کامل ثبوت ہے ورنہ یزید خلیفہ برحق کیونکر بن جاتے۔

شہرستانی کہتے ہیں کہ ''اہل اسلام نے بحالت اختیار بلا جبر واکراہ معاویہ و یزید کا امام برحق ہونا مع مروان اور اس کی اولاد کے تسلیم کر لیا ہے۔ (ملل ونحل)

پھر ص ۹۰ میں لکھا ہے کہ امامت موقوف اتفاق و اختیار پر ہے اور ہر شخص امام ہو سکتا ہے جب کہ اس پر اجماع ہو جائے، اسی اجماع و اتفاق کی وجہ سے معاویہ اور مروان مع اپنی اولاد کے خلیفہ ہوئے۔'' (ملل ونحل)

شرح عقاید نسفی ص ۱۰۲ ر میں لکھا ہے کہ ''جب یزید کو اصحاب رسولؐ نے معاویہ کے خلیفہ کر دینے سے خلیفہ مان لیا اور اس کی اطاعت کو تسلیم کر لیا تو امام حسینؑ اور جمیع اہل اسلام پر اس کی اطاعت واجب ہو گئی۔''

غرض کہ معاویہ کے حامی حسب فتوے علماء اہلسنت خلیفہ برحق کے ساتھ تھے، اور علیؑ خلاف حق خلیفہ سے لڑے اس لئے چاہئے تھا کہ علیؑ کا نام چوتھے نمبر خلافت سے بھی خارج کیا جاتا اور اپنا ساختہ اصول برقرار رکھتے یہ بھی نہ کیا اور چوتھا خلیفہ مانتے جاتے ہیں۔

شیعہ معاویہ اور ان کے ساتھیوں اور حامیوں کو کافر اور امام برحق علیؑ پر خروج کرنے والا، اور قاتلین مومنین اور جہنمی سمجھتا ہے۔

معاویہ نے خلافت پاتے ہی تنخواہ دار خطیب معین کئے جو مسجدوں میں علیؑ کو گالیاں دیتے، شیعوں کو مجبور کرتے کہ علیؑ کو برسر منبر گالیاں دیں۔ لاکھوں روپیہ صرف کر کے جھوٹی روایتیں فضائل صحابہ وخلفاء میں تصنیف کرائی جاتیں اور معاویہ کہتے کہ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھوں گا کہ بچوں کو علیؑ پر گالیوں کی عادت پڑ جائے اور جوان ہو جائیں اور بوڑھے اسی عادت پر مر جائیں''

یہ گالیاں خلیفہ عبدالعزیز نے ۵۲ھ ہجری میں حکماً بند کرائیں (کتاب الاحداث مداینی، تاریخ مروج الذہب مسعودی، تاریخ ابوالفداء، عقد الفرید کامل بن اثیر، تاریخ واقدی، صحیح مسلم)

حضرت علیؑ کے فضائل اور ان سے روایات بیان کرنے کی قطعی ممانعت تھی۔ کسی کو حضرت علیؑ کا نام لینے کی جرأت نہ تھی اگر کوئی نام لیتا تو ابوزینب کہتا۔ یہی حالت بنی عباسیہ کے زمانے تک رہی۔ (تاریخ کامل ابن اثیر، کتاب الاحداث ابوالحسن مداینی)

امام حسن علیہ السلام

بعد شہادت امیر المومنینؑ کوفہ والوں نے دست امام حسنؑ پر بیعت کی، لیکن معاویہ اس وقت پوری قوت پیدا کر چکے تھے۔ امام حسنؑ نے ۔۔۔۔۔۔ دین الٰہی کی بربادی اور شیعوں کی

جان کی غیر محفوظی دیکھ کر چند شرائط کے ماتحت ۶۶۱ء ۱۰/اگست کو معاویہ سے صلح کر لی جن میں اہم شرائط حسب ذیل تھے:

(۱) معاویہ کتاب خدا اور سنت رسولؐ اللہ کے خلاف نہ کرے۔

(۲) اپنے بعد کے لئے کسی کو ولی عہد نہ کرے۔

(۳) شیعیان علیؑ کی جان و مال محفوظ رہے۔ (مطالب السئول طلحہ شافعی، صواعق محرقہ)

معاویہ نے منظور کیا اور منبر کوفہ پر دست برداری خلافت کی تقریر کے لئے امام حسنؑ سے خواہش کی۔ امام عام مجمع میں منبر پر تشریف لے گئے، اور بعد حمد و ثنا الٰہی فرمایا: دنیا ہیچ ہے اور ہر چیز کی مدت مقرر ہے۔ لوگو! اب تم کو ایک ایسی خلافت سے سابقہ ہے جو اہل اور حقداروں کے ہاتھ میں نہیں ہے خدا قرآن مجید میں فرماتا ہے: "**وان ادری لعله فتنة لکم و متاع الی حین**" (سورہ انبیاء آیت ۱۱۱) "میں خیال کرتا ہوں کہ شاید یہ تمہارے لئے فتنہ نہ ہو اور چند روزہ بہار ہو۔" یہ فرما کر آپ منبر سے اُترے اور چپ چاپ مدینہ واپس آئے۔ اس صلح کے بعد معاویہ بے مزاحمت خلیفہ ہو گئے۔

دیکھو شرائط صلح اور امام کے آخری خطبہ کو جس سے دنیا کی بے ثباتی، اور حفظ ناموس الٰہی کی پرزور سفارش ہے اور صاف بتایا ہے کہ یہ نفوس قدسیہ ملک گیری اور سلطنت کے خواہاں نہیں ہیں۔

بنی امیہ کی یہ فتح درحقیقت اس گروہ کی فتح تھی جو دل سے مخالف اسلام تھا اور اولاد رسولؐ کا ہمیشہ سے دشمن تھا اب وہی رسولؐ کی جانشینی کر رہے ہیں، حالانکہ ان کے دل ذرا بھی نہ بدلے تھے۔ اور جو ان کے خلاف آواز بلند کرتا، اس کو تلوار سے خاموش کر دیا جاتا۔ اس دشمن اسلام گروہ کو اس وقت تک چین نہ آیا جب تک اس دین کو محکوم اور مسجد رسولؐ کو اصطبل نہ بنا لیا، اور

پرانے ایمان لانے والوں کو بے حرمت نہ کرلیا (ڈزی) اور رسولؐ کے جانی دشمن (ابوسفیان) کی اولاد رسولؐ کی جائز جانشین وخلیفہ بن بیٹھی اور جو آدمی ان کی بدعتوں کے خلاف آواز بلند کرتا اس کو تلوار سے خاموش کر دیتے تھے۔ (ایڈورڈ براؤن آف کیمبرج یونیورسٹی)

امیر معاویہ نے صلح ہوتے ہی امام حسنؑ کی گوشہ نشینی سے فائدہ اٹھایا، اور شرائط صلح نامہ کو ٹھکرا دیا، اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد کر دیا، شیعیان علیؑ کا قتل شروع کر دیا یہاں تک کہ خود امام حسنؑ کو ان کی زوجہ جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ روپیہ اور اپنے ولی عہد یزید کے ساتھ شادی کی لالچ دلا کر پانی میں زہر ملا کر پلا دیا، اور رسولؐ کے نواسہ کو شہید کر دیا۔

(تاریخ طبری، طبقات الاطباء، مروج الذہب مسعودی، استیعاب)

امام حسنؑ کی نعش روضۂ رسولؐ میں دفن نہ ہوسکی نعش پر تیر برسائے اور جنت البقیع میں وہ امام مظلومؑ دفن ہوا۔

خلیفہ ابوبکر کے زمانے ہی میں معاویہ اپنے بھائی یزید بن سفیان کے ساتھ شام گئے تھے، اور فتح شام کے بعد یزید پہلے گورنر شام ہوئے۔ ان کے بعد معاویہ گورنر رہے بیس سال تک اس کے بعد مطلق العنان بادشاہ بن گئے ۴۱ ہجری میں معاویہ بادشاہ بنے۔

ان کے اسلام نواز حالات کی مختصر فہرست حسب ذیل ہے:

(۱) امام شعبی ناقل ہیں کہ معاویہ نے خلاف احکام رسولؐ سب سے پہلے بیٹھ کر خطبہ پڑھنے کی ایجاد کی

(حلیۃ الایام ج ۳)

(۲) امام زبیری کہتے ہیں، معاویہ نے خلاف دستور نماز سے پہلے خطبہ پڑھنا شروع کیا۔

(حلی الایام ج ۳)

(۳) سعید بن مسیب کہتے ہیں عید کی نماز میں اذان کی ایجاد اور تکبیر کی کمی معاویہ کے ہاتھوں

ہوئی۔

(۴) اسلام میں مردوں کا خواجہ سرا بنانا اور محل سرا میں رکھنا۔

(۵) دفتر کے مہر کی ایجاد۔

(۶) مسجد میں اپنے کھڑے ہونے کے لئے مخصوص حجرہ بنانا۔

(۷) کعبہ کے غلافوں میں کمی کر کے اکہرا غلاف چڑھانا۔

(۸) رعایا سے امور سلطنتی میں حلف وفاداری لینا۔ یہ سب باتیں معاویہ کی ایجاد تھیں۔(حلے الایام عطا حسنی بک ج ۳)

(۹) عبدالرحمن بن خالد بن ولید کو زہر دے کر مارا۔(طبقات الاطباء ج ۱ ص ۱۱۷ کتاب الامثال ابوعبید القاسم بن سلام)

(۱۰) خالد بن مہاجر نے جب چچا کے قتل کی خبر پائی تو شام پہنچ کر ابن آثال عیسائی طبیب معاویہ کو قتل کیا جو کہ ہمیشہ حسب منشاء معاویہ زہر تیار کیا کرتا تھا۔ اس کی پاداش میں معاویہ نے سو کوڑے خالد کو مارے، اور دس ہزار درہم جرمانہ کیا۔ (طبقات الاطباء ج ۱ ص ۱۱۷)

(۱۱) معاویہ نے بڑے بڑے امراء اسلام اور ایک بڑی جماعت کو زہر دلوا کر خفیہ مروا ڈالا۔

(طبقات الاطباء، ج ۱ ص ۱۱۶)

(۱۲) مالک اشتر کو زہر دے کر مروا ڈالا۔ (کتاب الامثال)

(۱۳) حجر بن عدی صحابی کا قتل کرا دیا۔

(۱۴) خطیبوں واعظوں سے ہر مسجد میں منبروں پر سالہا سال علیؑ مرتضیٰ کو گالیاں دلوائیں۔

(۱۵) لاکھوں روپیہ دے کر مناقب وفضائل صحابہ میں جھوٹی روایتیں اصحاب رسول سے گڑھوائیں۔

(۱۶) جنگ صفین میں سیکڑوں اصحاب رسول کا خون بہایا، جناب عمار اویس قرنی ایسے بزرگ شہید کئے۔

(۱۷) یزید ایسے فاسق وفاجر کو ولی عہد کیا۔

(۱۸) جب مرنے لگے تو گلے میں صلیب تھی۔ (محاضرات راغب اصفہانی)

باوجود مذکورہ اوصاف کے مکہ اور مدینہ والوں نے بہ تعداد کثیر معاویہ کو اپنا خلیفہ برحق سمجھا جس سے صاف واضح ہے کہ جس قوم اور جن اصحاب کی ذہنیت ایسی ہو ان کے تمام اجماعوں اور انتخابوں سے کیسی خلافتیں قائم ہوسکتی ہیں۔

چند تاریخی سوالات

وفات رسولؐ سے عہد معاویہ تک جو مختصر تاریخی مستند واقعات بیان ہوئے اس کو دیکھنے کے بعد پہلی صدی اسلام کی اور اسلامی بزرگوں کی اسلام نوازی کے لئے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کو صحیح تاریخ کی روشنی میں ہر مصنف حل کرسکتا ہے۔

(۱) وفات رسولؐ کو تین روز تک چھپانا اور نعش کا پھول جانا۔ (نعوذ باللہ علیؑ وفاطمہؑ کی زندگی میں یہ کب ممکن تھا، علیؑ نے دفن وکفن کردیا تھا، صحابہ کی تین روز بعد خبر گیری کے لئے یہ تاریخ پر پردہ ڈالا گیا ہے)

(۲) سعد بن عبادہ پر پہلے اجماع ہو چکا تھا جو پیٹ کر نکالے گئے۔ صحابہ پرستی اور صحابی تہذیب کا مظاہرہ تھا۔

(۳) حضرت علیؑ اپنے کو اور اپنی اولاد کو خلیفہ برحق سمجھتے رہے۔

(۴) حضرت علیؑ خلافتوں کو ناجائز اور خلاف حکم خدا ورسولؐ سمجھتے رہے۔

(۵) حضرت علیؑ اور سیدہؑ سے خلفاء کو اور بنی امیہ کو سخت دشمنی تھی۔

(۶) بعد وفات سیدہؑ علیؑ کی کوئی عزت نہ تھی۔
(۷) حضرت علیؑ خانہ نشین رہے اور امور دین میں جب ان سے مشورہ کیا کبھی علیؑ نے دریغ نہیں کیا۔
(۸) علیؑ واولاد علیؑ کا منشاء صرف تحفظ اسلام تھا، اور دین الٰہی میں کسی قسم کی آمیزش نہ چاہتے تھے اس لئے سیرت خلفاء کی پیروی کو کبھی قبول نہ کیا۔
(۹) ابوبکر کو خلافت دے کر اولاد رسولؐ کے حق کو ہمیشہ کے لئے میٹ دیا اور خلافت کو دشمنان رسولؐ کے گھروں میں ڈھکیل دیا۔
(۱۰) خلافتی جماعت قرآن وسیرت رسولؐ کو نامکمل سمجھتی تھی اور سیرت خلفاء کو مقدم سمجھتی رہی۔
(۱۱) خلافتوں میں علیؑ واولاد علیؑ کو ہر عہدے اور منصب سے جدا رکھا گیا۔
(۱۲) عثمان کی مدد اور نصرت میں علیؑ مرتضیٰ نے کوئی فروگذاشت نہیں کی۔
(۱۳) مدینہ اور مکہ والوں نے عثمان کی بالکل مدد نہ کی۔ قتل ہوجانے دیا، دفن وکفن نہ کیا نماز جنازہ نہ پڑھی۔
(۱۴) علیؑ کو مجبور کر کے بیعت کی پھر بیعت توڑی، قتل عثمان کا الزام لگایا اور جمل وصفین کی لڑائیاں لڑکر ہزاروں مسلمانوں اور اصحاب کا خون ناحق کیا۔
(۱۵) فرزند رسولؐ امام حسنؑ کو شہید کیا اور کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ خون عثمان کے قصاص کے لئے شام وبصرہ ایک کر دیا اور فرزند رسولؐ چپ چپاتے شہید ہوگئے۔
(۱۶) عثمان کے مقبرہ یہود میں دفن ہونے کا بہانہ بلوائیوں کے سر تھوپا، اور بی بی عائشہ کے فتوے کو چھپا ڈالا لیکن فرزند رسولؐ کے جنازے پر تیر برسانے والوں سے کس نے مواخذہ کیا۔
(۱۷) مذکورہ خلافتوں میں بجز قیصریت وکسرویت روحانیت ومذہبیت کی کون سی نمائش ہوئی۔

یہ سب وہ واقعات ہیں جو اجماعی خلافتوں کے متعلق ایک صحیح نتیجہ تک پہنچا سکتے ہیں، اور یہی ایک مضبوط کڑی سلسلہ شہادت امام حسینؑ بلکہ قتل جملہ اولاد رسولؐ کی ہے جو بنی عباسیہ کے ہاتھوں ہوئی۔ اسی لئے حامیان یزید عزاداری امام حسینؑ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہتے ہیں، کیونکہ ان کے مذہب کا پول کھلتا ہے۔

فرزند رسولؐ امام حسینؑ عہد رسولؐ سے اس وقت تک کے واقعات کا گہری نظر سے مطالعہ فرما رہے ہیں، ان کے پیش نظر صحیح واقعات ہیں، وہ مسلمانوں کی سازشی چالوں کو نظر غائر سے دیکھ رہے ہیں۔

الف: رسولؐ کا جنازہ کیونکر اُٹھا، کیا احترام ہوا۔

ب: اولاد رسولؐ کس طرح سے تباہ و برباد کی گئی۔

ج: اصحاب میں کس طرح سے جوتی پیزار ہو رہی ہے۔

د: خودساختہ خلیفہ عثمان کا کیا حشر ہوا۔

ہ: علیؑ مرتضیٰؑ کی خود ہی بیعت کی خود توڑی اور کیسا انسانیت سوز سلوک کیا۔

و: حسنؑ مجتبیٰ کا باوجود کنارہ کشی کیا حشر ہوا۔

ز: معاویہ کی عہد شکنی۔

ح: اصول مسلمۂ اسلامی کی توہین و بے پروائی۔

اب امام حسینؑ سے یزید کی بیعت کی خواہش معاویہ کے لئے کہاں تک جائز تھی۔ امام کا یزید کی ولی عہدی کو قبول نہ کرنا اپنی جان دینے کا قطعی فیصلہ تھا اور بے شک رسول زادے کا فرض تھا کہ نانا کے دین کی حفاظت کریں، خواہ اس دین پرستی میں جان و آبرو پر کچھ بھی آبنے اور یہ بھی واقعات سے طے شدہ تھا کہ مثل حسنؑ مجتبیٰ صلح کر لینے کے بعد بھی

شہادت کے سوا کچھ چارہ نہ تھا۔

حالات موجودہ میں ایک بیوقوف بھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ حسینؑ کو اپنی مادّی فتح وکامیابی کی ذرہ برابر بھی امید نہ تھی جس سے ملک گیری وطمع کا الزام آپ پر عائد ہوسکے سوائے طرفداران یزید ومعاویہ کے کسی کو یہ نہ سوجھے گا۔

(۳۹)
خلیفہ یزید بن معاویہ

۵۶ھ میں (یزید) ولی عہد ہوا۔ ۶۸۰ء میں معاویہ مرا اور یزید تخت نشین ہوا۔ یہ خلیفہ اور خلیفہ زادے علانیہ شراب پیتے اور لڑتے، راگ ورنگ میں ہمیشہ ڈوبے رہتے، گویوں سے دربار بھرا رہتا، قرآن نے جن عورتوں کو حرام کیا تھا ان کو حلال سمجھتے، ماں بہنوں سے زنا کرتے، نماز نہ پڑھتے، سیر وشکار میں بسر کرتے حتیٰ کہ باپ کے مرنے کے وقت بھی موجود نہ تھے۔ بندر اور کتے پالتے اور بیش قیمت کپڑے اور زیور پہناتے۔

یزید کے حالات الم نشرح تھے۔ کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جو نہ جانتا ہو (رسالہ جواز لعن بر یزید از ابن جوزی، تاریخ علی جلال حسینی، طبقات ابن سعد، کامل التواریخ)

معاویہ نے جب ان کی ولی عہدی کے مشورے لئے تو کون ایسا تھا جس نے اس کی آوارگی، بدچلنی، عشق بازی کا ذکر کرکے نااہل ثابت نہ کیا ہو مگر بجز چندانے گنے اشخاص کے تمام عوام وخواص اصحاب وتابعین نے بے چوں وچرا ولی عہدی قبول کرلی تھی۔

یہ تھی اس وقت کی اسلام نوازی، دینداری، شریعت پرستی، تاریخیں کب جھٹلائی جاسکتی ہیں عبداللہ بن عمر خلیفہ زادے نے یہ رائے ظاہر کردی تھی کہ اگر یزید نیک چلن رہے تو ہم راضی

ہیں، اور بدی کی تو ہم صبر کریں گے۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی) امام حسینؑ فرزند رسولؐ سے یہ واقعات پوشیدہ نہ تھے۔

شہادت امام حسین علیہ السلام

وفات رسولؐ کے وقت سے امام اپنی بے بسی، بیکسی، بے اثری، بے زری کو جانتے تھے اوراس کا بھی علم تھا کہ آج تاج وتخت کے مالک ان کے خاندان کے دیرینہ دشمن اوراسلام کے بدخواہ ہیں۔ حسینؑ کو یزید سے بغاوت وفوج کشی وملک گیری وفتح مندی کا خواب میں بھی خیال نہ ہوسکتا تھا۔

صورتِ موجودہ میں حسینؑ کے لئے کھُلے ہوئے دوراستے تھے یا بیعت کریں اورمخالفت اسلام پر یزید کی تباہکاریوں پرمہر تصدیق لگادیں یا ترک بیعت کرکے جان دے دیں۔

یزید کے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی گورنر مدینہ ولید کو حکم پہنچتا ہے کہ حسینؑ ابن علیؑ کو مجبور کرکے بیعت لو، انکار کریں تو قتل کرکے سر بھیج دو۔ (تاریخ طبری)

امام حسینؑ نے اپنے طے کردہ فیصلہ سے کام لے کر جان دینے کی تیاری کرلی۔ حسینؑ کا سیاسی اصول تھا کہ دین الٰہی کو بچائیں، لہٰذا یہ روحانی اور مادی جنگ تھی، ایک طرف روحانیت پوری قوت سے کام کررہی تھی، دوسری طرف مادیت اپنی پوری قوت سے کارفرما تھی۔

اب امام کے سامنے تین صورتیں تھیں:

الف: مدینہ میں بیٹھے رہیں یزید سے وہیں لڑیں قتل ہوں یا قید ہوں۔ فتح کے تمام ذرائع واسباب مفقود تھے۔

ب: مکہ معظّمہ میں قیام کریں، قتل ہوں یا قید ہوں یا لڑیں۔

ج: کسی اور سمت چلے جائیں۔

بیعت نہ کرنے والے کے لئے انحصار مذکورہ شکلوں میں تھا۔ مدینہ کی حالت سب کو معلوم، سب طرفدار یزید، بیعتی غلام لڑتے تو کس برتے پر۔ حرمت مدینہ بھی جاتی، زن و مرد بنی ہاشم قتل ہوجاتے، خاندان رسولؐ کا خاتمہ ہوجاتا۔

یہ اعلان کرتے ہوئے مدینہ چھوڑا ''میں مرنے جاتا ہوں جس کو ساتھ دینا ہو جان دینے کے لئے چلے'' زن و بچہ ساتھ لے کر مکہ روانہ ہوتے ہیں۔

مکہ پہنچے، عبداللہ بن زبیر کو یزید سے برسر پیکار دیکھ کر علیحدہ ٹھہرے، اور ان کی شرکت سے صاف انکار کردیا، عبداللہ بن زبیر مکہ کے قیام پر مصر ہیں۔ حسینؑ سمجھتے ہیں کہ یہ خود طالب حکومت ہیں، حسینؑ کو یہ کب چین لینے دیں گے۔ اپنی بیعت پر مجبور کریں گے۔ حسینؑ کے لئے کسی کی بیعت کرنا کب ممکن تھا، بیعت نہ کریں گے تو اس بارگاہ سے بھی قتل کا فتویٰ ملے گا۔

خود عبداللہ بن زبیر نے بھرے دربار میں معاویہ سے گفتگو میں دعویٰ خلافت پیش کیا تھا۔ (عقدالفرید، ج۲ ص۹۹) معاویہ نے گفتگو میں ابن زبیر پر الزام دھرا تھا ''کل کی بات ہے تو اور تیرا باپ عائشہ کو (طمع خلافت سے بہکا کر) علیؑ سے لڑنے لے گیا تھا۔ (عقدالفرید ج۲ ص۹۷)

عبداللہ امام حسینؑ کے کب خیرخواہ تھے، جنگ بصرہ میں ان کی تمناؤں میں پانی پھر چکا تھا، ان کے باپ زبیر مارے گئے تھے۔ حسینؑ پر قابو پا کر کب چھوڑنے والے تھے۔ اگر حسینؑ سے ہمدردی ہوتی تو شہادت حسینؑ کو ٹھنڈے دلوں بیٹھے نہ دیکھتے۔ مدینہ اور مکہ والے اصحاب و تابعین سبھی تو قتل حسینؑ کو ٹھنڈے دلوں دیکھتے رہے۔ انھیں حسینؑ کے بھائی محمد حنفیہ کو مکہ معظّمہ چاہ زمزم میں انھیں عبداللہ نے قید کیا تھا۔ حسینؑ بھی قید ہوتے یا قتل ہوتے یا بیعت پر مجبور کئے

جاتے۔

حسینؑ اور ان کے خاندان نے یزید تک کی خلافت اولیٰ سے لے کر کسی کی بیعت نہیں کی۔ حسینؑ نہ کسی کی بیعت کے لئے تیار تھے نہ کسی سے لڑنے کے لئے۔ نہ کسی سازش میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ اگر یزید ان کو نہ چھیڑتا تو وہ قبر رسولؐ پر خاموش بیٹھے رہتے۔ حسینؑ اصولی آدمی تھے، وہ مرتے دم تک اپنے کو خلیفہ برحق اور وارث رسولؐ سمجھتے تھے، ان کا بیعت کر لینا اصول کی قربانی تھی۔

اب حسینؑ مکہ بھی چھوڑتے ہیں، اور عام مجمع میں خطبہ پڑھتے ہیں ''میں قربان گاہ کی طرف جارہا ہوں، ساتھ والوں کسی کو گردن کٹانا ہو تو ساتھ چلے ورنہ اپنی اپنی راہ لو، لوگ ساتھ چھوڑ چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے۔ حسینؑ مکہ معظّمہ کو بھی وداع کرتے ہیں۔

اب منحصر ہے کہ حسینؑ تیسری سمت اختیار کریں، جہاں جانے پر لوگ نہ کہہ سکیں کہ جان بوجھ کر حسینؑ نے جان دے دی۔ تاریخی فتوے، بے عقلی و بے تدبری کے فتوے نہ دیں۔ وہ کوفہ ہی کی سمت تھی جہاں سے پے در پے وفود آرہے تھے خطوط کی بھر مار تھی، بتاؤ عقل کیا کہتی ہے۔ حسینؑ کو کس طرف جانا چاہئے تھا۔ اگر کوفہ نہ جاتے کسی اور طرف رُخ کرتے تو دو ہی صورتیں تھیں:

(۱) یزیدی مملکت سے نکلنے کی کوشش کرتے۔

(۲) یا حکومت کے کسی دوسرے گوشہ میں پناہ لیتے۔

دونوں صورتوں میں حکومت کا جب یہ قطعی فیصلہ ہے کہ بیعت ہو یا قتل تو جس سمت جاتے راہ میں گرفتار ہوتے یا قتل ہوتے، اس وقت سیاسین عالم کا کیا فتویٰ ہوتا۔ حسینؑ کو کوفی بلا رہے تھے، ان کو چھوڑا اور مفت جان دی۔ کوفی لڑتے حمایت کرتے اپنی طلب کی لاج رکھتے۔ اس

وقت بجائے مظلومیت حماقت کے فتوے لگتے۔

کوفہ کی بیوفائی عام لوگوں نے طے نہ کر لی تھی۔آج تاریخیں اہل کوفہ کی بے وفائی پر ماتم کررہی ہیں، مکہ ومدینہ والے روک رہے تھے۔لیکن دیکھنا یہ ہے کہ امام کوحجازیوں کی وفاداری پر کب ایمان تھا۔ان کی بے وفائی کوفیوں سے زائد تھی۔کوفی جدید معاہدہ نصرت کا کررہے ہیں،اس کا خلاف ابھی ظہور میں نہیں آیا ہے،عہد شکنی پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

حجازی نہ عام طور پر روکتے ہیں۔نہ رائے عامہ حمایت حسینؑ پر قائم ہے نہ کوئی جدید عہد حفظ جان وناموس حسینی کا حجازیوں نے کیا ہے۔حسینؑ حجاز چھوڑتے ہیں۔بڑے بڑے صحابی بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔کب کسی نے حسینؑ کا ساتھ دیا بلکہ اکثر نے قتل حسینؑ کی تائید کی۔قاضی شریح دربار ابن زیاد میں حاضر رہتا تھا۔اس نے قتل ہانی کو چھپایا اور مظلوم ہانی کی مدد سے اہل کوفہ کو روک دیا۔اس کے بیٹے نے حامیان حسینؑ (مسیب) سے جنگ کی۔سمرہ بن جندب کوفہ بصرہ،عراق کے شہر ودیہات والوں کو قتل امام حسینؑ کی ترغیب دیتے رہے۔

(شرح ابن ابی الحدید، ج ۴)

انس بن مالک صحابی دربار ابن زیاد میں حاضر رہتے تھے۔پیغمبر کا ان پر حق تھا کہ ابن زیاد کو اس کے اس فعل پر روکتے، جب اس نے سر امام حسینؑ سے بے ادبی کی تھی،لیکن انھوں نے نہ روکا۔ (تذکرہ خواص الامہ،عینی شرح صحیح بخاری)

علاوہ ان کے مقتدایان واکابر اصحاب جیسے جابر بن سمرہ، زید ابن ارقم، زید بن خالد جہنی، سمرہ بن جندب، نعمان بن بشیر، بریدہ بن حصیب اسلمی، مسلمہ بن مخلد انصاری، ابوبردہ اسلمی، اسید بن خضیر اوسی، ابوسعید معلے انصاری، رافع بن اوس، عرباین بن ساریہ، رافع بن خدیج انصاری، سائب بن یزید مدنی، اسلم عدوی، ابان بن عثمان بن عفان، ابو

ادریس خولانی، زر ابن حبیش، سنان بن سلمہ ابن محبق بصری، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر وغیرہ وغیرہ صحابی وتابعی وپیروان خلفاء تھے۔ کسی نے بھی فرزند رسولؐ کی مدد نہ کی۔ خون حسینؑ کا بدلا لینے والوں کا بھی ساتھ نہ دیا۔

چنانچہ جو لوگ فوج یزید میں شامل ہوکر حسینؑ کے قتل میں شرکت نہ کرسکے تھے۔ وہ بعد معرکۂ کربلا عبدالرحمن بن سعید، ورقاء بن عازب وغیرہ سلیمان بن صرد خزاعی سے لڑنے کو اور ابن زیاد کی کمک کو آئے۔ (مقتل ابومخنف)

آج تاریخیں جن واقعات کو دہرا رہی ہیں کیا امام حسینؑ ان سے بے خبر تھے، ہرگز نہیں۔ امام حسینؑ کو جھوٹے کوفیوں کو گھر تک پہنچانا تھا۔ تمہارے طلبیدہ آتے ہیں مدد کرو، ساتھ دو۔ حسینؑ جہاں جاتے قتل ہوتے، اس وقت کوفی بھی الزام دھرتے اور غیر کوفی بھی۔ اب تو آئی گئی کوفیوں کے سر گئی۔ پھر کوفیوں نے تیسرے روز بے سر لاشوں کو دفن تو کردیا، حجازیوں نے تو اپنے تیسرے خلیفہ کو دفن تک نہ کیا کوفیوں نے ایک وقت توبہ بھی کی۔ انتقام خون حسینؑ کے لئے جانیں دیں، قاتلان امام کو تہہ تیغ بھی کیا۔ حجازی تو منکے بھی نہیں، خلافت کے لئے لڑے مرے اور انتقام خون امام حسینؑ کے لئے ایک بھی نہ اُٹھا، بتاؤ دونوں میں کون زائد بے وفا تھا۔

یزید کا شرابی بھائی عثمان بن محمد بن ابی سفیان مدینہ کا حاکم تھا، جب اسیران کربلا مدینہ پہنچے کس نے احتجاج کیا تاریخ بتاتی ہے کہ دس صحابی جن میں ''منذر بن زبیر'' صحابی وصحابی زادے شامل تھے، عبداللہ بن حنظلہ غسیل ملائکہ مدینہ سے شام تشریف لے جاتے ہیں، اور لاکھ درہم سرکار یزید سے لے کر واپس تشریف لاتے ہیں۔ جب ان رقموں سے جیبیں گرم کرلیتے ہیں تب ان کو خبر ہوتی ہے کہ یزید شرابخوار، تارک الصلوٰۃ ہے، مستحق سلطنت نہیں ہے۔

قتل اولاد رسولؐ تک استحقاق سلطنت میں یزید کے کوئی حرف نہیں آتا ہے، فرزند رسولؐ کو مدینہ میں بٹھانے والے دست حسینؑ پر بیعت نہیں کرتے، آج شہادت امام حسینؑ کے بعد دست عبداللہ بن حنظلہ پر بیعت ہوتی ہے نعمان بن بشیر انصاری مقدس صحابی خلیفہ وقت حضرت یزید کی سفارش فرمارہے ہیں۔ دمشق سے آکر مدینہ والوں کو بیعت یزید پر باقی رہنے کی سفارش فرماتے ہیں۔

صحابیت رسولؐ کا مظاہرہ ہورہا ہے۔ نام نہاد اسلامی دنیا کے عقائد وخیالات وحالات سے امام زادہ باخبر ہے جن کو آج تک تاریخیں دہرا رہی ہیں، امام حسینؑ کس بھروسے پر کسی سمت جاتے۔

یزیدیوں کے عقائد

امام حسینؑ کن اعتقادوالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ واقعات تاریخ اس کا صحیح تصفیہ کرتے ہیں۔

امام حسینؑ نے قبل سفر عراق اپنے بھائی مسلمؑ بن عقیلؑ کو کوفہ روانہ کیا تھا، جہاں جناب مسلمؑ اور فوج ابن زیاد سے جنگ ہوئی۔ تنہا پر یورش کی گئی۔ محمد ابن اشعث نے دھوکا دے کر جناب مسلم کو قصر الامارہ تک پہنچا دیا۔ آپ پیاسے تھے، پانی مانگا، مسلمؑ بن عمر باہلی اموی نے کہا ''تم کو ایک قطرہ پانی کا نہ ملے گا تا اینکہ حمیم جہنم چکھو'' حضرت مسلمؑ نے پوچھا تو کون ہے، وہ بولا ''میں وہ ہوں جس نے حق کو پہچانا، جب کہ تم نے گمراہی کی، اور میں نے اپنے امام کی اطاعت کی جب کہ تم مخالف ہوئے میں مسلم بن عمر باہلی ہوں۔''

خود ابن زیاد نے جناب مسلمؑ کے خلاف ایک خطبہ میں کہا ''بندگان خدا اطاعت و بیعت یزید کو لازم جانو، اور اپنے نفسوں پر الزام لے کر خود کو ہلاک نہ کرو''۔

جناب ہانی بن عروہ حمایت جناب مسلمؑ میں جب زخمی ہوئے اور قاضی شریح سے فرمایا کہ

میری اس حالت کو میرے قبیلہ بنی مذحج تک پہنچا دو۔اس قاضی نے بجائے صحیح پیغام کے دیوار قصر الامارہ سے پکار کر قبیلہ ہانی کو دھوکا دیا اور کہا ''ابن زیاد نے مجھ کو یہ کہنے کے لئے بھیجا ہے کہ ہانی زندہ ہیں۔''

جب حضرت مسلمؑ دربار ابن زیاد میں حاضر کئے گئے تو ابن زیاد نے کہا ''اے مسلمؑ تمہارے نفس نے وہ آرزو کی جو دوسرے کو زیبا تھی، اور خدا نے تم کو اس کے قابل نہ دیکھا۔ جناب مسلمؑ نے پوچھا پھر کون اس کے قابل ہے، ابن زیاد نے کہا امیر المومنین یزید''۔

جب امام حسینؑ کوفہ پہنچے تو ابن زیاد نے ایک خط لکھا ''میں نے سنا ہے کہ آپ کوفہ پہنچے ہیں، بحکم یزید آپ کو حکم دیتا ہوں کہ یا بیعت یزید کیجئے یا آپ کو قتل کیا جائے۔امام نے کچھ جواب نہ دیا، اس وقت ابن زیاد نے حُر کو امام حسینؑ کے کربلا میں روکنے کے واسطے بھیجا، اس کے بعد ایک قاصد حُر کے پاس بھیجا، اس نے امام کو سلام نہ کیا اور حُر کو خط ابن زیاد کا دیا۔

یزید ابن مہاجر صحابی نے قاصد سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا کہ فاسق کا قاصد بن کر آیا۔امام برحق کو چھوڑ دیا اس نے جواب دیا ''میں نے اپنے امام (یزید) کی اطاعت کی اور اپنی بیعت پر وفا کی''۔

کربلا کی مشہور جنگ شروع ہونے پر عمر سعد نے لشکر میں منادی کی ''اے لشکر خدا سوار ہو تم کو بشارت جنت ہو'' یعنی فرزند رسولؐ کو قتل کر کے جنت میں جاؤ۔ نافع بن ہلال بجلی لشکر امام حسینؑ سے نکلے اور فرمایا ''میں دین علیؑ پر ہوں'' مزاحم بن حریث مقابلہ کو آیا، اور پکارا ''میں دین عثمان پر ہوں'' نافع نے کہا ''تو دین شیطان پر ہے۔''

بریر بن خضیر ہمدانی لشکر امام سے نکلے اور پکار کر کہا ''آؤ میرے پاس اے قاتلان مومنین، اے قاتلان اولاد بدریین، اے قاتلان اولاد رسولؐ رب العالمین''

عمر بن حجاج سردارلشکر پسر سعد اپنے لشکر کو پکارتا ہے ''اے اہل کوفہ اطاعت کو لازم جانو اور جوشخص دین اسلام سے پھرا ہے (نعوذ باللہ امام حسینؑ)، اورتمہارے امام یزید کا مخالف ہے اس کے قتل میں شک نہ کرو۔''

امام حسینؑ جواب میں فرماتے ہیں ''اے ابن حجاج خدا ہی خوب جانتا ہے کہ کون دین اسلام پر ہےاورکون اس سے منحرف ہےاورکون سزاوارجہنم ہے۔''

امام حسینؑ نے گرد خیام خندق کھود کر آگ روشن کردی تا کہ لشکر یزید سے حفاظت ہو، ایک شقی نے پکار کر کہا ''اے حسینؑ تم نے آگ میں جانے میں جلدی کی روز قیامت کی آگ سے''۔

سرامام حسینؑ جب دربار یزید میں زیرتخت یزید رکھا گیا تو یزید نے کہا آج بدر کی لڑائی کا بدلا ملا (مناقب ابن مفازلی، تاریخ واقدی، سیرت ابن ہشام خمیس دیار بکری)۔

بدر کی لڑائی رسولؐ سے ہوئی تھی، جس میں علیؑ مرتضیٰ کے ہاتھوں یزید کے چھ بزرگ قتل ہوئے تھے۔ حنظلہ بن ابوسفیان، عاص بن سعید بن عاص، شیب بن ربیعہ، عامر بن عبداللہ، عقبہ ابومعیط، ولید بن عقبہ بن ربیعہ، یہی کافرانہ جذبہ قتل امام میں کارفرما تھا۔

یزید چھڑی سے لب ودندان امام سے بے ادبی کرتا اور کہتا جاتا تھا ''حسینؑ کہتے تھے کہ میرا باپ یزید کے باپ سے بہتر ہے اور میری ماں یزید کی ماں سے بہتر ہے اور میرے نانا یزید کے نانا سے بہتر ہیں، اور میں یزید سے بہتر ہوں، (فصول المہمہ)

یہی اعتقاد بعد تک اس گروہ کا رہا ہے۔ حجاج بن یوسف کے سامنے عبداللہ بن ہانی کہہ رہا ہے، ہمارے وہ فضائل ہیں جو تمام عربوں میں سے کسی کو حاصل نہیں۔ امیرالمومنین معاویہ کے ساتھ جنگ صفین میں ہمارے قبیلہ کے ستر آدمی تھے اور علیؑ کے ساتھ صرف ایک شخص تھا اور

ہم اس کو برا سمجھتے تھے۔ متوکل نے کہا قسم بخدا یہ فضیلت ہے۔

عبداللہ: ہمارے قبیلہ کی کوئی عورت علیؑ سے بیاہی نہیں گئی۔

متوکل: قسم بخدا یہ بھی فضیلت ہے۔

عبداللہ: ہمارے قبیلہ کی کوئی عورت نہ تھی جس نے حسینؑ ابن علیؑ کے قتل ہونے پر دس قربانیوں کی نذر نہ کی ہو، اور بعد قتل نذر پوری نہ کی ہو۔

متوکل: قسم بخدا یہ بھی فضیلت ہے۔

عبداللہ: ہمارے قبیلہ کا کوئی زن و مرد نہیں جس نے علیؑ پر لعن نہ کیا ہو، اور بزرگوں سے سیکھ کر یہ عمل جاری نہ رکھا ہو، اور میں نے تو اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ علیؑ کے ساتھ حسنؑ و حسینؑ و فاطمہؑ پر بھی لعنت کی۔

حجاج: واللہ یہ بھی فضیلت ہے۔ (مروج الذہب مسعودی، ج ۲)

باوجود ان مختصر حالات تاریخی کے ہر شخص تصفیہ کرسکتا ہے کہ شیعہ اور پیروان خلفاء میں اعتقادی اور اصولی کیا فرق تھا، اور قتل اولاد رسولؐ کا جرم کس پر عائد ہوتا ہے۔ امام حسینؑ کو مع اکہتر ساتھیوں کے کس نے بھوکا پیاسا کربلا کے جنگل میں قتل کیا، مال و اسباب کس نے لوٹا، کس نے آل رسولؐ کے خیمے جلائے۔ نعشوں کے سر کاٹ کر نوک نیزہ پر کس نے بلند کئے۔ کربلا سے کوفہ کوفہ سے شام اولاد رسول کو سر برہنہ اسیر و مقید کر کے کون لئے پھرا۔ رسولؐ زادیوں کو رسن بستہ دربار یزید میں کون گروہ لے گیا۔ سال بھر ان بیکسوں کو قید شام میں کس نے رکھا۔

یہی تھی اسلامیت؟ یہی تھی رسولؐ پرستی؟ یہی ہے تمدن اسلام؟ خلیفہ اسلام ایسا ہی ہونا چاہئے؟ اور ایسے ہی لوگوں کے پیرو اور مداح مسلمان ہیں؟ شیعہ ان سب کو کافر و منافق سمجھتے ہیں

ع کافر نکند آنچہ مسلماں کردند

شہداء آل رسول

علاوہ اصحاب رسولؐ و شیعیان علیؑ کے رشتہ داران رسولؐ و اولادِ علیؑ جو واقعہ کربلا میں قتل ہوئے حسب ذیل ہیں:

(۱) مسلمؑ بن عقیلؑ بن ابوطالبؑ
(۲) امام حسینؑ
(۳) علی اکبرؑ بن امام حسینؑ
(۴) علی اصغرؑ بن امام حسینؑ
(۵) عبداللہ بن علیؑ بن ابی طالبؑ
(۶) جعفرؑ بن علیؑ بن ابوطالبؑ
(۷) عثمان بن علیؑ بن ابی طالبؑ
(۸) عباسؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ
(۹) محمد اصغرؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ
(۱۰) ابوبکرؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ
(۱۱) ابوبکرؑ بن حسنؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ
(۱۲) قاسمؑ بن حسنؑ بن علیؑ ابن ابی طالبؑ
(۱۳) عبداللہؑ بن حسنؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ
(۱۴) عونؑ بن عبداللہؑ بن جعفرؑ بن ابی طالبؑ
(۱۵) محمدؑ بن عبداللہؑ بن جعفرؑ بن ابی طالبؑ
(۱۶) عبیداللہؑ بن عبداللہؑ بن جعفرؑ بن ابی طالبؑ

(۱۷) عبداللہؑ بن عقیلؑ بن ابی طالبؑ

(۱۸) جعفرؑ بن عقیلؑ بن ابی طالبؑ

(۱۹) عبداللہؑ اکبرؑ بن عقیلؑ بن ابی طالبؑ

(۲۰) محمدؑ بن مسلمؑ بن عقیلؑ بن ابی طالبؑ

(۲۱) عبداللہؑ بن مسلمؑ بن عقیلؑ بن ابی طالبؑ

(۲۲) محمدؑ بن ابی سعیدؑ بن عقیلؑ ابن ابی طالبؑ

امام حسینؑ شہید ہوئے اور ظاہری شکست ہوئی، یہ ان اشخاص کی شکست نہ تھی بلکہ مادیت کی شکست تھی۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ حشمت وشوکت اموی خاک میں مل گئی، اور حقیقی عزت ووقار جو آل رسولؐ کی مذہبی میراث تھا۔ حسینؑ نے شہید ہوکر ہمیشہ کے لئے خلفاء سے واپس لے لیا، اور ''مسٹر مارگولنتھ'' ایسے بے خبروں کو سمجھا دیا کہ مادی حکمرانوں اور روحانی پیشواؤں میں اوران کے مقصد حیات میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ امام حسینؑ روحانی پیشوا تھے، مادی حکمران نہ تھے، بے شک حسینؑ کی روحانیت یزیدی مادیت پر فتحمندی ہوئی۔

تین سال چھ ماہ یزید نے حکومت کی پہلے سال امام حسینؑ کو شہید کیا۔ دوسرے سال مدینہ کو تاراج کیا۔ تیسرے سال کعبہ پر حملہ کیا (پروفیسر ایڈورڈ براؤن) اور یہ تینوں کارنامے یزید اور یزیدیوں کی اسلام نوازی کے لئے سچا معیار ہیں۔

مدینہ رسولؐ کی بے حرمتی

مسلم بن عقبہ ۶۳ھ میں شامیوں کا جرار لشکر مدینۂ رسولؐ پر لے کر حملہ آور ہوا۔ فضل بن عباس غسیل ملائکہ اور بہت سے اصحاب رسولؐ مارے گئے۔ مورخین کی تصریح کی بنا پر سات سو مہاجرین وانصار اور دس ہزار مسلمان مارے گئے، ایک ہزار عورتوں کی عصمت دری

ہوئی (حلی الایام ج ۳، ابوالفداء مروج الذہب مسعودی) سور بن مخزمہ صحابی کو کوڑوں سے پٹوایا۔ (عقدالفرید)

تین روز مدینہ خوب لٹا، حرم رسولؐ کو بے حرمت کیا گیا، مسجد رسولؐ میں گھوڑے باندھے گئے، انھیں لڑائیوں میں حضرت عبداللہ بن جعفرؓ بن ابوطالبؑ اورعون بن عبداللہ بن جعفرؓ بن ابوطالبؑ شہید ہوئے۔ (مقاتل الطالبین)

مکہ کی بے حرمتی

فتح مدینہ کے بعد مسلم بن عقبہ فوج لے کر مکہ روانہ ہوا، بیمار ہوکر مر گیا، حصین بن نمیر فوج کی کمان کرنے لگا، مکہ کے باہر منجنیق کی کلیں لگا کر بڑے بڑے پتھر شہر پر برسائے گئے۔شہر میں ہلچل مچ گئی۔خانہ کعبہ کی عمارت چکنا چور ہوگئی۔اسی مشین سے آگ برسائی گئی، غلاف خانہ کعبہ جل گیا، اور چوبی حصہ کعبہ کا سب جل گیا۔اتفاقاً مشین میں آگ لگ گئی۔ادھر موت یزید کی ۶۴ھ میں خبر شائع ہوئی، فوج بددل ہوکر واپس آ گئی۔

(تاریخ طبری)

(۴۰)

شیعوں کے دواہم اصول

امام حسینؑ کی شہادت سے اصول شیعہ میں دواہم اصول داخل ہو گئے۔

عزائے امام حسین علیہ السلام

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد دوستوں میں ماتم برپا ہوگیا، گھر گھر ماتم ہوتا، خصوصاً بنی ہاشم میں تو وہ غم منایا گیا جس کی غیر اقوام میں بھی نظیر نہیں ہے۔

سانحۂ کربلا نے نہ صرف خلافت کی بلکہ ان تمام اسلامی سلطنتوں کی جو زوال خلافت کے

بعد ظہور میں آئیں۔ قسمت کا فیصلہ کر دیا، وہ شخص جس نے اس شدید و پر جذبات رنج والم کا معائنہ کیا ہے جس میں ہر سال محرم کے موقع پر ہر ملک کے مسلمان شب شہادت کی طویل رات بسر کرتا ہے، ماتم کرتے ہیں، حسنؑ حسینؑ کے مستانہ نعرے مارتے ہیں وہ اس ہتھیار کو جو تیز بھی ہے اور دو دھارا بھی پہچانے بغیر نہیں رہ سکتا، جس کو بنی امیہ نے اپنے دشمنوں کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ (سر ولیم میور)

''تعزیہ'' عربی لفظ ہے جو عزا سے مشتق ہے۔ یہ تعزیہ شبیہ ضریح امام حسینؑ ہے، علم شبیہ نشان لشکر امام حسینؑ ہے، تابوت شبیہ جنازہ ہے، ذوالجناح اس سواری کے گھوڑے کی شبیہ ہے جو بروز عاشور امام حسینؑ کی سواری میں تھا۔ محمل اور عماریاں بھی شبیہ ہے جس پر دختران علیؑ وفاطمہؑ بہ تمام ذلت سوار کر کے در بدر پھرائی گئی تھیں۔ یہ سب چیزیں اس اصول پر متبرک سمجھی جاتی ہیں، جس اصول پر عیسائی مذہب میں صلیب کی تصویر اور نعل متبرک سمجھا جاتا ہے۔ یا اسلام میں قربانی کا جانور، کعبہ کا سنگ اسود، صفا اور مروہ کا پہاڑ متبرک ہے، ان سے مرادیں مانگنا یا سجدے کرنا یا اس کے سامنے بانا پٹا لڑنا یا سوانگ نکالنا یا لکڑیوں میں گودڑ باندھ کر آگ لگانا، یا تلوار وزنجیر سے ماتم کرنا یہ سب شیعہ مذہب میں حرام وگناہ ہے، اور جاہلوں میں ایسی باتیں رائج ہونا مذہب پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتیں۔

یہ تعزیہ وعلم دو طرح پر ہوتے ہیں:

ایک پہلی محرم سے آٹھویں ربیع الاول تک مختلف تاریخوں میں گشت کرائے جاتے ہیں۔

دوسرے وہ تعزیہ وضریح وعلم جو شیعوں میں گھر گھر سال بسال رکھے رہتے ہیں اور ہر وقت غم حسینؑ کو تازہ رکھا جاتا ہے، اور اس اخلاقی وروحانی قربانی کی یاد تازہ رکھی جاتی ہے۔ ہر جمعرات وغیرہ کو اُٹھا کر درگاہ یا کربلا یا امام باڑوں میں لے جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی بلا مصیبت

مثل وبا، قحط، طاعون وغیرہ کے شہر میں پھیلتا ہے، یا منّتی تعزیہ اور علم شہر میں گشت کراتے ہیں۔ ان کا رواج بنی عباس کی سلطنت مٹنے پر ''دیالمہ'' کی حکومت قائم ہونے کے وقت سے علانیہ ہوا۔ ورنہ اس کے قبل شہادت حسینؑ کے بعد سے پوشیدہ مجلس و ماتم کی حیثیت سے بخوف حکومت ہوتا رہا۔ ۳۵۳ھ میں معزالدولہ دیلمی نے بغداد میں ماتم کی گشت کا طریقہ جاری کیا، جو اب تک شیعوں میں جاری ہے۔

خاص روز عاشور بغداد میں دوکانداری بند کرائی گئی۔ عورتیں سر کے بال کھولے ماتم کو نکلیں (شرح الفیہ ابوفراس، تاریخ ذہبی، تتمہ مختصر ابن وردی، خطط مقریزی)۔ ایرانیوں میں علم رکھے جاتے تھے، انھیں کی تقلید سے ہندوستان و دکن کے امراء برابر علم رکھتے قطب شاہ کے خاندان گول کنڈہ اور حیدر آباد میں علم رکھے جاتے اور سیاہ پوشی کی جاتی ہے۔

''تاریخ عمادالسعادۃ'' میں ہے کہ نواب شجاع الدولہ بھی بڑی شان وشوکت سے علم اُٹھاتے اور دہلی میں بادشاہ کے پاس لے جاتے تھے۔ صوبہ اودھ میں نواب برہان الملک نواب شجاع الدولہ، نواب آصف الدولہ، غازی الدین حیدر، نصیرالدین حیدر، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ، واجد علی شاہ، شاہان اودھ و وزراء اور رؤسا و شاہزادگان اور غربا سبھی عزاداری کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اہل ہنود اور راجگان وریاستہائے اہل ہنود میں والیان ملک و رؤسا بھی مراسم عزاء نہایت عزت واحترام سے ادا کرتے ہیں۔ مثل بھرت پور، جے پور، اندور، دھولپور، گوالیار وغیرہ وغیرہ کے۔

ایران، مصر، شام، حجاز، عراق کون سا مقام ہے جہاں شیعہ عزاداری نہ کرتے ہوں۔ اور یہ ان کا جزو ایمان ہے اس لئے کہ ان کے اماموں نے اس کی بے حد تاکید کی ہے خود رسولؐ خدا نے بعد ولادت امام حسینؑ ام الفضل سے گود میں لیا اور خبر شہادت سنا کر روئے۔

(مشکوٰۃ شریف، ج۸ ص ۱۴)

حضرت علیؑ کا کربلا کی طرف سے گذر ہوا تو آپ نے حسینؑ کی خبر شہادت بیان کر کے گریہ فرمایا۔ (طبقات ابن سعد، مسند احمد بن حنبل، صواعق محرقہ)

روز عاشورام المومنین ام سلمہ نے رسولؐ خدا کو خواب میں مصیبت امام حسینؑ بیان کر کے روتے ہوئے دیکھا۔ (امام ترمذی) اسی طرح ابن عباس نے خواب میں رسولؐ خدا کو روتے دیکھا۔ (صواعق محرقہ، تاریخ الخلفاء)

حضرت ام سلمہ بعد شہادت امام حسینؑ جب تک زندہ رہیں عورتوں کو جمع کر کے پُرسہ لیتی تھیں۔ (ترمذی، معجم صغیر طبرانی) زید بن ارقم صحابی دربار ابن زیاد میں روئے (ینابیع المودّہ) انس بن مالک صحابی بھی مصیبت امام حسینؑ پر روئے۔ (منہاج السنہ ابن تیمیہ) حسن بصری تابعی نے خبر شہادت امام حسینؑ پر گریہ کیا ہے۔ (ینابیع المودۃ) شیعوں کو عزاداری میں رو پیٹ لینا ہی مقصود نہیں ہوتا ہے، بلکہ حسب الارشاد امام جعفر صادقؑ اہم مقصد یہ ہے کہ ''فضل بن یسار'' سے آپ نے فرمایا ''میں ان مجالس کو دوست رکھتا ہوں جن میں ہمارے امر کو زندہ رکھا جائے۔ جو ہماری بات کو زندہ رکھے خدا اس پر رحم کرے۔ اے فضل جو ہمارا ذکر کرے یا اس کے سامنے ہمارا ذکر ہو اور اس کی آنکھ سے پر پشہ کے برابر آنسو نکلے تو خدا اس کے گناہوں کو بخش دے گا چاہے وہ کف دریا سے زائد ہوں۔ (قرب الاسناد)

اہلبیت کے تذکرہ کا زندہ رکھنا کیا ہے۔ امام رضاؑ فرماتے ہیں ''خدا اس بندے پر رحمت نازل فرمائے جو ہمارے امر کو زندہ کرے۔

عبدالسلام: آپ کے امر کا احیاء کیونکر ہوتا ہے؟

امام: ہمارے علوم کی درس وتدریس، کیونکہ جب لوگوں کو ہمارے محاسن کلام پر

اطلاع ہوگی تو وہ ہماری پیروی کریں گے۔ (معانی الاخبار صدوق، مراۃ العقول)

صاف معلوم ہوا کہ مجالس میں علوم ائمہ کا بیان کرنا، وہ سننا، ان پر عمل کرنا، اصل اصیل ہے اور ان کے مصائب و ایثار و قربانی کو سن کر جو شخص رو دے اور نیک عمل اور سیرت ائمہ ہدیٰ پر عمل کرے گا بیشک وہ بخشا جائے گا۔ اس لئے کہ نجات کا انحصار تو نیک عملی اور اتباع سیرت ائمہ ہی میں ہے، نہ کہ عیسائیوں کے اعتقاد کفارے کی طرح جس کی اسلام میں ہرگز گنجائش نہیں ہے۔ دنیا کی بداعمالی کریں اور رو کر بخشوالیں، ہرگز یہ اسلامی تعلیم نہیں ہے۔

لہٰذا عزاداری یہ ہے کہ اصول و آئین حسینی اور تعلیمات حسینی کی تبلیغ اور اسوہ حسینی پر عمل کرنے کا سبق مجلسوں میں حاصل ہونا چاہئے۔ واقعات تاریخی اور احکام مذہبی کی تعلیم و ترویج ہو، جذبات روحانی، خودداری و ایثار و قربانی کا مظاہرہ ہو، ادب و خطابت کی مشق ہو، ظالم سے نفرت، مظلوموں سے ہمدردی ہو، انھیں مجالس کا اجر و ثواب ہے، اور یہی بہترین عبادت پروردگار ہے جس سے تہذیب و اخلاق اسلام کی پابندی ہو۔

اس عزاداری کو علماء شیعوں کے مشائخ صوفیہ بھی مذہبی فرض سمجھتے ہیں۔ حضرت باوا فرید گنج شکر تو ایک مرتبہ مصیبت امام حسینؑ پر اس بے قراری سے روئے کہ سر پھوڑ لیا اور انتقال کیا۔ حضرت بوصیر مکی کا قصیدہ تتمہ ابن خلکان میں دیکھو جس کی شرح ابن حجر مکی نے کی تھی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی، حضرت نظام الدین اولیاء حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری، حضرت سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی چشتی، شیخ الاسلام مخدوم علاء الحق پنڈوی، حضرت سید محمد بندہ نواز گیسودراز شیخ عبدالحق محدث دہلوی، حضرت امجد شیبانی، سید عبدالرزاق بانسوی، خواجہ منصور بادشاہ اصفہانی، مجدد دین ہمدانی، شیخ عبدالفتوح نصیرآبادی، خواجہ محمود حدادی متقی، خواجہ امام شرف الائمہ ابونصر السنجانی، خواجہ اشعری حنفی نیشاپوری، امام شیخ احمد محمد

شیبانی، ملا عبدالجلیل رازی وغیرہ وغیرہ (روح المعانی، لطائف اشرفی، اخبارالاخبار، نقض الفضائح)

یہ اعاظم مشائخ صوفیہ محرم کا چاند دیکھ کر ترک لذات کرتے، خیرات کرتے، روتے پیٹتے اور مجالس عزا برپا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ اجمیری نے تو وصیت کی تھی کہ میری قبر پر ہمیشہ عشرۂ محرم میں مجالس ہوتی رہیں جو آج تک ہوتی ہیں۔

تبرّا

عربی کا لفظ ہے، جس کے معنی نفرت و بیزاری کے ہیں۔

(منتہی الادب، تاج المصادر بیہقی، ترجمہ قزوینی قاموس)

لعنت کے معنی، رحمت الٰہی سے دوری (نہایۃ ابن اثیر، دیوان الادب، قاموس) ہر مذہب والا دوسروں سے نفرت و بیزاری کرتا ہے، اگر نفرت نہ کرے تو دوسرے مذہب کو اختیار کیوں نہ کرلے۔ اصول کی مخالفت پر ایک دوسرے سے نفرت کرتا ہے، متمدن ومہذب قوموں میں ووٹ آف سنسر پاس ہوتا ہے، لعنت وتبرّا ابھی کوئی نئی چیز نہیں ہے نہ دل آزار ہے۔ شیعہ مذہب کا یہ جزو ایمان ہے کہ اپنے مذہب کی صداقت اور غیر مذہب سے بیزاری کریں، جو شیعوں کے لئے قرآن وحدیث کا حکم ہے، اور انسان کا فطری حق ہے۔ قرآن مجید میں ہے ''**ان الذین یوذون اللہ ورسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والاخرۃ واعد لھم عذابا مھینا۔**'' (پارہ ۲۲، رکوع ۴)

''جو خدا ورسولؐ کو ایذا دیتے ہیں خدا ان پر دنیا وآخرت میں لعنت کرتا ہے اور ان کو عذاب جہنم میں مبتلا کرے گا۔''

رسولؐ خدا نے فرمایا تھا: ''فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے، جس نے اس کو غصہ دلایا اس نے مجھ کو غصہ

دلایا (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۸۳ مطبوعہ مصر) دوسری حدیث ہے ''جس نے فاطمہؑ کواذیت دی اس نے مجھ کواذیت دی۔ (صحیح مسلم،صحیح ترمذی)

اور علیؑ مرتضیٰ کے بارے میں فرمایا ''جس نے علیؑ کواذیت دی اس نے مجھ کواذیت دی، لوگو! جو شخص علیؑ کواذیت دے گا وہ قیامت کے روز یہودی ونصرانی ہوگا۔

(مناقب احمد بن حنبل، ینابیع المودّہ)

قرآن مجید میں دوسری آیت ہے **''ومن یقتل مومنا متعمدا فجزائه جهنم خالدا فیها و غضب الله علیه و لعنه و اعد له عذابا عظیما۔** (پارہ ۵ رکوع ۹)

جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے اس کی جزاء ہمیشہ کے لئے جہنم ہے، اور اس پر خدا کا غضب اور لعنت ہے اور سخت عذاب ہے۔

تیسری آیت قرآن مجید کی ہے: **''لا تتولوا قوماً غضب الله علیهم''** (پارہ ۲۸ رکوع ۸) ''ان لوگوں سے دوستی نہ کرو جن پر خدائی غضب ڈھایا گیا ہے۔''

رسولؐ خدا ہر نماز میں رکوع سے سر اُٹھا کر **سمع الله** کے بعد فرمایا کرتے تھے خداوندا تو لعنت کر فلاں فلاں اور فلاں پر۔ (صحیح بخاری ج ۳ مطبوعہ مصر ص ۱۷)

تبرّے اور لعن کو گالی کہنا رسولؐ اور ان کی نماز میں اقتدا کرنے والے نمازیوں اور اصحاب کو گالی باز کہہ کر گستاخی کرنا ہے اور نمازوں میں گالی بکنے کے جواز کا اتہام ہے۔

مذکورہ آیات اور احادیث کی روشنی میں قاتلان آل رسولؐ اور اذیت دہندگان علیؑ و بتولؑ پر لعنت وتبرا خدا نے کیا ہے، رسولؐ نے لعنت وتبرا کیا ہے۔ شیعوں کا مذہبی حق ہے، انصاف وعدالت کا فتویٰ ہے کہ ظالم سے نفرت اور مظلوم سے ہمدردی ہو۔ بیشک علیؑ وآل علیؑ پر جو ظلم ومصائب کے پہاڑ توڑے گئے وہ عالم کی تاریخیں پکار رہی ہیں تو شیعوں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا

ہے جو شہادت امام حسینؑ سے بڑھ جاتا ہے۔

شیعوں کے اس اصول کی موافقت مذہب صوفیہ نے بھی کی ہے۔ اکابر علماء جو مشائخ صوفیہ دشمنان آل رسولؐ پر لعنت ونفرین کو واجب سمجھتے، اور کتابوں میں لکھتے اپنے مریدوں کو حکم دیتے بخلاف منافقین مسلمین۔ دیکھو لعن کفر کے فتوے علمائے صوفیہ کے تفسیر روح المعانی علامہ سید آلوسی، ابن الجوزی، سید سمہودی جواہر العقدین اور اتحاف لحب الاشراف میں اور فتاویٰ مولانا عبدالعلی فرنگی محلی سب نے قاتلان امام حسینؑ یزید اور ان کے ساتھیوں پر متحدہ ومتفقہ فتوے لعن وتبرے کے دیئے ہیں۔

(۴۱)

خلیفہ معاویہ بن یزید

یزید کے مرنے کے بعد ان کا بیٹا معاویہ خلیفہ ہوا، انھوں نے تخت پر بیٹھتے ہی شاہی پہلے خطبہ میں اپنے باپ دادا کی بدکاریوں اور غصب خلافت کا پُرزور تذکرہ کرتے ہوئے خلافت سے دست برداری کی اور دربار سے اُٹھ کر اپنے حجرے میں چلے گئے، اور عبادت الٰہی میں مشغول ہوگئے چالیسویں روز اسی اعتکاف میں انتقال کیا۔

(صواعق محرقہ، حیوۃ الحیوان دمیری، خمیس دیار بکری)

(۴۲)

خلیفہ مروان بن حکم

۶۴ھ میں معاویہ بن یزید کی خلافت سے دست برداری کے بعد بنی امیہ کا بوڑھا آدمی مروان خلیفہ کیا گیا۔ آپ کے کارنامے عثمان کے قتل کے تاریخوں میں مشہور ہیں، آپ شریر ومفسد مشہور تھے۔

ضحاک کو دھوکے سے بلاکر قتل کیا اور حمص و فلسطین کی بغاوت کا خاتمہ کیا۔ یزید کی بیوی خالد کی ماں سے سیاسی عقد کیا، خلیفہ صاحب بے حد گالیاں بکتے تھے، ایک روز خالد کی ماں کی شرمگاہ کی بھرے دربار میں ہجو کی، جس کی پاداش میں خالد کی ماں نے سوتے میں گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ ۶۵ھ میں آپ مرے۔

بغاوت اهل کوفه

۶۱ھ میں بعد شہادت امام حسینؑ کے کوفی امام کی مدد نہ کرنے پر پشیمان ہوئے اور متفقہ طور پر تجویز ہوئی کہ بنی امیہ سے خون حسینؑ کا بدلہ لیا جائے۔ عوام کوفہ نے سرداروں کو جمع کیا اور قتل امام کی عظمت پیش کی، اور اپنی مدد نہ کرنے کا تاسف کیا، متفقہ فیصلہ ہوا کہ انتقام خون حسینؑ کے لئے اُٹھنا چاہئے۔ سلیمان بن صرد خزاعی لیڈر مقرر ہوئے اور دور و دراز ملکوں میں شیعوں کے پاس انتقام خون حسینؑ کے لئے وفود روانہ ہوئے، سب نے بخوشی شرکت کا وعدہ کیا۔ طے پایا کہ سب کو پہلے توبہ و استغفار لازم ہے، پھر میدان عمل میں قدم دھرنا چاہئے، تمام مجمع نے سر جھکا کر خلوص دل سے توبہ کی اور تلواریں نیام سے نکال کر نیزے بلند کئے، اور ایک زبان اعلان کیا کہ ہم دنیا کو قاتلان اولاد رسولؐ سے پاک کر دیں گے، اور امام زین العابدینؑ کو خلیفہ بنائیں گے۔

قریب موت خلیفہ مروان ۶۵ھ میں سلیمان بن صرد خزاعی کی زیر کمان فوج کشی شروع کر دی۔ ان لوگوں کا مقصد یہ تھا کہ مروان اور عبداللہ بن زبیر کو ساتھ ہی تخت سے اُتار دیں۔ لوگوں نے باصرار سلیمان سے کہا کہ توقف کریں تاکہ کافی فوج اور روپیہ جمع ہو جائے۔ سلیمان نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم دنیا طلبی کے لئے جمع نہیں ہوئے ہیں، جان جائے یا رہے، ہم خون ناحق امام حسینؑ کا ضرور بدلا لیں گے۔ یہ کہہ کر دو ہزار سواروں کو لے کر قبر امام حسینؑ پر کربلا پہنچے اور ایک شبانہ روز یہ لوگ توبہ و استغفار کرتے رہے، اور روتے پیٹتے رہے، رحمت الٰہی کے نزول

کی دعائیں کیں۔ ادھر مروان نے بسر کردگیِ ابن زیاد اس بغاوت کے فرو کرنے کے لئے ایک جرار فوج روانہ کردی۔ سلیمان کربلا سے شام کی طرف روانہ ہوئے۔ یکا یک خبر ملی کہ مروان مرگیا، اس کا بیٹا خلافت پر بیٹھا۔

(۴۳)

خلیفہ عبدالملک بن مروان

۶۵ھ میں مروان کے مرنے پر عبدالملک کو خلافت ملی۔ سلیمان شام کی سمت بڑھ رہے تھے، ابن زیاد نے بریرا ابن سلیمان کو ایک مختصر فوج دے کر مقابلہ کے لئے روانہ کردیا تھا جس نے کربلا پہنچ کر ضریح رکھے دیکھ کر اہل کربلا کو قتل کرنا اور لوٹنا شروع کردیا، عین وہیں سلیمان بن صرد اور فوج ابن زیاد سے مقابلہ ہوا۔ حصین بن نمیر بارہ ہزار فوج سے دو ہزار جانبازوں کے مقابل ہوا اور شکست کھا کر پسپا ہوا۔ دفعتاً بیس ہزار فوج کی کمک پہنچ گئی، لڑائی کا رنگ بدل گیا، سلیمان شہید ہوئے، مسیب نے فوج کا علم لیا، وہ بھی شہید ہوئے۔ عبداللہ بن سعید نے فوج کا علم لیا اور شہید ہوئے۔ رفاعہ آگے بڑھے اور شکست کھا کر مفرور ہوئے۔

عبداللہ بن زبیر

معاویہ بن سفیان کے مرنے پر عبداللہ بن زبیر نے مکہ پر قبضہ کرلیا تھا اور قتل امام حسینؑ سے فائدہ اٹھا کر بصرہ اور کوفہ پر بھی اثر جما لیا تھا۔ کچھ دنوں سے حکومت مکہ پر مطمئن جمے بیٹھے تھے۔

مختار ابن ابوعبیدہ ثقفی جو ہجرت کے پہلے ہی سال پیدا ہو چکے تھے اور صغرسنی سے باپ کے ساتھ لڑائیوں میں رہتے تھے اور شہرت حاصل کر چکے تھے۔ دوستی امام حسینؑ میں عبیداللہ

بن زیاد کی قید سخت میں گرفتار ہو گئے تھے اور قید سخت سے یہ حالت ہو گئی تھی کہ داہنے اور بائیں نہ مُڑ سکتے تھے۔

شہادت امام حسینؑ کے بعد قید سے چھوٹ کر نکلے اور عبداللہ بن زبیر کی کمک کو مکہ پہنچے، لیکن عبداللہ کے چند شرائط ناقابل قبول پاکر کوفہ واپس آئے اور ۶۶ھ میں محمد بن حنفیہ ابن علیؑ مرتضیٰ کے لئے فوج جمع کرنا شروع کر دی، جناب محمد حنفیہ نے باصرار مختار کو اس خونریزی سے روکا لیکن مختار نے انتقام خون حسینؑ سے دست کشی نہ کی اور کوفہ میں برابر فوج جمع کرتے رہے۔ عبداللہ بن زبیر کا کوفہ پر تسلط ہو گیا تھا، اور عبداللہ بن مطیع گورنر کوفہ تھا۔

عبیداللہ ابن زیاد زبیریوں سے جنگ مکہ میں اُلجھا ہوا تھا۔ عبداللہ بن مطیع نے مختار کو پھر گرفتار کر کے قید کر دیا۔ کوفیوں نے قید خانے پر یورش کر کے مختار کو قید سے چھڑا لیا۔ اور عبداللہ بن مطیع کوفہ سے بھاگ گیا، اور مکہ میں عبداللہ بن زبیر سے جاملا اور جب تک ابن زیاد زبیری فوجوں میں اُلجھا رہا مختار نے کوفہ میں قوت حاصل کر لی، اور تین ہزار سپاہ یزید ابن انس کی سرکردگی میں ابن زیاد کے مقابلہ میں روانہ کر دی۔ اس عرصہ میں بایزید سخت بیمار ہو گئے، لیکن موصل پہنچ کر چھ ہزار سپاہ ابن زیاد سے مقابلہ ہوا اور سب کو شکست دی۔ تین سو قیدی گرفتار کر کے بایزید کی خدمت میں لائے گئے۔ بایزید کے دم واپسیں پر یہ قیدی پہنچے، بایزید نے فوج کا افسر ''زوفا'' کو کر دیا تھا، ''زوفا'' نے تمام قیدیوں کو قتل کر دیا۔ بایزید کا بھی انتقال ہو گیا۔

زوفا نے مختار سے کمک مانگی ۶۷ھ میں سات ہزار فوج مختار نے اور روانہ کی، ابراہیم مالک اشتر کو افسر مقرر کیا۔ یہ فوج ابھی ایک منزل کوفہ سے آگے بڑھی تھی کہ قاتلان امام حسینؑ نے کوفیوں کو دھوکا دیا، اور کہا کہ بایزید شامیوں کے ہاتھوں مارے گئے، اور اب ہم شامی اور

زبیری فوجوں میں گھر گئے ہیں۔

لہٰذا مختار کی بیعت سے کام نہ چلے گا کسی دوسرے کی بیعت کرنا چاہئے۔ لوگ مختار کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ ہوگئے۔ مختار نے چالاکی سے ابراہیم کی فوج کو خفیہ واپس بلایا اور کوفہ میں قتل عام شروع کردیا، چالیس قاتلان امام حسینؑ جو سازشی تھے قتل ہوئے۔ پھر سب نے اطاعت کی۔ (تاریخ طبری)

چار ہزار قاتلان امام حسینؑ اس وقت چین کی زندگی کوفہ میں بسر کررہے تھے جن میں پسر سعد، شمر، خولی بھی تھے۔ لوگوں نے مختار کو مشورہ دیا کہ پہلے ان قاتلوں کا استیصال ہونا چاہئے پھر ابن زیاد کی خبر لے لیں گے۔ مختار نے گرفتاری قاتلان امام کا حکم دے دیا، اور ہزاروں کو تہہ تیغ کیا۔ بعض بھاگ کر بصرے میں پناہ گزیں ہوئے۔

جب مختار کوفہ کو قاتلان امام سے پاک کرچکے تو فی الفور ابراہیم کو موصل روانہ کردیا اور شرط اللہ کو برکت کا موجب سمجھ کر فوج کے ساتھ کردیا۔ نہایت جوش وخروش سے ابراہیم شرط اللہ کو لئے یلغار کرتے موصل روانہ ہوئے، اور خود ابن زیاد کی فوج سے مقابلہ ہوگیا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی، اور ابن زیاد مارا گیا۔ سر کاٹ کر مختار کے پاس لایا گیا، اور ابراہیم بن مالک موصل کے حاکم ہوئے۔ عبیداللہ کا سر خاص اسی دروازے پر شہر کے لٹکایا گیا جہاں چھ سال پیشتر سرفرزند رسولؐ کا اسی عبیداللہ نے لٹکایا تھا۔

عبداللہ بن زبیر بجائے اس کے کہ خون امام حسینؑ کے انتقام میں مدد دیتے اور بنی امیہ کا خاتمہ کرتے اپنی خلافت کے خطرے میں پڑ کر امام حسینؑ کے بھائی محمد حنفیہؓ کو جو بخیال حج مکہ آئے تھے، یہ خلیفہ زادہ صحابی زادہ رسولؐ کا بھتیجا مسافر حاجی، ابن زبیر کا مہمان جنگ و پیکار کے لئے نہ آیا تھا۔ ان کا طرفدار مختار بھی زبیریوں سے برسرِ پیکار نہیں تھا۔ لیکن ابن زبیر علیؑ کے

فرزند کو بیعت یا قتل پر اسی طرح مجبور کرتے ہیں جیسے یزید حسینؑ کو، محمد حنفیہؒ ایک سال کی مہلت غور وفکر کے لئے چاہتے ہیں۔ ابن زبیر ایک ساعت کی مہلت کے لئے تیار نہیں۔

محمد حنفیہؒ سیرت رسولؐ یاد دلاتے ہیں، فتح مکہ کے بعد صفوان نے رسولؐ خدا سے سال بھر کی مہلت مانگی تھی، رسولؐ نے اس کافر کو مہلت دی اور میں تو علیؑ کا فرزند ہوں۔

لوگوں کے سمجھانے بجھانے سے علیؑ کے فرزند کو دو ماہ کی مہلت دے کر مع بال بچوں کے قید کیا جاتا ہے۔ محمد حنفیہؒ مختار کو مخفی اپنی قید کا حال لکھتے ہیں۔ مختار ایک ہزار فوج لے کر چپ چپاتے مکہ میں داخل ہوتا ہے اور پہرہ داروں کو قتل کر کے محمد حنفیہؒ اور ان کے ساتھیوں کو قید سے چھڑا کر مدینہ پہنچا دیتا ہے، اور خود کوفہ واپس آتا ہے۔ ابن زبیر بھڑک اُٹھتے ہیں اور عراق پر فوج کشی کر دیتے ہیں۔

اب مروانیوں پر حسینیوں کے قتل کو ترجیح ہو جاتی ہے مصعب بن زبیر کو جو بصرے کے عبداللہ بن زبیر کی طرف سے گورنر تھے اور ان کو اور بعض ایرانی حاکموں کو مختار سے جنگ کے لئے روانہ کیا جاتا ہے۔ ایران سے ''مہلب'' اور بصرے سے مصعب بلائے ناگہانی کی طرح ۷۱ھ میں مختار پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

کوفی مختار کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور مختار نوے آدمیوں سے اس جرار فوج کا مقابلہ کر کے شہید ہو جاتے ہیں۔ چھ ہزار کوفی جو مصعب کے وعدے پر جان بچا کر بیٹھ رہے تھے مصعب نے سب کو قتل کر دیا جس پر بوقت ملاقات عبداللہ بن عمر نے مصعب پر ملامت کی اور سیرت رسولؐ یاد دلائی جناب عبداللہ بن علیؑ بن ابی طالب اسی جنگ میں شہید ہوئے۔

(مقاتل الطالبین)

عبدالملک بن مروان نے ۶۷ھ میں کوفہ پر فوج کشی کی، مصعب بن زبیر عبداللہ بن

زبیر کی طرف سے فوج لے کر نکلے اورلڑے، لیکن مختار کے چچا ''بریدہ'' بخیال انتقام خون مختار عبدالملک کے شریک ہو گئے تھے۔ مصعب کو قتل کر کے سر کاٹ کر نعرہ مارا کہ'' آج مختار کا بدلا ملا'' زبیری اقتدار کا کوفہ سے خاتمہ ہوا، عبدالملک نے ''بریدہ'' کو ایک ہزار اشرفی دینا چاہی جس کے لینے سے بریدہ نے انکار کر دیا، اب عراق عبدالملک کا مطیع ہو گیا۔ مہلب عبداللہ بن زبیر کے فدائی عبدالملک سے رشوت لے کر ''اہواز'' کے باغی ہو گئے، ایران بھی قبضہ عبداللہ بن زبیر سے نکل گیا۔ اب عبدالملک نے حجاج کی سرکردگی میں مکہ پر حملہ کر دیا عبداللہ بن زبیر کا بھی خاتمہ ہوا، مکہ آٹھ ماہ سات یوم محصور رہا عبداللہ بن زبیر کا سر کاٹ کر شام روانہ ہوا اور نعش کو لکڑی سے باندھ کر چند روز لٹکا رکھا۔ عبداللہ بن زبیر نو سال مکہ پر قابض رہے اب تمام عرب نے عبدالملک کی خلافت کو تسلیم کر لیا۔

عبدالملک ۶۵ھ میں خلیفہ ہوا تھا اس نے خطبہ میں کہا کہ عثمان بن عفان کمزور اور معاویہ مکار تھے۔ (عقدالفرید، ص ۲۲۸)

عبدالملک نے اپنے بیٹوں ولید اور سلیمان کی بیعت لینا شروع کی۔ سب مدینہ والوں نے بیعت کی۔ لیکن سعید بن مسیب نے بیعت نہیں کی جن کو ٹاٹ کے کپڑے پہنا کر کوڑے لگائے گئے۔ (عقدالفرید، ص ۳۳۸)

دیکھنے کی بات ہے کہ ایک خلیفہ دو خلیفوں کو برا کہتا ہے، لیکن نہ ان کی خلافت پر حرف آتا ہے نہ ان کی خلافت پر جن کو برا کہا گیا ہے۔ پھر ایک وقت میں دو خلیفہ بن رہے ہیں اور کسی کو بیعت میں عذر نہیں ہوتا ہے۔ یہ ہے اصول پرستی، یا دنیا پرستی شیعوں کے لئے یہ زمانہ بدترین زمانہ تھا۔ کسی کی جان و مال محفوظ نہ تھی۔ حجاج نے زن و مرد سے قید خانے بھر دیئے تھے، شیعوں کی کھالیں کھنچوالی تھیں۔ کربلا کا راستہ بند کر دیا تھا تا کہ شیعہ زیارت امام حسینؑ کو نہ جانے پائیں

اور کسی کی مجال نہ تھی کہ کربلا کا مجاور ہو سکے۔

عبدالملک اکیس سال سلطنت کر کے ۸۶ھ میں مرا۔

(۴۴)

خلیفہ ولید بن عبدالملک

۸۶ھ میں تخت نشین ہوا۔ سعید بن جبیر انھیں کے عہد میں حجاج کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ دست و پا کاٹ کر جسم کو سولی دی گئی اور کھال جسم سے اُتاری گئی۔

امام زین العابدینؑ

۳۸ھ میں پیدا ہوئے۔ کربلا کوفہ اور شام کی مصیبتیں اور قید جھیل کر مدینہ میں خاموش زندگی بسر کر رہے تھے۔ اپنے اصحاب کو تعلیم علوم فرماتے اور ہر جنگ و شورش سے علیحدہ رہتے۔ کسی سازش میں کبھی شرکت نہ کی، بلکہ شیعوں کو سختی سے جنگ و خونریزی سے روکتے، اس لئے کہ اصول ائمہؑ ملک گیری و فتحمندی نہ تھا، بلکہ ان کا اصول صرف کثرت نفوس اور افزائش پرستاران مذہب تھا۔ کب ممکن تھا کہ وہ جان دینے کی اجازت دیتے۔

اس خاموش گوشہ نشین ہستی کو زہر دے کر شہید کیا۔ محرم ۹۵ھ میں شہادت ہوئی۔ ولید نے دس سال حکومت کی ۔ ۹۶ھ میں مرا۔ (تاریخ طبری، عقد الفرید، حلی الایام، کامل ابن اثیر)

(۴۵)

خلیفہ سلیمان بن عبدالملک

ربیع الاول ۹۶ھ میں تخت نشین ہوا، اور صفر ۹۹ھ میں دو سال دس ماہ پندرہ یوم حکومت کر کے مرا۔ یہ بڑا پیٹو خلیفہ تھا، سیب اور انڈوں کے ٹوکرے خالی کر دیتا تھا، تخمہ ہو کر مرا۔

(طبری، کامل بن اثیر، عقد الفرید)

سنت امیر معاویہ کو انھوں نے پھر زندہ کیا، امیر المومنین علیؑ مرتضیٰ کو مسجدوں میں گالیاں دی جاتی تھیں، انھوں نے عبداللہ بن محمد بن علیؑ بن ابی طالب کو قید کیا پھر زہر دے کر شہید کیا۔ (مقاتل الطالبین) اس نے بذریعہ وصیت نامہ عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ کیا۔

(۴۶)

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز

یہ ایک دیندار، خداترس، نیک بخت خلیفہ تھا۔ اس نے گذشتہ مظالم و بدعات کا خاتمہ کیا۔ باغ فدک شاہی قبضہ سے نکال کر دست برداری کی۔ (عقد الفرید، ج ۲ ص ۲۴۵)

انھوں نے مسلمانوں کو کفار کی وضع قطع بنانے کی ممانعت کی، انھوں نے مروانیوں کو ان کے بزرگوں کی غصب کردہ جائدادوں کی واپسی کا حکم دیا۔ بنی امیہ کے مظالم کا عوض لیا، معاویہ کے وقت کی جاری شدہ بدعت یعنی حضرت علیؑ کو منبروں پر لعنت کرنے کو روکا انھوں نے ارادہ کیا کہ خلافت بنی فاطمہؑ اور اولاد علیؑ کو واپس کردیں، بنی امیہ کو جب اس ارادے کی خبر ملی تو قتل کی سازش کی، اور یزید بن عبدالملک بن مروان نے نوکر کے ذریعہ ان کو زہر دلا دیا۔

(عقد الفرید ج ۲ ص ۲۴۷)

۱۰/ ماہ صفر ۹۹ ہجری روز جمعہ تخت نشین ہوئے تھے اور رجب ۱۰۱ھ میں وفات ہوئی۔

(۴۷)

خلیفہ یزید بن عبدالملک

۱۰۱ھ میں خلیفہ ہوا، اور ۱۰۵ھ میں مرا۔ یہ بڑا خونی، عیاش مزاج، خود پسند خلیفہ تھا۔ چار سال دور حکومت میں عشق بازی اور قتل شیعیان علیؑ میں بسر کی ان کی موت کا عجیب واقعہ ہے۔ ''حبابہ'' یا ''عالیہ'' ایک لونڈی سے کھیل رہے تھے، انگور اُچھالتے لونڈی منھ میں روکتی۔ اور لونڈی انگور اچھالتی اور خود منھ میں روکتے۔ اتفاقاً ایک انگور لونڈی کے حلق میں پھنسا اور دم بند

ہو کر مرگئی۔ یزید نے لاش دفن نہ کی اور میت سے بد فعلی کرتے رہے اور اسی سبب سے مرے۔

(عقد الفرید)

(۴۸)

خلیفہ ہشام بن عبد الملک

یہ خلیفہ نہایت تند مزاج، جابر وظالم تھا۔ بیس سال عیش وعشرت میں کاٹی، حج کو گیا تو چھ سو اونٹ اس پوشاک کے ہمراہ تھے جو روزانہ استعمال ہوتے تھے۔ ہشام کی طرف سے یوسف بن عمر کوفہ اور بصرے کا حاکم تھا۔

زید شھید

زید ابن امام زین العابدینؑ خانہ نشین اور عابد و پرہیز گار تھے، اور کوفہ میں مقیم تھے۔ تمام کوفی آپ کی کمال عزت کرتے تھے۔ حاکم کوفہ نے اندیشہ کیا کہ آپ کا رسوخ اور اثر حکومت میں انقلاب نہ پیدا کردے۔ اس لئے کوفہ سے آپ کو شہر بدر کیا۔ ایک لاکھ کوفیوں نے امداد کا وعدہ کیا، لیکن امام زادے نے قبول نہ کیا، اور کوفہ چھوڑ کر دشت سالم میں معاویہ بن زید بن حارث کی سرا میں ایک سال مقیم رہے۔

یوسف بن عمر حاکم کوفہ نے تہمت لگائی کہ زید اہل موصل کو اپنی مدد کے لئے دعوت دے رہے ہیں۔ اس الزام پر اس نے امام زادے پر فوج کشی کردی۔ جناب زید نے دو ہزار ہمراہیوں کے ساتھ مقابلہ کیا، ۱۲۱ھ میں سب شہید ہوئے۔ شیعوں نے آپ کو دفن کر کے قبر کو پوشیدہ کر دیا۔ لیکن یوسف نے قبر سے نکال کر سرتن سے جدا کر کے لاش کو سولی دی، اور یہی ساتھیوں کے ساتھ کیا۔

یحییٰ بن زید

جناب زید کی شہادت کے بعد ان کے فرزند یحییٰ خراسان بھاگ گئے۔ مگر جہاں جاتے آپ کو کوئی

ٹکنے نہ دیتا۔ جنگلوں میں مارے مارے پھرتے۔ آخر ابو حمص کی سرا میں بحالت تباہ مقیم ہوئے۔

یوسف بن عمر کا خط نصر بن یسار حاکم خراسان کو ملا کہ یحییٰ کو ڈھونڈھ کر گرفتار کرو۔ نصر کو آپ پر رحم آ گیا اور وہاں سے بھگا دیا۔ آپ گرگان کو بھاگ گئے۔ وہاں بھی تلاش ہو رہی تھی۔ وہاں سے بلخ بھاگے۔ عقیل حاکم بلخ نے گرفتار کیا۔ ہشام کو اس وقت آپ کے قید ہونے کی خبر ملی جب وہ دم توڑ رہا تھا۔

امام محمد باقر علیہ السلام

یہ امام ۶۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ کربلا میں آپ کی عمر تین سال کی تھی۔ وفات ۷۳۱ء میں ہوئی۔ آپ بھی کربلا کے مصائب جھیل کر مدینہ میں گوشہ نشین تھے اور بجز علمی مشاغل اور عبادت الٰہی کوئی شغل نہ تھا۔ باوجود اس کے ہشام نے عام اعلان کر دیا تھا، کوئی شخص امام سے نہ ملے، اس لئے کہ یہ اولاد علیؑ ہونے کی وجہ سے مشہور ساحر ہیں، اس لئے کوئی روادار نہ تھا کہ امام یا ان کے رفیقوں کو مہمان کر سکے۔ ہشام نے اس خاموش ہستی کو زہر دے کر قتل کیا۔ ستاون سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی۔ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

ہشام کے عہد میں جناب عبداللہ بن محمد بن علی بن حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب کو بنی امیہ نے زہر دے کر شہید کیا۔

ہشام شعبان ۱۰۵ھ میں تخت نشین ہوا اور ربیع الاول ۱۲۵ھ میں مرا۔

(۴۹)

خلیفہ ولید بن یزید بن عبدالملک

ربیع الثانی ۱۲۵ھ میں تخت نشین ہوا، اور جمادی الثانی ۱۲۶ھ میں مرا۔ ان سے کوئی گناہ نہیں چھوٹا۔ اپنی لڑکی تک سے زنا کیا۔ شرابخواری، زنا کاری، لہو ولعب اور شکار آپ کا مشغلہ

تھا، خلیفہ عثمان کی پوتی ''سعدی'' پر عاشق ہوئے، نکاح کیا، پھر طلاق دی اور ان کی بہن ''سلمیٰ'' پر عاشق ہوئے اور شادی کی۔ (عقدالفرید)

جناب یحییٰ بن زید شہید حاکم بلخ کی قید میں تھے، ولید نے حاکم خراسان ''نصر'' کو لکھا کہ یحییٰ کو قید سے رہا کر کے عراق بھیج دے۔ نصر نے یحییٰ کو رہا کیا، اور دس ہزار درہم دے کر روانہ کیا۔ جناب یحییٰ نیشاپور پہنچے تھے، وہاں کے حاکم ''عمر بن زرارہ'' نے یہ خیال کر کے کہ آپ قید سے فرار ہوئے ہیں دس ہزار فوج لے کر مقابلہ کیا۔

جناب یحییٰ نے ہر چند سمجھایا اور فرمایا کہ وہ نصر با خود ولید سے دریافت کر لے اور اس وقت تک میری نگرانی کرے لیکن اس نے ایک نہ سنی، اور جنگ شروع کر دی۔ جناب یحییٰ بھی مجبور ہوئے، اور جہاد شروع کر دیا، آپ کے بھائی ابوالفضل کے ہاتھوں عمر بن زرارہ قتل ہوا، شہر پر قبضہ ہو گیا نصر یہ خبر سن کر ایک عظیم فوج کے ساتھ چڑھ دوڑا۔

جناب یحییٰ نے اصل واقعہ سمجھایا، مگر اس نے ایک نہ سنی اور حملہ کر دیا۔ جناب یحییٰ اور ابوالفضل ۱۲۵ھ میں شہید ہوئے۔ ان کی لاشیں گرگان میں منظر عام پر سولی دی گئیں۔ اور اس وقت تک سولی پر لٹکی رہیں، جب تک ابومسلم خراسانی ان ملکوں پر قابض ہوا، اس نے لاشیں سولی سے اتار کر کفن و دفن کیا۔ سلیمان بن ہشام نے ولید سے بغاوت کی، ولید نے اس کو گرفتار کر کے ڈاڑھی موچھیں منڈوا کر شہر بدر کر دیا۔ ولید نے خالد بن عبداللہ قشیری مجتہد وقت کو قتل کیا اور قرآن پر تیراندازی کر کے بے حرمتی کی۔ آخر امراء شہر نے سازش کر کے خلیفہ کو قتل کر دیا۔

(۵۰)
خلیفہ یزید بن ولید بن عبدالملک

رجب ۱۲۶ھ میں تخت نشین ہوئے اور چھ ماہ بعد ذی الحجہ ۱۲۶ھ میں مرے۔ آپ

بانکے سپاہی تھے۔عید کی نماز ہتھیار باندھ کر پڑھتے تھے۔آپ کا لقب یزید ناقص تھا۔مرتے وقت بجائے کلمہ شہادت فرماتے تھے ''واحسرتاہ وااسقاہ''۔

(۵۱)

خلیفہ ابراہیم بن ولید بن یزید بن عبدالملک

۱۲۶ھ میں انھوں نے دومہینہ بھی سلطنت نہ کی تھی کہ مروان بن مروان بن حکم نے ان سے تخت وتاج چھین لیا۔اس عہد میں خوب خانہ جنگیاں ہوئیں بادشاہوں کی لاشیں قبر سے نکال کر سولیوں پر چڑھائی گئیں، خاندان خلافت میں خانہ جنگیاں ہوئیں۔

(عقدالفرید، تاریخ طبری، جلی الایام)

(۵۲)

خلیفہ مروان الحمار

۱۲۶ھ میں خلیفہ ہوئے، اور آخری تاجدار بنی امیہ کے تھے۔ ان کے زمانے میں چہارطرف بغاوت پھیلی۔ ایک طرف سلیمان بن ہشام، دوسری طرف عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابوطالبؑ جو ۱۲۷ھ میں شہید ہوئے۔ تیسری طرف ضحاک، چوتھی طرف یمن کے طالب حق۔

اس پر طرہ ابومسلم خراسانی سیاہ لباس پہنے، سیاہ جھنڈے لئے بنی عباس کے لئے خفیہ بیعت لے رہے تھے۔ مروان الحمار قریب مصر ذی الحجہ ۱۳۲ھ میں مارے گئے۔ سر کاٹ کر ابوالعباس عباسی کے پاس بھیجا گیا،اور خلافت بنی امیہ کا خاتمہ ہوگیا۔ (عقدالفرید)

(۵۴)

خلیفہ ابوالعباس سفاح عباسی

۱۳۲ھ میں خلیفہ ہوا۔ ابومسلم خراسانی نے امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں خط لکھا کہ آپ ہمارا ساتھ دیں تاکہ ہم بنی امیہ کے تخت وتاج کا خاتمہ کردیں۔ امام نے بغیر خط کھولے نذر آتش کیا اور قاصد سے فرمایا اس خط کا یہی جواب ہے۔

بنی عباس و بنی امیہ میں جنگ چھڑ گئی اور ۷۵۰ء میں ''زاب'' کی جنگ میں مروان الحمار کو شکست ہوئی۔ وہ مصر بھاگ گیا۔ لیکن اس کے دشمنوں کو خبر مل گئی، اور اس کو قتل کردیا۔ سفاح کی خلافت مسلم ہوگئی، اس نے بنی امیہ کو چن چن کر قتل کیا۔ ایک بچہ بنی امیہ کا زندہ نہ چھوڑا۔ شاہان بنی امیہ کی لاشیں قبروں سے نکال کر جلا دیں۔

ابومسلم خراسانی نے جناب عبیداللہ بن حسین بن علی بن امام حسینؑ کو زہر دے کر شہید کیا۔

(مقاتل الطالبین)

سفاح نے حکم دے دیا جہاں کہیں شیعہ علیؑ ہو قتل کردیا جائے۔ کوفہ میں تمام شیعوں کے گھر مسمار کردیئے گئے۔ تمام شیعہ قتل کردیئے گئے۔ چند عورتیں اور بچے بھاگ کر ہسپانیہ پہنچے اور وہی بچ سکے۔

۱۲ ذی الحجہ ۱۳۶ھ کو مرض چیچک سے سفاح مرا اپنے بھائی منصور کو خلیفہ کیا۔

(۵۴)

خلیفہ منصور عباسی

ذی الحجہ ۱۳۶ھ میں منصور خلیفہ ہوا اس نے شیعوں کے قتل عام کا حکم دیا۔ خانہ تلاشی کر کے جس شیعہ کو پایا قتل کیا۔ اس کے حکم سے گورنر مدینہ نے شیعیان و اولادِ علیؑ کو گرفتار کر کے کوفہ بھیجا جو بنی عباس کا اس وقت پایۂ تخت تھا۔ یہاں کل اولادِ علیؑ قید خانے میں بھر دیئے گئے، یہ اس لئے کہ بنی عباس کو بھی بنی امیہ کی طرح یقین تھا کہ کوئی اگر ہماری اطاعت نہ کرے گا تو وہ اولادِ علیؑ ہی ہوگی۔ اس لئے کہ انکا تقدس و زہد و علم ہمیشہ ہمیشہ لوگوں کو اپنی طرف جذب کرتا رہتا تھا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام

۸۰ھ مطابق ۶۹۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۴۸ھ مطابق ۷۶۵ء میں شہید ہوئے اور قبرستان بقیع میں دفن ہوئے۔ آپ کا زمانہ نہایت پر آشوب تھا، اس لئے کہ اس زمانے میں خلافت بنی امیہ کا زوال اور خلافت بنی عباس کی بنیاد پڑی تھی۔

منصور کے حکم سے امام کا گھر جلوا دیا گیا۔ باوجودیکہ امامؑ نے کبھی ملک و سلطنت کی خواہش نہیں کی، نہ کسی سازش میں شریک ہوئے۔ ساری عمر گوشہ نشین رہے۔ صرف نشر علوم رسالتی آپ کا مشغلہ تھا۔ بنی امیہ اور بنی عباسیہ کی باہمی آویزش سے آپ کو کچھ مہلت ملی تو اس قدر دین حق کی ترویج کی کہ مذہب شیعہ آپ کے نام سے مذہب جعفری مشہور ہو گیا۔

منصور نے گورنر مدینہ کو حکم دیا کہ امام کو زہر آلود انگور کھلا کر شہید کرے۔ دھوکہ دے کر امام کو زہر آلود انگور کھلائے گئے۔ آپ شہید ہوئے اور اپنے فرزند امام موسیٰ کاظمؑ کو اپنا جانشین کیا، ساٹھ سال کی عمر میں شہادت ہوئی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

خلیفہ منصور کے زمانے کی سادات کشی کی فہرست بہت طولانی ہے۔ شیعیان علیؑ و آل علیؑ کو

چن چن کر قتل کیا گیا، تاریخ جن ناموں کو پیش کرتی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) جناب عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ علم و فضل و کرم میں مشہور اور سردار بنی ہاشم تھے۔ ان کو اور ان کے بھائیوں اور ساتھیوں کو مدینہ سے قید کرا منگایا اور قید خانے میں شہید کیا۔

(۲) حسن بن حسن بن امام حسنؑ علمائے مذہب وزہاد، متورعین میں سے تھے قید میں شہید ہوئے۔

(۳) ابراہیم بن حسن بن امام حسنؑ۔

(۴) ابوبکر بن حسن بن امام حسنؑ۔

(۵) اسماعیل بن ابراہیم بن امام حسنؑ۔

(۶) اسحاق بن ابراہیم بن امام حسنؑ۔

(۷) علی بن حسن بن حسن بن امام حسنؑ خاضع و خاشع وزاہد، قید کر کے شہید کیا۔

(۸) ابوجعفر عبداللہ بن حسن بن حسن بن امام حسنؑ قید میں شہید ہوئے۔ مذکورہ حضرات ایسے قید خانے میں شہید ہوئے جس کی تاریکی کی وجہ سے دن رات میں تمیز نہ تھی۔ ۱۴۵ھ میں یہ حضرات مطوق و مسلسل رہ کر قید خانے میں شہید ہوئے۔

(۹) عباس بن حسن بن حسن بن امام حسنؑ۔

(۱۰) علی بن محمد بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ۔

(۱۱) موسیٰ بن محمد بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ۔ یہ سب (حضرات) قید شدید میں شہید ہوئے۔

(۱۲) محمد بن ابراہیم بن حسن بن امام حسنؑ کو زندہ دیوار میں چنوا کر شہید کیا۔

(۱۳) عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ اور ان کے تمام گھر والوں کو مروان کے گھر کے اس تہہ خانے میں قید کیا جس میں اونٹوں کے کھانے کا باردانہ رکھا جاتا تھا۔ تین سال تک طوق و زنجیر

میں جکڑا رکھا۔ منصور کا یہ قول تھا کہ ایک شخص کا آل رسولؐ میں سے قتل کرنا بہتر ہے دس غیر شخصوں کے قتل سے۔ جناب عبداللہ کو چھت سے گرا کر کچل کر قتل کیا۔

(۱۴) یعقوب بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ۔

(۱۵) اسحاق بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ۔

(۱۶) محمد بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ سب کو قید میں شہید کیا۔

(۱۷) ابراہیم بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ کو زندہ دفن کر دیا۔

(۱۸) پسر ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ۔ خوف اعدا سے مع عیال واطفال بھاگے، اور ''مہنیہ'' کے پہاڑ پر پناہ لی، دشمنوں نے تعاقب کیا، اور حملہ کر دیا۔ یہ بیکس بھاگے، آپ کا ایک شیر خوار بچہ ماں کی گود سے پہاڑ کے نیچے آ رہا اور شہید ہو گیا۔

(۱۹) ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن حسنؑ بن امام حسنؑ اپنے زمانے میں علم وفضل وحفظ احکام وتفقہ وشجاعت وسخاوت میں افضل ترین حجاز تھے۔ اور صاحب نفس ذکیہ کہلاتے تھے، آپ کے فضائل حسنہ کے خیال سے لوگ آپ کو مہدی آل محمدؐ سمجھتے تھے۔ لیکن خود آپ اپنے کو شہید بتاتے تھے اور خاندانی لوگ کہتے تھے کہ یہ مہدی نہیں ورنہ قتل نہ ہوتے آپ کی شہادت کا ہر ایک کو یقین تھا۔ خود آپ اپنی شہادت کی خبر دیتے اور مقام شہادت بتایا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی مقام پر شہید ہوئے۔

لوگوں کو اس قدر حسن عقیدت تھی کہ کہتے تھے اگر ختم رسالت نہ ہو چکتی تو یہی نبی ہوتے۔ خود منصور نے عہد بنی امیہ میں ان سے بیعت کی تھی، اور کہا کرتا تھا کہ دین خدا میں آپ سے زائد کوئی آل رسولؐ میں عالم نہیں ہے اور نہ کوئی آپ سے زائد حقدار ولایت وخلافت ہے۔

جب آپ کو لوگ حسن عقیدت سے مہدی آل محمدؐ کہتے تو امام جعفر صادقؑ نصیحت فرماتے

تھے اور کہتے تھے کہ ان کو نہ خلافت وامامت مل سکتی ہے نہ یہ مہدی ہیں۔ ابوجعفر سفاح خلیفہ ہوگا۔ اس کے بعد منصور خلیفہ ہوگا اور محمد بن عبداللہ ''زیت'' کے پتھروں پر قتل ہوں گے اوران کے بھائی گھوڑے پر اس طرح قتل ہوں گے کہ گھوڑے کے پاؤں پانی میں ہوں گے۔

جب سفاح خلیفہ ہوا تو اس وقت لوگوں کو امامؑ کی پیشین گوئی کی صداقت کا یقین ہوا اور آپ کا لقب صادقؑ قرار پایا۔ محمد بن عبداللہ شہید ہوئے اور سر ان کا کاٹ کر منصور کو پیش ہوا۔

(۲۰) ابوجعفر حسن بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابوطالبؑ کو گرفتار کر کے منصور نے تازیانے سے خوب مارا، اور قید کر دیا۔ خلیفہ مہدی کے زمانہ تک وہ جناب قید رہے پھر رہا ہوئے۔

(۲۱) ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ نفس ذکیہ کے قتل کے بعد ان کے بیٹے عبداللہ اشتر ہند بھاگ آئے۔ لیکن منصور نے ہشام بن عمر بن بسکام ثعلبی کو روانہ کیا۔ جب وہ تعاقب کرتا پہنچا تو دیکھا کہ عبداللہ اشتر مع ہمراہیوں کے باغ میں سو رہے ہیں۔ ہشام اور اس کے ساتھیوں نے لکڑیاں مار کر سب کو قتل کر دیا، اور سر کاٹ کر منصور کو روانہ کر دیئے۔

(۲۲) ابراہیم بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ علم وشجاعت وزہد وورع میں یکتائے زمانہ تھے۔ جب ان کو خبر شہادت نفس زکیہ معلوم ہوئی تو بھائی کے خون کے قصاص کے لئے خروج کیا۔

منصور کی فوج سے مقابلہ ہوا اور زخمی ہو کر گھوڑے سے گرے ''بشیر رحال'' نے تھام کر آپ کو سینہ سے لگا لیا، اسی حال میں آپ اور بشیر قتل ہوئے۔ سر کاٹ کر نیزے پر بلند ہوا بازار میں لٹکا یا گیا۔

(۲۳) موسیٰؑ بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ کو منصور نے بلاتقصیر ایک مرتبہ اتنے کوڑے

مارے کہ آپ بے ہوش ہو گئے دوسری مرتبہ پھر پانچ سو کوڑے مارے اور قید کر دیا۔ قید میں شہید ہوئے۔

(۲۴) علی بن حسن بن زید بن حسن قید خانے میں شہید ہوئے۔

(۲۵) حمزہ بن اسحاق بن علی بن عبداللہ بن جعفر بن ابوطالبؑ قید خانے میں شہید ہوئے۔

منصور جب ۱۸۸ھ کو مکہ معظّمہ جانے لگا تو اپنے بیٹے مہدی کے نام وصیت نامہ لکھا جو کہ اس وقت ملک رے میں تھا، اور وصیت نامہ اس کی زوجہ ''ربطہ بنت ابوالعباس'' کو دیا، اور خزانے کی کنجیاں حوالے کر کے تاکید کی کہ جب تک میری موت کی خبر نہ پانا اس وقت تک مہدی کو خزانہ نہ کھولنے دینا، اور نہایت مخفی کھولنا۔

جب منصور کے مرنے کی خبر مشہور ہوئی تو مہدی اور اس کی زوجہ نے خزانے کھولے، اور ایک بہت بڑے تہہ خانے میں آل ابوطالبؑ کے مقتولوں کی کثیر جماعت پائی۔ ہر شہید کے کان میں ایک کاغذ پر ان کا نام ونسب لکھا لٹکا ہوا تھا۔ اس گروہ میں بچے، بوڑھے، جوان سبھی تھے۔ یہ دیکھ کر مہدی کانپ اٹھا، اور ایک گڑھا کھدوا کر سب کو اس میں دفن کر دیا۔

(تاریخ طبری)

یہ وہ سادات رفیع الدرجات تھے جن کا نام ونشان بھی معلوم نہ ہو سکا۔

منصور ۱۵۸ھ میں مرا، اس کی سو قبریں کھودی گئیں اس خوف سے کہ قبر پہچان کر کوئی نعش نہ نکال لے، یہی دستور تمام بنی عباس کی قبروں کا تھا کہ پوشیدہ رکھی جاتی تھیں۔ (طبری)

(۵۵)

خلیفہ مہدی عباسی

منصور کے مرنے کے بعد ۱۵۸ھ ۹/ذی الحجہ روز پنجشنبہ بغداد میں خلیفہ ہوا۔ ۱۶۹ھ میں

مرا۔ بزرگوں کی سیرت کوانھوں نے بھی خوب نباہا۔خون آل رسولؐ سے خوب ہاتھ رنگے۔

(۱) امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کومدینہ سے لاکر بغداد میں قید کیا۔

(۲) علی بن عباس بن حسن بن حسن بن امام حسنؑ کوقید کیا، پھرزہر سے شہید کیا۔

(۳) عیسیٰ بن زید بن امام زین العابدینؑ کو جوعلم وورع وزہد میں یکتائے زمانہ تھے، اور کوفہ میں علی بن صالح بن حی کے مکان میں پوشیدہ تھے شہید کئے گئے۔

(۵۶)
خلیفہ موسیٰ ہادی عباسی

۱۶۹ھ میں خلیفہ ہوا اور ان کے زمانے میں بھی شیعیان علیؑ واولاد رسولؐ قتل ہوتے رہے۔

(۱) حسین بن علی بن حسن بن حسین بن امام حسنؑ شہید ہوئے۔

(۲) سلیمان بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ۔

(۳) حسن بن محمد بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ۔

(۴) عبداللہ بن اسحاق بن ابراہیم بن حسن بن امام حسنؑ۔

(۵) حسین بن علی صاحب الفخ وہ بزرگ ہیں کہ جن کے بارے میں رسولؐ خدا نے مقام فخ میں پہنچ کر شہادت کی خبر دی تھی اور گریہ فرمایا تھا۔ موسیٰ ہادی کی فوج نے مقام فخ میں گھیر کر آپ کو قتل کیا، اور ساتھیوں کوبھی شہید کیا۔ سر کاٹ کر موسیٰ ہادی کے پاس روانہ کئے۔ اس وقت اولاد امام حسنؑ وامام حسینؑ سے اکثر لوگ دربار میں موجود تھے۔

امام موسیٰؑ بن جعفرؑ بھی تشریف فرما تھے۔ سب سروں کو دیکھ کر امام رونے لگے، اور فرمایا ''قسم بخدا حسینؑ مسلمان وصالح وروزہ دار تھے۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والے

تھے، اپنے گھرانے میں بے نظیر تھے‘‘۔

حسینؑ بن علیؑ کے اقربا کے گھر جلا ڈالے گئے، مال واسباب لوٹ لیا گیا جوان کے ہمراہ اسیر ہوکر آئے تھے، سب شہید کئے گئے۔

(۶) یحییٰ اولاد جناب حسن بن حسن بن امام حسنؑ۔

(۷) سلیمان اولاد عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ۔

(۸) ادریس اولاد عبداللہ بن حسن بن حسنؑ۔

(۹) علی بن ابراہیم بن امام حسنؑ۔

(۱۰) ابراہیم بن اسماعیل طباطبا۔

(۱۱) حسن بن محمد بن عبداللہ بن امام حسنؑ۔

(۱۲) عبداللہ اولاد اسحاق بن حسن بن علی بن امام حسینؑ۔

(۱۳) عمر اولاد اسحاق بن حسن بن علی بن امام حسینؑ۔

(۱۴) عبداللہ بن اسحاق بن ابراہیم بن امام حسنؑ۔

مذکورہ اولاد علیؑ ورسولؐ سب شہید ہوئے۔

(۵۷)

خلیفہ ہارون رشید

۱۷۰ھ میں خلیفہ ہوئے اور ۱۹۳ھ میں مرے۔ اولاد رسولؐ کی خون آشامی میں آپ نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ۱۷۲ھ میں تمام اولاد ابوطالب کو بغداد سے نکلوا دیا اور اکثر کو قتل کیا۔

(۱) یحییٰ بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ، جن کو امام جعفر صادقؑ نے وصیت بھی فرمائی تھی اور تمام گھرانے میں سب سے بہتر سمجھے جاتے تھے۔ ہمیشہ ہدایت خلق فرماتے تھے۔ آپ شہر

بشہر قریہ بقریہ مارے پھرتے، اور کئی مرتبہ قید ہوئے۔شہر دیلم میں روپوش رہے، آخر رشید نے گرفتار کرکے ایک تاریک مکان میں قید کیا۔

ایک روز قید خانہ میں ہارون آیا، اور سولکڑیاں آپ کو ماریں اور چلا گیا۔ دوبارہ پھر آیا اور سولکڑیاں ماریں اور چلا گیا، آخر زہر دے کر شہید کیا۔

بعض مورخین نے کہا ہے کہ بھوکا پیاسا شہید کیا بعض نے کہا ہے کہ درندوں کو گوشت کھلوا دیا۔ آپ کے ساتھی بارہ سال تک قید رہے، اور کچھ صحراؤں میں بھاگ گئے۔

(۲) جناب ادریس بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ افریقہ بھاگ گئے اور ''طنجہ'' اور ''بربر' اور ''فاس'' میں پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہارون رشید کو خبر ہوئی۔ اس نے ''سلیمان بن جریر جرزی'' کے ہاتھ زہر روانہ کیا۔ جس نے دھوکا دے کر وہ زہر سنگھا دیا اور آپ کو غش آگیا۔ بعض مورخین نے کہا ہے کہ زہریلی مچھلی کھلا کر شہید کیا۔

(۳) عبداللہ بن حسن بن علی بن امام زین العابدینؑ کو قید کیا۔ جعفر بن یحییٰ نے آپ کو قتل کیا۔ سر رومال میں لپیٹ کر رشید کو ہدیہ بھیجا۔

(۴) محمد بن یحییٰ بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ کو ''بکار بن عبداللہ'' زبیری نے قید کیا، اور قید خانے میں انتقال ہوا۔

(۵) حسین بن عبداللہ بن اسماعیل بن عبداللہ بن جعفر ابن ابوطالبؑ کو بکار زبیری نے اتنے کوڑے مارے کہ راہی جنت ہوئے۔

(۶) عباس بن محمد بن عبداللہ بن علی بن امام حسینؑ کو گرز مار کر رشید نے قتل کیا۔

(۷) اسحاق بن حسن بن زید بن امام حسنؑ کو قید کیا، اور قید میں انتقال ہوا۔

(۸) امام موسیٰ کاظمؑ

یہ امام مظلوم ۱۲۹ھ مطابق ۷۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۸۲ھ میں انتقال فرمایا۔ تمام زندگی عبادت میں بسر کی۔ خلیفہ مہدی نے مدینہ سے لا کر بغداد میں آپ کو قید کیا۔ ہارون رشید نے بھی آپ کو قید رکھا اور سخت ایذائیں پہنچائیں۔ بصرے میں قید کیا۔ داروغہ قید خانہ عیسیٰ نے آپ کے زہد و عبادت کو دیکھ کر ہارون رشید کو لکھا کہ امامؑ کو قید سے رہا کر یا میری نگہبانی سے نکال لے۔ (اتحاف، مقاتل الطالبین)

رشید کو غصہ آیا اور امامؑ کو بغداد بلا لیا۔ پہلے فضل بن ربیع اور بعد میں یحییٰ برمکی کی نگرانی میں قید کیا۔ پھر مختلف لوگوں کی نگرانی میں مختلف قید خانوں میں رکھا، جہاں جہاں امامؑ قید ہوتے اپنی عبادت، امن جوئی، صلح پسندی، خاموش طبیعت سے لوگوں کو مسخر کر لیتے تھے۔

ایک روز ہارون نے ایک خوبصورت عورت کو قید خانے میں بھیجا تا کہ امام کو متہم کر کے قتل کر دے۔ یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔ بالآخر ''سندی بن شاہک'' کو آپؑ کے قتل پر آمادہ کیا۔ اس نے انگوروں میں زہر دے کر آپؑ کو شہید کیا۔ (عمدۃ الطالب، فصول المہمہ)

قید خانے میں بیڑیاں ہتھکڑیاں کاٹ کر ایک تختہ پر نعش رکھ کر بغداد کے پل پر رکھوا دیا، اور منادی کرائی کہ یہ رافضیوں کا امام موسیٰ بن جعفرؑ ہے۔ شیعوں نے آپ کو غسل و کفن دے کر، نماز پڑھ کر قریب بغداد کاظمین میں دفن کیا۔ ہارون نے موسیٰ بن عیسیٰ عباسی کو کوفہ کا حاکم کیا تھا۔ اس نے بحکم خلیفہ روضۂ امام حسینؑ کو کھود ڈالا۔ ایک بیری کا درخت نشان قبر بتاتا تھا جس کی شناخت پر شیعہ زیارت کرتے تھے، اس درخت کو بھی کاٹ ڈالا۔

(۵۸)

خلیفہ مامون رشید عباسی

ہارون رشید کے فرزند اپنے بھائی خلیفہ محمد امین کو قتل کر کے ۱۹۸ھ میں خلیفہ ہوئے۔ انھوں نے بھی قتل اولاد رسولؐ میں دریغ نہیں کی۔

(۱) نصر بن شبیب حج کو نکلے۔ مدینہ منورہ پہنچے، اہلبیت رسولؐ کی تلاش شروع کی۔ اس وقت علی بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ محمد بن علی بن عبداللہ بن جعفر بن علی بن ابی طالبؑ خانہ نشین تھے۔ اور کسی کو حاضری کی اجازت نہ تھی۔ اسی طرح سے جناب عبداللہ بن موسیٰ بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ بھی خانہ نشین تھے۔ لیکن جناب محمد بن ابراہیم بن حسن بن امام حسنؑ مظالم خلفائے عباسیہ کے شاکی رہتے، اور لوگوں سے ملاقات بھی کرتے تھے۔

نصر بن شبیب ان کے پاس حاضر ہوئے اور مظالم بنی عباس و خونریزی کی شکایت کی، اور انتقام خون شیعیان علیؑ کے لئے آمادہ کیا۔ اور وعدہ لیا کہ کوفہ تشریف لائیں۔ جناب محمد نے دعوت قبول کر لی اور مع اصحاب روانہ کوفہ ہوئے۔

ادھر نصر نے اپنے قبیلہ کو جمع کیا، اور نصرت محمد بن ابراہیم کی دعوت دی۔ بعض نے وعدہ کیا اور بعض نے اختلاف کیا۔ جنھوں نے اختلاف کیا انھوں نے کہا کہ عالم بھر اولاد رسولؐ کا دشمن ہے۔ آج لوگوں نے اطاعت کی تو کل ساتھ چھوڑ دیں گے۔

آخر نصر نے مجبور ہو کر جناب محمد سے معذرت کی۔ محمد مجبوراً حجاز واپس ہو رہے تھے۔ راہ میں ابوالسرایا بن سری بن منصور'' سے ملاقات ہوئی جو مامون رشید سے باغی ہو چکے تھے اور ان کے تین غلام ''ابوالسوءل''، ''بشار''، ''ابوالہرماس'' خاص شیعیان علیؑ سے تھے، ان سے ذکر آیا۔ سب نے محمد بن ابراہیم کی اطاعت کی اور طے پایا کہ جناب محمد کوفہ روانہ ہوں۔

حسب قرار داد وہ کوفہ روانہ ہوئے اور دعوت دینا شروع کی اہل کوفہ جمع ہونا شروع ہوئے۔ ایک کثیر جماعت ساتھ لے کر جناب محمد کربلا آئے، اور قبر امام حسینؑ پر تمام شب دعا وزیارت وعبادت میں بسر کی۔ صبح کو ''زیدیہ'' کو جمع کر کے خطبہ پڑھا جس میں فضائل آل رسولؐ بیان کئے اور مظالم عباسیہ کا ذکر کیا، اور قصاص خون امام حسینؑ کی دعوت دی سب کو ساتھ لے کر پھر کوفہ روانہ ہوئے، اور پشت کوفہ پر قیام کیا۔ ان کے ساتھ علی بن عبداللہ بن حسین بن امام زین العابدینؑ بھی تھے۔

اہل کوفہ ٹڈی دل آنا شروع ہو گئے مگر غیر منظم بغیر اسلحہ محض لکڑیاں، چھڑیاں، پتھر لئے ہوئے۔ یہاں تک کہ ''ابوالسرایا'' اپنی جماعت کے ساتھ آ گئے، اور جناب محمد کو لے کر کوفہ میں داخل ہوئے۔ جناب محمد نے خطبہ پڑھا اور امام رضاؑ کی بیعت کی طرف دعوت دی۔ سب نے بیعت کر لی پھر فضل بن عباس بن عیسیٰ بن موسیٰ والی کوفہ سے جنگ شروع ہوئی، اس کو شکست دی۔

پھر زہیر نے جناب محمد پر فوج کشی کی اس کو بھی شکست ہوئی۔ ابوالسرایا فتحمند داخل کوفہ ہوئے۔ پھر عبدوس بن عبدالصمد نے ایک ہزار سوار تین ہزار پیادوں سے ابوالسرایا پر حملہ کیا، سب قتل ہوئے یا بھاگے۔ جناب محمد بیمار تھے انتقال کیا، اور علی بن عبداللہ کو اپنا جانشین کیا علی بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن جعفر بن امیر المومنینؑ یمن میں قتل ہوئے۔

(۲) محمد بن حسن بن حسن بن علی بن امام حسینؑ بھی یمن میں شہید ہوئے۔

(۳) حسین بن اسحاق بن حسین بن زید بن امام زین العابدینؑ جنگ سوس میں ابوالسرایا کے ساتھ تھے قتل ہوئے۔

(۴) حسن بن حسن بن زید بن امام زین العابدینؑ ابوالسرایا اور ''ہرثمہ'' کی جنگ میں قتل ہوئے۔

(۵) محمد بن محمد بن زید بن علی بن حسن بن علی بن ابی طالبؑ ابوالسرایا کی جنگ سے پیشتر شہید

ہوئے۔

(۶) محمد بن جعفر بن محمد بن علی بن امام حسینؑ اپنے وقت میں اولاد ابوطالبؑ کے سردار تھے، اورمرد فاضل تھے، اپنے آباء کرام سے روایت کرتے تھے، اوران سے دیگر علماء روایت کرتے تھے۔ ابوالسرایا کے زمانے میں ایک شخص نے ایک تحریر میں بنی فاطمہؑ کو نام بنام گالیاں دی تھیں، اولاد ابوطالبؑ اس تحریر کو لئے ہوئے خدمت میں جناب محمد کے لائے اور تحریر سنائی۔ آپ نے اس وقت کوئی جواب نہ دیا، اور گھر میں آکر زرہ پہنی، تلوار نکالی اور نکل گئے۔ آل ابوطالب کی ایک جماعت ساتھ ہوگئی۔ ہارون ابن مسیب سے جنگ شروع کردی۔ آپ کے ہمراہ حسین بن حسن افطس، محمد بن سلیمان بن داؤد بن حسن بن امام حسنؑ، اور محمد بن حسن معروف بسیاق، اورعلی بن جعفر بن محمد تھے۔

بعد جنگ مقام ''جبلہ'' میں قیام فرمایا، لیکن آزوقہ ختم ہونے کی وجہ سے سب متفرق ہوگئے۔ آخر محمد بن جعفر بن عیسیٰ جلودی سے امان مانگی۔ اس نے امان دی، اور تمام اولاد ابوطالب کو گھیر کر قید کرلیا۔ اونٹوں کی برہنہ پیٹھ پر سوار کرکے خراسان لے چلے۔ اہل غاضریہ نے مقام ''زبالہ'' پر فوجیوں سے جنگ عظیم کرکے قیدیوں کو چھڑالیا، اس وقت یہ قیدی خود سے حسن بن سہل کے پاس چلے گئے، اس نے اس قافلہ کو مامون رشید کے پاس خراسان روانہ کردیا، وہاں پہنچ کر محمد بن جعفر نے انتقال کیا۔

(۷) عبداللہ بن جعفر بن ابراہیم بن جعفر بن حسن بن امام حسنؑ ملک فارس کی طرف بھاگے۔ راہ میں خوارج نے آپ کو قتل کیا۔

(۸) امام رضاؑ

امامؑ کی پیدائش ۱۵۱ھ مطابق ۷۷۰ء مدینہ میں ہوئی اور ۲۰۳ھ مطابق ۸۱۹ء ملک

طوس میں وفات ہوئی۔آپ اپنے پدر بزرگوار کے جانشین تھے۔مامون رشید کے عہد میں سخت بدامنی ہوئی۔اس نے اپنے وزیر فضل بن سہل کے مشورے سے امامؑ کو مدینہ منورہ سے لاکر اپنا جانشین کیا۔

۲۰۰ھ میں آپ مدینہ منورہ سے بغداد تشریف لائے۔آپ کے فرزند امام محمد تقیؑ آپ کے ہمراہ تھے،شہر ''مرو'' میں بادشاہ سے ملاقات ہوئی، اور مامون نے امامؑ کو خلافت پیش کی۔امامؑ نے عذر فرمایا،اور صاف انکار فرمادیا۔بادشاہ نے آپ کو قتل کی دھمکی دی۔(مقاتل الطالبین) مجبوراً آپ نے اس شرط پر قبول فرمایا کہ بادشاہ کبھی خالص دنیاوی معاملات میں امامؑ کو مشورے کی تکلیف نہ دے۔ (وسیلۃ النجات)

پھر آپ نے اس طرح دعا فرمائی ''خداوندعالم تو عالم الغیب ہے، میں نے مجبور ہوکر مامون رشید کی خلافت کو قبول کیا ہے اس لئے مجھ پر عذاب نہ کرنا۔جیسا کہ تو نے حضرت یوسف اور حضرت دانیال سے باز پرس نہیں کی۔''

مامون نے ۲۰۱ھ میں بھرے دربار میں اپنی بیٹی ام حبیبہ کی آپ سے شادی کردی،اور سب نے باوجود وہ ناراضی کے امامؑ سے ظاہر بظاہر اطاعت کرلی،امامؑ کا نام خطبوں میں پڑھا جانے لگا،اور عباسی سیاہ............ کے بجائے شیعوں کے سبز علم مستعمل ہونا شروع ہوگئے،سکہ پر نام امامؑ کا اس طرح سے جاری ہوا ''مامون سلطان الدین والایمان وامیر خلیفۃ المومنین والرضاؑ امام المسلمین'' مامون نے امامؑ سے کہا کہ ماہ رمضان میں آپ ہی نماز پڑھادیں۔آپ نے انکار فرمایا،لیکن مامون نے بے حد اصرار کیا،اس وقت اس شرط سے آپ نے قبول کیا کہ میں اسی طرح سے نماز پڑھاؤں گا جو طریقہ رسول وعلیؑ مرتضیٰ کا تھا۔

مامون نے منظور کیا،امام بڑے مجمع کے ساتھ داخل مسجد ہوئے اور شیعوں کی سی نماز

جماعت بڑی آزادی سے پڑھائی۔ (فصول المہمہ وسیلۃ النجاۃ)

بغداد والوں کو خبر ہوئی تو برافروختہ ہوکر مامون رشید کے چچا ابراہیم کو مبارک کا لقب دے کر اس کی خلافت کا اعلان کر دیا، اور مامون کو تخت سے اُتار دینے اور قتل کی دھمکی دی۔ امام رضاؑ نے کل واقعات سے مامون کو خبر کی اور خواہش کی کہ میری وجہ سے مسلمانوں میں خونریزی نہ ہو لہٰذا مجھ کو دست کش ہونے دے۔ مامون نے منظور نہ کیا اور ایک فوج ابراہیم کی سرکوبی کو روانہ کی جس نے ابراہیم کو مغلوب کیا۔ لیکن ساتھی مامون کا امام رضاؑ سے رنگ بدل گیا اور امامؑ کی ذلت کے موقعے ڈھونڈھنے لگا، اور امامؑ نے اپنی شہادت کی پیشین گوئی شروع کر دی۔ کبھی فرمایا ''میری قبر ہارون کی قبر کے پاس ہوگی''، کبھی اپنے سکریٹری حسن بن عباد سے فرمایا کہ ''مجھے پھر بغداد دیکھنا نصیب نہ ہوگا''۔

ہرثمہ سے فرمایا، یہ دغاباز (مامون رشید) مجھے زہر دینا چاہتا ہے۔ کبھی فرمایا ہارون کی قبر کی پائنتی مامون مشرق کی طرف قبر مجھ کو دفن کرنا چاہے گا۔ لیکن زمین ایسی سخت ہوجائے گی کہ قبر نہ کھد سکے گی، اس وقت لوگ مامون کو مغرب کی طرف کھودنے کا مشورہ دیں گے۔ اس قبر میں پانی بھر جائے گا اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں برآمد ہوں گی پھر ایک بڑی مچھلی نمودار ہوکر سب مچھلیوں کو کھا جائے گی اور خود غائب ہوجائے گی، پانی بھی غائب ہوجائے گا۔

یہ سب پیشین گوئیاں پوری ہوئیں، اور مامون تعجب سے کہنے لگا واقعی رضاؑ امام برحق تھے۔ (فصول المہمہ، صباغ مالکی)

ایک روز مامون نے امامؑ کو بلایا اور بے حد تعظیم وتوقیر کر کے میوے کا طبق پیش کیا، امامؑ نے انکار فرمایا، لیکن مامون نے بے حد اصرار کیا، مجبوراً امامؑ نے تین انگور نوش فرمائے اور فوراً کھڑے ہوگئے۔ مامون نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے فرمایا جہاں تو بھیجنا چاہتا ہے۔

(وسیلۃ النجاۃ)

امامؑ گھر تشریف لائے اور انتقال کیا، مامون نے نہایت اہتمام سے دفن وکفن کیا، اور ظاہری غم منایا، ہارون کی قبر کے پاس دفن کیا، اور دونوں قبروں کو ایک طرح سے بنوا دیا تاکہ شیعوں کو پتہ نہ چلے کہ امامؑ کی کون سی قبر ہے۔ لیکن شیعوں نے پتہ لگا لیا، اور قبر امامؑ زیارت گاہ بنی، اور قبر ہارون ٹھکرائی جانے لگی۔ (رحلہ ابن بطوطہ)

مامون رشید نے ۲۱۲ھ میں ماہ ربیع الاول میں اعلان کیا کہ جناب علیؑ مرتضیٰ بعد رسولؐ خدا افضل خلائق تھے اور قرآن مجید مخلوق ہے جیسا کہ شیعوں کا اعتقاد ہے۔ (تاریخ طبری)

(۹) جناب ابوجعفر محمد بن عبداللہ بن حسنؑ بن علیؑ بن امام زین العابدینؑ جو ''افطس'' کے لقب سے مشہور تھے، بے خطا شربت میں زہر ملا کر پلا دیا اور شہید کیا۔

خلیفہ مامون ۲۱۸ھ میں رطب کھا کر ''طرسوس'' میں مرے۔

(۵۹)

خلیفہ ابواسحاق معتصم بن ہارون رشید

۲۱۸ھ میں خلیفہ ہوئے اور ۲۲۷ھ میں مرے انھوں نے بھی قتل سادات سے دریغ نہیں کی۔

(۱) ابوجعفر بن محمد بن قاسم بن علی بن عمر بن امام زین العابدینؑ کو تین روز تک ایک تنگ وتاریک جگہ میں جو تین ہاتھ چوڑی اور دو ہاتھ لمبی تھی قید کیا۔ پھر وہاں سے نکال کر اس سے کشادہ مقام پر قید کیا، اور لوگ نگرانی کے لئے مقرر کئے۔ ایک روز کسی طرح سے آپ قید خانے سے مفرور ہو گئے، اور پتہ نہ لگا، معتصم اور واثق کے زمانے میں آپ پوشیدہ رہے۔ متوکل نے آپ کو پھر گرفتار کیا اور قید خانے میں رکھ دیا وہیں زہر دے کر شہید کیا۔

(۲) عبداللہ بن حسن بن عبداللہ بن اسماعیل بن عبداللہ بن جعفر بن ابوطالبؑ کو صرف اس خطا

پر کہ آپ نے سیاہ کپڑے پہننے سے جو بنی عباس کا لباس تھا انکار کیا۔ سر من رائے میں قید کئے گئے اور قید خانے ہی میں آپ کی وفات ہوئی۔

(۳) امام محمد تقیؑ

۱۹۵ھ مطابق ۸۱۱ء میں پیدا ہوئے، اور ۲۲۰ھ مطابق ۸۳۵ء شہر بغداد میں شہید ہوئے اور قبر امام موسیٰ کاظمؑ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ آپ کا اسم گرامی محمد تھا لیکن کثرت جود وسخا کی وجہ سے جواد لقب ہوا، اور شدت عبادت کی وجہ سے تقی مشہور ہوئے، جو بے حد مشہور ہے۔

صغر سنی میں یتیم ہوئے، علم وفضل کی وجہ سے مامون رشید اس قدر گرویدہ ہوا کہ اپنی بیٹی ام الفضل کا آپ کے ساتھ عقد کرنا چاہا، لوگوں نے شدید اختلاف کیا۔ مامون نے علماء وفضلاء عصر کو جمع کر کے صحبت مناظرہ منعقد کی۔ سب کملاء امام سے مغلوب ہوئے۔ سب سے بڑے قاضی یحییٰ بن اکثم شیخ ترمذی بھی انتہائی شرمندہ ہوئے۔

(صواعق محرقہ، فصول المہمہ، اتحاف)

آخر کو سب عباسی مخالفت سے باز آئے اور بھرے دربار میں ام الفضل کے ساتھ امام کا عقد ہوا۔ اس شادی سے نہ امامؑ خوش تھے نہ ام الفضل بلکہ ام الفضل بنی عباس کی طرفدار تھی، اور امامؑ کی دشمن رہی، اور ہمیشہ امامؑ پر تہمتیں لگاتی۔ آٹھ سال امام بغداد میں رہے۔ پھر مدینہ تشریف لائے خلیفہ معتصم کے اغوا سے ام الفضل نے انگوروں میں امامؑ کو زہر دیا۔ پچیس سال کی عمر میں آپ نے دنیا سے رحلت کی جب آپ بغداد سے مدینہ تشریف لا رہے تھے، لوگوں نے پوچھا آپ کا جانشین کون ہوگا، امامؑ رونے لگے، اور فرمایا یہ سفر میرے لئے خطرناک ہے، میرے بعد میرا فرزند علی نقی جانشین ہوگا۔ (فصول المہمہ)

معتصم باللہ چونکہ سخت دشمن اولا درسولؐ تھے اس وجہ سے یہ اعظم الخلفاء تھے۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی) ان کے وقت میں کوئی شخص مجاورت کربلا نہ کر سکتا تھا۔

(۶۰)

خلیفہ واثق باللہ عباسی

۲۲۷ھ میں خلیفہ ہوئے اور ۲۳۲ھ میں مرے اولاد حضرت ابوطالب سرمن رائے میں اس وقت جمع تھی آپ کے عہد میں جناب علی بن محمد بن عیسیٰ بن زید بن امام زین العابدینؑ کو عمر بن ینع نے قتل کیا تھا۔

(۶۱)

خلیفہ متوکل علی اللہ عباسی

۲۳۲ھ میں خلیفہ ہوئے اور ۲۴۷ھ میں مرے، ان کے بیٹے نے قتل کیا۔

یہ خلیفہ قتل اولاد رسولؐ میں اس قدر دلیر تھا کہ بنی عباس کی روحیں بھی شرماتی ہوں گی۔ ادنیٰ ادنیٰ شبہ پر اولاد رسولؐ قتل ہوتے تھے۔ ۲۳۷ھ میں انھوں نے حکم دیا تھا کہ جو شخص زیارت امام حسینؑ کو آوے قتل کیا جائے، زائرین کے دست و پا کاٹے جاتے ''دیزج'' یہودی کو قبر امام حسینؑ بہا دینے کا حکم ہوا۔ نہر کھود کر قبر بہا دینے کی کوشش کی گئی، ہل چلا کر زراعت کا حکم دے دیا۔ (تاریخ الخلفاء)

عمر بن فرج رجی حاکم مدینہ و مکہ کو حکم دیا کہ آل ابوطالبؑ ایک دوسرے سے ملنے نہ پائیں، نہ ان کی کوئی اعانت و امداد کرنے پائے۔ بنی ہاشم کی یہاں تک حالت تباہ ہوئی کہ کنبہ بھر کے پاس ایک پیراہن تھا جس کو باری باری پہن کر ہر ایک نماز ادا کرتا تھا، اور عورتیں زمین میں گڑھے کھود کر برہنگی کو چھپاتی تھیں۔ تمام اولاد ابوطالبؑ جنگلوں، صحراؤں میں ماری ماری

پھرتی تھیں۔ بہت سی اولادعلیؑ کوقید وقتل کیا۔

(۱) ابوعبداللہ محمد بن صالح بن عبداللہ بن موسیٰ بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ کومع عیال واطفال واصحاب تین سال تک قید رکھا پھر چھوڑ دیا اور وہیں آپ کا انتقال ہوا۔

(۲) محمد بن جعفر بن حسن بن عمر بن امام زین العابدینؑ کوعبداللہ بن طاہر نے قید کرکے نیشاپور میں رکھا وہیں انتقال ہوا۔

(۳) قاسم بن عبداللہ بن حسین بن امام زین العابدینؑ کو ''عمر بن فرج رحجی'' سامرہ سے مکہ لایا، اور سیاہ لباس بنی عباس کا پہننے پر مجبور کیا۔ آپ نے انکار کیا، اور قریب بہ سیاہ لباس پہننا اختیار کیا۔

حکومت کی بے حد اطاعت وفرمانبرداری کے باوجود بذریعہ طبیب کوئی زہر ایسا دونوں ہاتھوں میں مل دیا جس سے دونوں ہاتھ خشک ہوگئے۔ آپ پوشیدہ زندگی بسر کرتے یہاں تک کہ انتقال کیا۔

(۴) ابوعبداللہ احمد بن عیسیٰ ابن زید بن امام زین العابدینؑ زمانہ ہارون رشید سے شہر بشہر پھرتے رہے۔ تمام خلفاء مابعد تجسس میں رہے۔ آخر ۲۲ ؍رمضان ۲۴۷ھ میں انتقال کیا۔

(۵) عبداللہ بن موسیٰ بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ مامون رشید کے عہد سے شہر بشہر چھپتے رہے۔ مامون رشید نے بعد شہادت امام رضاؑ بذریعہ تحریر آپ کو امام رضاؑ کی قائم مقامی کی درخواست دی۔ آپ نے جواب دیا کہ تو نے امامؑ کو انگوروں میں زہر دے کر شہید کیا۔ مجھ کو تجھ سے کیا توقع ہوسکتی ہے۔ یہ جناب زمانہ متوکل تک خود کو چھپاتے رہے آخر انتقال کیا۔

(۱۰) امام علی نقی علیہ السلام

۲۱۴ھ عہد مامون میں آپ کی ولادت ہوئی۔ چھ سال کی عمر میں آپ یتیم ہوئے۔

نہایت خاموش زندگی بسر کرتے تھے، بارہ سال کی عمر تک تعلیم وتربیت مخلوق میں مشغول رہے۔

عراق وایران، مصر وحجاز سے جوق در جوق لوگ آ کر آپ کی تعلیم سے فیضیاب ہوتے تھے۔ رینہ کے گورنر عبداللہ بن محمد نے امام کو بہت پریشان کیا۔ خلیفہ متوکل کو لکھا کہ امامؑ گھر بیٹھے سلطنت کر رہے ہیں۔ سونا چاندی اسلحہ بہت بڑی تعداد میں جمع کر لیا ہے، خلیفہ سے لڑنے کا ارادہ ہے۔ امامؑ نے بھی فوری متوکل کو عبداللہ کی سختیوں کی شکایت لکھی۔ (فصول المہمہ)

متوکل نے یہ چال چلی کہ امام کو دوستانہ خط لکھ کر یحییٰ بن ہرثمہ کو مع لشکر روانہ کیا، اور ملاقات کے لئے بغداد بلایا اور بہت سے تحف وہدایا روانہ کئے۔ امامؑ اپنے نتیجہ سے خبردار ہو گئے، لیکن اپنے کو متوکل کے پنجہ میں اسیر پا کر سامرہ روانہ ہوئے۔ دو سال تک متوکل نے امامؑ کو اپنا مہمان رکھا، پھر متوکل نے امامؑ کو فقرا کے محلہ میں ایک خرابے میں نظر بند کر دیا اور ایک افسر فوج ''رزافہ'' کو نگہبان مقرر کیا۔ (شواہد النبوۃ ملا جامی، وسفینۃ النجاۃ)

امامؑ نے قید خانے میں ایک قبر کھودی تھی اس کے قریب ایک چٹائی بچھا کر ہر وقت عبادت خدا فرماتے تھے۔ ''رزافہ'' امامؑ کی عبادت وزہد سے گرویدہ ہو گیا۔ متوکل کو جب معلوم ہوا تو اس نے سعید کے سپرد نگہبانی کی۔ امامؑ کی ملاقات کی صرف اسی کو اجازت ملتی جو آپ کے قتل کا وعدہ کرتا۔ سخت ترین نگہبانی ہوتی، اور شدید تکالیف پہنچائی جاتی تھی۔

ایک روز امامؑ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا، اور دربار میں بلایا، چار غلاموں کو برہنہ تلواریں دے کر حکم دیا کہ جس وقت امامؑ آئیں چاروں حملہ کر کے آپ کو شہید کریں۔ امامؑ جب دربار میں داخل ہوئے۔ غلام تلواریں پھینک کر قدموں سے لپٹ گئے۔ متوکل نے جب غلاموں سے پوچھا چاروں نے کہا کہ جب ہم نے قتل امامؑ کا ارادہ کیا تو ایک بزرگ برہنہ تلوار سامنے آئے اور فرمایا اگر امامؑ پر تم نے ہاتھ اُٹھایا تو سب کو قتل کر دوں گا اس طرح سے امام بچ گئے۔

تھوڑے عرصہ بعد متوکل کے ایک بری قسم کا پھوڑا نکلا اطباء علاج سے عاجز رہے۔ متوکل کی ماں نے خفیہ قید خانے میں امامؑ سے علاج دریافت کرایا، آپ نے بکری کی مینگنیوں کے ضماد کا حکم دیا۔ اطباء ہنستے رہے، لیکن فتح بن خاقان وزیر کی سفارش سے ضماد کیا گیا۔ پھوڑا پھوٹا متوکل اچھا ہو گیا۔ متوکل کی ماں نے دس ہزار دینار ایک تھیلی میں رکھ کر امامؑ کی خدمت میں قید خانے بھیجے۔ (فصول المہمہ)

باوجود اس خلق و کرم کے متوکل ہمیشہ در پے قتل امامؑ رہا۔ ایک روز سعید کو حکم دیا کہ امامؑ کی خانہ تلاشی کرے، اور جو اسلحے برآمد ہوں پیش کرے۔ سعید نے خود امامؑ کی ہمراہی میں قید خانے کا چپہ چپہ ڈھونڈا، بجز ایک زنگ آلود چھری کے اور اس تھیلی کے جس میں روپیہ آیا تھا کچھ نہ ملا، متوکل کو شرمندگی ہوئی۔ (فصول المہمہ)

متوکل کے زمانے سے لے کر مستعین عباسی اور معتز عباسی کے عہد تک امامؑ انھیں تکالیف میں مبتلا رہے ۲۵۴ھ میں معتز باللہ نے امامؑ کو زہر دے کر شہید کیا۔ آپ کے فرزند امام حسن عسکریؑ نے غسل و کفن دے کر اپنے گھر میں دفن کیا۔

(۷) ابوالحسن یحییٰ بن عمر بن یحییٰ بن حسین بن زید بن امام زین العابدینؑ کو کوڑے مارے گئے اور فتح بن خاقان کے گھر میں قید ہوئے۔ پھر رہا ہو کر بغداد آئے اور وہاں سے کوفہ گئے۔ زمانہ مستعین میں آپ سے اور عباسیوں سے جنگ ہوئی، اور سر کاٹ کر دربار مستعین میں مع اسیروں کے لایا گیا۔

(۶۲)
خلیفہ مستعین باللہ

۲۴۸ھ میں خلیفہ ہوا اور ۲۵۲ھ میں خلافت سے دستکش ہوا۔ اس کے زمانے میں

شہداء حسب ذیل تھے:

(۱) یحییٰ بن عمر۔

(۲) حسین بن محمد بن حمزہ بن عبید اللہ بن حسین بن امام زین العابدینؑ دس سال قید رہے۔

(۳) محمد بن جعفر بن حسن بن جعفر بن حسن بن امام حسنؑ سامرے میں قید ہوئے اور قید خانے میں انتقال ہوا۔

(۴) امام حسن عسکریؑ کو قید خانہ سخت میں قید کیا۔

(۶۳)
خلیفہ معتز عباسی

۲۵۲ھ میں خلیفہ ہوئے اور ۲۵۶ھ میں خلافت سے معزول ہوئے۔

ان کے عہد میں امام حسن عسکریؑ قید رہے اور چند امام زادے شہید کئے گئے۔

(۱) حسن بن یوسف بن ابراہیم بن موسیٰ بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ اس لڑائی میں شہید ہوئے جو اہل مکہ اور اسمٰعیل بن یوسف بن ابراہیم بن موسیٰ بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ سے ہوئی تھی۔

(۲) جناب جعفر بن عیسیٰ ابن اسماعیل بن جعفر بن ابراہیم بن محمد بن علی بن عبداللہ بن جعفر بن ابوطالبؑ بھی جنگ مکہ میں شہید ہوئے جو اسمٰعیل بن یوسف سے ہوئی تھی۔

(۳) احمد بن عبداللہ بن موسیٰ بن محمد بن سلیمان بن داؤد بن حسن بن امام حسنؑ کو مکہ میں عبدالرحمن خلیفہ ابوالساج نے قتل کیا۔

(۴) عیسیٰ بن اسماعیل بن جعفر بن ابراہیم بن محمد بن علی بن عبداللہ بن جعفر بن ابوطالبؑ کو

ابوالساج نے قید خانہ کوفہ میں قتل کیا۔

(۵) جعفر بن محمد بن جعفر بن حسن بن حسن بن علی بن عمر بن علی بن امام حسینؑ ملک رے میں قتل ہوئے۔

(۶) ابراہیم بن محمد بن عبداللہ بن عبیداللہ بن حسن بن عبداللہ بن عباس بن امیر المومنینؑ کو طاہر بن عبداللہ نے قتل کیا۔

(۷) احمد بن محمد بن یحییٰ بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ مدینہ میں قید ہوئے اور قید میں انتقال کیا۔

(۸) امام علی نقیؑ کو ۲۵۶ھ میں زہر دے کر قتل کیا۔

(۶۴)

خلیفہ مہتدی عباسی

۲۵۶ھ میں خلیفہ ہوا اور اسی سال معزول ہوا۔ ان کے زمانے میں کثرت سے اولاد رسولؐ شہید ہوئی جو حسب ذیل ہیں:

(۱) علی بن زید بن حسین بن عیسیٰ بن زید بن امام زین العابدینؑ۔

(۲) طاہر بن محمد بن قاسم بن حمزہ بن حسن بن عبیداللہ بن عباس بن علی بن ابی طالبؑ۔

(۳) طاہر بن احمد بن قاسم بن محمد قاسم بن حسن بن زید بن امام حسنؑ۔

(۴) موسیٰ بن بغا۔

(۵) حسین بن محمد بن حمزہ بن قاسم بن حسن بن زید بن امام حسنؑ۔

(۶) علی بن عبدالرحمن بن قاسم بن حسن بن زید بن امام حسنؑ۔

(۷) محمد بن حسن بن محمد بن ابراہیم بن حسن بن زید بن امام حسنؑ۔

(۸) جعفر بن اسحاق بن موسیٰ بن جعفر بن محمد بن امام زین العابدینؑ۔

(۹) موسیٰ بن عبداللہ بن موسیٰ بن عبداللہ بن حسین بن امام حسنؑ۔

(۱۰) ادریس اور ان کے بھتیجے۔

(۱۱) محمد بن یحییٰ عبداللہ بن موسیٰ۔

(۱۲) ابوطاہر احمد بن زید بن حسین بن عیسیٰ بن زید بن امام زین العابدینؑ کا سر محرم ۲۵۶ھ میں کاٹ کر مہتدی کو بھیجا گیا۔

(۱۳) عیسیٰ بن اسماعیل بن جعفر بن ابراہیم بن محمد بن علی بن عبداللہ بن جعفر۔

(۱۴) محمد بن عبداللہ بن اسمعیل بن ابراہیم بن محمد بن عبداللہ ابی الکرام بن محمد بن علی بن عبداللہ بن جعفر۔

(۱۵) علی بن موسیٰ بن موسیٰ بن محمد بن قاسم بن حسن بن زید بن امام حسنؑ قید میں شہید ہوئے۔

(۱۶) محمد بن حسین بن محمد بن عبدالرحمن بن قاسم بن حسن بن زید بن امام حسنؑ۔

(۱۷) علی بن موسیٰ بن اسماعیل بن موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن امیر المومنینؑ نے قید میں انتقال کیا۔

(۱۸) ابراہیم بن موسیٰ بن عبداللہ بن موسیٰ بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ نے قید میں انتقال کیا۔

(۱۹) عبداللہ بن محمد بن یوسف بن موسیٰ بن عبداللہ بن امام حسنؑ نے قید میں انتقال کیا۔

(۲۰) امام حسن عسکریؑ نے بھی قید شدید میں انتہائی تکالیف اُٹھائے۔

(۶۵)
خلیفہ معتمد عباسی

۲۵۶ھ میں خلیفہ ہوئے۔ان کے عہد میں خوب سادات کشی ہوئی۔

(۱) احمد بن محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن اسماعیل بن ابراہیم بن حسن بن امام حسنؑ کا سر کاٹ کر معتمد کو بھیجا گیا۔

(۲) احمد بن محمد بن جعفر بن حسن بن عمر بن علی بن امام حسینؑ۔

(۳) عبداللہ بن علی بن عیسیٰ بن یحییٰ بن حسین بن زید بن امام زین العابدینؑ۔

(۴) علی بن ابراہیم بن علی بن عبیداللہ بن حسین بن امام زین العابدینؑ۔

(۵) محمد بن احمد بن محمد بن حسن بن علی بن عمر بن علی بن حسین بن علی بن عمر بن امیر المومنینؑ۔

(۶) حمزہ بن حسین بن محمد بن جعفر بن قاسم بن اسحاق بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالبؑ۔

(۷) حمزہ بن عیسیٰ بن محمد بن قاسم بن حسن بن زید بن امام حسنؑ۔

(۸) محمد بن حسن بن علی بن عبداللہ بن حسین بن علی بن امام حسینؑ۔

(۹) ابراہیم بن حسن بن علی بن عبداللہ بن حسین بن علی بن امام حسینؑ۔

(۱۰) حسن بن محمد بن زید بن عیسیٰ بن زید بن حسینؑ۔

(۱۱) اسماعیل بن عبداللہ بن حسین بن عبداللہ بن اسماعیل بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالبؑ نے قید خانے میں انتقال کیا۔

(۱۲) محمد بن حسین بن محمد بن عبدالرحمن بن قاسم بن حسن بن زید بن حسن بن امیر المومنینؑ۔

(۱۳) موسیٰ بن محمد بن سلیمان بن داؤد بن حسن بن امام حسنؑ۔

(۱۴) علی بن محمد بن احمد بن عیسیٰ بن زید بن علی بن امام حسینؑ نے قید خانے میں انتقال کیا۔

(۱۵) احمد بن موسیٰؑ بھی قید خانے میں شہید ہوئے۔

(۱۶) حسین بن ابراہیم بن علی بن عبدالرحمن بن قاسم بن حسن بن زید بن امام حسنؑ قید

ہوئے۔

(۱۷) محمد بن عبداللہ بن زید بن عبداللہ بن حسن بن زید ابن امام حسنؑ قید خانے میں شہید ہوئے۔

(۱۸) علی بن موسیٰ بن عبداللہ بن موسی بن جعفر بن محمد بن علی بن امام حسینؑ۔

(۱۹) عبداللہ بن موسیٰ بن عبداللہ بن موسیٰ بن جعفر بن محمد بن امام زین العابدینؑ۔

(۲۰) علی بن جعفر بن ہارون بن اسحاق بن حسن بن زید بن امام حسنؑ۔

(۲۱) محمد بن عبداللہ بن جعفر بن محمد بن عبداللہ بن جعفر ابن ابراہیم بن محمد بن علی بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالبؑ۔

یہ سب اولاد رسولؐ قتل کئے گئے۔

(۱۱) امام حسن عسکری علیہ السلام

۲۳۴ھ مطابق ۸۴۶ء یا ۸۴۵ء میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور ۲۶۰ھ مطابق ۸۷۴ء میں سامرے میں شہید ہوئے۔ آپ کی عمر شریف چھ سال تھی جب اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ سامرے تشریف لائے۔ مدت العمر یہیں رہے۔ معتز ترکوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اور مستعین اس کا جانشین ہوا۔

اس نے قتل امامؑ کی یہ تدبیر کی کہ اس کے اصطبل میں ایک شریر خچر تھا جو کسی کو قریب نہ آنے دیتا تھا۔ مستعین نے امامؑ کو بلا کر کہا کہ آپ اس خچر پر سوار ہوں۔ امامؑ نے اپنے ہاتھ سے اس پر کاٹھی کسی اور سوار ہو کر مختلف رفتار سے اس کو دوڑایا، وہ جانور امام کا مطیع رہا۔ مستعین نے شرمندہ ہو کر وہ خچر امام کو نذر کر دیا۔ (وسیلۃ النجاۃ، شواہد النبوۃ)

معتز باللہ اور مہتدی باللہ نے امامؑ کو قید رکھا اور سخت ترین اذیتیں دیں۔ جو نگہبان امام کا

زہد وورع وعبادت کو دیکھتا نرمی کرتا۔ مہتدی اس کو برطرف کر دیتا اور دوسرا نگہبان مقرر کرتا۔

روز بروز امام پر سختی بڑھتی، آب وطعام تک کی قلت تھی، حتیٰ کہ وضو کے واسطے بھی پانی نہ ملتا۔

معتمد نے ایک روز امامؑ کو درندوں کے کٹہرے میں ڈلوا دیا۔ وہ شیر آپ کے گرد جمع ہو کر قدموں پر آنکھیں ملنے لگے۔ امام بشفقت سروں پر ہاتھ پھیر کر مشغول عبادت الٰہی ہو گئے۔ معتمد یہ دیکھ کر متحیر ہو گیا، اور امامؑ کو اس کٹہرے سے نکال کر دو سال محل شاہی میں قید رکھا۔ ایسی کوٹھری میں جس میں روشنی تک نہ آتی تھی۔ آپ کی زوجہ کو بھی آپ سے عرصہ تک جدا رکھا تا کہ نسل آپ کی قطع ہو جائے۔

آخر کو اڑتالیس سال کی عمر میں امامؑ کو زہر دیا۔ شہر میں طلاطم ہو گیا، اور بہت تزک واحتشام سے جنازہ اُٹھا۔ اپنے پدر بزرگوار کے پہلو میں سامرے میں اپنے گھر میں دفن ہوئے۔

(۱۲) امام محمد مہدی علیہ السلام

امام حسن عسکریؑ کے فرزند ۲۵۵ھ مطابق ۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا لقب، امام منتظر، حجۃ اللہ امام زمان اور مہدیؑ ہے۔ تمام شیعوں کا اتفاق ہے کہ آپ زندہ اور غائب ہیں۔ جب مصلحت خدا ہوگی آپ ظاہر ہوں گے۔ تمام مستند علمائے اہلسنت کا یہی اعتقاد ہے۔ لیکن بعض اہلسنت کا خیال ہے کہ آخر زمانے میں آپ پیدا ہوں گے اور اولاد رسولؐ سے ہوں گے۔ ابھی پیدا نہیں ہوئے۔ اسی اعتقاد سے بہت سے مہدویہ فرقوں نے فائدہ اٹھایا اور اکثر مدعیان مہدویت پیدا ہوتے رہے۔

بعد ولادت امامؑ کو نظر سے پوشیدہ رکھا گیا۔ آپ کی والدہ ماجدہ جناب نرجس خاتون کو بھی معتمد نے چھ ماہ قید رکھا۔ امام کی ولادت کی خبر پا کر امام حسن عسکریؑ کی خانہ تلاشی ہوئی اور سو سوار ''راشق''، بحکم معتمد لے کر اچانک مکان میں امامؑ کے داخل ہوا، لیکن امامؑ کا پتہ نہ لگا اور نظروں

سے پوشیدہ رہے۔ (ینابیع المودہ)

(٦٦)

خلیفہ معتضد عباسی

ان خلیفہ نے بھی دشمنی آل رسولؐ میں کوتاہی نہیں کی۔

(۱) محمد بن زید بن محمد بن اسماعیل بن حسن بن زید بن امام حسنؑ معروف بداعی رمضان ۲۸۹ھ میں قتل ہوئے۔

(۲) زید بن محمد بن محمد بن اسماعیل بن حسن بن زید بن امام حسنؑ۔

(۳) محمد بن عبداللہ بن محمد بن قاسم بن حمزہ بن حسن بن عبداللہ بن عباس بن علی بن ابی طالبؑ نے قید خانے میں انتقال کیا۔

(٦٧)

خلیفہ مکتفے عباسی

ان بزرگ نے بھی قتل اولاد رسولؐ میں دریغ نہیں فرمائی۔

(۱) محمد بن علی بن ابراہیم بن محمد بن حسن بن محمد بن علی بن عبداللہ بن امام حسنؑ کے اول دست و پا کاٹے پھر گردن زدنی کی۔

(۲) علی بن محمد بن علی بن عبداللہ بن جعفر بن عبداللہ بن محمد بن امیر المومنینؑ کے بھی دست و پا کاٹ کر گردن زدنی کی۔

(۳) زید بن حسین بن حسین بن زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالبؑ کو ابن کردیہ نے راہ مکہ میں قتل کیا۔

(۴) محمد بن حمزہ بن عبیداللہ بن عباس بن عبیداللہ بن عباس بن علی بن ابی طالبؑ کو ان کے

باغ میں قتل کیا گیا۔

(۶۸)

خلیفہ مقتصد عباسی

اس خلیفہ کے زمانے کی فہرست شہیدوں کی بہت طولانی ہے

(۱) اسحاق بن عباس بن اسحاق مہلوس بن ابراہیم بن موسیٰؑ بن جعفر بن محمد بن علی بن امام حسینؑ آرمینہ میں قتل ہوئے۔

(۲) ایک اور بزرگ آل ابوطالبؑ کے جو عباسیوں اور طالبیوں سے مسجد کوفہ کے بارے میں جو جنگ ہوئی اس میں قتل ہوئے۔

(۳) طاہر بن یحییٰ بن حسن بن جعفر بن عبیداللہ بن حسین بن علی بن ابوطالبؑ

(۴) حسن بن محمد بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ راہ مکہ میں قتل ہوئے۔

(۵) عبداللہ بن محمد بن سلیمان بن عبداللہ بن حسن بن حسن

(۶) علی بن علی بن عبدالرحمن بن قاسم بن حسن بن زید بن حسن بن علی بن حسن بن علی ابن ابی طالبؑ مالک کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔

(۷) قاسم بن زید بن حسن بن علی بن امام حسنؑ

(۸) محمد بن عبداللہ بن حسن بن علی بن جعفر بن محمد بن علی بن امام حسینؑ

(۹) علی بن موسی بن علی بن علی بن محمد بن عون بن محمد بن امیر المومنینؑ

(۱۰) قاسم بن یعقوب بن جعفر بن ابراہیم بن محمد بن علی بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالبؑ

(۱۱) جعفر بن صالح بن ابراہیم بن محمد بن علی بن ابراہیم بن محمد بن علی بن عبداللہ

(۱۲) عبدالرحمن بن محمد بن عبداللہ بن عبداللہ بن عیسیٰ بن جعفر بن ابراہیم بن محمد بن علی بن

عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کو سلیمان بن بشر سلمی نے قتل کیا۔

(۱۳) احمد بن قاسم بن محمد بن جعفر بن محمد بن علی بن امام زین العابدینؑ

(۱۴) حسین بن علی بن محمد بن علی بن محمد بن علی بن اسمٰعیل بن جعفر بن محمد بن علی بن امام حسینؑ تغلیس میں شہید ہوئے۔

(۱۵) محمد بن احمد بن حسین بن علی بن ابراہیم بن حسن بن امام حسنؑ شمشاط میں قتل ہوئے۔

(۱۶) محمد بن جعفر بن محمد بن ابراہیم بن اسماعیل بن ابراہیم بن حسن بن امام حسنؑ خوارج کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔

(۱۷) قاسم بن احمد بن عبیداللہ بن قاسم بن اسحاق بن عبداللہ بن جعفر بن ابوطالبؑ حبشہ میں قتل ہوئے۔

(۱۸) جعفر بن حسین بن حسن افطس بن علی بن علی بن امام حسینؑ حبشہ میں قتل ہوئے۔

(۱۹) حسین بن حسن بن محمد بن سلیمان بن داؤد بن حسن بن امام حسنؑ

(۲۰) احمد بن حسین بن علی بن ابراہیم بن عمر بن محمد بن عمر بن محمد بن عمر بن علی بن ابی طالبؑ مقام توبہ میں قتل ہوئے۔

(۲۱) زید بن عبداللہ بن مسلم بن عبداللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب توبہ میں قتل ہوئے۔

(۲۲) علی بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن حمزہ بن اسحاق بن علی بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب مقام ''نجّہ'' ملک حبشہ میں قتل ہوئے۔

(۲۳) جعفر بن اسحاق بن عبداللہ بن جعفر بن عبداللہ بن جعفر بن محمد بن علی بن ابی طالب عمری کے ہاتھوں مقام ''نجّہ'' ملک حبشہ میں قتل ہوئے۔

(۲۴) محمد بن علی بن اسحاق بن جعفر بن قاسم بن اسحاق جعفری کو بھی عمری نے قتل کیا۔

(۲۵) احمد بن علی بن محمد بن عون بن محمد بن علی بن ابی طالبؑ

(۲۶) داؤد بن عبداللہ بن عبیداللہ بن حسن بن عبیداللہ بن عباس بن امیر المومنینؑ کو ادریس بن موسیٰ بن عبداللہ بن موسیٰ نے قتل کیا۔

(۲۷) ایوب بن قاسم بن حسن بن محمد بن عبدالرحمن بن قاسم بن حسن بن زید بن حسن بن امیر المومنینؑ کو نوبہ میں قتل کیا۔

(۲۸) جعفر بن علی بن حسن بن علی بن عمر بن علی بن امام حسینؑ نیشاپور میں قتل ہوئے۔

(۲۹) حسین کوکبی بن احمد بن محمد بن اسماعیل بن محمد ارقط بن عبیداللہ بن امام زین العابدینؑ کو حسن بن زید نے قتل کیا۔

(۳۰) عبیداللہ بن حسن بن جعفر بن جعفر بن عبیداللہ بن حسین بن علی بن امام حسینؑ کو تالاب میں ڈبو کر قتل کیا پھر نعش نکال کر تہہ خانے میں ڈال دی۔

(۳۱) حسن عقیقی بن محمد بن جعفر بن عبداللہ بن حسین بن امام زین العابدینؑ کو جرجان میں قتل کیا۔

(۳۲) حسن بن عیسیٰ بن زید بن حسین بن عیسیٰ بن زید بن امام زین العابدینؑ کو ''حجشان'' نے جرجان میں قتل کیا۔

(۳۳) محمد بن حمزہ بن یحییٰ بن حسین بن زید

(۳۴) ادریس بن علی بن حسن بن محمد بن عبدالرحمن بن قاسم بن حسن بن زید بن امام حسنؑ مدینہ میں قتل ہوئے۔

(۳۵) محمد بن علی بن قاسم بن محمد بن یوسف طبرستان میں قتل ہوئے۔

(۳۶) احمد بن عیسیٰ بن عبداللہ بن محمد بن عمر بن علی بن ابی طالب

(۳۷) داؤد بن احمد بن عبداللہ بن موسیٰ بن عبداللہ بن حسن ابن امام حسنؑ

(۳۸) علی بن ادریس بن محمد بن جعفر بن ابراہیم جعفری

(۳۹) احمد بن ادریس بن محمد بن جعفر بن ابراہیم جعفری

(۴۰) احمد بن محمد بن جعفر بن ابراہیم جعفری

(۴۱) صالح بن محمد بن جعفر بن ابراہیم جعفری

(۴۲) ابراہیم بن داؤد بن موسیٰ بن عبداللہ بن امام حسنؑ

(۴۳) محمد بن داؤد بن موسیٰ بن عبداللہ بن امام حسنؑ

(۴۴) محمد بن جعفر بن حسن بن موسیٰ بن جعفر

(۴۵) عبداللہ بن داؤد ابن موسی بن عبداللہ بن امام حسنؑ

(۴۶) علی بن محمد بن زید بن حسین بن عیسیٰ بن زید بن امام زین العابدینؑ۔

(۴۷) صالح بن موسیٰ بن عبداللہ بن موسیٰ

(۴۸) ابراہیم بن عبداللہ بن داؤد بن محمد بن جعفر بن ابراہیم جعفری۔

(۴۹) ایک فرزند داؤد بن محمد بن ابراہیم بن محمد بن علی بن عبداللہ بن جعفر کا۔

(۵۰) آٹھ جعفری اور قتل ہوئے جن کے نام ابوالفرج اصفہانی کو معلوم نہ ہوسکے۔

(۵۱) حسین بن حسن بن حسن بن حسن بن محمد بن سلیمان بن داؤد بن حسن بن حسن بن امام حسنؑ مدینہ میں قتل ہوئے۔

(۵۲) احمد بن ابراہیم بن اسماعیل بن حسن بن زید بن حسن بن علی

(۵۳) محمد بن احمد

(۵۴) ابراہیم بن محمد بن ہارون بن محمد بن قاسم بن حسن بن زید

(۵۵) محمد بن یحییٰ بن محمد بن علی بن جعفر بن محمد بن علی بن امام حسینؑ
(۵۶) احمد بن عبداللہ بن موسیٰ بن حسن بن علی بن جعفر بن محمد بن امام زین العابدینؑ
(۵۷) محمد بن جعفر بن حسن بن حسن بن حسن بن موسی بن جعفر بن محمد
(۵۸) محمد بن ابراہیم بن یحییٰ بن عبداللہ بن موسیٰ بن عبداللہ بن امام حسنؑ
(۵۹) محمد بن جعفر بن محمد بن ابراہیم حسینی
(۶۰) احمد بن موسیٰ بن محمد بن سلیمان بن داؤد بن حسن
(۶۱) محمد بن احمد بن حسن بن علی بن حسین حسینی
(۶۲) حسن بن جعفر حسینی معروف بہ ابن ابی رواح
(۶۳) علی بن محمد بن عبداللہ الفافا جعفری معروف با بن شرواط
(۶۴) احمد بن علی بن اسحاق جعفری
(۶۵) مطرف بن داؤد بن محمد بن جعفر بن ابراہیم جعفری
(۶۶) اسماعیل بن اسماعیل بن جعفر بن ابراہیم جعفری
(۶۷) عبداللہ بن محمد بن سلیمان بن عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ
(۶۸) موسی بن محمد بن یوسف بن جعفر بن ابراہیم جعفری
(۶۹) محمد بن احمد بن محمد بن اسماعیل بن حسن بن زید ابن امام حسنؑ
(۷۰) حسین بن محمد بن یوسف
(۷۱) جعفر بن محمد بن جعفر بن ابراہیم جعفری
(۷۲) قاسم زید بن حسین بن عیسیٰ بن زید
(۷۳) عبدالرحمن بن محمد بن عیسیٰ بن جعفر ابراہیم

خاندان رسالت کے یہ وہ شہداء ہیں جن کی شہادت کی خبر ابوالفرج اصفہانی کو جمادی الاول ۳۱۳ھ تک ملی اور جولوگ دیگر بلاد میں شہید ہوئے یا جن کا قتل پوشیدہ رکھا گیا ان کی کس کو خبر ہے۔ان امام زادوں کے پیروشیعہ کی تعداد تو خدا ہی جانتا ہے۔لاکھوں پر نوبت پہنچی ہے جو قید ہوئے، قتل ہوئے، جلائے گئے، زندہ دفن ہوئے، دست و پا کاٹے گئے، زبانیں کھینچی گئیں اور طرح طرح کے مصائب جھیلے۔

(۶۹)

خصوصیات مذہب شیعہ

ہر مذہب نے کچھ نہ کچھ قربانیاں دی ہیں، لیکن شیعہ مذہب کے کچھ خصوصیات ہیں جن سے وہ دیگر مذاہب کے مقابلے میں ممتاز ہے۔

(۱) ہر مذہب کا زمانۂ ابتلا محدود وقت کے لئے تھا، لیکن شیعہ مذہب کا ہر دور سخت سے سخت آزمائشوں کا رہا ہے۔

(۲) مذہب کے بانی کی نسل کو خصوصیت سے اتنی قربانیاں نہیں دینا پڑیں جتنی بانی اسلام کو اپنی نسلی قربانیاں دینا پڑیں۔

(۳) شیعہ مذہب کو باوجود پرامن اور خاموش زندگی بسر کرنے کے محض پابندی مذہب کے جرم پر قربانیاں دینا ہوئیں۔ترک مذہب کا مطالبہ انھوں نے کسی طرح قبول نہ کیا اور بس یہی اس کا جرم تھا۔

(۴) رسولی مشن اُن کے بعد سے اُنھیں کی نسل نے صحیح معنوں میں چلایا جس میں سرمو

اختلاف نہ تھا۔ یک رنگی و یک آہنگی عہد رسولؐ سے آخر تک رہی، بخلاف خلافتوں کے جو سیاسی تھپیڑوں میں مختلف ہوتے رہتے تھے۔ تاریخ کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوگا، اور یہی یک رنگی اصل ونقل میں فرق وامتیاز کراتی ہے۔

(۵) یہ مذہب محض علمی بنیادوں پر قائم ہے۔ روحانی علوم میں جتنی بھی ترقی کرو، روحانیت کے مدارج سامنے کھلے ہیں۔ علوم مادیہ میں جتنی چاہے ترقی کرو یہ نظام شمسی تمہاری ترقیوں کے لئے ناکافی اور قید خانہ ہے۔ دوسرے عوالم اور دیگر نظاموں کو اپنی جولان گاہ بناؤ۔ مذہب نے اس کے راستے بھی تمہارے لئے کھول رکھے ہیں۔

الدنیا سجن للمؤمن وجنة للکافر : (الحدیث)

انسانی زندگی کے بس یہی دو معیار ہیں کہ روحانی و مذہبی، دنیاوی و مادی ترقی میں معراج کمال کو پہنچے۔ شیعہ مذہب نے بس اسی اصول کو مدنظر رکھا ہے۔ ملک گیری وفتوحات وخون آشامی وفتنہ گری وحکومت وسلطنت اس کے لئے نعمت نہیں، برکت نہیں، لعنت وعذاب ہے۔ وہ صرف علمی حکومت کا مدعی ہے اور اس کو علمی حکومت کی تحصیل وتاکید کا حکم ہے۔

جب کہ مصائب کی گھٹائیں جھوم جھوم کر بنی فاطمہؑ اور شیعوں پر برس رہی تھیں۔ جس وقت بلاؤں اور جفاکاریوں کے پہاڑ ڈھائے جا رہے تھے۔ جس وقت موت کی گرم بازاری تھی، جس وقت سادات وشیعہ افلاس وفاقہ کشی سے مر رہے تھے، اس وقت جس صبر واستقلال وہمت وبسالت وجوانمردی سے دین الٰہی کی حفاظت وتبلیغ اسلام کی جدوجہد عالم کے گوشہ گوشہ میں ان فداکاروں نے کی وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

شیعوں کو اس کا فخر رہا کہ علمی دنیا اور علمی حکومت کے مالک وہی ہیں، اسلام کے دوسرے فرقوں کو اس پر ناز رہا کہ قیصریت وکسرویت ان کی آستانہ بوسی کرتی ہے۔ شیعہ فرقہ کو فخر ہے، اور

تاریخ گواہ ہے کہ ان کو سابقیت وفوقیت علمی حاصل رہی، اسلام کے دیگر شعبوں میں انھیں نے علمی روح پھونکی۔ معلم اول فرقہ شیعہ تھا، اور ہر علمی شعبہ میں اسی نے رہبری کی جس کے دو ذریعے تھے۔

تبلیغ علم ومذہب کا پہلا ذریعہ

باوجود اس تاریک زمانے کے ائمہ ہدیٰ نے تعلیم وتصنیف میں انتہائی جدوجہد کی پوشیدہ اور موقع پانے پر علانیہ تعلیم دیتے تھے، اور شیعہ بھی جانیں دے دے کر خدمت ائمہ ہدیؑ میں حاضر رہتے تھے۔

شیعوں کا یہ مذہب ہے کہ رسولؐ کی اصلی وہ تعلیم ہے جو شیعہ مذہب کی ہے۔ عہد رسولؐ ہی میں جہاں جہاں آوازہ رسالت سن کر اطراف عالم سے جو وفود خدمت رسولؐ خدا میں حاضر ہوئے۔ وہ مذہب شیعہ ہی کی تعلیم لے کر پلٹے۔

حیات رسولؐ خدا میں بے روک ٹوک صحیح مذہب کی ترویج رہی۔

وفات رسولؐ خدا کے بعد سے سچے مذہب پر خودساختہ مذہبی پردے پڑنا شروع ہوئے۔ اس تاریک عہد میں بھی شیعوں نے علم کی روشنی سے عالم کو منور رکھا۔ پہلی ہی صدی ہجری میں تبلیغی جدوجہد شروع ہوگئی۔

سب سے پہلے علیؑ مرتضیٰ نے قرآن مجید جمع کر کے دربار خلافت میں پیش کیا جو نہ لیا گیا۔ (تاریخ واقدی، استیعاب ابن عبدالبر، صواعق محرقہ، سیرت مصطفویہ ابن عبداوس، طبقات ابن سعد، مفتاح نجاح بدخشانی، تحفۃ المومنین بدخشانی)

''ابوالاسود دئلی ظالم بن عمر'' کو امیر المومنینؑ نے علم نحو کے قواعد بتا کر علم نحو کی بنیاد ڈالی، اور کتاب تصنیف کرائی، جن کا انتقال ۶۹ھ میں ہوا۔

سلیم بن قیس ہلالی صحابی امیرالمومنینؑ نے تاریخ کی ایک کتاب لکھی، جس میں وفات رسولؐ کے بعد کے واقعات درج تھے، اور ابن ابان بن عیاش فیروز صحابی امام حسینؑ کو دی۔

ابراہیم ابورافع آزاد کردہ رسول صحابی امیرالمومنینؑ نے جو کہ کوفہ میں خزانچی امیرالمومنینؑ تھے، فقہ میں ایک کتاب باب باب کر کے لکھی، جس میں روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ، وقضا کے احکام تھے۔ (منتہی المقال)

جناب امیرؑ کے شاگردوں اور اصحاب میں کیسے کیسے علماء فنون وعلوم جمع تھے، جن سے ہزاروں نے تعلیم پا کر علوم وفنون مذہب کی ترویج کی۔ ہزاروں کتابیں مختلف علوم میں لکھ ڈالیں۔ خود امیرالمومنینؑ کے خطبات وکلمات واحادیث اس کثرت سے ہیں کہ علماء ومحققین نے ضخیم جلدیں لکھ ڈالی ہیں۔

۲۶۰ھ تک امام حسن عسکریؑ کے عہد تک ہر امام کے ہزاروں شاگرد وشاگردوں کے شاگرد تھے، جو اطراف عالم آتے اور تعلیم حاصل کر کے متفرق ہو جاتے تھے، جنھوں نے ہر ہر علم میں ہزاروں کی تعداد میں تصانیف کی ہیں۔ علوم الائمہ اور علوم القرآن کی نہایت حفاظت کی گئی۔ لاکھوں روایتیں ایک دوسرے سے نقل کرتے اور حفظ رکھتے، اور تصانیف وتالیف کے ذریعہ نشر کرتے۔

فقیہ، قاضی، مفتی، متکلم، محدث، ادیب، خطیب، شاعر، فلسفی، منطقی، مورخ، نساب، قاری، نجومی، مہندس، ریاضی، طبیب، مفسر، نحوی، لغوی وغیرہ وغیرہ چوتھی صدی کے اندر ہی اندر گذرے ہیں۔ حجاز، عراق، ایران، یمن، خصوصیت سے مراکز علوم شیعہ کے رہے ہیں۔

عراق میں کوفہ، بصرہ، بغداد۔ ایران میں قم، نیشاپور، اصفہان۔ حجاز میں مکہ معظّمہ ومدینہ منورہ خاص مراکز علمیہ تھے جن میں ہر علم کے جاننے والے سیکڑوں علماء تھے جن میں بعض

عورتیں بھی ہیں۔ ان کے حالات سے کتب سیر وتاریخ ورجال بھرے پڑے ہیں۔ ان چند ورقوں میں ان کی کہاں گنجائش ہے۔

کتاب کشف الفنون فی اسماء الکتب والفنون، رجال نجاشی۔ فہرست شیخ طوسی، فہرست ابن ندیم، رجال کبیر، منتہی المقال، کتاب اغانی وغیرہ میں مفصل حالات موجود ہیں۔

محقق بےنظیر آقا الشیخ علی بن حجۃ الاسلام، آقا شیخ محمد رضا نجفی آل کشف الغطاء نے طبقات الشیعہ میں دس بارہ جلدوں میں ۱۹۱۲ء میں اپنی تصنیف دکھائی تھی جو علامہ موصوف کی جانکاہیوں کا نتیجہ ہے، اور علمی اور قومی احسان تھا۔ برا ہو بےحسی کا، قوم کے دولتمندوں نے اس گوہر بےبہا کی طباعت پر آج تک توجہ نہ کی۔

ائمہ معصومینؑ کے عہد میں ان کے شاگردوں نے چار سو اسی کتابیں لکھیں جو اصول اربعہ مأۃ کہلاتی ہیں جن سے کلینی رحمہ اللہ المتوفی ۳۲۹ھ میں کتاب کافی کو جمع کیا، اور جناب صدوق المتوفی ۳۸۱ھ میں من لایحضرہ الفقیہ، اکمال الدین اتمام النعمۃ، عیون اخبار رضا، امالی وغیرہ وغیرہ تین سو تصانیف لکھے اور محقق طوسی رحمہ اللہ المتوفی ۴۸۸ھ نے تہذیب الاحکام، استبصار وغیرہ لکھیں، پھر وسائل الشیعہ، بحارالانوار، وافی وغیرہ وغیرہ لکھی گئیں، جو سیکڑوں علوم پر مشتمل ہیں۔

علامہ نجاشی المتوفی ۴۵۰ھ نے اپنی کتاب رجال میں بارہ سو پانچ اصحاب وتابعین وعلماء کے اسماء درج کئے ہیں۔ جنھوں نے ہزاروں تصانیف مختلف علوم وفنون میں کئے ہیں۔ جو ائمہ علوم وفنون تھے، جن کے فضل وکمال وشاگردی کا اعتراف دیگر فرق اسلام نے بھی کیا ہے۔

عراق عرب میں کوفہ، بغداد بصرہ، واسط، حلب انبار، مدائن کے علماء ومصنفین کی فہرست بہت طولانی ہے۔ مدائن ایک نہایت بزرگ وآباد شہر تھا جس میں رسولؐ کے دو بزرگ صحابی اور

علیؑ وآل علیؑ کے شیدا جناب سلمان فارسی اور جناب حذیفہ یمانی رہے اور مدفون ہوئے بقول یاقوت حموی مصنف ''مراصد اطلاع مدائن'' شیعوں کا ملک رہا، غرض کہ عراق عرب میں ہزاروں علماء ومحدثین واصحاب ائمہ پوشیدہ تبلیغ دین کرتے رہے۔

حلب

میں احمد بن عمر بن ابی شعبہ محدث ومصنف۔ حسن بن خالویہ ابوعبداللہ نحوی ولغوی ومحدث۔ یحییٰ بن عمر بن علی ابوشعبہ صحابی امام جعفر صادقؑ وامام موسیٰ کاظمؑ محدث ومصنف تبلیغ شیعہ کررہے تھے۔

واسط

میں بسطام بن سابور الزیات، زکریا بن سابور، زیاد بن سابور، حفص بن سابور صحابی امام جعفر صادقؑ وامام موسیٰ کاظمؑ محدث ومصنف تصانیف تبلیغ واشاعت کرتے تھے۔

ایران میں قم، خراسان، اصفہان، نیشاپور، مراکز علماء ومصنفین تھے ان کی فہرست بھی طولانی ہے۔

دیلم وخراسان

میں محدث سعید بن عبداللہ مصنف تصانیف خراسان ودیلم میں۔ محمد بن سلیمان بن عبداللہ مصنف ومحدث۔

ملک رے

بکر بن عبداللہ بن حبیب فرنی، جعفر بن یحییٰ علا ابومحمد رازی محدث ومصنف۔

اھواز

احمد بن علی بن احمد بن عباس بن محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن محمد بن عبداللہ نجاشی۔ اور محمد

بن جبرئیل محدث اور محمد بن جعفر بن عتبہ حداد عبداللہ بن محمد۔ اور عبداللہ بن محمد بن حصین حصینی صحابی امام رضاؑ اور علی بن مہز یار صحابی امام رضاؑ اور امام محمد تقیؑ یہ علماء و محدثین و مصنفین تبلیغ دین شیعہ فرماتے تھے۔

طبرستان

میں محمد بن اسلم طبری جبلی ابوجعفر محدث و مصنف طبرستان میں تجارت کرتے تھے۔ اور محمد بن حسن بن عبداللہ بن حسن بن محمد بن حسن بن محمد بن عبداللہ بن حسن بن علی بن حسین بن امیر المومنینؑ محدث و مصنف تصانیف تھے۔

ملک شام

امیہ بن علی قبسی صحابی امام محمد تقیؑ، خلید بن اوفے ابوالربیع صحابی امام جعفر صادقؑ، عباس بن ہلال شامی صحابی امام رضاؑ، محدثین و مصنفین سے تھے۔

مملکت آرمینیہ

عبداللہ بن حکم صحابی امام جعفر صادقؑ، اور فضل بن ابوقرہ تمیمی سمندی صحابی امام جعفر صادقؑ مملکت آذربائیجان سے آرمینیہ میں منتقل ہوئے اور موسیٰ بن زنجویہ ابوعمران محدث آرمینیہ ہیں۔

تفلیس

میں شریف بن سابق ابومحدث و مصنف۔

شمشاط

میں علی بن محمد بن عدوی محدث۔

سجنان

میں حریز بن عبداللہ ابومحمد ازدی صحابی امام جعفر صادقؑ و امام موسیٰ کاظمؑ محدث ومصنف کوفہ اور سجستان میں گھی اور تیل کی تجارت کرتے تھے۔ اور سالم بن ابی سلمہ کندی محدث۔ اور محمد بن سالم بن ابی سلمہ محدث۔

مملکت بلخ

میں مقاتل بن مقاتل صحابی امام رضاؑ، نضر بن صیاح ابوالقاسم، مظفر بن محمد بن احمد ابوالجیش المتوفی ۳۶۷ھ۔

سنجار ولایت موصل

میں نصر بن عامر بن وہب ابوالحسن۔

طرسوس

میں محمد بن احمد بن روح ابومحمد محدث

سمرقند

میں محمد بن مسعود بن محمد بن عیاش سلمی ابوالنضر معروف بعیاشی محدث وفقیہ ومفسر، جعفر بن احمد بن ایوب محدث۔

سمرقند محمد بن مسعود بن محمد بن عیاش سلمیٰ ابونضر معروف بعیاشی محدث وفقیہہ ومفسر جعفر ابن احمد بن ایوب محدث

طیالس

موسیٰ حماد طیالسی محدث۔

کابل

میں عبدالسلام بن صالح بن ابوصلت ہروی صحابی امام رضاؑ، ابوخالد کابلی صحابی امام زین

العابدینؑ۔

رودنیل

میں محمد بن حسن بن ابی سادو ابوجعفر رواسی حسن بن ابی سادو دونوں بزرگ اصحاب امام محمد باقرؑ وامام جعفر صادقؑ سے تھے۔

مصر

میں عبداللہ بن فضل بن محمد بن ہلال ہنانی ابوعیسیٰ محدث، ہارون بن عبدالعزیز ابوعلی الاراجتی خطاط ومحدث واسماعیل بن موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابوطالب۔ احمد بن محمد بن احمد ابوعلی جرجانی۔

ہندوسندھ

صباح بن نصر ہندی مسائل امام رضاؑ کی تبلیغ کرتے۔طلحہ بن زید ابوالخزرج ہندی صحابی امام جعفر صادقؑ، جناب فرج سندی، جناب خلاد سندی بزاز صحابی امام جعفر صادقؑ، ابان بن محمد بجلی سندی۔

حضرات مذکورین تو وہ حضرات تھے جو تصنیف وتالیف کے ذریعہ اور تعلیم کے ذریعہ علوم حقہ کی مقامات مذکورہ میں قرون اولیٰ ہی میں ترویج کررہے تھے اور کم ازکم قرب وجوار کے ممالک ان کے فیوض سے بہرہ اندوز تھے، اور ان کے شاگردوں کے ذریعہ اور کہاں کہاں اشاعت ہوئی ہو تاریخ کی نامکملی کی وجہ سے پتہ نہیں ہے۔

تبلیغ مذہب کا دوسرا ذریعہ

بنی امیہ و بنی عباسیہ کے ظالم سلاطین کے آل رسولؐ اور شیعوں پر جو ظلم وستم ہوئے اس کی وجہ سے یہ علمی گروہ بخوف جان وعزت پہاڑوں، جنگلوں، دوردراز ملکوں میں پھرتے تھے، اور

اپنے مخفی و پوشیدہ تعلیمات سے خلقت خدا کو فیضیاب کرتے تھے اور وہ جنگیں جو آل رسولؐ نے بنی امیہ و بنی عباسیہ سے عاجز آ کر کیں ان سے بھی بہت زائد مذہب شیعہ کی ترویج و تبلیغ ہوئی۔ جن میں فاطمین کی جنگیں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔

عرب کا گوشہ گوشہ جہاں اسلام پہنچا شیعہ مذہب ساتھ ساتھ پہنچا۔

یمن خود عہد رسولؐ میں دست علیؑ بن ابی طالب پر ایمان لایا۔

حجاز: علیؑ و آل علیؑ کے قیام و وجود سے علوم مذہبیہ سے آگاہ تھا۔

عراق عرب علی کا دارالسلطنت رہا تھا جزیرۃ العرب کا گوشہ گوشہ خبردار تھا۔ ۱۴۸ھ میں ابراہیم بن عبداللہ بن حسن بن امام حسن علیہ السلام بخوف خلفاء موصل، انبار، بغداد، مداین، نیل واسط میں پھرتے رہے اور اسی واسط میں جنگ عظیم کے بعد شہید ہوئے۔ یہ وہ بزرگ تھے جن کی حمایت کے لئے امام ابوحنیفہ لوگوں کو اُبھارتے اور فتویٰ دیتے تھے، اور امام شعبی اس جنگ کو ''بدر صغریٰ'' کہتے تھے۔ (مقاتل الطالبین)

حجاز، عراق، عرب، حلب، شام، دیار بکر، بغداد پر فاطمیین کے قبضے رہے۔ چالیس مرتبہ فاطمیین کا سکہ اور خطبہ بغداد میں جاری ہوا۔

ایران ۱۲۲ھ میں زید بن علی بن امام حسینؑ سے جنگ ہوئی جس میں مدائن، بصرہ، واسط، موصل، خراسان، رے، گرگان، کوفہ کی کثیر جماعتیں جناب زید سے بیعت کر چکی تھیں اور مختلف بلاد میں وفود روانہ ہو چکے تھے، جس سے نشر و تبلیغ دین کی کافی ہوئی۔

یحییٰ بن زید بعد شہادت پدر مدائن، رے، سرخس، بلخ میں بخوف ہشام و ولید مارے مارے پھرے۔ بندر بوشہر اور بیہق سے مالی امدادیں جناب یحییٰ کے واسطے آئیں، اور ''ہرات'' و ''گرگان'' میں جناب یحییٰ خود گئے لڑائیاں ہوئیں اور ۱۲۵ر ہجری میں گرگان میں

سولی دی گئی۔

۱۲۷ھ میں عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابوطالبؑ نے عہد ولید میں خروج کیا اور کوفہ، بصرہ، قم، رے، اصفہان، قومس، ہمدان پر قابض ہو گئے تھے۔ ان کے بھائی اصطخر پر قابض تھے۔ دوسرے بھائی شیراز پر، تیسرے بھائی علی کرمان پر، چوتھے بھائی صالح قم پر اور اسی سال قتل ہوئے۔

عہد متوکل عباسی میں جناب محمد بن جعفر بن حسن بن عمر بن امام زین العابدینؑ۔ اور محمد بن محمد بن جعفر بھی مملکت ''رے'' میں بھاگ گئے تھے۔

۲۰۱ھ میں مامون رشید کا امام رضاؑ کو ولی عہد کرنا، اور آپ کے نام کا سکہ جاری کرنا، اور بطور شیعہ نماز جماعت پڑھانا، اور ترویج دین تمام قلمرو مامون رشید میں ہونا، بلاد مختلفہ کے اہل علم سے مناظرے پچیس ہزار حفاظ حدیث کا قلم ودوات وکاغذ لے کر سرراہ امام رضاؑ کی سواری کے انتظار میں کھڑے ہونا اور صرف ایک حدیث امام سے سننا، یہ سب باتیں تمام بلاد میں دور ودراز ملکوں میں ترویج مذہب حقہ کے لئے کافی تھیں۔ ۲۲۲ھ میں خود مامون رشید نے جناب امیر کی افضلیت کا خلفاء پر اعلان کیا تھا۔ (تاریخ طبری)

علاوہ اس کے اکثر امام زادے ایران کے مختلف شہروں میں بھاگ بھاگ آتے اور قید وشہید ہوتے۔

عہد متوکل میں جب اولاد ابوطالبؑ شہروں میں متفرق ہوئی تو حسن بن زید بن محمد بن اسماعیل بن حسن بن زید بن امام زین العابدینؑ، طبرستان ونواحی دیلم میں پھرتے رہے۔

آرمینیہ عہد مقتدر عباسی میں اسحاق بن عباس بن اسحاق پہلوس مملکت آرمینیہ میں رہے اور مقام ''دیبل'' میں ایک آرمنی کے ہاتھوں سے شہید ہوئے۔

جناب حسین بن علی بن محمد بن علی بن اسماعیل بن جعفر بن محمد بن امام زین العابدینؑ مملکت آرمینیہ شہر تفلس میں شہید ہوئے۔

جناب محمد بن احمد بن حسین بن علی بن ابراہیم بن حسن بن امام حسنؑ شہر شمشاط میں دفن ہوئے۔

کابل دربار منصور میں ستر کابلی موجود تھے، جو ساحر تھے، امام کی معجزنمائی سے ہلاک ہوئے جو ایک ذریعہ شہرت امام کا ہوا۔

عبداللہ الاشتر بن محمد بن عبداللہ بن حسن بن امام حسن کو عیسیٰ بن عبداللہ بن مسعدہ بعد شہادت محمد کوفہ لے کر بھاگ آئے۔ وہاں سے بصرے آئے۔ بصرے سے سند ہوتے ہوئے قندھار پہنچے۔ جناب یحییٰ بن زید بھی شہر ہرات میں آئے تھے۔

حبشہ ونوبہ عہد رسولؐ خدا میں جناب جعفر طیارؑ کا ملک حبشہ میں آنا، اور جناب عمار یاسر صحابی خاص کا تبلیغ مذہب حق کے لئے کافی تھا۔ جناب قاسم بن احمد، جناب حسین بن حسن، جناب علی بن محمد بن عبداللہ اور جعفر بن اسحاق مملکت حبشہ مقام ''نجّہ'' میں رہے اور شہید ہوئے۔ جناب زید بن عبداللہ بن مسلم شاہ نوبہ کی جنگ میں شہید ہوئے۔ اور جناب ایوب بن قاسم بن حسن بلاد نوبہ میں شہید ہوئے۔ اولاد جناب عقیل بسلسلہ تجارت حجاز و یمن ہوتے ہوئے داخل حبش ہوئے اور سب سے بڑے مقام ''جبرت'' میں مقیم ہوئے جس کا بعد میں نام ''جبرتیہ'' ہوا اور اسلامی پہلی سلطنت حبشہ میں قائم ہوئی جس کا پائے تخت ''وفات'' تھا۔ (الاسلام فی الحبشہ مصنفہ یوسف احمد مدرس خط کوفی مدرسہ الخطوط الملکیہ مطبوعہ قاہرہ نومبر ۱۹۳۵ء)

مصر و بربر مصر پہلی ہی صدی ہجری میں علی مرتضیٰؑ کے گورنروں محمد بن ابی بکر اور مالک اشتر کے عہد میں اصول وفروغ مذہب حقہ سے خبردار ہو چکا تھا۔

جناب ادریس بن عبداللہ مشہور واقعہ ''فخ'' سے روپوش ہوکر اپنے غلام رشید کے ساتھ بھاگے افریقہ، مصر، بربر، فاش طنجہ میں پھرتے رہے۔ مامون رشید کے زہر سے شہید ہوئے غلام نے آپ کو دفن کیا، زوجہ حاملہ تھیں۔ صاحبزادہ پیدا ہوا، رشید غلام نے پرورش کیا، اور نام صاحبزادے کا بھی ادریس ہی رکھا، اور بربر میں ان کی تربیت کی۔

۲۸۶ھ میں جب کہ معتضد باللہ عباسی خلافت کررہا تھا، فاطمیوں کی سلطنت مصر میں قائم ہوئی جو کہ شیعہ مذہب تھے، اور مظالم بنی عباس سے جان بچا کر مصر بھاگ آئے تھے، آہستہ آہستہ ترقی کرکے افریقہ، اسپین، قیروان، طرابلس، مصر، اسکندریہ سے آبنائے تک قابض ہوگئے۔

۲۸۶ھ میں ابوالقاسم محمد بن عبیداللہ المہدی بن حسینؑ بن احمد بن عبداللہ بن محمد بن اسماعیل بن امام جعفر صادقؑ قیروان میں بادشاہ ہوئے۔

۱۸؍ذی الحجہ ۳۶۴ھ میں المعزلدین اللہ چوتھے فاطمی بادشاہ نے مصر فتح کرکے عید غدیر کا بڑا جشن کیا۔ ۳۷۵ھ نویں ربیع الاول کو جب چھٹا فاطمی خلیفہ الحاکم بامراللہ پیدا ہوا تو بہت بڑا جشن کیا گیا، اس لئے کہ اسی تاریخ عمر بن سعد قاتل امام حسینؑ کا سر مختار کے پاس آیا تھا اور شیعہ اس روز عید مناتے تھے۔

الحاکم کے عہد میں شہر ''انبار'' اور ''مدائن'' بھی فتح ہوئے اسی بادشاہ نے عورتوں کو گھر سے نکلنے کی ممانعت کی، اور پردے کی سخت تاکید کی۔ یہود ونصاریٰ کے لئے لباس معین کئے، اور صدہا مدرسہ تمام قلمرو میں کھولا گیا جس میں صدہا مدرس علماء وفقہاء درس وتدریس کرتے تھے۔ تمام مسکرات کی خرید وفروخت وساخت ممنوع قرار پائی۔ اور **اشهد ان علیاً ولی اللّٰہ و خلیفة رسوله بلافصل**'' باآواز بلند اذانوں میں رائج ہوا۔

۴۰۱ھ میں حمیدالدین کرمانی کو اسی بادشاہ نے مدینہ منورہ بھیج کر امام جعفر صادقؑ کے گھر

کے تہہ خانے کو کھُدوایا، اور کتب وصحائف ائمہ معصومینؑ اور اسلحہ ائمہ کو برآمد کرایا۔ (قلائد الجواہر) تاریخ ''ابن ذولاق'' میں ہے کہ یہ شخص صاحب کرامات تھا۔

مستنصر باللہ شاہ ہشتم فاطمی کے عہد میں ناصر خسرو خراسانی مصرآیا اور سات سال تک قیام کرکے شہر بلخ میں ترویج مذہب شیعہ کے لئے روانہ ہوا۔ حسن بن صباح بھی اسی طرح سے بلاد عجم میں مصر سے تبلیغ کے لئے روانہ ہوئے اور ''قلعہ الموت'' پرخود مختار حاکم بن کر مذہب شیعہ کی تبلیغ کی۔

۴۴۰ھ میں اس بادشاہ نے عسقلان میں سرداران فوج کو بھیج کر سر امام حسینؑ کو منگایا، اور ۸؍جمادی الثانی میں مصر میں ''قیصر زمردی'' میں سر مبارک دفن کیا جو آج تک زیارت گاہ امامؑ ہے۔ اگرچہ اکثر مورخین نے اس کی تصدیق نہیں کی ہے۔

الغرض دوسو بہتر سال چند یوم فاطمیوں نے سلطنت کی اور عاضدلدین اللہ چودھواں فاطمی خلیفہ قید میں مرا، صلاح الدین یوسف نے عباسیوں کی طرف سے تمام افریقہ پر قبضہ کرلیا، اور تمام حکام قاضی، مفتی، مدرس، شیعہ مذہب کے نکلوا کر مذہب شافعی کے قاضی اور مفتی مقرر کئے اس وقت شیعیان علیؑ افریقہ سے بھاگ کر یمن چلے آئے۔

جزائر اوقیانوس المعزلدین اللہ چوتھے فاطمی خلیفہ کے غلام ''جوہر'' نے ساحل بحر اوقیانوس و جزائر خالدات پر قبضہ کرکے شیعہ مذہب کی ترویج کی۔ اسی طرح سوریا (دمشق) کو بھی فتح کیا۔

اسپین سفاح کے حکم سے جب شیعوں کا قتل عام ہوا تو بجز چند زن و بچہ کوئی باقی نہ رہا اور وہ اسپین میں بھاگ کر مقیم ہوئے۔ ۳۴۵ھ میں بنی فاطمہ اسپین پر حکومت کر رہے تھے۔

ہندوستان بعثت رسولؐ کی خبر سن کر ابوسعید کشمیری مشتاق زیارت رسولؐ روانہ ہوئے بارہ

بارہ میں سیاحت کرتے کشمیر سے کابل پہنچے۔ بہت کچھ مال ودولت ساتھ لے گئے تھے، کابل میں لوٹ لئے گئے وہاں سے بلخ آئے، داؤد بن عباس بن ابی اسود وہاں کا حاکم تھا، غانم فارسی خوب بولتے تھے۔ دربار داؤد میں فقہائے بلخ اور غانم سے مناظرے ہوئے۔ بلخ سے قم پہنچے۔ ان کے ہمراہ اور بھی رفقاء تھے۔ ایک سندی بھی تھے۔

بغداد سے عباسیہ آئے، عراق عرب سے خراسان پہنچے اور وہیں انتقال ہوا۔

غانم ناقل ہیں کہ جب یہ کشمیر میں تھے تو دربار شاہی میں چالیس آدمی کتب سابقہ توریت وانجیل وزبور وصحف انبیاءؑ کے پڑھنے والے موجود تھے جو پرستاران کتب کو حلال وحرام کی تعلیم دیتے تھے۔ (کافی)

مذکورہ بیان کے مطابق مذہبی نشر واشاعت کا رواج کشمیر، سند میں بہت عرصہ قبل سے معلوم ہوتا ہے اور عربی مذاہب سے ہندوستان والے پہلے سے خبردار تھے جس کی تصدیق ذیل کے حاشیوں سے بھی ہوتی ہے۔

(۱) امام جعفر صادقؑ نے نیاع مسابری سے فرمایا کہ ''فن نجوم کوئی نہیں جانتا سوائے اہلبیت عرب (اہلبیت رسولؐ) کے یا اس کے جاننے والے ایک گھرانا ہندوستان کا ہے۔

(بحارالانوار)

(۲) امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ چار ستارے اور ہیں (علاوہ سبعہ سیارات کے) جن کو کوئی نہیں جانتا، بجز اہلبیت عرب (آل رسولؐ کے) اور ان چار ستاروں میں سے ایک ستارے کو ہندوستان میں ایک گھرانا ہے وہ بھی جانتا ہے اس لئے ان کا حساب کچھ درست ہے۔

(انوارنعمانیہ)

مذکورہ دونوں روایتوں سے معلوم ہوا کہ امام کو ہند کے اس گھرانے کی تفصیلی خبر تھی۔ ان

کے علمی خصوصیات و مشاغل اوران کے حسابات وغیرہ کو جانتے تھے ان ذرائع آمدورفت کی وجہ سے ہندوستان وحجاز وغیرہ کے مابین تھے، اگر چہ تاریخیں ان ذرائع سے ایک حد تک ساکت ہیں اور وہی ذرائع حضرات ائمہ کی تعلیمات مذہبی وغیرہ کے نشر کا بھی سبب ہوں گے۔ علاوہ اس کے عاضدلدین اللہ کے بعد صلاح الدین یوسف کے تشدد سے مصر اور افریقہ سے بھاگ کر شیعہ یمن ہوتے ہوئے ہندستان پہنچے اور ملک دکن میں آئے اور پیشہ تجارت اختیار کیا جو بوہرہ اسمٰعیلیہ کہلاتے ہیں، اس وقت اہل دکن گجرات والے مسلمانوں کو ترک اور تاجروں کو بوہرہ کہتے تھے۔ یہ لوگ آخری چھٹی صدی ہجری میں آئے۔ فاضل ملا علی نام بوہرہ فرقے کے جن کا مزار شہر ''کھمبائت'' میں ہے ۶۰۰ھ میں شیعہ مذہب کی تبلیغ کرتے تھے۔ غرض کہ مظالم بنی امیہ و بنی عباس سے جو لوگ جانبر ہوئے اطراف عالم میں منتشر ہوئے۔ مختلف لباسوں مختلف صورتوں، مختلف پیشوں، مختلف ذاتوں میں تحفظ جان کے لئے داخل ہو گئے تھے جیسے دہلی میں سید قطب الدین بختیار کاکی، اجمیر میں سید حسن معین الدین چشتی، آگرہ میں سید ابویعلے، بہرائچ میں سید سالار مسعود غازی، ملتان میں سید شمس الدین گردیزی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ حضرات باوجود اولاد علی ہونے کے اور بغرض تحفظ مذہبی عرب سے ایران بھاگ بھاگ کر آئے تھے وہ فی الحقیقت سنی المذاہب تھے ان کے عقائد ملفوظات وقصائد سے ان کے صحیح عقائد کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سب کے سب علیؑ مرتضیٰ کو جملہ خلفاء پر ترجیح دیتے اور ائمہ ہدیٰ کو امام روحانی کہتے اور محض تحفظ جان کے لئے سنی بنے ہوئے تھے۔ بعد آنے والی نسلیں حقیقت کو نہ سمجھیں یہ لوگ معاویہ و یزید و مابعد خلفاء کو بادشاہ اسلام دنیادار سلاطین شمار کرتے تھے، اور نشر فضائل ومناقب وعلوم ائمہ ہدیٰ میں ہمیشہ سرگرم رہے ہیں، اس لئے وہ قریبی رشتہ دار شیعوں کے ہیں۔ ہر چند کہ اصول عقائد میں بھی انھوں نے اضافے کر لئے اور فروع میں تو بہت کچھ اہلسنت کے سیاسی

اتحاد کی وجہ سے اضافہ کرلیا ہے۔ اسی طرح سے معتزلہ بھی افضلیت واشرفیت علیؑ مرتضیٰ کے قائل ہیں لیکن عام فرق اسلام سے شیعوں کو کوئی تعلق عقیدتاً نہیں ہے۔

ہم نے اس کتاب میں جا بجا لفظ سنی اور اہلسنت کا استعمال کیا ہے عام سنیوں کے مقابل میں جو خوارج ونواصب سے ملے جلے ہوئے ہیں اور منافقین میں شامل ہیں اور نام کے سنی اور فضیلت علیؑ مرتضیٰ اور دوستداران اہلبیتؑ ہرگز مراد نہیں ہیں، خواہ وہ اپنے کو سنی ہی کہتے ہوں اور انھیں کی شریعت پر عمل کرتے ہوں۔۔۔۔تمام شد ❀❀❀

تبصرہ

علامہ سید مجتبیٰ حسن کامون پوری

جوہری محلہ، عقب کوتوالی چوک، کوٹھی نواب محمد رضا صاحب، لکھنؤ

ہر مذہب کسی نہ کسی حد تک انسانی تاریخ پر اثر انداز ہوا ہے۔ انبیاء وفلاسفر نے اپنی قوم کی تہذیب وتمدن میں حصہ لیا ہے لیکن جو عالمگیر تبدیلیاں انتہائی دلیری سے محمدؐ وآل محمدؐ نے پیدا کیں اس کی مثال تاریخ میں ناپید ہے۔ تاریخ ایسا کوئی مذہب پیش کرنے سے عاجز ہے جس نے سچائی کے لئے اس قدر کثیر اور گرانقدر قربانیاں پیش کی ہوں جس قدر اسلام اور تشیع نے پیش کیں۔ ڈھائی صدی کی انتہائی حکیمانہ زندگی میں محمدؐ وآل محمدؐ نے علوم وفنون، حریت فکر، آزادی تعلیم اور تہذیب وتمدن کی جو خدمت کی ہے انسانی ترقی کی معراج ہے۔ اگر صرف امام جعفر صادقؑ کے علوم وفنون اور ان کے خدمات کی باقاعدہ تشریح کی جائے تو اس کے لئے ایک انسائیکلو پیڈیا بھی ناکافی ہے۔ شیخ ابوالعباس بن عقدہ نے امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں کا چار ہزار تک شمار کیا ہے اور حسن بن علی وشّا نے مسجد کوفہ میں دوسو آدمیوں کو حدثنی جعفر بن محمد کہتے ہوئے سنا ہے۔ ظاہر کہ ایسی معجزہ کار اور مثالی ہستیوں کے تاریخ کا دیباچہ بھی کسی محدود صفحات کی کتاب میں نہیں کیا جاسکتا۔ حکیم الامت

جناب مولانا سید احمد صاحب قبلہ نے اس مختصر صحیفہ میں کوشش فرمائی ہے کہ محمدؐ وآل محمدؐ کے اصول زندگی اوران کی قربانیوں پر سرسری نظر ڈالیں خصوصاً اس لحاظ سے یہ کتاب اور بہت اہم ہوجاتی ہے کہ اس میں مقاتل الطالبین ابوالفرح اصبہانی ۳۵۶ھ کی کتاب کا خلاصہ دیا ہے جس میں خاندان رسالت کے ۳۱۳ھ تک کے شہداء کے مختصر واقعات دیئے گئے ہیں۔

❀❀❀

تاریخ شیعہ کا پہلا ورق

مصنف

خطیب اکبر لسان الشعراء مولانا سید اولاد حسین نقوی شاعرآ جتہادی

تاریخ شیعہ کا پہلا ورق

خطیب اکبر لسان الشعراء مولانا سید اولاد حسین صاحب شاعر آجتہادی، پبلسٹی افسر ریاست رامپور

ہندوستان میں شیعہ آبادی اور اس کا عروج

شیعہ مذہب کیونکر پھیلا؟

اسلام پر یہ عام اعتراض ہے کہ وہ بزور شمشیر پھیلایا گیا۔ کسی منصف مزاج انگریز مصنف نے یہ جواب بھی خوب دیا ہے کہ جن شہسواروں نے ایران وشام کو فتح کیا خود ان کو کن تلواروں نے مفتوح کیا جب کہ آنحضرتؐ کی یتیمی ومفلسی ایک واضح حقیقت ہے۔ اس مسکت جواب کے بعد بھی دنیا چپ کیوں نہیں ہوتی اور آریہ ونصاریٰ کی طرف یہ آموختہ بار بار کیوں رٹا جاتا ہے؟ آگ پر پانی اثر کیوں نہیں کرتا؟ شاید یہ اس لئے ہو کہ محل اعتراض غلط باور کیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ نے ہمیشہ مدافعانہ جہاد کئے۔ بدر واحد وخندق جن لڑائیوں کو اولیت حاصل ہے، یہ تینوں لڑائیاں مکہ معظّمہ کے مشہور قبیلہ قریش کی جد وکد سے وقوع میں آئیں۔ بدر کے سرکردہ حضرت ابوجہل تھے اور احد وخندق کے بطل اعظم حضرت ابوسفیان پدر حضرت معاویہ۔

پہلی جنگ چشمۂ بدر اور دوسری مدینہ منورہ کے مشہور پہاڑ احد، اور تیسری لڑائی خود مدینہ کی حصاری دیوار کے قریب واقع ہوئی۔ تم جغرافیہ کا نقشہ اٹھا کر دیکھو کہ یہ مقامات مکہ سے کتنی دور اور مدینہ سے کتنے نزدیک ہیں۔ جارحانہ پیش قدمی کس نے کی اور مدافعانہ کشش وکوشش کا فریضہ کس نے پورا کیا، مگر فتوحات شام وایران ومصر میں مسلمان چڑھ کر گئے تھے یا کفاران

کے ملک پر چڑھ کرآئے تھے؟ کس کی قوت جارحانہ اور کس کی حیثیت مدافعانہ تھی؟ یہ نومسلم جماعت بیت المقدس میں شمشیر رانی کررہی تھی یا اسوۃ الرسول کی تلقین وتبلیغ کررہی تھی۔ آتش پرستان عجم کا مقابلہ شعلہ ورشمشیر سے ہورہا تھا یا تعلیم قرآن سے روشنی پھیلائی جارہی تھی، اس کا جواب بھی جغرافیہ کے نقشہ اور تاریخ سے لو اور آریہ ونصاریٰ کے اعتراض پر غور کرو۔

کرشمہ دامن دل میکشد که جا اینجا است

ہاں! بقول رسولؐ صرف مدینہ ہی کو کہا جاسکتا ہے کہ اس کو قرآن نے فتح کیا، لیکن جنود اسلامی کے جرنل سعد بن ابی وقاص نے عجم کے فاتحین سے حفظ قرآن کے متعلق دریافت کیا تو بشر الخشعمی نے کہا مجھے تو صرف بسم اللہ الرحمن الرحیم یاد ہے اور معدیکرب نے اس سے بھی انکار کردیا اور کہا کہ شغل جہاد نے مشغول کرلیا سارے لشکر میں صرف سات [1] قاری نکلے۔ یہ ہے اس تعلیم قرآن کی حقیقت جس پر مسلمانوں کو ناز ہے۔ دوسروں کا ملک چھیننے، قتل وغارت پر مسکرانے، اموال غیر جمع کرنے، بیکس کنیزوں، ناچار غلاموں کی تقسیم سے اگر کوئی ذات محفوظ ہے تو وہی علیؑ جو اپنی اور اپنے خاندان کی تباہی منظور کرسکتا تھا مگر اسوۃ الرسول میں ترمیم پر راضی نہ تھا۔ لطف یہ کہ ہنگامۂ عام نے اس عہد کو بھی حرب وضرب سے خالی نہ رکھا۔ آپ سے بھی تین لڑائیاں ہوئیں مگر علیؑ بھی آنحضرتؐ کی طرح مدافعت کرتے نظر آئے۔ وہی عرب کا نقشہ اٹھاؤ اور دیکھو کہ بصرے والے ملکی سرحد میں کہاں تک چڑھ آئے تھے اور شام سے ساحل فرات میدان صفین کتنی دور ہے۔

اصل تو یہ ہے کہ خلافت کے بنیادی اصول میں جب سے جبر شریک کیا گیا، اس وقت سے مسلمانوں میں صدق شعاری وحق پرستی کے جذبات فنا ہوتے گئے۔ شیعہ قوم تو تقیہ کے برکات

---

(۱) اصابہ، ج ۱ ص ۱۷۲، مطبوعہ مصر

سے محفوظ ہوگئی مگر جن کے یہاں تقیہ نہ تھا ان کے یہاں یہی نا شدنی رسوم ضمیر بن گئے۔ اگر چہ تقیہ صرف شیعوں میں ہے مگر وہ کون ہے جس نے تقیہ کو حرام کہہ کر بھی تقیہ نہ کیا ہو اور ظالم سے ظالم، رنگیلے سے رنگیلے، شرابی، زانی، فاسق بادشاہوں کی خلافت نہ تسلیم کی ہو، ہاں یہ اور بات ہے کہ واقعات سے یکسر منھ پھیر لیا جائے۔ آپ تاریخ اسلام کا ضرور مطالعہ کیجئے اور تشخص مذہبی، عصبیت فرقہ وارانہ سے پرہیز کر کے مطالعہ کیجئے۔ آپ کو اس ساری تاریخ کا خلاصہ ان تین جملوں میں مل جائے گا: ابتدا میں میدان خونی، اوسط میں محشرستان بغاوت، اور آخر میں شبستان عشرت ہے۔

آپ کو اکثر غلام نظر آئیں گے جنہوں نے اپنے آقا کو بیدردی سے قتل کر کے شاہی حاصل کی، اکثر ایسے سردار ملیں گے جنہوں نے میدان جنگ میں سپہ سالار کو قتل کر دیا۔ بہت سے ایسے شہزادے نظر آئیں گے جنہوں نے باپ کی دعوت جام زہر سے کی، یا قلعوں میں محبوس کر کے مار ڈالا، یا بستروں پر بیدریغ تہ تیغ کیا۔ مگر جب ان احسان فراموش، محسن کش، قاتل پدر و برادر کی سیرت و تاریخ پر نظر پڑے گی تو معلوم ہوگا کہ یہ جملہ صفات حسنہ کے مالک تھے اور ان کی قبروں پر گزر ہو جائے گا تو آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ ان کا شمار اولیاء اللہ میں ہے۔

خدا جانے ہماری ابتدا اور انتہا کیا ہے

شیعہ بادشاہوں میں بھی اگر چہ نہ کوئی معصوم ہے نہ محفوظ، مگر ان میں سے کوئی خلافت یا امامت کا مدعی بھی نہیں ہے۔ اس طرح اگر ان میں سے کچھ شراب نوش یا عشرت پرست ہوں تو ان کی کمزوری عام مادیت کے نقطۂ نظر سے دیکھی جائے گی اور روحانیت کا مقدس خیال بھی پیدا نہ ہو سکے گا لیکن جب اسے خلاف شرع ممنوع بالنص عادت کو خلفائے اسلام کی سنت جاریہ سمجھا

جائے اور اپنی شراب خوری کی سند روحانی دعویداروں کے لب تر سے دی جائے تو البتہ مذہب اسلام کے لئے مضر قرار پائے گی۔ مگر آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ شیعہ سلاطین میں شراب خواری کم اور بغاوت شاذ اور عصبیت معدوم ہے۔ چونکہ خلافت کا بنیادی اصول یا تعمیری خشت اول ہی ذرا کج ہوگیا تھا۔ اس لئے سلطنت اسلام کی دیوار ثریا تک خمیدہ کمر ہوتی گئی۔ شاہی کے لئے تشخیص کوئی نہ تھی، البتہ خلفائے عباسیہ کبھی خوشامد کے طور پر اور کبھی اپنے اثرات کے نفوذ کے لئے بلاد اسلام کے شمشیر بکف بادشاہوں کو خلعتِ شاہانہ کے ساتھ اجازت نامہ شاہی بھی بھیجتے تھے۔ مگر ان کی حقیقت عباسیہ دارالامارہ کے بوسیدہ حجاب سے صاف نظر آتی تھی۔

دنیا من مانی کارروائیاں کررہی تھی اور خلافت گاہ کو بہرطور چشم پوشی کرنا پڑتی تھی۔ جس نے تلوار سنبھالی وہ خلیفہ یا کم از کم بادشاہ ہوگیا۔ کفار پر ہر طرح کا جبر وظلم جائز رکھا گیا۔ اگر مرد نذر شمشیر ہوئے تو ہزاروں عورتیں بچوں کو گود میں لے کر آگ میں کودنے پر مجبور ہوئیں۔ کفار کے مال ومنال بالکل ان کے تھے، خاموش سلطنتوں پر دھاوا ان کا حق تھا، آبادیوں کی اینٹ سے اینٹ بجادینا ان کا شیوہ تھا۔ لاکھوں انسانوں کے قتل کرنے کی قسم کھائی اور اس کو باحسن دعویٰ پورا کیا میدان کے میدان خون سے رنگین کئے اور زمانے کو مسلح بنا کر اپنی خون آشامی کی داد لی۔

شیعہ بادشاہ کم از کم خونخوار نہ تھے۔ ان کا مذہب عجیب وغریب طریقہ سے پھیلا۔ ان کو ملک و دولت بے نظیر ذرائع سے ہاتھ آئی۔ آپس میں بھی جنگ ہوئی اور کفار سے بھی مگر صلح اکثر مطمح نظر تھی۔ شاہانہ غیظ وغضب اگر پوشیدہ نہ تھا تو رحم وکرم کا پہلو بھی نمایاں تھا۔ کفار کے ممالک پر بھی قبضہ کیا، قلعے بھی چھینے مگر فتح کے بعد کفار کو بھی مذہبی آزادی دی، ان کے معابد کی حفاظت کی، ان کی عزت کو اپنی عزت جانا اور کم از کم کبھی اس لئے جنگ نہیں کی کہ فلاں

راجہ کی بی بی خوبصورت ہے۔ کفار نے ان کے درباروں میں بارِ عام پایا۔ بڑے بڑے عہدوں پر بھی ان کو فائز کیا گیا۔ مگر جب ان کی تاریخ مرتب ہوئی تو دنیا کے ذلیل، عیوب کے حامل بتائے گئے۔ ہندوستان میں شیعہ بھی ہجرت کر کے آئے، مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے استقبال کے لئے خونِ کفار کی سرخ مخمل بچھائی گئی۔ ان کا سب سے پہلا قدم فقیرانہ تھا وہ ہدایت کے لئے نکلے تھے۔ اس لئے تلوار ساتھ نہ تھی، زبان کارِ ذوالفقار کرتی تھی۔ ان کے پہلو میں خنجر نہ تھا، قرآن مجید سے قلعہ دل مسخر ہوتے تھے۔ فقرائے شیعہ کے حالات کے لئے ایک باب مخصوص کر دیا گیا، اس لئے انشاءاللہ آئندہ بیان کیا جائے گا۔

لیکن آٹھویں صدی ہجری سے شیعہ قوم نے بھی امارت وسلطنت کی طرف عملی اقدام شروع کر دیا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ سب سے پہلے جس سرزمین پر شیعوں کو شہر یارانہ عروج ہوا وہ دکن کی زمین ہے اور سب سے پہلی بار جس سرزمین پر خطبۂ شاہی میں ائمہ اثناعشر علیہم السلام کے اسمائے گرامی بالائے منبر لئے گئے وہ یہی سرزمین ہے۔ اسی زمین پر عراق و ایران وترکستان وگرجستان کے شیعہ جمع ہوئے اور اپنے ساتھ وہ تبرکات وتحائف بھی لائے جو نقدِ جاں دے دے کر بچائے گئے تھے (ان تبرکات کا تذکرہ وفہرست کے لئے ایک باب مخصوص ہوگا انشاءاللہ)۔

میر فضل اللہ انجو، ملا طاہر، مشہور علم دوست وزیر محمود گاواں، میر عالم، میر مومن، میر فتح اللہ شیرازی اور ایسے ہی خدا جانے کتنے علماء وفضلا وباکمال، فاتح جنرل، پرجگر سپاہی اسی زمین میں پوشیدہ ہوئے۔ ہماری گمنام تاریخ کا سرمایہ قلعہ شولا پور واحمد نگر کے کھنڈرات، بیجاپور وگلبرگہ سے لے کر حیدرآباد اور کرناٹک تک پھیلا ہوا ہے۔ مگر افسوس کہ ہم کو نشان قبر تک نہیں معلوم۔

ابتداً دکن میں صرف ایک شیعہ خاندان شاہی رونما ہوا، مگر چراغ سے چراغ روشن ہوتا رہا

اورآخرکارتمام دکن میں چراغاں ہوگیا یا ہماری روشنی پھیل گئی اور یہ سب کچھ انہیں مولویوں کی کارگزاری ہے جوآج ہر دشنام کے پہلے مستحق ہیں۔امریکہ وہندوستان کے متجسس آج یورپ بھر میں واجب الاحترام ہیں مگر شیعہ مولوی سلطنتیں دلوا کر تبلیغ مذہب کر کے بادشاہوں کوشیعہ بنا کر واجب اللعن ہیں۔ ہندوستان سے باہر ایران وترکستان وعراق ومصر واندلس بھی شیعہ برکات سے خالی نہیں ہیں، لیکن ان کی جستجو کے لئے ایک مکمل زندگی درکار ہے۔اوران بکھرے ہوئے موتیوں کو چننے کے لئے زمانہ کا وسیع دامن چاہئے ہے۔اس میں شک نہیں کہ اگر ایسی تاریخ جمع ہوجائے تو نہ صرف اردو بلکہ عربی وفارسی میں بھی آپ اپنی نظیر ہوگی۔

درین دریائے بے پایان درین طوفان شورافزا

دل افگندیم بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرِيٰهَا وَمُرْسٰهَا

سیداولادحسین،ازرامپوراسٹیٹ۔۲۲؍دسمبر ۱۹۳۱ء

سلاطین دکن

شیعہ قوم اپنی ابتدا سے ایک مظلوم قوم ہے، اس طبقہ کو خلفائے راشدین کی خلافت کی حقیقت سے انکار ہے اور وہ اجماع واستخلاف وشوریٰ جس نے حضرات ابوبکر وعمر وعثمان کو خلیفہ آنحضرتؐ بنایا اس کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔اگر آپ یہ سوال کریں کہ کیوں؟ تو اس کا جواب کتب مناظرہ میں ملے گا جن کی قلت نہیں ہے۔جس طرح آج مسلمانوں کو انکار ہے کہ گاندھی گول میز کانفرنس میں ان کے نمائندہ نہیں ہیں اور جس طرح نیشلسٹ مولانا شوکت علی کی نمائندگی سے منکر ہیں، اسی طرح شیعہ قوم حضرات خلفائے ثلاثہ کی نمائندگی سے منکر تھی اور منکر ہے۔لیکن وہ اسلامی حکومت جس کی بنیاد اجماع یا جمہوریت پر پڑی تھی اس میں کم از کم رائے کی آزادی مفقود تھی۔آج شوکت علی کی نمائندگی کے منحرف نیشنلسٹ بہرطور زندہ ہیں اوران کی

عزت و آبرو بھی محفوظ ہے۔مگر شیعہ اس گناہ پر جو (جو اختلاف رائے سے زیادہ نہ تھا) واجب القتل تھے۔ چنانچہ عہد بنی امیہ میں ان کا قتل وغارت، خانہ ویرانی واسیری نہ صرف جائز بلکہ شاید باعث ثواب بھی تھی یہاں تک کہ اس بارے میں امیر معاویہ کے احکام تک پائے جاتے ہیں۔

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ صرف خلافت ہی میں نہیں بلکہ دوسرے فروع میں بھی شیعوں کو اختلاف رہا ہے جیسے ارکان نماز روزہ وغیرہ۔ یہ اعتراض بالکل صحیح ہے مگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ خود حضرات اہلسنت میں بھی یہ اختلاف موجود ہے۔ مثلاً امام مالک کے ماننے والے شیعوں کی طرح ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہیں۔امام شافعی کے یہاں قنوت پڑھنے کا دستور ہے۔ پھر شیعوں کے لئے یہ اختلاف اصولی کیوں قرار دیا گیا اور مالکی وشافعی میں اسی اختلاف کو فروعی کیوں تسلیم کیا گیا اس کا جواب دشوار تر ہے۔

خلفائے عباسی کے عہد میں صرف یہ کہنا کہ ہم شیعہ ہیں اور جان سے ہاتھ دھونا برابر تھا۔ اور یہ سلسلہ ترتیباً سلجوقیہ وغزنویہ کا بھی دستورالعمل رہا۔اسی بنا سے صدیوں تک شیعہ قوم پوشیدہ رہی۔ ان کا اجتماع مذہبی بالکل اسی طرح ناممکن تھا جیسے عیسائی روما کے عروج میں یہودیوں کا اجتماع۔عہد خلفائے بنی امیہ کے بعد خلفائے عباسیہ نے تختِ خلافت پر قدم جمائے اور اگرچہ اس نام نہاد مذہبی سلسلہ کو قائم رکھنا ان کے لئے بھی ضروری تھا جو ان سے شروع ہوکر خلفائے راشدین سے مل جاتا تھا،مگر کم از کم یہ آل ہاشم میں تھے اور بنی امیہ کے ازلی وابدی مخالف، اس لئے شیعوں کو ایک غیر محسوس سی فضا سانس لینے کے لئے مل گئی یعنی وہ اپنے معتقدات کو امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالب کے نام پر تو ظاہر نہ کر سکے مگر امام حسینؑ کے نام پر گاہے بگاہے ان کا اجتماع ہونے لگا اور وہ اپنی مجالس میں بیٹے کے ذریعہ سے باپ کے فضائل بھی بیان کرنے

لگے اور اس طرح ان کی تبلیغ مسلسل مگر دھیمی رفتار سے شروع ہوگئی۔ان خلفا میں بعض نے مجالس کی غایت پہچان لی اور ان مجالس پر خلاف قانون جلسوں کا دفعہ لگا کر عسکرانہ قوت سے مدافعت کرنے لگے۔بس اتنا فرق تھا کہ ہندوستانی پولیس ڈنڈے برسانے پر قناعت کر لیتی ہے اور عہد عباسیہ کے سپاہی شمشیر رانی پر بھی توکل نہ کرتے تھے بلکہ گھروں کو بھی گرا دیتے تھے اور گھر والیوں کو بھی اس جیل خانے میں پہنچا دیتے تھے جس میں اے اور بی کلاس تو کہاں، سی کلاس اپنی تنگی، اپنی تعفن، اپنی تاریکی، اپنی مضرتی سے زڈ کلاس کہے جانے کے قابل تھا۔اس قسم کی قید و بند اور آزادی کے گلے پر چھری چلانے میں خلیفہ متوکل عباسی کا عہد بہت ممتاز ہے۔

اگر یہ سچ ہے کہ تصنیف کے لئے فضا کا سکون، اور شہر آشوبی کا فقدان ضروری ہے تو ہم سے کسی قسم کی تصنیف کا مطالبہ اپنی تاریخی ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے۔پھر بھی مذہب کی بقا کے لئے اسناد کی ضرورت تھی لیکن زمانہ کی تنگی قلمی موشگافی کا راستہ بھی نہ پاتی تھی، اس لئے سب سے اہم ضرورت کو مقدم کیا گیا اور امام محمد باقر و امام جعفر صادق علیہما السلام نے مذہبی قانون (فقہ) کی تدوین کر ہی دی، اس لئے کہ قانون ہی پر مدار مذہب ہے۔اس کے بعد کلام میں بیشتر حصہ امام رضا علیہ السلام کی روایت پر منحصر ہوا اور تفسیر میں امام حسن عسکریؑ نے اپنی نشانی چھوڑی، لیکن جن علوم کا ادب سے تعلق تھا اگر چہ ایک حد تک ان میں بھی جد و جہد کی گئی مگر اس کو کافی نہیں کہا جا سکتا۔خصوصاً تاریخ کا حصہ بالکل ہی ناتمام رہا۔اگر چہ بعد میں علامہ طبرسی نے اعلام الوریٰ اور جناب مفید علیہ الرحمہ نے ارشاد اور ابن شہر آشوب نے 'مناقب' پیش کیا مگر اول الذکر دونوں کتابیں تاریخی نہیں کہی جا سکتیں، ہاں سیرت کہہ لیجے اور آخر الذکر کتاب کا براہ راست مناقب سے تعلق ہے اگر چہ ضروریات سیرت سے یہ خالی نہ ہو۔

غرض صرف ہمارے زندہ افراد ہی مردہ نہیں کئے گئے بلکہ اموات کی قبریں بھی رفتہ رفتہ

بے نشان ہوگئیں۔ یہی اسباب ہیں کہ اس وقت عربی وفارسی میں بھی ہماری قومی تاریخیں نہیں پائی جاتیں اوراسلاف کے حالات صرف دوسروں کے رحم وکرم ہی سے ہم تک پہنچتے ہیں۔

مؤرخین اسلام کے خصوصیات

اگر فرقہ وارانہ جذبات کا وجود اس ترقی یافتہ دنیامیں پایا جاتا ہو، اگر گورے کالے کا امتیاز، ہندو مسلم کی تفریق اہل کتاب وغیر اہل کتاب کی تقسیم اب تک زندہ ہو،تو آپ کو یقین رکھنا چاہئے کہ ہمارے جذبات کالحاظ کئے بغیر اپنے معتقدات کو پیش کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو فرقہ واری اختیار کی ہی گئی، جیسے عقد حضرت ام کلثوم حضرت خلیفہ ثانی سے۔اس مضمون میں میرا یہ فریضہ نہیں ہے کہ میں اس نکاح کے عدم و وجود پر بحث کروں لیکن فن تاریخ کی کثیر التعداد مجلدات میں مجھے صرف دو تاریخیں ایسی نظر نہ آئیں جس میں مصنف نے اپنی تحقیق کو دخل دیا ہو اور الفاظ روایت وواقعات بدل نہ گئے ہوں اور بھی اختلاف یہی واقعات کی بوقلمونی کہتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔حافظہ نباشد۔

دوسری قسم کے وہ مسلمان مؤرخین ہیں جوسخت روادار تھے۔انہوں نے کبھی فرقہ نہیں بتایا اوراس طرح حضرات احناف کوکافی فائدہ حاصل ہوایعنی زید اگرچہ کسی فرقہ سے متعلق کیوں نہ ہو لیکن اس کا مسلم ہونا اس کی حنفیت کی دلیل سمجھا جائے گا۔ایسے مصنفین نے بھی ہمارا کافی نقصان کیا۔

تیسری قسم کے وہ مؤرخین ہیں جو سرے سے واقعات ہی ہضم کرجاتے ہیں اور آجکل کے مقصد پرست اس حیلہ سے ضعف کونمایاں کرتے ہیں۔غرض، ہماری تاریخ کے ساتھ ہمارے اسلاف اور ہمارے قومی کارنامے امتداد زمانہ کی مٹی میں دفن ہوتے چلے گئے اور ہندوستان پر کیامنحصر چھٹی صدی سے پہلے گویاکسی سرزمین پرشیعہ امامیہ آباد ہی نہ تھے۔

ان سب کے بعد اس نئی روشنی میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو ہی گیا کہ جو ہمارے معزز افراد پرانی غارتگری سے محفوظ رہ گئے تھے ان کو بھی اپنے زمرہ میں شمار کرنے لگا، جیسے فردوسیؔ، جیسے غالبؔ، خواجہ آتش لکھنوی اور ایسی بودی دلیلوں سے جن کو دوسری لفظوں میں غرض پرستی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، مثلاً غالبؔ اس لئے شیعہ نہ تھے کہ ان کو نواب صاحب لوہارو نے (جو حنفی المذہب تھے) دفن کرایا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس دلیل سے وہ غرباء وفقراء کس مذہب میں شمار ہوں گے جن کو شہر کی مینوسپلٹیاں دفن کرادیتی ہیں۔ اور اگر یہی دلیل کی قوت ہے تو پٹنہ والوں کو جلد ہوشیار ہوجانا چاہئے۔ ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے میر علی محمد صاحب شادؔ عظیم آبادی سے اقرار شیعیت ہزار بار سنا ہوگا لیکن پچاس برس کے بعد یہ بھی براہ راست حنفی المذہب تسلیم کرلئے جائیں گے۔ اور دلیل یہ ہوگی کہ قبر پر چادریں چڑھتی تھیں۔ اسی طرح مرنے والوں کو بھی آئندہ احتیاط ضروری ہے، جگہ دیکھ کر مرنا چاہئے۔

اسی خطرہ سے ڈر کر میں نے عرصہ سے ارادہ کرلیا تھا کہ میں تاریخ شیعہ لکھنے کی اہم خدمت انجام دوں مگر اب تک اس کا منتظر رہا کہ مجھ سے بہتر کوئی اہل قلم اس فرض کو پورا کرے خصوصاً وہ گروہ جس نے اقدام عمل میں پاؤں کی بہ نسبت گلے پر زیادہ زور دیا ہے مگر ابتک تو مجھے کسی جانب احساس پیدا ہوتے ہی نظر نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں تاریخ لکھنے کے لئے گھسے ہوئے کلک سے پن ہر طرح بہتر ہے، اس لئے کہ کلک والا قلم کشیدہ و ''نظری'' گروہ انگریزی سے میری ہی طرح بالکل کورا ہے۔ دوسرے مولوی کاہل سست زمانہ شناس ہیں۔ مگر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کیا کررہا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ صرف مولوی ہی عمل کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ حقیقتاً الزام واتہام کے لئے وہ نشانہ بالکل ٹھیک ہے جس کو مولوی کہتے ہیں، اس لئے کہ اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ۔

یہ عرض کردینا بھی ضروری ہے کہ تاریخ شیعہ کو صدر اسلام سے شروع ہونا چاہئے مگر پھر خلافت کے فرسودہ مضامین زیر قلم آجاتے دوسرے اپنی گرفتاریوں اور دماغی وجسمانی کمزوریوں سے مجھے یہ امید بھی نہیں کہ یہ طویل الذیل مضمون میری زندگی میں ختم ہوسکے گا۔ لہٰذا وطنیت کے غلبہ سے مغلوب ہوکر شیعہ ہندوستان کے حالات سے شروع کرتا ہوں اگر یہی باب تمام ہوگیا تو یہی سمجھوں گا کہ میری زندگی کا مقصد پورا ہوگیا۔ ہندوستان میں بہمنیہ وعادلیہ ونظام شاہیہ وقطبیہ وعمادیہ سلاطین کے بعد سلاطین گجرات وکشمیر، سندھ وٹھٹھ، مما لک شرقی (جونپور)، بنگال وبہار واودھ، رام پور میسور وکرناٹک وغیرہ کے شیعہ امرا وسلاطین کے حالات کچھ کم نہیں ہیں۔

شیعوں کے عروج میں عام اہل اسلام سے جداگانہ طور پر آپ کو تدریج نظر آئے گی اور اس کی بنا یہی ہے کہ شیعہ فوجوں اور لشکروں کے ہمراہ نہ آئے تھے، انہوں نے فقیری سے امیری حاصل کی جو ان کی دانش ان کی قوت عمل کی گواہ ہے۔ صاحبقران امیر تیمور کے عہد سے ایرانیوں کی آمدورفت کا دستور عام ہوگیا۔ ہندوستان پر ایرانیت اسی طرح چھانے لگی جیسے آج انگریزیت چھا گئی ہے۔ اگر آج ہیٹ اور سوٹ ترقی وتہذیب کی نشانی ہیں تو کل یہی بدنام عمامہ وعبا عزت کا ذریعہ تھے۔ جیسے آج انگریزی الفاظ کے بغیر اردو کا مضمون قابل وقعت نہیں ہوتا، اسی طرح کل فارسی زبان اظہار خیال کا باوقار ذریعہ تھی اور ہندوستان ہی پر کیا منحصر ہے خود ایران بھی عروج اختر حجاز سے یوں ہی متاثر ہو چکا تھا۔ سعدیؔ وحافظؔ کی شیریں زبانی میں عربی کے شہد کا بڑا حصہ ہے۔ ان دونوں نے فارسی میں عربی کے پیوند کثرت سے لگائے۔ فتح وظفر ایک تیز آندھی ہے، ناتواں پتے ہمیشہ ہوا کا رخ دیکھتے رہتے ہیں اور ہوا کے گھوڑے پر سوار مغرب ومشرق کی سیر کرتے پھرتے ہیں۔ استقلال تو انہیں موجودات کا حصہ ہے جن کو فطرت

نے متانت وسکون بخشا ہے، جیسے پہاڑ تیز آندھیوں میں بھی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں مگر اڑتے ہوئے پتے ہمیشہ انہیں سے ٹکراتے ہیں۔یہی حال آج کو وقار علماء کا ہے۔

یہ اپنا کچھ نہ رکھنے والے معاشرت، تہذیب یہاں تک کہ لباس میں بھی غیروں کے محتاج ہیں اور ہر قوم کے عروج سے متاثر ہونا، دوسروں کی نقل کرنا، غیروں کے ہم زبان بننا ان کے نزدیک ترقی کا راز ہے۔ دیکھ لیجئے کل عمامہ وعبا ذلیل کن تھے اور سوٹ ہیٹ میں عزت محفوظ تھی آج ڈاسن کے جوتے اور ولایتی سرج پر ایمان رکھنے والے چپل اور کھدر پر اتر آئے ہیں۔ جن کی نگاہ میں انگریزیت نجات دارین کا واحد ذریعہ تھی، اب وطنیت وقومیت ہی میں ان کے نزدیک ہر مرض کی دوا مشخص ہے۔ ابتدا تو آج ہی سے ہوچکی مگر پچاس برس بعد یہی گروہ انگریزی تہذیب وتعلیم کو جہالت، انگریزی وضع کو غداری سے تعبیر کرے گا، مگر علماء سو برس پہلے بھی یہی کہہ رہے تھے اور آج بھی ان کی زبان نہیں (رکی) اور مدتوں ان کا بیان یہی رہے گا اگر ابتدا ہی میں انگریزی تعلیم انگریزی تہذیب کا بائیکاٹ ہوجاتا تو پاؤں کی بیڑیاں اتنی نہ ہوتیں، زندان کا قفل زنگ خوردہ آسانی سے کھل سکتا مگر علماء اس وقت بھی متعصب جاہل ناعاقبت اندیش تھے اور آج بھی۔

دربار ہمایوں میں شیعوں کا اجتماع، ان کا عروج کچھ ایسا نہ تھا کہ چغتائی فوج کے احناف نے سہل انگاری ہی میں ـــــ۔ نجات شیر شاہ کے شکست کے اسباب میں بڑا راز یہی ہے۔ ہمایوں کی شکست، بیرم خاں کی رہبری سے ایران کا سفر، شیعہ بادشاہ سے استمداد، (ان) کے قوت بازو سے ہندوستان پر دوبارہ قبضہ یہ بہت بعد کا قصہ ہے۔

سلاطین بہمنیہ کا عہد شیعوں کی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ سلاطین خلجیہ دہلی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سلطان علاؤ الدین حسن بہمنی کانکوی صوبہ داری سے شاہی پر آمادہ ہوا اور روز جمعہ

۲۴ ربیع الاول ۸ ۷۴۸ھ مسجد قطب الدین شاہ میں اعلان بادشاہی کے بعد تخت نشین ہوگیا۔(۱) یہ بادشاہ حنفی المذہب تھا اس لئے بتقلید خلفائے عباسی چتر شاہی کا رنگ سیاہ رکھا گیا، سلطان حسن نے حسن آباد گلبرگہ دکن کی تعمیر کی اور یہی اس کا تخت گاہ تھا۔

بنام حسن خسروی شد تمام
جہان زیر فرمانِ اوگشت رام
بر او رنگِ شاہی برآمد پگاہ
برآورد برسر کیانی(۲) کلاہ
ہماں شہر گلبرگہ شد تخت گاہ
عمارت برآورد چو بر اوج ماہ
بنام حسن شہر شد چوں تمام
نہادند آن را حسن آباد نام

سلطان حسن نے جاہ وجلالت وعدل وانصاف کے ساتھ بادشاہی کی۔ جود وسخا میں بھی حسن نے کافی حصہ لیا۔ نہ صرف دکن کے غربا بلکہ مکہ معظّمہ مدینۂ منورہ کے مساکین بھی اس کے ابر کرم سے ترلب ہوتے رہے۔ تخت نشینی کے بعد پہلا اور بستر موت پر آخری حکم خیرات کا حکم تھا۔ چنانچہ حسب وصیت علماء ومشائخ احناف کو بہت کچھ دیا گیا۔ اور غرّہ ربیع الاول ۷۵۹ھ میں

---

(۱) تاریخ فرشتہ، ج۱ ص ۲۷۷، مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ

(۲) سلاطین بہمنیہ کا سلسلۂ نسب ساسانیان ایران سے منسوب کیا جاتا ہے۔ بہمن نامہ میں جابجا کلاہ کیانی وغیرہ کا تذکرہ آتا ہے لیکن بہمن نامہ خود قابل اعتبار نہیں ہے اس لئے کہ اس کی تصنیف شیخ اذری سے منسوب ہے اور یہ طے ہو چکا ہے کہ یہ شیخ اذری کا کلام نہیں ہے، کسی گمنام شاعر کا کارنامہ ہے۔

وفات پائی۔گلبرگہ میں قبر بنی۔محمد شاہ نے باپ کی قبر پرایک شاندار گنبد تعمیر کرادیا جوآج تک باقی ہے۔

سلطان محمد شاہ بہمنی باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔اس نے حدود سلطنت میں بہت کچھ اضافہ بھی کیا، سرحدوں پر مضبوط قلعے بھی بنائے۔سلطان حسن تک نظام سلطنت معین نہیں ہوا تھا۔محمد شاہ نے عہدے معین کئے، اور مستحق ارکانِ دولت کو متعین کیا۔ چتر ہما وتخت فیروزہ اسی کے عہد میں تیار ہوا۔سلطان محمود شاہ کے عہد میں اس تخت کی قیمت ایک کڑوڑ ہوں (۱) تخمینہ کی گئی تھی۔عجب نہیں کہ شاہجہاں کا تخت طاؤس چتر ہما وتخت فیروزہ کے جواب میں بنایا گیا ہو۔

محمد شاہ سلاطین دکن ہی میں نہیں بلکہ اکثر حالتوں میں نام نہاد خلفائے عباسیہ سے بھی بہتر تھا۔اس نے ماں باپ کی عزت ایسی کی ہے جو صرف غرباہی میں رائج ہے۔بات کا بڑا دھنی تھا۔اسلام کے نام پر جان دینے کے لئے تیار تھا۔اسی نے بعض مسلمانوں کے انتقام میں ایک لاکھ ہندوؤں کو قتل کرنے کی قسم کھائی تھی اور اس قسم کو پورا بھی کیا۔اس کے عہد میں شیعوں کی تعداد میں اضافہ تو ہوا لیکن خاندان شاہی کے کان میں اب تک لفظ شیعہ نہ پڑا تھا اور شیعہ تو شیعہ خود اہلبیتؑ ہی سے واقفیت نہ تھی۔چنانچہ سلطان حسن کے بعد ملکہ جہاں نے اپنے سعادت مند فرزند (محمد شاہ) سے حج بیت اللہ وزیارت مدینہ منورہ کی اجازت لی اور بیٹے نے تمام وہ چاندی اور سونا جو باپ نے مصالح دنیوی کے لئے جمع کیا گیا پائی پائی کرکے ماں کے ہمراہ کردیا، اس میں مسکوک وغیر مسکوک طلا ونقرہ شامل تھا، چار سومن سونا اور سات سومن چاندی غیر مسکوک ملکہ جہاں کے ہمراہ ہوئی۔محمد شاہی کشتی پر آٹھ سو مہمانوں کی مہمانی کرتی ہوئی ملکہ جدہ

(۱) فرشتہ، ج۱رص ۲۸۸،

سے مکہ معظّمہ پہنچی اور ریگستان حجاز میں دریائے جود وسخا جوش زن ہوا۔ حج کے بعد ملکہ جہاں مدینہ منورہ آئیں اور سادات کے چار ہزار لڑکے اور لڑکیوں کا اپنے صرف سے نکاح کیا۔[(۱)] گنبد خضراء وخاتم النبینؐ کی زیارت کے بعد جنت البقیع کا رخ کیا۔ مزار حضرتِ سیدۃ نساء العالمین بضعۃ الرسول حضرت فاطمہ الزہراؑ پر بھی حاضر ہوئیں۔ اور بہت کچھ خیرات کی۔ پھر امام حسنؑ کی قبر کی زیارت کر کے صدر الشریف سے دریافت کیا کہ حضرت بی بی کے دوسرے فرزند امام حسینؑ کی قبر منور کہاں ہے؟ (یہ تھی اہلبیت کی معرفت جس پر مسلمانوں کو ناز ہے۔ میرا خیال اگر صحیح ہے تو آج کل کے ہندو ہی اس سے زیادہ واقف ہیں) صدر الشریف نے کہا کہ ان کی قبر کربلائے معلیٰ میں ہے اور ساتھ ہی ساتھ یزید کے مظالم اور مدینہ سے روانگی اور کربلائے معلیٰ میں پہنچ کر شہادت کا تذکرہ کیا۔ ملکہ جہاں بے اختیار ہو کر روئیں اور کہنے لگیں مجھے معلوم ہے کہ ماں کو چھوٹے بچے سے محبت زیادہ ہوتی ہے لہٰذا بغیر زیارت امام حسینؑ حضرت بی بی مجھ سے خوش نہ ہوں گی۔ فوراً سفر عراق کا سامان کیا، سامان سفر مہیا ہو رہا تھا کہ ملکہ جہاں نے خواب میں سیدۂ عالم کو دیکھا کہ آپ فرما رہی ہیں کہ میں تیرے حسن اعتقاد سے بہت خوش ہوں اور خدا اور رسولؐ بھی راضی ہیں، تیرا بیٹا تیرا منتظر ہے تو یہیں سے دکن کو واپس چلی جا[(۲)] (سچ ہے محبت کا جواب محبت ہی ہے ملکہ جہاں نے سیدہؑ کے فرزند کو یاد کیا تو سیدہؑ ملکہ جہاں کے فرزند کو کیوں بھولتیں۔ اہلبیتؑ کی محبت میں بھی ایک ادا اسقدر دلکش ہے جس سے مسلمان تو مسلمان کفار بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے اور انہیں باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ مذہب بے روح مذہب نہیں ہے) سلطان محمد شاہ نے بہت کچھ توسیع مملکت کے بعد ماہ ذیقعدہ ۷۶۶ھ میں

---

(۱) فرشتہ، ج۱ ص ۲۸۴ (۲) فرشتہ، ج۱ ص ۲۸۵

وفات پائی اورگلبرگہ میں دفن ہوا۔محمد شاہ کے بعد تاریخ اسلام اپنے پرانے رنگ میں رنگ گئی۔قتل وغارت وفساد کا بازار گرم ہوگیا، ہوس جہانبانی میں عزیز کشی شروع ہوگئی۔ چنانچہ محمد شاہ کے بیٹے مجاہد شاہ کو داؤد بن سلطان حسن نے بستر بیماری وخواب پر ذبح کیا اور داؤد شاہ کو بھتیجے کے قتل کے بعد حالت نماز میں قتل کیا گیا۔ ۷۸۰ھ تک یہ سب کچھ ہوگیا۔

داؤد شاہ کے بعد اس کا بھائی سلطان محمود شاہ بن سلطان علاء الدین حسن تخت نشیں ہوا۔ اس کے عہد میں پھر امن واماں کا دور دورہ ہوا اور بادشاہ کی علم دوستی نے اکثر علماء کو جمع کرلیا جس میں شیعوں کی تعداد ممتاز تھی۔ میر فضل اللہ انجو، خواجہ زین العابدین ہمدانی، خواجہ محمد کازرونی (کاظمینی)، ملا محمد قاسم مشہدی ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ میر فضل اللہ انجو کرسیِ صدارت(۱) پر رونق افروز تھے۔ ساتھ ہی ساتھ غلامان ترک کا بھی عروج ہوا جو آخر میں مصائب کا سبب ہوا سلطان محمود نے ۷۹۹ھ میں وفات پائی اور گلبرگہ میں دفن ہوا۔

سلطان محمود شاہ کے بعد سلطان غیاث الدین بن محمود شاہ نے تخت پر قدم رکھا۔ اس کے عہد میں شیعوں کے اثرات نے ایک زینہ اور بلندی حاصل کرلی تھی، یعنی غیاث الدین تھا تو حنفی المذہب مگر سادات پروری اس کا خاص شیوہ ہوگیا۔ باپ کے عہد سے غلامانِ ترک کا عروج ہو چکا تھا اور وہ اکثر معزز عہدوں پر فائز تھے۔ غیاث الدین نے صاف صاف کہہ دیا کہ سادات پر غلاموں کی حکومت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہی لفظیں تھیں جس سے تغلچیں غلام بادشاہ کا دشمن ہوا اور بادشاہ تغلچیں کی خوش جمال دختر پر عاشق ہوا جو حسن صورت کے ساتھ موسیقی میں بھی کافی شہرت رکھتی تھی۔

---

(۱) تاریخ فرشتہ، ج ا ص ۳۰۲

تغلچیں نے غیاث الدین کو دعوت کے بہانے سے اپنے گھر بلایا اور بیٹی کے لانے کے حیلے سے بادشاہ کو تنہا کیا۔ پھر طرب نامی خواجہ سرا نے شراب میں بیہوشی دی اور اسی حالت میں دونوں نے مل کر غیاث الدین کو گرفتار کرلیا اور خنجر سے آنکھیں نکال لیں ؎

آنکھیں کھوئیں حسرت دیدار میں۔

غیاث الدین کے ساتھ جو دروازے پر منتظر تھے ان میں سے ایک ایک کو بادشاہ کے نام سے گھر میں بلالیا گیا اور چوبیس باختیار عہدہ دار ذبح کر ڈالے گئے۔ غیاث الدین کی دو ماہہ سلطنت رمضان ۷۹۹ھ میں ختم ہوگئی اور تغلچیں نے غیاث الدین کے چھوٹے بھائی شمس الدین کو پانزدہ سالگی میں تخت نشیں کر کے در پردہ خود سلطنت کرنا شروع کر دی۔ اگرچہ غیاث الدین کے عہد میں شیعہ بھی بااختیار عہدوں پر فائز تھے مگر یہ سب کے سب قتل سے محفوظ رہے اور بظاہر اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ بادشاہ کی شرابخوری اور اس کی اوباشانہ صحبتوں میں شریک نہ تھے۔

شمس الدین کنیز زادہ تھا اور اس کی ماں مادر غیاث الدین کی لونڈی تھی۔ غیاث الدین کی موجودگی میں اس کنیز کو اپنے فرزند کی شاہی کا وہم بھی نہ تھا۔ تغلچیں کی اس خونخوارانہ تدبیر سے بہت خوشی ہوئی، اس لئے کہ بیٹے کی شاہی کے ساتھ ساتھ یہ خود بھی ملکہ جہاں ہو چکی تھی۔ غرض تغلچیں سے بہت خوش تھی اور تغلچیں بھی اپنی لڑکی کے عشق کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ آخر تحفہ وتحائف کا سلسلہ جاری ہو ہی گیا۔ رفتہ رفتہ ملکہ جہاں اس کے قبضہ میں آ کر رہی۔ ایک طرف تو وہ اپنے بیٹے کو تغلچیں کی متابعت کا حکم دیتی تھیں، دوسری طرف خود سراپا تغلچیں کی تابع تھیں۔ خرد سال شمس الدین کو یہ نہ معلوم تھا کہ اب تغلچیں سے اس کا رشتہ کیا ہے۔ معاملات سلطنت میں شوریٰ کی ضرورت ایک واجبی بات ہے، شمس الدین تو بچہ تھا تغلچیں اور ملکہ جہاں سے

پہروں تخلیہ رہا کرتا تھا۔ (تاریخ اودھ کا مضحکہ اڑانے والے اپنے جھوٹ کے ساتھ اس حقیقت پر غور کریں)۔

اس طرف تو عدت سے پہلے ہی تخلیہ اور مشورہ تھا، اُدھر داؤد شاہ کے دونوں لائق بیٹے، فیروز خان واحمد خان جو میر فضل اللہ انجو کے فاضل شاگرد تھے اپنی فکر میں تھے۔ وہ تغلچین کے ان اختیارات مزید سے مضطرب تھے۔ چنانچہ انہوں نے انتقام کی ٹھانی اور شمس الدین کو الٹی میٹم کی صورت میں جو خط لکھا اس میں یہ فقرہ نہایت بامعنیٰ تھا، **تغلجین مخل ناموس است۔**[1]

شمس الدین بیچارہ ماں کے ہاتھ میں تھا اور ماں تغلچین کے قدموں میں۔ اس خط کا اثر کیا ہوسکتا تھا۔ آخر سدھو خان جاگیردار ساغر اور فضل اللہ انجو کی کوشش وسعی سے فیروز خاں نے دعویٰ سلطنت کیا اور بہت جلد بادشاہ ہوگیا۔ فیروز شاہ نے اپنے بھائی (احمد خاں) کو خانخانان وامیر الامرا کا عہدہ دیا اور میر فضل اللہ انجو نائب السلطنت اور سدھو خاں سرنوبت ہوئے اور شیعوں کا اختر اقبال اور ایک درجہ بلند ہوگیا۔

ابوالمظفر غازی سلطان فیروز شاہ بہمنی

ماہ صفر المظفر ۸۰۰ھ کی آخری تاریخوں میں فیروز شاہ تخت آبائی پر رونق افروز ہوا اور سلطان علاء الدین حسن کی تلوار کمر میں لگائی۔ شمس الدین کو مکحول کر کے ماں کے ساتھ قلعہ بیدر میں قید کیا (جو باجازت فیروز شاہ آخر میں مکہ معظّمہ چلے گئے اور زندگی بھر شاہی وظیفہ پاتے رہے

---

(۱) فرشتہ، ج ۱ ص ۳۰۵

یہاں تک کہ مکہ معظمہ میں انتقال ہوا) تغلچین کو غیاث الدین نابینا کے سپرد کیا۔ اگر چہ غیاث الدین نابینا تھا مگر اس نے ایک ہی وار میں تغلچین کا خاتمہ کر دیا۔

فیروز شاہ کی سیرت

فیروز شاہ کا دبدبہ وصولت اپنے اسلاف سے کہیں زیادہ تھا۔ رایان رایانِ بیجانگر جن سے سلاطین بہمنیہ ہمیشہ برابر کی جنگ کرتے رہے، فیروز شاہ کی تلوار نے ان کا سر جھکا دیا۔ آخر دیورائے والئ بیجانگر نے اصول و مذہب وقواعد سلطنت وخاندان کے خلاف اپنی لڑکی کا عقد فیروز شاہ سے کیا۔ فیروز شاہ ہی نے وہ تاج نما دستار سب سے پہلے پہنی جو آج تک دکن کی حکومتی اور قومی دستار ہے۔ قلعہ نیکا پور وممالک تلنگ کا بڑا حصہ فیروز شاہ ہی نے فتح کیا۔ ملا داؤد بیدری نے تحفۃ السلاطین اسی کے نام سے معنون کی ہے۔ فیروز شاہ نے میر فضل اللہ انجو کی بیٹی سے شہزادہ حسن اور اپنی بیٹی سے میر شمس الدین محمد انجو کا نکاح کیا۔ (شاہی خاندان کا شیعہ طبقہ سے یہ رشتہ شاید پہلا رشتہ ہے۔) بادشاہ پابند صوم وصلوۃ تھا اور کوئی فریضہ کبھی قضا نہیں ہوا۔ اس کے عہد میں چوبیس لڑائیاں ہوئیں اور اکثر میں یہی غالب رہا۔

کمزوری

فیروز شاہ میں دو کمزوریاں بھی تھیں یعنی وہ شراب نوش بھی تھا اور گانا بھی سنتا تھا مگر ان دونوں عادتوں سے تاویل کے ساتھ اظہار شرمندگی بھی کرتا رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا کہ شراب سے فتنہ انگیزی کی قوت دبی رہتی ہے اور سماع نغمہ سے یادِ خدا پیدا ہوتی ہے مگر میں ان دونوں خصلتوں سے نادم اور طالب مغفرت ہوں۔ غنیمت ہے کہ فیروز شاہ شراب خوری سے نادم تھا اور نبیذ کی صورت میں جواز کا خواہاں ہوکر دنیا کی تباہ کاری میں شاعی نہ تھا۔ بعض نام نہاد خلفا نے اپنا گناہ چھپانے کے لئے نبیذ کو نہ صرف جائز بلکہ عام میں فتوؤں کے ذریعہ سے رائج

بھی کردیا تھا۔ رہا سماع نغمہ یا گانا بجانا اس کے لئے کچھ کہنا ہی بیکار ہے۔ جب فقرا کی قبریں اور اولیاء اللہ کی خوابگاہیں ڈھولک کی دستبرد اور مرد رقاصوں کے ۱۶/انچہ قدوم کی پا کوبی سے محفوظ نہیں تو دربار شاہی کے طبلہ کی مست تھاپ اور پھول سے پاؤں کی تھرک کو کون کہہ سکتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ شریعت تو دونوں جگہ پامال ہے۔ پھر بھی ادبیت یا لطیف شعریت یہیں پائی جاتی ہے۔ چاہے خدا انہیں حلقوں میں پایا جاتا ہو جہاں داڑھیوں کا جنگل کود پھاند سے متحرک رہتا ہے۔

فیروز شاہ کی علم دوستی

ہندوستان کے شاہانہ سلسلے میں صرف دو چار بادشاہ علمی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ ایک محمد شاہ تغلق جو صرف معقولات میں دستگاہ رکھتا تھا اور منقول سے معرا ہو کر بھی معقولات سے مطابقت کیا کرتا تھا جو سخت مغالطہ تھا۔ فیروز شاہ کا مرتبہ معقول و منقول میں ایک تھا۔ وہ کتب سماوی کو بہت خصوصیت سے دیکھا کرتا تھا اور افضلیت سرور کائناتؐ اور افضلیت اسلام تمام شرائع سابقہ سے ثابت کرتا رہتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ شریعت اسلام کامل اور انجیل وتوریت پردہ اور ممانعت شراب کے سے اہم اخلاقی قانون سے خالی ہیں۔ وہ فارسی کے علاوہ دوسری مشرقی زبانیں بھی جانتا تھا اور ہر ایک زبان میں بے تکلف گفتگو کرتا تھا۔ عربی زبان کا ادیب تھا اور اسی زبان سے زیادہ دلچسپی تھی۔ فارسی میں اس کی غزلیں اور رباعیاں بھی ہیں جن میں عروجی تخلص کیا گیا ہے۔ میر فضل اللہ انجو کا شاگرد رشید تھا اور میر فضل اللہ مشہور شیعہ اور علامہ تفتازانی کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ہفتہ میں تین دن، شنبہ، دوشنبہ، چہارشنبہ علمی سرگرمی کے لئے مخصوص تھے اور تخت شاہی اور جشن ملوکانہ کے ہنگامے کو ترک کر کے فیروز شاہ ایک معلم کی حیثیت سے طالب علموں میں آ بیٹھا تا تھا جہاں معقول و منقول میں سبق دیئے جاتے تھے۔

منقول میں تفسیر اور معقول میں حکمت و ہندسہ سے فیروز شاہ کا گہرا تعلق تھا۔ ۸۱۰ھ میں بالا گھاٹ قلعہ دولت آباد میں اس نے رصدگاہ بنانے کا حکم دیا تھا اور کام بھی شروع ہوگیا تھا حکیم حسن گیلانی محمود کازرونی (کاظمینی) اس کے نگراں تھے مگر حکیم حسن کی بے وقت موت سے یہ ارادہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

فیروز شاہ کا مذہب

دنیا کا تو یہ رنگ ہے کہ جس مسلم کے نام سے آثار اسلام پائے جائیں، اسکو زبردستی ہی حنفی المذہب تسلیم کرے اور اس طرح مؤرخین کے سکوت سے بے دلیل فائدہ اٹھایا جائے، لیکن مذہب ایک دستور العمل کا نام ہے۔ ہمارے خیال میں انسانی اعمال کی تقسیم کرکے دیکھنا چاہیئے کہ اس کے عمل کو کس مذہب سے خصوصیت حاصل ہے؟ اسلام کے تہتر فرقہ قریب قریب اصول میں زبانی طور سے ایک حقیقت رکھتے ہیں، لیکن فروع میں اس قدر گہرا اختلاف ہے کہ جو شے ایک فرقہ میں نہ صرف جائز بلکہ موجب ثواب بھی ہے۔ وہی دوسرے فرقہ میں حرام مطلق ہے۔ مثلاً نبیذ؛ احناف میں جائز اور شیعوں میں حرام ہے۔ اگر کوئی شخص نبیذ کو جائز سمجھے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کو شیعہ کہا جائے۔ اسی طرح اگر کوئی حنفی المذہب تقیہ ومتعہ پر عمل پیرا ہو تو اس کو کیوں نہ شیعہ کہا جائے۔ اسی اعتبار سے فیروز شاہ کا مذہب شیعہ تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ فیروز شاہ میر فضل اللہ انجو کا شاگرد تھا اور میر فضل اللہ کھلے ہوئے شیعہ تھے۔ فیروز شاہ جاہل ہی نہ تھا کسی جاہل کا کسی فرقہ کے خصوصیات پر عمل پیرا ہونا اور بات ہے اور کسی پڑھے لکھے کا کسی مسئلہ خصوصی کو قبول کر لینا اور شے ہے۔

مسئلہ متعہ کا فیصلہ

فیروز شاہ نے بھرے دربار میں تجدید ازواج کے متعلق سوال کیا۔ علمائے احناف نے

بتایا کہ اس میں زیادتی بھی ہوسکتی ہے، مگر اس طرح کہ چار میں سے ایک کو طلاق دیا جاتا رہے اور اس خالی جگہ کی خانہ پری محل نو سے ہوتی رہے۔ اس جواب پر غیرت اسلامی وشاہی راضی نہ ہوئی دوسرے فیروز شاہ جاہل نہ تھا وہ یقینا واقف تھا کہ بے سبب طلاق نہ صرف ممنوع ہے بلکہ آنحضرتؐ نے وعید عذاب سے نذارت بھی فرمائی اور بظاہر بھی ایک کھلا ہوا ظلم ہے۔ بادشاہ نے اس مسئلہ پر کافی بحث کی اور کسی جواب سے اس کی تسکین نہ ہوسکی، آخر میں میر فضل اللہ انجو سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا اور انہوں نے مذہب امامیہ کا مختار پیش کرتے ہوئے یہ بھی دعویٰ کیا کہ متعہ خود آنحضرتؐ اور حضرت خلیفہ اول کے عہد میں جائز اور عام اہل امت میں رائج تھا، اس کو حضرت خلیفہ ثانی نے کسی خفیہ وجہ سے حرام کیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت خلیفہ ثانی کو شریعت میں ترمیم کا کوئی حق حاصل نہ تھا، وہ بہ ہزار دشواری اگر کہے جاسکتے تو حافظ شریعت، صاحبِ شریعت بالاتفاق نہ تھے۔

علمائے احناف نے حسب عادت اس سے انکار کیا اور کتب صحاح ستہ دربار میں آ گئیں۔ بادشاہ نے اپنی آنکھ سے جواز متعہ دیکھا اور بھرے دربار میں جواز متعہ تسلیم کرلیا۔ اس پر علمائے احناف نے کافی طور سے تاویلی شور مچایا مگر فیروز شاہ جاہل نہ تھا۔ آخر علمائے حنفی کو خاموش ہونا پڑا اور بادشاہ نے اسی روز آٹھ سو عورتوں سے (۱) متعہ کیا۔

عشرت خانہ میں علمی جدت

متعہ کے جواز کا حل ہوجانے کے بعد بادشاہ نے فیروز آباد کی تعمیر کی جس میں بہت محلات تھے اور ہر محل ایک بیگم سے مخصوص تھا۔ بادشاہ کے ازواج میں عرب، عجم، ترک، گجراتی، مرہٹی

---

(۱) فرشتہ، ج ۱ ص ۳۰۷

وغیرہ بیگمیں تھیں اور جس ملک کی خود بیگم تھی اسی ملک کے خادم اور کنیزیں بھی ہوتی تھیں، غیر زبان جاننے والی عورت اس محل میں داخل نہ ہوسکتی تھی۔ گویا فیروز شاہ نہ چاہتا تھا کہ زبانِ خاص میں نقص پیدا ہو۔ عرب میں اس کے کارندے رہا کرتے تھے جو عربی کنیزیں اور غلام بھیجا کرتے تھے۔ بادشاہ ان بیگمات سے ان کی اصلی زبان میں گفتگو کرتا تھا۔ اس کی عدالت کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ہر بیگم یہ جانتی تھی کہ مجھ سے زیادہ بادشاہ کسی کو دوست نہیں رکھتا۔

دیورائے کی بیٹی سے عقد

بیجانگر کی ہندو حکومت کسی بادشاہ اسلام کی کبھی مطیع نہ ہوئی تھی اور ہمیشہ برابر کی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ۸۰۹ھ میں ولی عہد بیجانگر نے فیروز شاہ کے ممالک میں دخل وتصرف کیا جس کا جواب فیروز شاہ کی طرف سے یوں دیا گیا کہ خود دارالسلطنت بیجانگر تک بھگاتا ہوا گیا۔ بیجا نگر کی دیواروں کے نیچے شرائط ذیل پر صلح ہوئی:-

(۱) راجہ اپنی عزیز بیٹی کو نکاح میں دے۔ (۲) پانچ من موتی۔ (۳) پچاس ہاتھی۔ (۴) دوہزار کنیز وغلام۔ (۵) قلعہ نیکاپور جہیز میں دیا جائے۔ آخر یہ سب شرائط پورے کئے گئے اور فیروز شاہ کامیاب واپس ہوا۔

آخری جنگ اور شکست

۸۲۰ھ میں فیروز شاہ نے پھر دیورائے سے جنگ کی اور قلعۂ گولکنڈہ (حیدرآباد) کا محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ دوسال جاری رہا اور اسی زمانے میں فوجِ شاہی میں ہیضہ بھی پھوٹ پڑا۔ دیورائے بھی کثیر فوج سے آ پہنچا۔ عین گرمی جنگ میں جب کفار کا طلیعہ شکست ہو چکا تھا اور میر فضل اللہ انجو میمنہ پر حملہ کر چکے تھے، قریب تھا کہ کفار کا میمنہ بھی ٹوٹ جائے کہ سید کے

نمک حرام نمک خواروں میں سے ایک نے پس پشت سے سر پر تلوار لگائی اور سید مرحوم کو شہید کر دیا۔ اس شخص سے دیورائے نے امارت کا وعدہ کیا تھا۔ آخر فیروز شاہ کو شکست ہوئی اور نہ صرف شکست بلکہ اکثر ممالک بھی ہاتھ سے نکل گئے اور مسلمانوں کا قتل عام اور مساجد کا انہدام بھی ہو کر رہا۔ اگر چہ احمد خاں خانخانان برادر فیروز شاہ نے یہ ممالک دوبارہ واپس لے لئے مگر پیرانہ سری میں اس شکست سے فیروز شاہ کا دل ٹوٹ گیا۔ آخر یہی غم مرض الموت ثابت ہوا۔ فیروز شاہ کے عہد میں سید محمد گیسودراز (جو آج غریب نواز مشہور ہیں) گلبر گہ میں وارد ہوئے۔ یہ بھی شیعہ تھے۔ ان کا ذکر بھی باب فقراء شیعہ میں انشاءاللہ کیا جائے گا۔

وفات

۱۵ رشوال ۸۲۵ھ میں فیروز شاہ نے انتقال کیا اور گلبر گہ میں دفن ہوئے **إنا لله وإنا إليه راجعون**۔

فیروز شاہ کی آخری زندگی شکستہ دلوں اور افسردہ مزاجوں کی زندگی تھی۔ دربار بہمنیہ میں روشنی تو تھی مگر طاق شاہی کا چراغ خود خدا سے لو لگائے تھا۔ اس کی رنگیں مزاجی میں سادگی، حکومت میں نرمی، سلطنت سے استغناء، امور مملکت سے بے پروائی پیدا ہو گئی تھی۔

اس صورت حال سے دو غلاموں نے فائدہ اٹھایا ان کا نام ہشیار و بیدار تھا، ہشیار عین الملک ہو گیا اور بیدار کی قسمت جاگی تو نظام الملک کا خطاب پایا۔ اختیارات کا دائرہ اگر چہ کافی وسیع تھا مگر قناعت نہ تھی اور لالچ اقطار ارض وسموات کو بھی چھوٹا سا گھروندہ جانتی تھی۔ ان دونوں کی نگاہیں تخت فیروزہ کی جگمگاہٹ کو اپنے قدموں کے نیچے اور چتر ہما کا سایہ اپنے سر پر دیکھ رہی تھیں۔

اگر چہ میر فضل اللہ انجو کا خاتمہ ہو چکا تھا، جس خار کی دامنگیری کا اندیشہ تھا، وہ ٹوٹ چکا تھا

(اور خدا ہی جانے کسی ہندو راجہ کی سازش سے یا اہل حسد کی کوشش سے) بھی خان خاناں احمد خاں کا وجود ان کے منصوبوں کو خاک میں ملائے دیتا تھا، رات بھر وہ شاہی کے خوشگوار خواب دیکھتے تھے مگر صبح کو خانخاناں کا چہرہ ان زریں تعبیروں پر پانی پھیر دیتا تھا۔ پھر بھی ایک راستہ منزلِ مقصد کے قریب تھا یعنی فیروز شاہ اپنی زندگی ہی میں اپنے فرزند حسن خاں کو ولی عہد کردے اور یہ دونوں در پردہ حکومت کریں۔ بیٹے کے لئے باپ سے سفارش کرنا کوئی اہم امر نہ تھا۔ یقیناً چپکے چپکے کہا ہوگا۔ ہاں یہ آوازۂ بلند آج تک تاریخ کے اوراق سے سر ٹکرا رہا ہے کہ حسن خاں کو فیروز شاہ نے ولی عہد کردیا۔ حسبِ مدعا ولی عہد کے تقرر کے بعد منزل مقصود اور ایک قدم باقی رہ گئی۔ چنانچہ فیروز شاہ کو اس پر بھی آمادہ کرلیا گیا کہ خانخاناں کو یا تو قتل کردیا جائے یا کم از کم نابینا کر کے عدم و وجود برابر کردیا جائے۔ خانخاناں کو یہ خبر پہنچی اس نے اپنے گردوپیش شاہی لشکروں سے مقابلہ کرنے والوں کا اجتماع نہ پایا، صرف چار سو مسلح جوان تھے۔ اگر چہ یہ سب مسلح متحد یک دل و یک زبان تھے مگر ان کی تعداد ملک پر قبضہ کرنے کے لئے کافی نہ تھی۔ غرض وہ دن تو ہجوم افکار میں گزرا۔ شب کو خانخانان اپنے فرزند علاء الدین کے ساتھ بندہ نواز خواجہ سید محمد گیسو دراز سے فیض روحانی حاصل کرنے پہنچے۔ بندہ نواز نے بھی بندہ نوازی کی اور نہ صرف دونوں باپ بیٹوں کو دعائے خیر دی بلکہ اپنی دستار بھی دونوں کے سر پر باندھی اور ساتھ ہی کھانا بھی کھایا اور مژدہ سلطنت بھی دیا۔

خانخاناں اسی صبح کو اپنی مختصر فوج کے ساتھ دار السلطنت سے کوچ پر تیار ہو گئے۔ شہر کے دروازے پر خلف حسن بصری سے ملاقات ہوئی اور وہ بھی مبارکباد سلطنت دیتے ہوئے۔ خلف حسن بصری ایک تاجر تھے جو اکثر تجارت کے ذریعے سے خانخاناں کی خدمت میں آتے رہتے تھے اور کافی فائدہ اٹھایا تھا۔

یہ چوتھی صدی کا واقعہ ہے جب شریف اپنی احسان مندی و وفا سے پہچانا جاتا تھا اور جب ادائے احسان کے لئے وقت کی تلاش رہتی تھی اور وقت ملنے پر جان نثار کردینا شریف کا شیوہ تھا۔ یہ چودھویں صدی نہ تھی جب غیر تو غیر مادر وطن کا احسان نہ صرف چشم پوشی بلکہ قابل فراموش ہے۔

خلف حسن بصری بھی شریف تھے۔ حالات معلوم کرنے کے بعد خانخاناں کی ممانعت پر بھی ساتھ ہوئے اور خان خاناں کو یہی جواب دیا کہ وقت فراغت وآسائش، جلیس وندیم بودن ودر محنت وتعب خاک بیوفائی در دیدۂ مردم می پاشیدن در کیش ارباب وفا پسندیدہ نیست۔ خانخاناں کو خلف حسن بصری کی شرافت اور وفاداری پسند آئی لیکن صلہ دینے کے لئے کیا تھا۔ ہاں وعدہ کیا کہ اگر سلطنت ہم کو حاصل ہوئی تو تم بھی شریک ہوگے۔ غرض دارالسلطنت سے نکل کر پہلی منزل خانپور میں ہوئی اور خان خاناں نے نذر کی کہ اگر سلطنت ملی تو وہ اس قصبہ کا نام رسول آباد رکھ کر اس کو سادات مکہ ومدینہ ونجف اشرف وکربلائے معلیٰ کے لئے وقف کردے گا۔ (۱)

لو خدا کی شان دیکھو کہ آج مکہ معظّمہ ومدینہ منورہ کے پہلو بہ پہلو نجف اشرف وکربلائے معلیٰ بھی یاد آرہا ہے۔ کیا تاریخ اسلام اس انقلاب ذہنی کے بعد بھی احمد خان خاناں کے مذہب کو شیعہ نہ تسلیم کرے گی۔ اگر دلیل پوچھو تو صاف یہ ہے کہ آج سے پہلے کسی مسلمان بادشاہ نے نجف اشرف یا کم از کم کربلا کو یاد نہیں کیا۔ سب سے بڑے سخی بادشاہ بہمنی علاء الدین حسن کانکوئی نے بھی آخری خیرات میں صرف حنفی المذہب تک اپنی سخاوت کو محدود رکھا، اگرچہ آج

(۱) فرشتہ، ج۱ ص ۳۱۷

خیرات میں غیر مسلم بھی نہیں چھوڑے جاتے۔کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ شیعہ مستحق نہیں ہوتا۔اگر چہ ہمارے لئے اس ضمنی دلیل کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔۔کہ ابوالقاسم ابن محمد علی سمنانی ساسانی نے اپنی کتاب سلالۃ السیر [1] میں صاف صاف اقرار کرلیا ہے اور (خان خانان احمد خاں) قواعد لشکر کشی وآداب فرمانروائی را نیکو میدانست وشیعه مذہب بود واعتقادے تمام به سید محمد گیسو دراز داشت وشہر احمدآباد بناکرده اوست۔

خانخانان اس کے بعد کلیانی وگلبرگہ وبیدر سے لوگوں کو جمع کرتے رہے یہاں تک کہ رفیقوں کی تعداد چارسو سے بڑھ کر ایک ہزار ہوگئی پھر بھی کوئی مستقر نہ تھا،آج یہاں کل وہاں پھر رہے تھے۔ادھر عین الملک ونظام الملک چار ہزار سواروں اور چند ہاتھیوں کے ساتھ چڑھ دوڑے اور بعد کو مزید کمک آجانے سے یہ لشکر آٹھ ہزار کی تعداد تک پہنچ گیا۔حوالئ گلبرگہ میں اس لشکر نے احمد خاں خانخاناں کو گھیر لیا اگر چہ خلف حسن بصری جنگ پر آمادہ تھے اور ایک چلتی ہوئی تدبیر بھی بڑھتی ہوئی تقدیر کے ساتھ تھی یعنی کچھ بنیے بقال اپنے ٹٹوؤں اور گائے،بیل کے ہمراہ قریب ہی آکر اتر پڑے تھے خلف حسن بصری کی یہ رائے تھی کہ بیلوں کے سینگوں پر بیرقیں باندھ کر اور غیر فوجی آدمیوں کو سوار کرکے غلاموں کو کثرت لشکر سے ڈرایا جائے اور یہ افواہ اڑائی جائے کہ خانِ خاناں کے ساتھ بہت بہمنی امرا شریک ہیں جو اپنی جاگیروں سے لشکر لئے آرہے ہیں مگر خانخاناں جنگ پر تیار نہ تھے۔

---

(۱) سلالۃ السیر قلمی نسخہ،ص ۲۵۶۔مجھے نہیں معلوم کہ یہ کتاب طبع ہوئی یا نہیں لیکن مذکورہ نسخہ قلمی کتاب خانہ رامپور کی فہرست تاریخ میں نمبر ۲۶۸ پر موجود ہے۔

غرض جنگ سے پہلوتہی کی گئی۔کسی نہ کسی طرح شاہی لشکر کی زد سے الگ نکلے۔راہ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے تو خواب میں دیکھا کہ ایک شخص درویش لباس ایک تاج سبز رنگ دوازدہ ترک دے کر کہہ رہا ہے کہ یہ تاج سلطنت ہے جو ایک فقیر گوشہ نشیں نے بھیجا ہے۔

قارئین کرام کو اسی خاندان بہمنیہ کا چتر سیاہ فراموش نہ ہوا ہوگا جو لباس عباسیہ کا ہمرنگ تھا۔اب اس تاج سبز دوازدہ ترک کو دیکھئے سادات کا شعار آج سبز رنگ ہے جو سلاطین بنی فاطمہ مصر نے منتخب کیا تھا اور آج تک جاری ہے۔شاید یہ اس لئے کہ کربلا والے علم کا پھریرہ بھی سبز رنگ تھا اور اگر یہ بھی مناسبت صحیح نہ سمجھی جائے تو شاعرانہ نزاکت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ سادات کا رنگ سبز سبزۂ باغ سے پیدا کیا گیا جو آج بھی بیگانہ کہا جاتا ہے،جس طرح اہلبیت اپنے گھر کی شریعت سے یگانہ ہوکر بیگانہ کردیئے گئے اور اسی طرح پامال تھے جس طرح آج سبزہ پامال ہے۔پھر لطف یہ کہ تاج بھی چار ترک نہ تھا دوازدہ ترک تھا۔کیا خوب ہوتا اگر اس جگہ مکاشفہ یوحنا عارفہ ملحقہ انجیل کا بھی مطالعہ کرلیا جائے [(۱)] جس میں یوحنا نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے آسمان پر ایک نشان دیکھا پھر ایک عورت نظر آئی جو آفتاب کو اوڑھے ہوئے تھی اور جس کے پائینتی مہتاب اور سر پر بارہ ستاروں کا تاج تھا اور دردزہ میں مبتلا تھی یہ وہ ماں ہے جس کا فرزند لوہے کے عصا سے حکومت کرے گا۔یوحنا کو پھر ایک نشان نظر آیا اس عورت کے قریب اژدر ہفت سر نظر آیا جو چاہتا تھا کہ بچے کو نگل لے مگر بچہ پیدا ہوتے ہی تخت خدا کے سامنے پیش کردیا گیا۔ساتھ ہی ساتھ تفسیر والشّمس والقمر بھی ملاحظہ ہو اور پھر غور کیا جائے کہ یہ کون عورت ہے جس کی سر پر نبوت اور جس کے قدموں میں اولادِ سعید کی طرح امامت جلوہ گر ہے۔

(۱) مکاشفہ یوحنا ملحقہ انجیل مطبوعہ فارن بائبیل سوسائٹی لاہور۔۱۲

اور یہ بارہ ستارے کون ہیں جو گہرہائے تاج فخر ہیں کس کے فرزند کی شریعت لوہے کے ڈنڈے سے چلے گی اژدرِ ہفت سراپنی ہر ہفت قوت کے ساتھ کس کو ہلاک کردینے پر تیار تھااور کون پیدا ہوتے ہی تخت خدا کے سامنے پیش کردیا گیا، اگر یہ عورت حضرت مریم مادرِعیسیٰؑ ہیں تو تاریخی ناواقفیت ہے یوحنّا پیشینگوئی کررہے ہیں اور اس وقت جب بقول نصاریٰ عیسیٰؑ شہید ہوچکے ہیں (اور بقول قرآن مجید رفع عیسیٰؑ ہوچکا ہے)۔

اگر یہ تصور ہلکا سا چربہ مادرحضرتِ سرور کائنات (حضرت آمنہ) کا ہے تو چشم ماروشن دل ماشاد مگر آنحضرتؐ نے کبھی لوہے کی سی سختی اختیار نہیں کی "**واخفض جناحك للمومنين**" سرجھکائے رہنے کا حکم شاہد عینی ہے۔ پھر تخت خدا کے سامنے پیش ہونے سے اگر معراج مراد ہے تو وہ ۲ھ میں ہوئی ہے جس وقت آنحضرتؐ کا سنِ مبارک ۵۳ برس کا تھا۔ اگر وفات کا وقت مقصود ہے تو سن مبارک ترسٹھ سال کا تھا۔ ہم کسی کا نام نہیں لیتے مگر خدا کا شکر کرتے ہیں کہ ائمہ اہلبیتؑ ان لوگوں میں نہ تھے جو ولادت سے پہلے مذکور نہیں ہوتے "مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ" ہمارا یہ بیان ان لوگوں کے لئے بھی نہیں ہے جو صرف مادیت کے آگے سربسجود ہیں "إِنَّمَا يتذكر اولوا الالباب" یہ تو روحانیت والے ٹھنڈے دل سے سوچیں، اب تاج دوازدہ ترک پانے والا اور لانے والا اور بھیجنے والا کس مذہب سے متعلق تھا، یہ کوئی راز نہیں رہا اگرچہ فرشتہ نے تصریح نہیں کی مگر تاریخ کے تصنیف کا زمانہ اسی کا مقتضیٰ تھا کہ وہ تقیہ سے کام لیں۔

اس بشارت غیبی کے بعد خانخانان کا دل بڑھ گیا۔ عین میدان جنگ میں بقالوں کے گاؤ خر کا سیاہہ دکھایا گیا اور غلاموں کے جی چھوٹ گئے۔ خانِ خاناں کو نہ صرف پہلی فتح حاصل ہوئی بلکہ اس ہزیمت خوردہ لشکر کے پسماندگان بھی ان کی کمی فوج میں آملے اور مال و اسباب

ہاتھی گھوڑے غنیمت میں حاصل ہوئے اور گلبرگہ سے قریب لشکر نے چھاؤنی چھائی۔

عین الملک کے اور نظام الملک کے اغوا سے فیروز شاہ نے اس شکست کا تدارک چاہا۔ اپنے بیٹے حسن خاں کے سر پہ چتر شاہی آراستہ کر کے خود پالکی میں بیٹھ کر ساتھ ہوا اور مقابلہ کی ٹھہر گئی لیکن بیماری کی زیادتی ہوئی ہوش و حواس جاتے رہے بیہوش بادشاہ کی پالکی واپس ہوئی اور پالکی کے ساتھ جنگی منصوبے بھی منہزم ہوئے۔

ہم کو خان خاناں میں سب سے بڑی شیعیت جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے بڑے بھائی کا تعاقب کرنا خلاف ادب سمجھا، ورنہ وقت کو تو حضرت عالمگیر نے اپنے باپ شاہ جہاں کے مقابل میں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ یہی حسن سیرت ہے جس پر شیعہ قوم کو فخر ہے اور یہی ان کے مذہب کی روح تعلیم ہے۔ عین الملک و نظام الملک نے اس کے بعد بھی حرفت مزبوحی کی نمائش کی۔ حسن خاں بھی تاج بارہ پر سے آتشیں توپوں کے دہانے کھولتا رہا مگر خانخاں نے کوئی جواب نہ دیا، صرف توپوں کی زد سے الگ ہٹ گئے۔

آخر فیروز شاہ کو ہوش آیا اور انہوں نے حسن خاں کو سمجھایا اور بتایا کہ سارا لشکر بھی اب خاں خاناں کی طرف مائل ہے میں نے تدبیر کی مگر تقدیر کچھ اور ہی کہتی رہی لہٰذا تم کو خاموش ہو جانا چاہئے۔ آخر خاں خانخاناں کو قلعہ میں بادشاہ نے بلا لیا اور خان خانان نے بڑے بھائی کے پاؤں پر سر رکھ کر گرم گرم آنسوؤں سے تر کر دیا۔ فیروز شاہ نے شکر کیا کہ میں نے اپنی زندگی میں تم کو بادشاہ دیکھ لیا، پھر وصیت کی اور کہا کہ تم کو خدا کے سپرد کرتا ہوں اور حسن کو تمہاری حفاظت میں دیتا ہوں۔ فیروز شاہ نے اس کے بعد انتقال کیا اور شاہانہ شان و شوکت سے فیروز شاہ کا جنازہ اٹھایا گیا۔

مؤرخ فرشتہ نے بعض کتابوں کے پتہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ آخر وقت میں احمد خاں

خاناں نے بھائی کا گلا گھونٹ دیا مگر یہ روایت ایسی کتابوں سے نقل ہوئی ہے جن کا نام بھی نہیں لکھا گیا۔ پھر شاہی ملنے سے پہلے جس بھائی نے تعاقب کرنا پسند نہ کیا ہو، اس کی طرف اس قسم کا گمان کرنا خون اخلاق کرنا ہے۔ حقیقتاً یہ ایک افواہ تھی جس کو شیعہ بادشاہ کے لئے وضع کرنا ہی چاہئے تھا۔ فرشتہ نے بھی تاریخی خیانت پسند نہیں کیا اور اسی نے افواہاً لکھ دیا مگر تاریخ ہند جان سی مارسس (۱) صاحب نے بے وقعت افواہ کا تذکرہ تک نہیں کیا۔

احمد شاہ بھمنی کی تخت نشینی

خانِ خاناں نے اپنا نام بہمنی خطبہ وسکہ میں جاری کیا اور ۵ رشوال روز جمعہ ۸۲۵ھ تختگاہ گلبرگہ میں تخت نشینی عمل میں آئی۔ فیروز شاہ اس تخت نشینی سے دس روز بعد تک زندہ تھے۔

اس خاندان میں احمد شاہ سے پہلے خاندان شیخ محمد سراج سے بیعت کی جاتی تھی۔ فیروز شاہ کے عہد سے سست عقیدگی ظاہر ہونے لگی تھی مگر احمد شاہ نے کھلم کھلا سید محمد گیسودراز کی مریدی اختیار کرلی۔(۲) اس تبادلۂ بیعت میں بھی مذہبی اثرات کارفرما تھے۔ اس لئے کہ خاندان شیخ محمد سراج ویسا ہی کھلا سنی تھا جیسے سید محمد گیسودراز صاف صاف شیعہ تھے۔ غرض شیوخ سے ترکم ترکا اور اولاد رسول سے ظاہر بظاہر بیعت شروع ہوگئی اور بہت سے گاؤں ان کے لئے وقف ہوئے اور شہر کے متصل ایک محل سرا بھی بنوادی گئی۔

خلف حسن بصری وکیل امور سلطنت وخطاب ملک التجار سے مشرف ہوئے۔ اگرچہ بہت لوگوں نے اغوا بھی کیا مگر بادشاہ نے حسن خاں کو منصب بھی دیا اور فیروز آباد کا علاقہ بھی حوالے کردیا۔ حسن خاں ایک عیاش فطرت شخص تھے اپنے چچا کی زندگی تک خوب گزاری۔

---

(۱) فرشتہ، ج ۱ ص ۲۱۹، (۲) ترجمہ تاریخ جان سی مارسس میں بھی قبول کیا گیا اور قتل کا کوئی اشارہ بھی نہیں ہے۔ ۴۰۴

حسن خاں میں تو خون شریک تھا۔مگر احمد شاہ نے عین الملک ونظام الملک کی اس وفاداری کی بھی قدردانی کی جو فیروز شاہ کے لئے وفا اورخود احمد شاہ کے لئے جفا تھی۔ چنانچہ منصب امرائی کے ساتھ عین الملک کو امیرالدولہ کا خطاب بھی عطا ہوا۔ اور نظام الملک کو دوہزاری منصب اور دولت آباد کی سرلشکری (صوبہ داری) عطافرمائی گئی۔

دیورائے والی بیجانگر سے پہلی شکست کا انتقام

احمد شاہ نے سرحد گجرات کومضبوط کر کے دیورائے سے انتقام لینے کی ٹھانی جس نے فیروز شاہ کے عہد میں نہ صرف مسلمانوں کا قتل عام کیا بلکہ انہدام مساجد ومعابد میں بھی دریغ نہ کیا۔آخر سلطان احمد شاہ چالیس ہزار سواروں کی جمعیت سے حملہ آور ہوا۔گلبرگہ سے کوچ کر کے دریائے تمہدرہ کے کنارے قیام کیااس وقت دیورائے کی فوجوں کا اندازہ دس لاکھ کے قریب تک کیا گیا ہےاسی بناء سے دیورائے کی طرف سے زیادتی بھی ہورہی تھی۔شب کوچھپ کرلشکر اسلام میں ہنود آتے تھے ادھر ادھر جانداروں میں سے جوکوئی مل گیا ان کوقتل کر کے واپس چلے جاتے تھے۔آخر سلطان احمد شاہ نے شب کو بزم مشورت آراستہ کی اور تمام سرداران سپاہ نے کلام مجید کی قسمیں کھائیں اور صبح کو دریا عبور کرنے کی ٹھن گئی۔رائے ورنگل تک اس عزم مصمم کی خبرکسی نہ کسی طرح جا پہنچی اور وہ راتا راتی اپنی فوج سمیت ورنگل کی طرف روانہ ہو گیا پھر بھی دیورائے کی تمکنت وغرور میں کمی نہ تھی اوروہ فوجیں آراستہ کررہا تھا،ادھر سے دلاور خاں افغان نے صبح سے پہلے دس ہزار سواروں کے ساتھ دریا عبور کرلیا۔ہنوز صبح نمودار نہ ہوئی تھی اوردھندلکا باقی تھا کہ سلطانی لشکر نے حملہ کردیااوردیورائے کی فوج پراگندہ ہوگئی۔

دیورائے نیشکر کے کھیت کے قریب محوخواب تھا کہ سلطانی لشکر نے دریا عبور کیااورقدرتی شیرینی (شکر) انعاماً حاصل کرنے لگے دیورائے کوسر پر شکر کا بوجھ لے کر بھاگنا پڑا۔اگر صبح

ہوتی اور لشکر سلطانی پہچان لیتا تو سارا فساد اسی دن تمام تھا۔

سلطان احمد شاہ نے تمام ملک سے پورا انتقام لیا ہزار ہا ہندو قتل اور زن و فرزند اسیر ہوئے، مساجد کے عوض بت خانے مسمار کردیئے گئے، اکثر بت ہائے روئیں خواجہ بندہ نواز کے آستانے پر پائمالی کے لئے بھیجے گئے۔

خوش قسمتی سے جشن ہائے فتح سے جشن نوروزی بھی بغلگیر ہوا اور خوب دھوم دھام منائی گئی۔ (اتفاقاً ہم بھی اس واقعہ کو نوروز ہی میں لکھ رہے ہیں)۔

سلطان احمد شاہ کی بے نظیر شجاعت

اس واقعے کے بعد سلطان احمد شاہ بہت تھوڑے مصاحبین کے ساتھ عازم شکار ہوا۔ ادھر دیورائے کے ہندوؤں کو خبر ہوگئی اور چار پانچ ہزار ہم عہد و پیمان ہندوؤں کے لشکر نے اس دو چار سو کی جماعت کا تعاقب کیا۔ نہر کنڈیٰ کے سامنے مویشی کا خام باڑہ بنا ہوا تھا سلطان احمد شاہ نے اسی کو قلعۂ محفوظ سمجھا نہر کو عبور کرتے کرتے دشمن آ پڑا اور تقریباً دو سو مسلمان زخمہائے تیر سے کشتہ ہوئے۔ قریب تھا کہ سلطان بھی قتل ہو جائے مگر اتفاق وقت سے جانوران لشکر کے کچھ محافظ ادھر آ نکلے اور انہوں نے تیراندازی شروع کردی۔ سلطان نے اتنا وقفہ پاتے ہی نہر سے گھوڑے کو نکالا اور باڑے میں جا پہنچا۔ مسلم تیراندازوں نے دیوار سے تیراندازی شروع کردی لیکن یہ بیچارے چند کس اور ادھر ہزاروں کا نرغہ، پھر بھی شیعہ بہادران فوج نے قدم جمادیئے سید حسن و میر فرخ بدخشی و میر علی سیتانی خواجہ حسن اردستانی خواجہ بیگ قلندر قاسم بیگ صف شکن (عبداللہ کابلی) نے مرنے پر کمر باندھ کر وہ اظہار شجاعت کیا کہ دشمن محو حیرت تھے۔

لیکن ہندوؤں کے نرغے نے چند تیراندازوں کو تیر و سنگ و کلوخ کا نشانہ بنا کر قتل کیا اور باڑے کی دیوار کے نزدیک پہنچ گئے اور دیوار گرانے کی فکریں کرنے لگے۔ سلطان اپنے

ساتھیوں کے ساتھ خود بھی مصیبت میں شریک مگر مطمئن تھا۔ادھر سرسلحداران عبدالقادر بن محمد عیسیٰ بن محمود بن عمادالملک منصب دار دوصدی کو خیال ہوا کہ بادشاہ چند خاصہ سواروں کے ساتھ محوِ شکار ہے اور دشمن کا ملک ہے ایسا نہ ہو کہ کوئی افتاد درپیش ہو لہٰذا تین ہزار سواروں کے ساتھ تیزی سے جنگل کی طرف روانہ ہوا اور عین وقت پر پہنچا، فوراً فوج کو مرتب کر کے ہندوؤں پر حملہ شروع کر دیا، جب باڑہ کی دیوار نصف منہدم ہو چکی تھی اور جنگ جاری تھی۔

یہ لڑائی بہت شدید لڑائی تھی ایک ہزار ہندو اور پانچ سو مسلم شہید ہوئے لیکن ہندوؤں نے فرار پر قرار کیا اور سلطان احمد شاہ کو اس ناگہانی بلا سے نجات حاصل ہوئی۔ سلطان نے سرسلحدار عبدالقادر کو برادر جاں بخش کا لقب دیا اور حق گزار وخانِ جہاں کے لقب کے ساتھ منصب دو ہزاری وسرلشکر برار مقرر فرمایا اور ان کے بھائی عبداللطیف کو خطاب خانِ اعظم ومنصب دو ہزاری وسرلشکری تلنگ عنایت فرمائی اور اس جانباز گروہ کے اکثر افراد کو خلعت ومنصب عطا ہوئے۔ سید حسن نجفی ومیر فرخ بدخشی ومیر علی سیستانی وحسن خاں وفرخ خان وعلی خاں کو منصب سہ صدی وقاسم صف شکن کو پنج صدی مع جاگیر کلہر وخواجہ بیگ کو خطاب قلندر خاں وکافر کش ومنصب دوصدی دے کر داروغہ گلبرگہ کر دیا وعبداللہ کابلی حاکم جنیر منصبداراں صدہ میں مقرر کئے گئے۔

اسی دن سے سلطان نے تیراندازی کی مشق عام کردی، شاہزادہ کو خواجہ حسن اردستانی وخسرو بیگ کا شاگرد کر دیا اور عراقی وخراسانی وماوراءالنہری ورومی وعرب سے تین ہزار تیرانداز مقرر ہوئے۔

دیورائے شکست پر شکست سے مجبور ہو گیا اور جب قلعۂ بیجانگر محصور ہو چکا تھا، اس نے صلح کی عرضداشت بھیجی اور آخر سالہائے گذشتہ کا باقی خراج اپنے بیٹے کے ساتھ بھیجا۔

ولی بھمنی

سلطان احمد شاہ کے عہد میں متواتر دوسال بارش نہیں ہوئی قحط عظیم رونما ہوا۔ بادشاہ نے رعایا کے لئے درفیض کھول دیئے۔علماء نے نماز استسقاء ادا کی مگر بارش نہ ہوئی آخر سلطان احمد شاہ تنہا صحرا میں گئے اور نہایت تضرع وزاری سے نماز کے بعد دعا کی۔سجدہ سے سر نہ اٹھایا تھا کہ شدید بارش شروع ہوگئی اور اسی دن سے لوگ احمد شاہ کو ولی بہمنی کہنے لگے۔

ورنگل کی فتح

۸۲۸ھ میں رائے ورنگل پر اس لئے لشکر کشی کی گئی کہ وہ اصلاً رائے بیجاپور کا طرفدار ہوکر میدان میں آیا تھا۔ اگرچہ بادشاہ بھی روانہ ہوا مگر خان اعظم عبداللطیف خاں کے ہراول دستہ نے پہلے ہی فتح کرلیا اور بادشاہ کو ورنگل سے بیشمار دولت حاصل ہوئی۔ ورنگل کے بعد خان اعظم نے بالک تلنگہ من ورثائے رائے ورنگل کا کافی استیصال کردیا۔

۸۲۹ھ میں قلعہ ماہور جو سلطنت بہمنیہ سے نکل گیا تھا دوبارہ قبضہ میں آیا۔کلم کے ساتھ معدن الماسی بھی قبضہ میں آئی۔اسی سلسلے میں ایک سال ایلچپور میں قیام رہا اور قلعہ کادیل کی تعمیر وقلعہ ترنالہ کی ترمیم کی گئی۔

قلعہ کادیل کی بنا درحقیقت ملک خاندیش پر اثر انداز تھی اور یہ علاقہ صاحبقراں امیر تیمور نے انعاماً سلاطین بہمنیہ کو حوالے بھی کیا تھا۔ ہوشنگ شاہ اس تازہ تصرف کو برداشت نہ کرسکا اور والی خاندیش کی مدد سے قلعہ کہترلہ پر بار بار ناکام حملے کرنے لگا لیکن والی کہترلہ نرسنگھ جو احمد شاہ کا خراج گذار تھا ہمیشہ شکست دیتا رہا آخر خود ہوشنگ شاہ نے پوری جمعیت سے حملے کی ٹھانی اور نرسنگھ نے سلطان احمد شاہ سے مدد مانگی۔

سلطان نے صوبہ دار برار خان جہاں عبدالقادر کو حکم امداد نرسنگھ بھیج کر خود بھی چھ سات ہزار

سواروں کے ساتھ کوچ کر دیا اور ایلچپور پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ہوشنگ شاہ نے ابھی تک شاہ آباد مندو سے حرکت نہیں کی ہے، اس لئے بادشاہ مصروف شکار ہو گیا۔ ادھر ہوشنگ شاہ نے خیال کیا کہ احمد شاہ دبی کھا رہا ہے، فوراً یلغار کر دیا اور نرسنگھ کی مملکت میں قتل کا بازار گرم ہو گیا۔ یہاں تک کہ نرسنگھ قلعہ کہترلہ میں محصور ہو گیا۔ احمد شاہ کو خبر معلوم ہوئی اور وہ چلا ہی تھا کہ علماء نے مسلمانوں سے قتال کو حرام ٹھہرا دیا اور بادشاہ نے حکم شریعت کا پورا احترام کیا، ہوشنگ شاہ کو لکھا کہ نرسنگھ میرا طرفدار و باجگزار ہے تم اپنے ملک کو پلٹ جاؤ میں اپنے تخت گاہ کی طرف واپس جاتا ہوں لیکن ہوشنگ شاہ نے اس صلح نامہ کو ٹھکرا دیا اور احمد شاہ کا تعاقب شروع کر دیا اور تعاقب بھی یوں کہ آج اس منزل سے احمد شاہ روانہ ہوتے تھے دوسرے دن ہوشنگ شاہ وہاں قیام کرتا تھا۔

احمد شاہ جب اپنی سرحد پر پہنچا تو اس نے علماء سے صاف کہہ دیا کہ اب پیچھے ہٹنا میری توہین ہے جو میری سرحد میں داخل ہوگا اس سے جنگ کروں گا۔ یہ تو تھا تاریخ کا خلاصہ اب مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو آپ کو تعجب ہوگا کہ عالمگیر، ابوالحسن تاناشاہ پر فوج کشی کرتا ہے اور دہلی سے گولکنڈہ تک چڑھائی ہوتی ہے۔ اور ہزاروں مسلم قتل ہوتے ہیں مگر ایک عالمِ مذہب بھی یہ نہیں کہتا کہ ابوالحسن مسلمان ہے یہ کیوں کہیئے کہ ابوالحسن شیعہ تھا اور شیعہ مسلمان نہیں ہوتا یوں تسکین کر لیجیے کہ حضرت عالمگیر پانچویں مجتہد تھے اور یہ خطا خطاء اجتہادی تھی۔ رہا خون مسلم وہ بقاعدۂ قدیم نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

احمد شاہ کا اپنی سرحد پر ٹھہر جانا اور غیر سرحد سے ہٹ آنا، مسئلہ دفاع کی روشنی میں دیکھیے

اور اس پر فخر کیجئے کہ احترامِ شریعت میں بھی ہمارے بادشاہ آگے رہے ہیں۔

اب علماء بھی مجبور تھے اور کوئی حیلۂ شرعی باقی نہ تھا غرض دوسرے دن دونوں لشکروں میں قیامت خیز جنگ ہوئی۔ نتیجہ جو ہونا چاہئے تھا وہی ہوا یعنی ہوشنگ شاہ تمام مال و اسباب کے ساتھ اپنے ناموس کو بھی چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ان گرفتاروں میں ہوشنگ شاہ کی دو بیٹیاں بھی تھیں اگرچہ یہ ناکتخدا تھیں اور اسیرانِ جنگ میں تھیں مگر احمد شاہ شیعہ تھا۔ اس نے گرفتاروں کو خلعتہائے فاخرہ دئے اور خواجہ سراؤں کو ہمراہ کر کے بعزت واپس کر دیا۔

اس فتح حق کے بعد نرسنگھ بادشاہ کو اپنے قلعہ میں لے گیا اور علاوہ دعوت کے بہت کچھ مال ومتاع نذر دیا جن میں الماس و یاقوت و درعدن یک من وزنی تھے۔ اسی سلسلۂ سفر میں بادشاہ ایک پر بہار خطہ میں پہنچا جس پر احمد آباد بیدر کی بنیاد پڑی اور یہی شہر آخر میں تخت گاہ ہو گیا۔ احمد شاہ بہمنی و احمد شاہ گجراتی سے بھی جزیرہ مہیم بمبئی (آج مہیم بمبئی کا ایک کالونی ہے) کے لئے جنگ ہوگئی مگر علماء نے صلح کرادی۔ احمد شاہ نے اپنے بیٹوں پر ملک تقسیم کر دیا اور ملک التجار خلف حسن بصری کی سرکردگی میں ملک کوکن فتح ہوا۔

احمد شاہ نے بارہ سال دو مہینہ حکومت کے بعد ۲۸ رجب ۸۳۸ھ میں انتقال فرمایا۔ رحمۃ اللہ علیہ

احمد شاہ کے خصائص

احمد شاہ فقیر دوست و سادات پرور تھے، علم دوستی کا جذبہ حد کمال کو پہنچا تھا۔ ملک الشعرا آذری انہیں کے عہد میں وارد ہندوستان ہوئے اور شہر احمد آباد کی تعریف میں قطعۂ ذیل نظم کیا جو بخط ملا شرف الدین، مازندرانی مرید شاہ نعمت اللہ ولی دروازہ احمد آباد پر نصب کیا گیا:-

قطعہ

حبذا قصر مشید که زفرط عظمت
آسمانِ سده از پایهٔ ایں درگاه است
آسماں ہم نتواں گفت که ترک ادب ست
قصرِ سلطانِ جہاں احمد بہمن شاه است

لطف یہ کہ شاہ نعمت اللہ ولی وملا شرف الدین ماز ندرانی وملک الشعرا آذری یہ سب کے سب شیعہ تھے۔ شیخ آذری نے مشہور 'بہمن نامہ' بڑی حدتک نظم کیا۔ ان حضرات کا تذکرہ ذیل اولیاء وشعراء وعلماء شیعہ میں ہوگا انشاء اللہ المستعان۔

شاہ نعمت اللہ ولی کا تاج دوازدہ ترک بھیجنا اور احمد شاہ کو اپنے خواب کی پوری پوری تعبیر ملنا، شاہ موصوف کے تذکرہ میں درج ہوگا۔ احمد شاہ نے کربلائے معلیٰ ودیگر مقاماتِ مقدسہ کے سادات کے لئے بہت کچھ خیرات بھیجی ہے۔ سید ناصر الدین کربلائی کی توہین کے انتقام میں شریک خاں کو پائے فیل میں بندھوا دیا۔ احمد شاہ کی مدح میں خوب کہا ہے:

ندیدی کس از خویش واز اجنبی
گرامی تراز اہلبیتؑ نبیؐ
بجان معتقد بود سادات را
ہمه اہل تقویٰ وطاعات را
یقینش قوی بود دستش درست
بجز داد گر یاری از کس نجست

اولاد شاہ نعمت اللہ سے اپنی لڑکیوں کا عقد کیا اور خود شہزادہ علاء الدین کا عقد نصیر خاں

فاروقی والی سندھ کی دختر سے کیا۔ شاہ نعمت اللہ نے اپنے قلم سے لکھا تھا: اعظم الشہاں شہاب الدین احمد شاہ ولی۔

سلطان علاءالدین بن سلطان احمد شاہ بہمنی

۲۹ ؍رجب ۸۳۸ھ کو آفتاب اقبال بہمنیہ کا عروج ہوا اور سلطان علاءالدین تخت نشیں ہوئے۔ تخت نشینی تاریخ سلاطین میں (نہ) کوئی نئی بات ہے، نہ تختہ موت کی طرح کروٹ بدل لینا کوئی نیا حادثہ۔ سلطان علاءالدین کی تخت نشینی بھی قابل مبارکباد نہ ہوتی اگر اس نے اپنے مسلک اخلاق کے وہ جوہر نہ پیش کئے ہوتے جن سے جواہر خانہ تاریخ ہمیشہ روشن رہے گا۔ سلطان علاءالدین میں جذبۂ رحم و کرم بہت زیادہ تھا، وہ خطا پوش وعفو کوش تھا، صلۂ رحم اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔

حصول سلطنت یا بقائے حکومت کے لئے برادرکشی سلاطین اسلام کی سنت ہے اور جن کا اتقا جن کی عظمت زیادہ دلکش ہے، وہی اس بدسلوکی میں سب سے زیادہ آگے ہے۔ خلیفہ مامون عبدالرشید عباسی کو دیکھئے، اس کے علمی دربار کو پیش نظر رکھئے اور دعویٰ خلافت کو بھی فراموش نہ کیجئے اور کشتۂ حسرت امین الرشید پر ماتم کیجئے۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیر کی مشہور پرہیزگاری ان کی مقبول مولویت کو یاد کیجئے اور داراشکوہ اور دوسرے بھائی بہنوں، باپ کا قتل ستم قید و بند ملاحظہ فرمائیے۔ ایک دو ہوں شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ بادشاہ ایسا نظر آئے جس نے صلہ رحم کو قہر کی تلواروں سے ٹکڑے نہ اڑایا ہو۔ دیکھتے دیکھتے بھائیوں کی آنکھیں نہ پھوڑ دی ہوں یا دائم الحبس نہ کر دیا ہو۔ یہاں تک کہ الملك عقيم کی مثل مشہور ہوگئی۔

اس شورش عام میں کیا سلطان علاءالدین کا یہ کارنامہ قابل مدح نہ ہوگا کہ اس نے اپنے دونوں بھائیوں شہزادہ محمد خاں اور شہزادہ داؤد خاں کو نہ صرف صحیح الاعضاء زندہ رکھا بلکہ ان کو

بڑی بڑی جاگیریں بھی عطا کیں اور شہزادہ داؤد خاں کے انتقال کے بعد ان کی جاگیر بھی شاہزادہ محمد خاں کو عطا کر دیں۔شہزادہ محمد خاں کو لوازمات امارت چتر و فیل کیا نہ دیا گیا اور عیش و عشرت کا کوئی سا دروازہ نہ بند رکھا گیا۔

بھائیوں کے بعد ''قدیمان خودرا بیفزا'' سے قدر پر عمل کیا گیا اور خان اعظم دلاور خاں غوری وکیل شاہی و خواجہ جہاں استرآبادی وزیر کل و عماد الملک غوری امیر الامرا مقرر ہوئے۔

رایان بیجانگر وسلاطین بہمنیہ سے ہمیشہ ان بن رہی ہے اگرچہ ہمیشہ شکست ہوئی مگر یہ لوگ چین سے نہ بیٹھے اور سرکشی میں کبھی کمی نہ کی۔سلطان علاء الدین کے عہد میں بھی پنجسالہ خراج باقی تھا آخر شاہزادہ محمد خاں و خواجہ جہاں کے صبا رفتار و شیر شکار گھوڑوں نے راجہ کے علاقے پامال کرنا شروع کئے اور واپسی پر آٹھ لاکھ ہون بیس ہاتھی اور دوسو کنیزیں لے کر پلٹے۔

اس پہلی فتح نے شہزادہ محمد خاں کا حوصلہ بڑھا دیا تھا مگر مفسدوں نے اپنے دام میں پھنسایا، خصوصاً سکندر خاں دختر زادۂ سلطان احمد شاہ بہمنی شہزادہ کو سمجھایا گیا کہ یا نصف سلطنت ملے یا ایک ہی تخت پر دونوں پہلو بہ پہلو متمکن ہوں مگر یہ ارادہ بغیر خواجہ جہاں استرابادی و عماد الملک غوری کی تائید کے لغو تھا، اس لئے ان دونوں سے کہا گیا۔ان دونوں نے بغاوت کا سبق نہ پڑھا تھا، صاف انکار کیا اور دونوں قتل کئے گئے۔بغاوت شروع ہوگئی۔بیجانگر سے حاصل کردہ روپیہ سامان فوج کشی میں صرف ہونے لگا۔

سلطان علاء الدین کو خبر ہوئی قتل عماد الملک نے رُلا دیا، اس کی وفاداری، اس کے وہ خدمات جو خاندانِ بہمنیہ کے استحکام کے لئے عمل میں آئے تھے۔وہ سر کے سفید بال جنہوں نے اپنی سیاہی آب وفا سے دھوئی تھی یاد آنے لگے بادشاہ نے کہا کہ میں اس قتل پر صبر نہیں کرسکتا میں تو عماد الملک کو بجائے جد و پدر جانتا تھا۔

ہاں کسی غیر ملک کا پھول تم اپنے وطن میں لگاؤ، کچھ نہ کچھ زمین کا اثر پیدا ہوجائے گا مگر جس چمن کا پھول ہوگا اس چمن کی خاصیت تھوڑی چھوڑے گا۔ قدیم الخدمت ہونا ہمیشہ شریف مالکوں کے لئے ہزار رعایت کا باعث رہا ہے۔ حکیم امت امیر المومنینؑ نے حسنینؑ سے فرمایا تھا کہ ابوذرؓ تمہارے چچا ہیں۔ ابوذرؓ سا غریب ومفلس وطن آوارہ دنیا والوں کے نقطۂ نظر سے بیکار سوکھا سا کھا لاغر اندام اور پھر سلطنت کا گنہگار خلیفہ وقت کا معتوب۔

اور حسنؑ وحسینؑ سبط پیمبر شاہزادگان عرب سردارانِ جنت چچا کہیں، یہ سب اس لئے کہ ہمارے اخلاق جاری متبعین تک پہنچیں اور اگر چہ عماد الملک سہی مگر ایک نوکر کو دکن کا سلطان اعظم علاء الدین باپ کہے، اس طرح وہ بنیاد محبت جس پر اسلام کی تعمیر ہوئی تھی مضبوط ہوتی جائے۔

غرض طرفین سے جنگ کی تیاریاں ہوئیں اور یہ ایک گھر کی دونوں دیواریں زلزلہ خیز شور کے ساتھ ٹکرائیں۔ شہزادہ محمد خاں کی فوج بھاگی، شاہی فوج نے تعاقب کے لئے فتح نصیب گھوڑوں کی لجامیں اٹھادیں، مگر علاء الدین جنگ میں بادشاہ تھا، فتح کے بعد بڑا بھائی بن گیا اور فوج کو تعاقب سے روک لیا۔ (۱) شہزادہ محمد خاں کو اب سر بصحرائی کے سوا کیا چارہ تھا مگر بڑے بھائی نے خط لکھے اور بلا کر گلے لگایا اور شہزادہ داؤد خاں مرحوم کی جاگیر جنگ کے صلہ میں دے کر معاف کیا۔ اس جنگ میں بہت سے مفسد اسیر ہوئے خود علاء الدین کے بوڑھے چچا بھی پیر دستگیر کہے جانے کے قابل ہوئے مگر رحم وکرم، عفو واحسان، رہائی ومعافی، (۲) بس ساری سرزنش یہ تھی کہ دربار میں چشم وابرو سے وار کئے گئے۔ یہ ہیں وہ اخلاق جن پر شیعوں کو ناز ہے۔

• ۸۳۰ھ روز نوروز راجہ سنگیسر کے مقابلہ میں خان اعظم دلاور خاں کو خلعت رخصت عطا ہوا۔

---

(۱) طبقات الکبریٰ، ص ۴۱۸ (۲) فرشتہ، ج ا ص ۳۳۰

خان اعظم نے اگرچہ فتح حاصل کی اور نقد وجنس کے ساتھ راجہ سنگیسر کی مشہور خوبصورت لڑکی بھی بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوئی مگر استیصال کامل نہ ہوا۔ بعد کو سلطان نے اس غیر ضروری رعایت پر خان اعظم کو سزادی جو صرف اتنی تھی کہ خان اعظم نے انگشتری وکالت واپس کردی اور بادشاہ نے وہ انگشتری لے لی اور دستور الملک خواجہ سرا وکیل شاہی کے عہدہ پر سرفراز کردیا گیا۔

راجہ سنگیسر کی لڑکی اپنے حسن و جمال میں اپنے موسیقی کے کمال میں سارے دکن میں مشہور تھی اس کے حسن عالم سوز کی گرمی سے نبض سطور تاریخ اب تک تپیدہ ہے اوراس کی فلک بوس تانیں ہیں جو آج تک عمارت سیر میں گونج رہی ہیں اس لڑکی کا اسلامی نام 'زیبا چہرہ' رکھا گیا اور منکوحات شاہی میں داخل ہوگئی۔ ملکہ جہاں آغا زینب بنت نصیر خاں فاروقی (۱) والی برہان پور واسیر اس تازہ نکاح سے مضطرب ہوئی، چونکہ نصیر خاں اپنا سلسلہ خاندانی حضرت فاروق سے ملایا کرتا تھا اوراس طرح یہ بیگم ایک بڑے گھرانے کی صاحبزادی تھیں اس لئے سوتاپے کی ڈاہ نے بیتاب کردیا اگرچہ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ عرب میں تو یہ رسم عام تھی اور خود اسی خاندان کی لڑکیوں نے بی بیوں والے مردوں سے مصلحتی نکاح کر کے دوسری عورتوں کو سوتاپے کے غم میں مبتلا کیا ہے۔ مگر پھر بھی باپ سے شکایت کی اور باپ احمد شاہ گجراتی کے بھروسے پر چڑھ دوڑا۔ ادھر وکالت شاہی نے اور ایک کروٹ بدلی۔ میاں دستور الملک اس بڑے عہدے کو لیتے ہی پھول گئے۔ اور تو اور شاہزادوں کو بھی اڑن چھو بتانے لگے۔ آخر شاہزادہ ہمایوں کی سازش سے

(۱) نصیر خان فاروقی کو اپنے فاروقی ہونے پر اصرار تھا۔ اگرچہ کوئی سند موجود نہیں مورخ فرشتہ وخواجہ مرزا علی اسفراتی (جو سلاطین فاروقیہ کے معتمد تھے) سے ملاقات ہوئی ہے اور فرشتہ نے دریافت کیا ہے کہ کوئی کتاب شرح حالات خاندانی سلاطین فاروقیہ آپ نے دیکھی ہے۔ خواجہ نے کہا کہ نہیں۔ (فرشتہ، ج ۲ ص ۲۷۷)

قتل ہوگئے اور میاں من اللہ دکنی کی قسمت چمکی۔ نصیر خاں فاروقی کی جنگ ظاہراً تو اس لئے تھی کہ سلطان علاء الدین نے سوت لا کر ایک ایسا گناہ کیا جو کسی بادشاہ سے آج تک عالم ظہور میں نہ ہوا تھا لیکن امرائے سلاطین بہمنیہ سے جن الفاظ میں سازش کی گئی تھی، وہ یہ بتاتے ہیں کہ سلطان علاء الدین سے مخالفت کی وجہ مذہبی وجہ تھی اگرچہ فرشتہ نے اس واقعہ کو دبا کر لکھا ہے۔ مگر بعد کے آنے والے واقعات صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ امرائے بہمنیہ میں ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو شیعہ افراد کے خون کا پیاسا اور وقت کا منتظر تھا چنانچہ جب وقت ملا تو کربلا کے تاریخی ورق ہوائے دکن میں اڑنے لگے۔

میرے خیال میں یہ جنگ اس تعمیر کی نیو تھی اگرچہ کامیابی نہ ہوسکی۔ اس پر بڑی دلیل یہ ہے کہ جن الفاظ پر سلاطین بہمنیہ کو بلایا گیا ہے وہ سیاسی نہیں ہیں مذہبی ہیں چنانچہ آپس میں جو دعوت دی جاتی تھی اس کے الفاظ یہ ہیں:

"نصیر خان فاروقی از اولاد عمر فاروق است اگر نوکری
اورا اختیار کرده با مخالفانِ او شمشیر زنیم شہید و غازی
خواہیم بود۔"(۱)

دنیا جانتی ہے کہ شہید و غازی کا لقب انہیں میدانوں میں ملتا ہے جہاں کفار سے مقابلہ ہو، لیکن شیعوں سے جنگ بھی بعد کو غازی و مجاہد شہید بناتی رہی ہے۔ نصیر خاں دو ہزار سواروں سے آگے بڑھا راجہ کوندوارہ کی مدد بھی شامل ہوگئی، امرائے دکن قدوم آل فاروق کے منتظر تھے اور ایسے منتظر کہ خواجہ جہاں سرلشکر برار کو اپنی جان اپنی فوج سے بچانا دشوار ہوگئی، چنانچہ خواجہ

(۱) فرشتہ، ج ۱ ص ۳۳۱

بمشکل تمام اس حلقۂ موت سے نکل کر قلعہ ترتالہ میں متحصن ہو گئے۔

سلطان علاء الدین کو خبر ہوئی، مجلس مشاورت معین کی گئی، لیکن جب امرائے ملک خود سلطنت کی خرابی کے درپے ہوں تو کانفرنس و کانگریس سے کیا فائدہ۔ خود بادشاہ نے بوئے نفاق محسوس کی اور مجلس مشاورت ناکام ختم ہوئی۔ حالات کا مطالعہ سب سے بڑا گواہ ہے کہ 'زیبا چہرہ' کا سوتا پا صرف ایک حیلہ تھا، ورنہ امرا کو اس خانگی معاملہ میں دخل دینے کا کیا حق تھا، جب کہ دستور عالم یہی تھا اور پھر علاء الدین کا سن و سال بھی مولانا شوکت علی کے برابر نہ تھا، مولانا تو غیر ملکی بی بی بیاہ لائے اور علاء الدین نے تو ملکی ہی بی بی کی تھی، مذہب اسلام قبول کرا دینے میں دونوں برابر ہے۔ علاء الدین پر نصر خاں فاروقی چڑھ دوڑیں تو درست اور اگر مولانا کے باب خلافت سے مسلمان سر ٹکرائیں، تو مولانا صرف یہ کہیں کہ معاملہ پرائیوٹ ہے۔

اُمرائے بہمنیہ تعداد میں کم نہ تھے مگر مقابلے کے لئے ایک بھی راضی نہ ہوا۔ خواجہ جہاں کی امداد کے لئے ایک بھی نہ اٹھا اور اگر کوئی تیار ہوا تو وہی ملک التجار خلف حسن بصری، یہ بھی ایک روشن دلیل ہے کہ امرائے بہمنیہ کو وطنی پاس نہ تھا، وہ مذہبی تنگ خیالی میں مبتلا تھے، ان کو خیال تھا کہ چاہے صوبۂ برار نکل جانے سے سلطنت بہمنیہ کی کمر ٹوٹ جائے مگر تعصب مذہبی میں کمی نہ ہونے پائے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بادشاہ شیعہ ہے اس لئے سنی بادشاہ کا مقابلہ نہیں کیا جاتا، ہاں اگر حکومت نصرانی ہوتی اور مقابلے میں خلیفۃ المسلمین بھی ہوتے تو مسلمان عراق حجاز کو چھین لیتے اور خدام کعبہ ترکوں کو ان کی پنج صد سالہ خدمات کا صلہ توپوں بندوقوں کر چوں اور خدا جانے کس کس آلۂ جنگ سے دیتے۔

ملک التجار اگرچہ روانگی پر تیار تھے مگر انہوں نے کچا چٹھا پیش کر دینا ہی مناسب سمجھا اور بادشاہ سے عرض کیا کہ سلطان گجرات کے مقابل میں گذشتہ شکست مہائم (ممبئی) صرف

انہیں اصحاب کی بے التفاتی و کمزوری سے ہوئی اب یہ تلخ تجربہ دوبارہ نہیں کیا جاسکتا۔ میرے ساتھ صرف خاصہ خیل اور غیر ملکی فوج بھیجی جائے۔[1] یہ اصحاب ملک نہیں چاہتے کہ ہمارے ہاتھوں سے کوئی کارنمایاں ہو۔ بادشاہ نے ملک التجار کی التماس کو قبول کیا اور جو فوج بھیجی گئی ان کے سرداروں کے نام ذیل میں درج ہیں، یہ تمام اصحاب شیعہ تھے: قاسم خاں صف شکن، قرا خان گرد، احمد بیگ یکتہ، علی خان سیستانی، میر علی کافرکش، افتخار الملک ہمدانی، رستم خاں مازندرانی، حسین خاں بدخشی وغیرہم۔ امرائے حبش و دکن سے اس ساری جنگ میں صرف اتنا ہی کام لیا گیا کہ ان کو بعض سرحدات کی حفاظت کے لئے بھیج دیا گیا۔

ملک التجار کے ساتھ کل سات ہزار فوج تھی جس نے برار کی طرف کوچ کیا۔

(۱) ملکی وغیر ملکی کا قصہ آج تک دکن میں رائج ہے اور اب یہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ زیدا پاروالے غیر ملکی ہیں اور دکنی ہندوستانی نہیں ہیں لیکن ابتداً یہ تعصب ایرانی و ترکستانی وغیرہ کے ساتھ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ غیر ملکی و غریب کا لفظ شیعوں کے لئے تراشا گیا تھا۔ اس کے اسباب واضح ہیں حضرات اہلسنت عہد حضرت عثمان سے زمین ہندوستان پر فاتحانہ حیثیت سے آنے لگے اور محمد بن قاسم کے بعد سے جو فاتح آیا وہ کچھ اپنے فوجی اور کچھ نومسلم چھوڑ کر گیا اس طرح حضرات اہلسنت کی آبادی قدیم ٹھہری اور شیعہ جو غیر فاتحانہ حیثیت سے آئے وہ نسبتاً آنے والوں میں جدید تھے اہلسنت حضرات اس عرصہ میں لباس و وضع بھی بدل چکے تھے زبان بھی بدلتی جاتی تھی اور شیعہ ایرانیوں کے عمامہ و دستار میں فارسی بولتے چلے آرہے تھے جن کو ہر اعتبار سے غیر ملکی و غریب ہی کہا جاسکتا تھا اگر چہ یہ صحیح نہیں ہے کہ شیعہ بعد کو پہنچے بلکہ ان کے تجارت پیشہ اشخاص مالا بار میں شاید عہد حضرت عثمان سے بھی پہلے چھاؤنی چھا چکے تھے جو آپ کو مالا بار کی تاریخ شیعہ میں انشاء اللہ ملے گا پھر بھی شمالی ہندوستان میں حضرات اہلسنت کی آبادی دکن کی نسبت سے زیادہ تھی اور شمالی ہندوستان میں بڑے بڑے عہدے اُن سے پُر ہو چکے تھے اور جو دو ایک شیعہ فاتحانہ کی طرح اپنی ذاتی قابلیت سے بڑھ گئے تھے اُن کو تباہ کرنے کی مسلسل کوششیں جاری تھیں اس لئے شیعوں کو شمالی ہندوستان سے زیادہ دکن میں نام و نمود پیدا کرنے کا یقین تھا اسی بنا سے ان کا زیادہ مجمع دکن کی طرف آیا چنانچہ دکن میں آج تک مشہور ہے کہ چند پالکیاں صرف دہلی اور سیکڑوں دکن میں آئیں۔ یہ آنے والے اگر چہ بہ لباس صوفیہ علماء تھے مگر ان میں فیصدی ننا وے شیعہ تھے۔ لیکن دکن میں بھی حضرات اہلسنت سے مقابلہ کے بغیر چارہ نہ تھا چونکہ سلطنت بہمنیہ شیعہ ہو چکی تھی اس لئے بلا تقیہ شیعہ کہہ کر نباہ کرنا مشکل تھا اس لئے غریب و غیر ملکی لقب ملا تھا۔ غیر ملکی و غریب میں آپ کو شاذ و نادر ہی حضرات اہلسنت ملیں گے۔ ان میں زیادہ تر تعداد سادات اور کربلائی و نجفی و خراسانی اصحاب کی تھی۔

خان جہاں خبر آمد سن کر قلعہ تر نالہ سے نکل آئے اور قصبہ جھکر پر دونوں میں ملاقات ہوئی۔

خاں جہاں نے راجہ کونڈ واڑہ کی امداد کا منفذ روکا۔ یعنی ایلج پور اور مالا پور کے راستوں پر قبضہ کیا اور ملک التجار نصر خاں فاروقی جنگی کیمپ روہنکیر پر جا پڑے۔ جنگ ہوئی مگر بیکار، بعض جانیں گئیں اور مفت۔ نتیجہ حسب قاعدہ قدیم نکلا یعنی نصر خاں فاروقی نے فرار کیا، قسمت سے فرار کا راستا بھی کوہستان ہی ملا تھا جہاں کا بز کوہی خرام ناز میں مشہور ہے۔

ملک التجار نے گھر تک پہنچانے میں کمی نہ کی، آخر برہان پور کی فاروقی راجدھانی لٹی، متمولین سے خرچہ جنگ وصول کیا گیا، شاہی عمارات ڈھادئے گئے، نصر خاں فاروقی یہاں سے بھاگ کر قلعہ للنک میں پناہ گزیں ہوا، یہاں جب لوٹ سے فرصت ہوئی تو ظاہر تو یہ کیا گیا کہ دکن چل رہے ہیں مگر راستا بھول کر للنک پر آپہنچے۔ یہاں پھر ایک گھن گرج مقابلہ ہوا اور توپ خانہ، ہاتھی اور دوسرے لوازمات شاہی پر ملک التجار نے قبضہ کیا۔ یہ یاد رہے کہ اس لوٹ میں نہ عورتیں اسیر کی گئیں نہ جوان و پیر و طفل قتل ہوئے اور ان سب کے بعد نصر خاں اور اس کی ریاست کو پھر اسی کے لئے چھوڑا گیا۔ ہاں قلعہ للنک میں باغی امرائے دکن اور برہان پوری ریاست کے بہت سے مفسد سرِ میدان کام آئے۔

اس فتح عظیم سے غیر ملکیوں کی دھوم پڑ گئی۔ ملک التجار کے استقبال کے لئے شاہی حکم سے شاہزادہ ہمایوں نے منزل بھر آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ بادشاہ نے خلعت و شمشیر و کمر مرصع اور بہت کچھ دیا غربا کو جاگیریں ملیں۔ سلطان قلی شاہ جنہوں نے اس جنگ میں گھس گھس کے حملے کئے تھے شرف دامادی سے سرفراز ہوئے۔(۱) اسی دن سے غیر ملکی دست

---

(۱) فرشتہ، ص ۳۳۱

راست اور ملکی دست چپی مقرر ہوئے اور اہل یمین وشمال کی تقسیم ہوگئی لیکن ساتھ ہی ساتھ عداوت بھی پختہ ہوگئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں کا یہ جرات نامہ رائے بیجا نگر کے دربار میں بھی پڑھا گیا، اس لئے کہ اس زمانے میں راجہ کو مسلمانوں کی جرأت ماننا پڑی اور خود بھی اس نے ایک پوری مسلم فوج اپنے یہاں ملازم رکھی اور تالیف قلب کے لئے راجہ کے دربار میں کلام مجید رکھا جانے لگا تا کہ مسلمان سلام کے وقت کلام معبود کے سامنے سرخم ہوں۔ اس فوج کے تیار ہو جانے کے بعد سلطان علاء الدین سے ایک سخت ٹکر ہوئی جس میں فخر الملک دہلوی اور ان کے بھائی نے کارنمایاں کیا دونوں جوانمرد منہ پر سپریں کھینچ کر لڑتے ہوئے قلعہ میں داخل ہوئے یہاں تک کہ گرفتار ہو گئے اور خان زماں نے شہادت پائی مگر راجہ کو معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی قوت انسانی قوت ہے، البتہ حق کے ساتھ ہونے سے دو چند ہو جاتی ہے۔ اس جنگ میں بھی شاہی فوج غالب رہی۔

رائے بیجانگر نے ہمیشہ خراج دیتے رہنے اور سلطان علاء الدین نے آئندہ حملہ نہ کرنے کا معاہدہ کیا فخر الملک رہا ہوئے۔ اس فتح کے بعد ہی یکا یک سلطان علاء الدین پر مرض عشرت کا حملہ ہوا اور ایسا سخت کہ صاحب فراش (خانہ نشیں) کر دیا۔ فطرت کا یہ انقلاب اگرچہ حیران کن ہے مگر ہندوستان کی بدبختی کا راز انہیں فقروں میں مستور ہے۔ یہاں ہر وہ بادشاہ جو ذی ہوش ومستعد دیکھا گیا ہے، اس کو مصاحبوں نے اپنے فائدے کے لئے عشرت میں گرفتار کرادیا۔ سلطان بہمنی کے گرد تو دو مختلف الاغراض گروہ موجود تھے، ایک غرض فتوحات اور کارہائے نمایاں انجام دینے سے وابستہ تھی۔ دوسرا گروہ اس طرح اپنے حریف کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا مگر بادشاہ کو اپنے قبضہ میں رکھنا ضروری جانتا تھا، اس لئے دام عشرت پھیلایا گیا۔ درحقیقت غیر ملکیوں کو اس طرح کامل شکست ہوئی اور ان کو سپر انداختہ ہونا پڑا۔

جوع عشرت میں جس قسم کی کورش درکار ہوتی ہے وہ ملکی اصحاب ہی مہیا کر سکتے تھے، غیر ملکی تو اکثر ایسے تھے جو گھر سے فریداً وحیداً پہنچے تھے، بعض نے تو ہندوستان میں ایرانی وعربی خون ملا دیا تھا اور بعض ابتک اس رنگینی سے بھی محفوظ تھے، بھلا ان سے یہ رسد کیونکر مہیا ہوسکتی، لہذا بقول فرشتہ بادشاہ کے حول وگرد ملکیوں کا قبضہ ہو گیا، بادشاہ نے گھر سے نکلنا ترک کر دیا نعمت آباد میں ایک دلکش باغ بنا جس میں گل اور گلرخ دونوں تھے۔

جب اندر باہر قبضہ ہو گیا تو غیر ملکیوں کو شہر بدر کرنے کی تدبیر سوچی گئی اور بادشاہ کو علاقہ کوکن وسواحل دریا کے فتوحات پر آمادہ کیا گیا۔ اس مہم کے لئے ضرورتاً ملک التجار کا انتخاب ہوا۔ ملک التجار جن پر شوق جہاد غالب تھا قلعہ جالنہ کو مرکز مقرر کر کے گئے اور راجہ سرکہ پر فتح حاصل کر کے اس کو قتل واختیار دین اسلام میں مختار کیا۔ اس نے راجہ سنگیسر کے مسلم نہ ہونے کا عذر پیش کیا اور کہا کہ طعن وتشنیع کے علاوہ بھی آپ کی واپسی کے بعد میرا راج قائم نہ رہ سکے گا پہلے اس پر غلبہ حاصل کر لیجئے ملک التجار نے کہا ملک کے راستے سخت ناہموار اور ناقابل عبور ہیں لیکن سرکہ نے اپنی رہنما وفاداری کی چاشنی دی اور خود راجہ سنگیسر سے خفیہ ساز باز کر لیا۔

غیر ملکی حضرات میں سے بعض نے تو بنی اسرئیل کی طرح یہیں سے ساتھ چھوڑا(۱) اور "اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ" (سورہ مائدہ آیۃ ۲۴) کی عملی تفسیر کر دی اور جو ساتھ رہے وہ فوج میں بد دلی پھیلاتے رہے۔ راستہ بھی نہ صرف کوہستانی راستہ بلکہ ناہموار اور دشوار گزار ہونے کے علاوہ پیچ در پیچ تھا اور اندرون ملک آب وہوا خراب ومسموم، غرض سرکہ ایک ایسے موقع تک لے آیا جہاں وادی سرسبز عظیم الشان درختوں سے لبریز اور گرد پہاڑ اور پہاڑوں میں راجہ سنگیسر کے فوجی پوشیدہ

(۱) فرشتہ، ج۱ ص ۳۳۵

تھے۔ درختوں کی کثرت نے خیمہ سے خیمہ کو متصل نہ ہونے دیا اور اندھیری رات نے نگاہوں کے آگے اپنا پہرہ قائم کیا۔ تیز ہوا نے پہاڑ کی چوٹیوں کے نقارے بجانا شروع کئے اور سناٹے نے پہاڑ کے دروں میں قرنا نوازی کی۔ سرکہ غائب ہوا۔ اور دشمنوں نے کمین گاہ سے نکل کر پتھراؤ کر دیا۔ لطف یہ ہوا کہ ملکیوں کا کوئی نامی آدمی قتل نہ ہوا اور غیر ملکیوں میں چند کس کے سوا کوئی جان نہ بچا سکا۔ پانچ سو سادات بنی حسنؑ کے ساتھ ملک التجار نے جام شہادت نوش کیا ان میں اکثر مدنی و کربلائی و نجفی تھے۔ (۱)

بنا کردند خوش رسمے بخون خویش غلطیدن

خدا خیری دہد آن کشتگانِ پاک طینت را

مؤرخ فرشتہ بھی اس شکست کو انہیں منافق ملکیوں کی کارگزاری بتاتا ہے اور ہم بھی نہیں سمجھے کہ راجہ سنگیسر کی فوج نے غیر ملکیوں کو اندھیرے میں پہچان پہچان کر کیوں کر قتل کیا۔ جو غیر ملکی بچے ان کو بھی یہی شک تھا۔ چنانچہ ان میں سے بعض لوگوں نے واپسی پر یہ ظاہر کر دیا کہ بادشاہ سے اس کی شکایت کرنا ضرور ہے۔ ان کے یہی الفاظ تھے جو ان کے لئے قیامت ہو گئے۔ غیر ملکیوں نے بادشاہ کو یہیں سے عریضہ لکھا کہ غیر ملکی راجا یان کوکن سے ساز باز کر رہے ہیں اور ان کا ارادہ بغاوت کا ہے۔ خوش قسمتی سے ملکیوں کی جاگیریں قریب تھیں، وہ تو خط نویسی کے فریضہ سے فارغ ہو کر آرام سے گھر جا بیٹھے، لیکن بدنصیب غیر ملکیوں کی جاگیریں دور تھیں اور مال و اسباب غارت ہو چکا تھا، قرض دام کے بغیر سفر نہ کر سکتے تھے، اس لئے جالنہ میں آئے اور یہاں انتظام سفر کرنے لگے۔

---

(۱) فرشتہ، ج ا ص ۳۳۵

غیر ملکیوں کا خط مشیر الملک کے ہاتھ جن کے لئے فرشتہ نے حسب ذیل جملے لکھے ہیں:-

مشیر الملک کہ اعدای رد مغلان بود وقرب ومنزلت بسیار نزد سلطان داشت دراثنائے مستی عریضہ را بنظر سلطان درآورد و قصہ کشتہ شدن خلف حسن بصری وتمرد غریباں رابصورت قبیح تقریر کرد۔

بادشاہ دماغ ودل نذر شراب کر چکا تھا، پھر بھی انتقائے نائرہ بغاوت پر آمادہ ہوا اور اس مرتبہ سپہ سالاری کے لئے غیر ملکیوں کے سوا دوسرا کون تجویز ہوسکتا تھا۔ چنانچہ مشیر الملک ونظام الملک فوج لے کر چلے۔ پھر فرشتہ کی زبان سے حالات سنئے:-

وآنہا ہمچو عبید اللہ بن زیاد وشمر ذی الجوشن عداوت آل رسول ص اللہ دربر کردہ لشکر بسیار متوجہ آں طرف شدند۔

غربا اس تعذیری مہم کے آنے سے پہلے تو ہکا بکا ہو گئے پھر وقتی حفاظت کے لئے قلعہ میں جا بیٹھے اور اپنا تفصیلی حال لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا، جو راستے میں مشیر الملک کو ملا اور اس نے پارہ پارہ کر دیا۔ غرباء نے کچھ روز جواب کا انتظار کر کے اور دو خط لکھے۔ اپنے ہم جنسوں میں سے تو کسی کو بھیج نہ سکتے تھے غیر ملکیوں میں سے ایسے دو شخص نامہ بر مقرر کئے گئے جو غربا کے پروردۂ نعمت تھے مگر یہ دونوں کتّے کی دم ثابت ہوئے اور خلعت اسپ و مال وروز کے عوض انہوں نے بھی یہ دونوں خط مشیر الملک کے ہاتھ فروخت کر دئے جن کو منجے ہوئے ہاتھوں نے پارہ پارہ کر دیا اور نامہ بری کے لئے جتنے راستے ہوسکتے تھے سب پر پہرہ قائم کر دیا۔ اب انتظام مکمل ہو چکا تھا لہذا جنگ شروع ہوئی جو دو ماہ جاری رہی اور مشیر الملک کو ایک روز بھی فتح حاصل نہ ہوسکی۔ مشیر الملک نے جب دیکھا کہ غرباء اس طرح قبضہ میں نہ

آئیں گے تو ان کو دھوکا دیا گیا اور خدا و رسول اور قرآن کریم کے نام پر صلح ہوئی کہ ہم مسلمان ہیں، مسلمانوں سے کیا برائی کریں گے، تمہارا مشرح حال بادشاہ سے کہہ کر بات رفع دفع کر دیں گے۔ صلح کے بعد تین روز ان سب کو آرام سے رکھا گیا۔ چوتھے روز قلعہ میں دعوت کا پرانا حیلہ کیا گیا جس میں قاسم خان صف شکن اور احمد خان یکہ تاز وقرا خاں کے علاوہ سب شریک تھے جن کو کوئی خاص عذر تھا ادھر دسترخوان پر بیٹھے اُدھر چھپے ہوئے بہادر مسلمان نکلے اور مشیر الملک کے اشارے سے خون سادات بہنے لگا اور دم بھر میں ایک باقی نہ رہا۔

دارالامارہ میں تو یہ خونی دعوت ہو رہی تھی اور ادھر چار ہزار مسلح دکنی خبر پر کان لگائے کھڑے تھے چنانچہ خبر انجام دعوت سنتے ہی یہ لوگ اپنا حصہ لینے ٹوٹ پڑے اس کی تفصیل بھی فرشتہ ہی سے سنئے:-

”از طفل یک ساعت تا پیر صد سالہ ہمہ را شہید کردند چنانچہ یک ہزار و دو صد سید صحیح النسب و قریب ہزار مغل و پنج و شش ہزار طفل معصوم دران روز از دست ظالمانِ دکن از نقد روح پر داختند و حشرات دکن بعد از قتل مہاراج مشغول شدہ انواع دست اندازی بہ زنان و دختران کرد کہ در ہیچ عہدی بعد از واقعہ جناب امام حسینؑ چنان مصیبتی بسادات روی ننمودہ بود زہی بی حیا قومے کہ محض افترا و تہمت بہ فرزندان پیمبرؐ خود را باین وضع کشتند و خود را امت آن سلطان بارگاہ نبوت دانند۔

زہی تصور باطل زہی خیال محال

(فرشتہ، ج ۱ ص ۳۳۶)

یہ ہے شیعوں کی ترقی اور اس طرح ان کا مذہب پھیلا۔ پانچ سو سادات بنی حسنؑ کفار نے اور بارہ سو سادات مسلمانوں نے قتل کئے۔ قاسم خاں صف شکن وغیرہ نے اپنی عورتوں کو مردانہ لباس پہنایا اور قصبہ بیر کے راستے پر ہو لئے۔ مشیر الملک وغیرہ نے داؤد خاں کے ہمراہ دو ہزار سواران کے تعاقب میں روانہ کئے۔ صف شکن نے اس تنہائی و مصیبت میں بھی داد جوانمردی دی یعنی جہاں فوج نزدیک پہنچ گئی مڑ کر لڑے اور آگے بڑھے قصبہ بیر کے قریب راستہ دشمنوں کے قبضہ میں آ گیا اور داؤد خاں نے جاگیردار بیر حسن خان سے مدد طلب کی، غیر ملکیوں کی داستاں بغاوت کہی، مگر حسن خاں نے اس پروپیگنڈے کو جھوٹ جانا اور کہا کہ باغی ہوتے تو سرحد شاہ گجرات میں کیوں نہ چلے جاتے، جو صرف تین روز کا راستہ ہے اور اس طرف کیوں آتے۔

غرض عین جنگ میں حسن خاں اپنی فوج کے ساتھ پہنچا اور غیر ملکیوں نے داؤد خاں کو نشانہ تیر بنایا۔ لڑائی فتح ہوئی۔ قاسم خاں نے بادشاہ کی خدمت میں اور ایک آخری خط لکھا جو بادشاہ تک پہنچ گیا۔ اور بادشاہ نے گھبرا کر قاسم خاں کو بلا لیا۔ معاملہ معلوم ہوا تو بادشاہ کے غیظ و ندامت کی حد نہ تھی۔

مصطفی خاں (پیشکار) کو قتل کیا گیا اور لاش پائے فیل میں آویزاں ہوئی (اس نے غربا کے خط روک رکھے تھے) اصل مفتری جس نے پہلا خط بھیجا تھا قتل ہوا۔ مشیر الملک و نظام الملک و امرائے دکن قصبہ جالنہ سے پابہ زنجیر پیادہ پا احمد نگر لائے گئے املاک ضبط ہوئی، پیسے پیسے کو محتاج ہو گئے، دونوں برص میں مبتلا ہوئے۔ فرشتہ نے لکھا ہے:

"پسران ایشاں بجای زنانِ بازاری می گشتند فکیف دختران ایشاں"

بادشاہ نے بھی سزا پائی۔ شراب و عشرت دونوں کو چھوڑا اور امور سلطنت میں بذات خاص

منہمک رہنے لگا۔ مجھے یقین ہے کہ خوش فکر حضرات سلطان علاء الدین کو قتل سادات کا بانی ثابت کریں گے اور عجب نہیں کہ یزید ثابت کردیں جیسا کہ وہ خود کہا کرتا تھا کہ خدا ان کو عذاب جہنم سے محفوظ نہ رکھے جنہوں نے مجھے یزید کی طرح بدنام کرنا چاہا۔[۱] لیکن علاء الدین کی غفلت، اس کی عشرت شراب نوشی یہ سب یقیناً لائق سرزنش تھے اگر چہ یہ سب بھی سنت سلاطین اسلام ہے پھر بھی یزید و علاء الدین میں کوئی ربط نہیں۔ پہلے نے حکم قتل حسینؑ دیا تھا اور دوسرے کو ذبح سادات کی خبر بھی نہ تھی اور جب خبر ہوئی تو اس نے قاتلوں سے انتقام میں کمی نہیں کی اور بقیۃ السیف کی تسلی و تشفی کی۔ چنانچہ قاسم صف شکن کو سرلشکر دولت آباد و احمد یکہ تاز وغیرہ کو مناصب یکہزاری عطا کئے گئے پھر بھی وہ اپنی غفلت سے نادم تھا۔

علاء الدین جمعہ میں خطبہ پڑھتا تھا اور ان الفاظ کے ساتھ اپنا نام لیتا تھا: "اَلسُّلْطَانُ الْعَادِلُ الْكَرِيْمُ الْحَلِيْمُ الرَّؤُفُ عَلٰى عِبَادِ اللهِ الْغَنِيِّ عَلَاءُ الدِّينِ وَآلِهٖ بِبِنَاءِ عَلاءِ الدِّيْنِ اِبْنِ اَعْظَمِ الشَّهَانِ سُلْطَانُ اَحْمَدُ شَاهِ بَهْمَنِي۔" ایک جمعہ میں بادشاہ یہاں تک پہنچا تھا کہ ایک عرب اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کہا: "لَا وَاللهِ لَا عَادِلٌ وَلَا كَرِيْمٌ وَلَا حَلِيْمٌ وَلَا رَؤُفٌ اَيُّهَا الظَّالِمُ الْكَذَّابُ تَقْتُلُ الذُّرِّيَّةَ الطَّاهِرَةَ وَتَتَكَلَّمُ بِهٰذِهِ الْكَلِمَاتِ عَلٰى مَنَابِرِ الْمُسْلِمِيْنَ۔" ''خدا کی قسم نہ تو عادل و کریم ہے نہ حلیم و رؤف او جھوٹے، ظالم، اولاد طاہر (رسولؐ) کو قتل کرتا ہے اور منابر اہل اسلام پر ایسی ایسی باتیں بناتا ہے'' بادشاہ یہ سن کر منبر سے روتا ہوا اترا اور پھر اس کا جنازہ ہی گھر سے باہر نکلا۔

---

(۱) فرشتہ، ص ۳۳۵

مورخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ یہ ایک عرب تاجر تھا جس کی کچھ قیمت باقی تھی مگر روپیوں کے لئے نہ تو تاجر کو یہ جرأت ہوسکتی تھی اور نہ اس تقاضہ کو مسلمانوں کا مجمع سن سکتا تھا؟ نہ علاء الدین نادہند مشہور ہے، نہ کوئی واقعہ اس کی شہادت میں موجود ہے۔ یہ سب تو صرف مذہبی جوش ہی سے ہوسکتا ہے۔

علامۂ ہروی نے بھی اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے بقایا رقم کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

میں اس واقعہ سے جس نتیجہ پر پہنچتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ واقعہ قاسم صف شکن کے بلائے جانے سے پہلے کا ہے جس کو غلطی سے بعد از وقت لکھا گیا ہے، اس لئے کہ جب وہ خط جن کے پہنچ جانے سے ملکیوں کا اس سے زیادہ نقصان متصور نہ تھا کہ ان کے حریف ان کے مقابل رہتے بادشاہ تک نہ پہنچنے دے تو قاسم خاں کا یہ خط کیوں کر پہنچا ہوگا؟ کسی مؤرخ نے اس خط کے پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں بتایا۔ پھر مشیر الملک اگر جالنہ میں تھے تو میاں من اللہ دکنی اور مصطفی خاں تو دارالسلطنت ہی میں تھے اور اس خط کے پیش کرنے والے ان نتائج سے بھی بے خبر نہیں ہوسکتے جو قتل سادات کے افشائے راز کے بعد لازم تھے۔ میرا خیال ہے ڈاک پر پہرہ نہیں اٹھا تھا، البتہ عام مجمع میں ایک شخص آ بیٹھا اور واقعہ بیان کرنے لگا جس کو کوئی نہ روک سکا۔ یہ بالکل ممکن ہے اور اسی طرح یہ حال کھلا۔ آج ہی پر منحصر نہیں، منبر کے نیچے بولنے والے تو جامع مسجد کوفہ میں ابن زیاد کے سامنے بھی بولے اور کوئی کچھ نہ کرسکا۔ رہی خانہ نشینی وہ اس زخم ساق پا کی وجہ سے دوبارہ واقع ہوئی جس کو فرشتہ نے بھی مرض الموت کا باعث بتایا ہے۔ اس خانہ نشینی کے بعد بھی جلال خاں وسکندر خاں نے بغاوت کی مگر خواجہ محمود گاوان نے شکست دی اور بادشاہ نے معافی عطا کی، خواجہ کو ایک ہزاری منصب ملا۔ ۸۶۲ھ میں سلطاء علاء الدین نے زخم ساق پا سے انتقال کیا۔ ۲۳ سال اور چند ماہ حکومت کی۔ سلطان علاء الدین فارسی کا ماہر اور تقریر میں

فصیح وبلیغ تھا۔عربی علوم کچھ نہ کچھ حاصل کئے تھے۔احمد آباد میں ایک عظیم الشان شفاخانہ تیار کرایا جس کے خرچ کے لئے بہت سے مواضع وقف تھے۔

باپ کے انتقال کے بعد ولی عہد سلطنت کو حسب قاعدہ تخت نشیں ہونا چاہئے تھا۔مگر ہمایوں شاہ کو خبر بھی نہ ہوئی اور سیف خاں وملوخاں نے شاہ حبیب اللہ بن شاہ خلیل اللہ وغیرہم کی سازش سے حسن خاں (ہمایوں کے چھوٹے بھائی) کو تخت نشیں کر دیا اور نہ صرف تخت نشیں بلکہ ہمایوں شاہ کے مکان کو آگ لگا دینے اور غارت کر دینے کی بھی ٹھان لی۔ایک بدمعاش گروہ جا پہنچا جن کا اچانک مقابلہ ہمایوں شاہ نے سکندر خاں وغیرہ کی مدد سے اسی سواروں کے ساتھ کیا اوران کو ہزیمت دے کر دربار میں جا پہنچا اور حسن کو جو خوف سے تھر تھرا رہا تھا تخت سے اتار کر قید کر دیا۔حسن خاں کے ساتھ شاہ حبیب اللہ ونظیری(۱) شاعر بھی قید ہوئے۔ملوخاں سرحد کرناٹک کی طرف نکل گیا اور سیف خاں کو پائے فیل میں بندھوا دیا گیا۔

شاید یہی پہلا ظلم ہے جس کی وجہ سے ہمایوں شاہ کو ظالم کا تاریخی لقب دیا گیا ہو جس کی آج اس قدر شہرت ہے کہ کسی تاریخ میں ہمایوں کا نام اس لقب کے بغیر نظر نہیں آتا۔

ہمایوں شاہ کی مدت سلطنت صرف تین سال ہے۔اس مدت میں اس کے کارنامے بھی زیادہ نہیں ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ بغاوت سے اس کو فرصت ہی نہ ہوئی اور آخر اسی بغاوت نے اس کا خاتمہ کر دیا۔اس کے کارناموں میں پہلا کام یہ ہے کہ اس نے وزرات کے لئے خواجہ نجم الدین محمود گاواں کا انتخاب کیا جو نہ صرف سلاطین دکن وہند بلکہ نظام الملک طوسی کے بعد وزراء اسلام میں دوسرا نمبر رکھتے ہیں۔اس کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہمایوں کا قرعہ فال تھا۔

(۱)طبقات اکبری قلمی موجودہ کتب خانہ رامپور

بلکہ اس کی قوت انتخاب واضح ہے۔اس نے ایک عرصہ تک فکرمندی کے بعد یہ رائے قائم کی اور یہی رائے کیا، اس کی ہر تدبیر موافق تقدیر ہوتی تھی جیسا کہ صاحب 'طبقات اکبری' نے لکھا ہے۔

> دراصابت رای شما بہ بود کہ ہر تدبیرے کہ تعلیم فکر بر لوح ضمیر نگاشتی موافق صورت تقدیر بودی وچوں بر سریر جہانبانی قرار گرفت ہمگی ہمت بر نصب وزیر کامل وفاضل مصروف داشت ومیفرمود کہ ارتفاع بر مدارج قہر مانی ومعارج جہانبانی بہ اعانت و امداد وزیریکہ عمارت ممالک وترفیہ حال رعایا از نتائج آرای او وتکثیر محصولات وتنسیق سپاہ از ثمرات افکار اوست میسر نمی شود۔

جس طرح اس نے خواجہ محمود کے انتخاب میں قوت صحت فکری کا نمونہ پیش کیا اسی طرح سکندر خاں کو ذمہ دار اعلیٰ عہدہ سے محروم رکھنا اس کی اصابت رائے کا نقش ثانی ہے اگرچہ سکندر خاں اس کا قرابت دار اور حسن خاں کے مقابل میں واحد طرفدار ومصاحب تھا۔

اس نے خواجہ محمود کو لقب ملک التجار دے کر طرفدار بیجاپور وملک شاہ مغل کو لقب خواجہ جہاں دے کر طرفدار تلنگ و برادر زادہ عماد الملک غوری کو لقب نظام الملک ومنصب ہزاری دے کر بنیادی کاموں سے فرصت پائی تو سکندر خاں اپنی محرومی کے بہانے سے بھاگ کر اپنے باپ جلال خان کے پاس جاگیر تلکنڈہ پر پہنچا اور بغاوت شروع کر دی یہانتک کہ ہمایوں شاہ کو خود جانا پڑا اور جب انتظار کے بعد بھی سکندر خاں کی طرف سے پیغام صلح نہ آیا تو ہمایوں شاہ نے خود پیغام دیا اور جاں بخشی کے ساتھ دولت آباد کی طرفداری کا بھی وعدہ کیا مگر سکندر خاں نے کہا

کہ ملک نصف نصف ہونا چاہئے اگر تم احمد شاہ کے فرزند ہوتو میں ان کا دختر زادہ ہوں۔

سکندرخاں کا جواب اس کی دبی امنگ کا مظہر ہے وہ کسی ذمہ دار عہدہ پر ہوتا تو خدا جانے خاندان بہمینیہ کے ساتھ کیا کرتا اسی مقام پر دیکھ لینا چاہئے کہ وہ ہمایوں شاہ جو تاریخی ظالم ہے وہ انتخاب وزرات میں رفاہ عام رعایا اور ان کی ترقی کا خواہاں ہے اور سکندرخان کے مقابل میں نمکحرامی کو بھول کر صلح کا خواہاں ہے۔ اور صلح بھی ایسی صلح جس میں رحم وکرم دونوں نمایاں ہیں۔ ہمایوں شاہ کا تہور مردانگی وسخاوت میں بھی کافی حصہ[1] تھا۔ یہ بھی تعجب ہے کہ سخاوت وظلم یکجا نہیں ہوتے۔ اس پیغام رحیمانہ کا الٹا اثر یہ ہوتا ہے کہ عین معرکہ جنگ میں سکندرخاں خود ہمایوں شاہ پر نیزہ بدست حملہ کرتا ہے اور فیل شاہی اپنی نمک حلالی کے جوہر دکھا کر نمک حرام انسان کا خاتمہ کردیتا ہے۔ لڑائی تمام ہوتی ہے اور جلال خاں پدر سکندرخاں قلعہ بند ہوجاتا ہے لیکن جب عجز وانکسار کا اظہار کرتا ہے تو جاں بخشی کی جاتی ہے اور صرف قید پر اکتفا ہوتی ہے خدا جانے ابتک وہ کونسا ظلم ہے جس بنا پر ہمایوں شاہ ظالم کے لقب کا مستحق ہوتا ہے۔

اس جنگ کے بعد بادشاہ فتح ممالک کا ارادہ کرتا ہے، وہ بھی سزا کے طور پر، نہ جوع ارضی کے لئے۔ قلعہ دیواکندہ پر شاہی فوج خواجہ جہاں ترک ونظام الملک کی سرکردگی میں بھیجی جاتی ہے، اس لئے کہ راجہ دیوکند، اس بغاوت میں شریک تھا۔ پہاڑی قلعہ محصور ہوجاتا ہے۔ اتنے میں رائے اڑیسہ کی فوج کی آمد آمد ہوتی ہے۔ نظام الملک کی رائے ہوتی ہے کہ قلعہ کا محاصرہ ترک کرکے کھلے میدان میں جنگ ہو۔ خواجہ جہاں کا خیال ہوتا ہے کہ دشمنوں کی نگاہ میں سب کی نہ ہو، غرض خواجہ جہاں کی غلط رائے پر عمل ہوتا ہے۔ ایک طرف سے رائے اڑیسہ کی فوج

(۱) طبقات اکبری قلمی ۱۲ر

دوسری طرف سے قلعہ بند کفار کا حملہ ہوتا ہے اور ہزاروں مسلمان کھیت رہتے ہیں بقیۃ السیف ورنگل میں جب پہنچتے ہیں اور بادشاہ کو اہل اسلام کی تباہی کی خبر ملتی ہے اور اس کو غصہ آتا ہے تو خواجہ جہاں اپنی جان بچانے کے لئے اس ہزیمت کا سبب نظام الملک کو قرار دیتے ہیں اور نظام الملک فراری ہو کر سلطان محمود خلجی سے جاملتا ہے۔

ہمایوں شاہ کی کفار سے یہ پہلی جنگ تھی جس میں ہزیمت کے سوا مسلمان ہزاروں کی تعداد میں قتل ہوئے تھے۔ اس کی غیرت اسلامی کا تقاضہ تھا کہ وہ انتقام خون اہل اسلام لے۔ ابھی وہ اسی فکر میں تھا کہ دارالخلافت بیدر سے خبر پہنچتی ہے کہ پیری مریدی والوں نے شہر میں آفت برپا کردی اور قید خانہ کا دروازہ کھول دیا، سیاسی وغیر سیاسی تمام قیدی آزاد ہو گئے اور کوتوال شہر جو ذمہ دار تھا اپنے فرائض میں غافل پایا گیا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ یوسف ترک چپل غلام اور بعض مریدان شاہ حبیب اللہ نے کوتوال اور پیادوں کو ملا کر شاہ حبیب اللہ ہی کو نہیں بلکہ سارے قیدیوں کو جن میں حسن خاں مدعی سلطنت بھی شریک تھا رہا کر دیا اور یہ تمام قیدی متفرق طور سے فرار نہیں ہوئے بلکہ قصبۂ بیر میں یکجا مقیم ہیں۔ ان کا ارادہ پہلے قلعہ ارک اور بعد کو فتح بیر کا تھا یہاں تک کہ شاہی عہدے بھی تقسیم ہو چکے تھے اور تارک الدنیا شاہ حبیب اللہ وزیر کل اور یوسف ترک مرید امیر الامرا بن چکے تھے۔(۱) ہمایوں شاہ اس خبر کو معلوم کر کے یہاں کا انتظام وزیروں کے سپرد کر کے دیوانہ وار دارالخلافت میں پہنچا۔

اور اس ساری فوج کو جو قید خانہ کی محافظ تھی قتل کرادیا اور جب حسن وغیرہ گرفتار ہو کر آئے

(۱) فرشتہ، ج ا ص ۱ ۴ ۴

تو ان سب کو عذاب الیم سے قتل کیا۔بعض کو درندوں کے آگے ڈال دیا اور بعض کو کھولتے تیل میں جلا ڈالا اور ان کے اعزا واقربا اور عورتوں کو بھی قبیح حال سے قتل کیا۔

ہماری تاریخ نویسی اس لئے ایسی نہیں ہے کہ ہم دن کو رات کر دیں اور زبردستی حمایت کریں۔ہم بالاعلان کہتے ہیں کہ یہ آخری سزائیں نہایت سخت تھیں لیکن آج اس عہد روشن میں سازش کرنے والوں کی کیا سزا ہے اور قید خانہ ٹوٹ جانے پر گولی چلا دینے کا حکم ہے یا نہیں اور فوج کی سازش میں کورٹ مارشل جائز اور گولی سے اڑا دینے کی سزا عام ہے یا نہیں۔اگر یہ سب کچھ جائز ہے تو باغی فوج اور سازشی عہدہ داروں کا قتل ہمایوں شاہ کے لئے کیوں تعجب خیز وظلم انگیز سمجھا گیا۔ برادرکشی ایک عظیم لعنت ہے لیکن کیا یہ پہلی بات ہے اور سنت تاجداران اسلام نہیں ہے۔

ہمایوں شاہ اس ظلم پر ظالم کا لقب پائے اور اسی ظلم پر دوسرے تاجدار مولوی کا لقب حاصل کریں، اس کو کیا کہتے ہیں۔

شاہ حبیب اللہ لڑائی کے وقت لڑتے رہے تھے یہانتک کہ قتل ہو گئے۔حقیقتاً یہی قتل تھا جس نے مریدان شاہ صاحب کو ہمایوں شاہ کے اظہار ظلم میں یکزباں کر دیا اور مختلف روایات بیان ہونے لگیں، جن میں راستے سے عروس اہل شہر کو طلب کر لینا تک ہے۔ہم نہیں سمجھتے کہ جب ہمایوں شاہ مشہور عیاش ہے، نہ اس کی عیش پرستی کا تاریخوں میں ذکر ہے، نہ اس کی مختصر حیات اس افکار آلود زندگی میں عیاشی کے لئے موزوں ہی ہو سکتی ہے، پھر یہ طومار ظلم کہاں سے پیدا کیا گیا؟ اس کے سوا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سب تراش خراش فقط مریدان خوش عقیدہ کا جذبۂ انتقام ہے۔لطف یہ کہ تاریخ قتل حبیب اللہ شاہ جو سید طاہر استرآبادی نے کہی ہے اس میں بھی تذکرہ ظلم ومظلومی دونوں نہیں ہے۔

مه شعبان شہادت یافت درہند
حبیب اللہ غازی طَاَبَ مَثْوَاہُ
روان طاہرش تاریخ می جست
برآمد روح پاک نعمت اللہ
۴ ۲ ۸ ھ

مریدان شاہ صاحب کا جذبۂ انتقام نہ صرف زبانی رہا بلکہ معلوم ہوتا ہے اور ایک خفیہ سازش ہوئی جس میں ہمایوں شاہ کا خاتمہ ہوگیا۔ اپنے بستر پر محوآرام تھا کہ ایک حبشن نے سوتے میں عصا سے سرکچل دیا اور ہمایوں شاہ نے ذیقعدہ ۸۶۵ھ میں انتقال فرمایا۔ اس قدر اور بھی سن لیجئے بقول آنریبل ڈاکٹر ہنٹر صاحب سلاطین بہمنیہ کی فوج میں دو فرقہ تھے جو آپس میں رقیب تھے۔ ایک وہ جس میں دکنی مسلمان وحبشی تھے، یہ حنفی المذہب تھے اور دوسرے جو ایران وترکستان و وسط ایشیاء سے آئے تھے، وہ شیعہ تھے۔[۱] ہمایوں شاہ کا جس نے خاتمہ کیا وہ عورت حبشن تھی۔

نظام شاہ بن ہمایوں شاہ

آٹھ برس کے سن میں یہ خوبصورت یتیم بچہ تخت فیروزہ کا مالک ہوا۔ ہمایوں شاہ نے تین فرزند چھوڑے تھے۔ نظام شاہ کا سن سب سے زیادہ تھا۔ ملکہ جہاں مادر نظام شاہ ایک عفیفہ بافہم عورت تھی اور یہی ناظمۂ سلطنت تھی۔ اس نے شوہر کے انتخاب سے فائدہ اٹھایا اور خواجہ جہاں ترک وخواجہ محمود گاوان پر اعتماد کیا۔ خود بھی مشوروں میں شریک تھی مگر اپنی پردہ نشینی کا اتنا

(۱) تاریخ ہند آنریبل ڈاکٹر ہنٹر صاحب، مطبوعہ گورنمنٹ پریس، الہ آباد حصہ دوئم صفحہ ۳۶

احترام تھا کہ یہ سب کچھ براہ راست نہ ہوتا تھا بلکہ ماہ بانو خواص درمیان میں تھی۔نظام شاہ کی کمسنی سب سے بڑی مصیبت تھی جس کو یہ خیر خواہ جھیل رہے تھے۔راجہ اڑیسہ اس خبر کو سن کر سلطنت اسلام کو باجگزار بنانے چڑھ دوڑا۔خواجہ گاوان نے نظام شاہ کی کمسنی کا خیال نہ کیا اور اسی بچہ کو اس دھوم دھام سے میدان جنگ میں لائے کہ سلاطین ماضیہ کے جلوس (۲) نگاہوں سے گر گئے۔

اس جنگ میں جس میں دس ہزار کفار صرف مقدمۃ الجیش میں تھے۔شاہ محب اللہ بن شاہ خلیل اللہ کا کارنامہ تاریخ میں ہمیشہ تاباں رہے گا۔یہ شاہ حبیب اللہ کے چھوٹے بھائی تھے مگر وفا و درد اسلام میں کہیں بڑے تھے۔ایک سو ساٹھ آدمیوں سے دس ہزار پر گرے، اور صبح سے دوپہر تک جنگ کر کے ہزیمت دی، یہاں تک کہ جو خراج لینے آئے تھے (رائے اڑیسہ) وہ پانچ لاکھ تنگہ نقرہ خراج دے کر واپس گئے اس لئے کہ خواجہ محمود گاوان فراریوں کا تعاقب کرتے چلے آتے تھے۔

کفار کے بعد حریص و طامع مسلمانوں کی باری آئی۔ سلطان محمود خلجی نے حملہ کر دیا۔ سلطان کے اس حملہ نے ہندو راجاؤں کو دوبارہ ابھارا اور رائے اڑیسہ وغیرہ نے اپنی سرحدوں سے قدم بڑھائے۔ارکان دولت بہمنیہ کے لئے وقت نازک تھا مگر انہوں نے ہمت سے کام لیا۔اپنی فوج کو دو حصوں پر تقسیم کیا لشکر تلنگ ہندوؤں کے مقابلے کے لئے اور لشکر دولت آباد وغیرہ کو لے کر خود مسلمانوں سے معانقہ کے لئے آ گئے۔

---

(۲) فرشتہ، ج۱ص ۳۴۳

سلطان خلجی کا لشکر ۲۸ ہزار کی تعداد میں تھا۔ چھوٹا کمسن شیعہ سپاہی اور باایمان بادشاہ پریشان نہ ہوا۔ اس نے میدان جنگ کو بازیچۂ اطفال سمجھا اور دوش پر مرصع کمان، پہلو میں منبت ترکش، کمر میں نیمچۂ اصفہانی لگا کر آ گیا اور سپاہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ سپہ سالار کی حیثیت سے، غافل سپہ سالار، مجہول سردار کی طرح نہیں، 'فرائض سے آگاہ'، وقت کی نزاکت سے باخبر قائد کے مانند۔ فرشتہ گواہ ہے کہ اس نے آپ اپنی فوج کو آراستہ کیا آپ نقشۂ جنگ بنایا۔[1]

دس ہزار سواروں سے خواجہ محمود گاوان کو میمنہ سونپا، نظام الملک ترک کو میسرہ حوالے کیا گیا گیارہ ہزار[2] سوار اور سوسلسلہ فیل کے ساتھ خود قلب فوج میں ٹھہرا اور یہاں کا انتظام خواجہ جہاں ترک وسکندر خاں کے اختیار میں دیا۔

یہ ہے ہمارا ایک غیر تعلیم یافتہ جاہل تاریک خیال قدامت پرست چھوٹا سا سپاہی۔ غالباً موجودہ عہد روشن کے تعلیم یافتہ جرأت وجلالت میں، دشمن کشی میں، وقار قومی کی حفاظت میں اس بچہ سے زیادہ ہیں۔ تلوار کی جگہ ان کے پاس ٹینس کی تھاپی ہے، ان کا میدان حوصلہ افزا کرکٹ کی فیلڈ، ان کی نقشہ دانی کرکٹ کے وکٹ گاڑنے پر منحصر ہے۔

نظام شاہ غیر تعلیم یافتہ جاہل تھا، بچہ تھا۔ اس کی ساری باتیں ہی جہالت آمیز تھیں۔ قدرت وفطرت نے اگر چہ ابتک کرزن فیشن کا حامی بنا رکھا تھا مگر نہ سر پر انگلش بال، نہ یورپین ویسلین وکریم، نہ امریکن غازہ، نہ گلے میں ٹائی، نہ رانوں میں نیکر، نہ جیب میں سنہری سگریٹ کیس، سامان صحت وشرافت سے بالکل عاری،

---

(۱) تاریخ فرشتہ، ج ا ص ۳۴۳ (۲) طبقات اکبری قلمی

اسباب جہالت میں سراپا غرق ہے۔ وہی عہد حجر کے یادگار تیر، وہی عہد آہن کی بوسیدہ تلوار، وہی قدیم نامردانہ سپاہگری۔ بھلا آج کل کی شجاعت وزور آزمائی سے کیا نسبت؟ بہادر تو وہ ہے جو الگ الگ زہریلی گیس کے بم برسا کر حبس دم کردے اور خیریت سے گھر چلا آئے۔ زور آزما تو وہ ہے جو برقی روشمسی شعاع قاتل سے دنیا کو صاف کردے اور دشمن کی صورت تک نہ دیکھے۔ نظام شاہ سے زیادہ ان تجربہ کار سپاہیوں کی غلطی قابل گرفت ہے جو آج تک تاریخ میں بے نظیر سپاہی مانے جاتے ہیں جیسے خواجہ محمود گاوان، جیسے خواجہ جہاں ترک۔ انہوں نے نقشہ جنگ کی بنیاد ایک ناسمجھ بچہ کو کیوں سپرد کردی؟ نہ نظام شاہ نے کسی فوجی کالج میں تعلیم پائی تھی، نہ غیر ملکی شہسواروں سے نشانہ بازی سیکھی تھی، نہ یورپ کے میدانوں میں فرس رانی کی مشق کی تھی۔ بھلا فوجی رینک تو کہاں، خاں بہادری کا تمغہ تک سینہ پر نہ تھا، مگر ان بوڑھوں کا صرف ایک ہی جواب تھا کہ شیروں کے بچے شیر ہی ہوتے ہیں۔ نظام شاہ کے لشکر کی قواعد دانی اور نقشہ جنگ پر بھی ایک نظر کرنا چاہئے۔ سلطان محمود خلجی کی فوج کل اٹھائیس ہزار تھی جو میمنہ ومیسرہ وغیرہ پر تقسیم تھی۔[۱] سلطان محمود کا مشہور بہادر فرزند غیاث الدین جو میدان جنگ میں تنہا پانچ سو آدمیوں کا مقابل ہوسکتا تھا میمنہ[۲] پر تھا۔ مہابت خاں وظہیر الملک حاکم چندیر میسرہ پر اور خود سلطان محمود قلب فوج میں تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ کچھ فوج کمیں گاہ میں بھی تھی جس کی تعداد ان اٹھائیس ہزار سے جداگانہ تھی۔ فوج کی آراستگی کو شیخ اذری نے بہمن نامہ میں نظم کیا ہے:-

---

(۱) طبقات اکبری قلمی (۲) فرشتہ، ج ا ص ۳۴۳

دولشکر زمند و دگر از دکن
دو خسرو یکی طفل ودیگر کہن
بجنبش در آمد بمیدان دوکوہ
زمین از تگا پوی شان شد ستوہ

نقارۂ جنگ بجنے سے پہلے خواجہ محمود گاوان کو جوش جرأت پیدا ہوا اور انہوں نے اپنا مقابل میمنہ دشمن چھوڑ کر میسرہ پر حملہ کیا اور نظام الملک نے اپنے مقابل کا میسرہ چھوڑ کر دشمن کے میمنہ پر حملہ کیا گو خط رفتار متقاطع تھا۔ سواروں نے حملہ کیا تھا اور حملہ کہو، یا دھاوا اور اٹیک مگر بہر طور گھوڑوں کی رفتار پوری تیز ہونا چاہئے جس کو گیلپ کہتے ہیں اگر نظام شاہ کی فوج پوری قواعد داں نہ تھی تو میمنہ و میسرہ کے ۲۰ ہزار سواروں کو نقطہ تقاطع پر آپس میں خود لڑ جانا چاہئے تھا مگر ہم کو کہیں نظر نہیں آتا کہ ایک سپاہی اور ایک سوار بھی گر گیا ہو۔

نقشۂ جنگ کی یہ خوبی بھی قابل فراموشی نہیں ہے، کہ میمنہ کا حملہ دشمن کے میمنہ والوں کو جس طرح مخاطب کئے ہوئے تھا اسی طرح میسرہ والے بے خبر ہوں گے مگر یکا یک میمنہ چھوڑ کر میسرہ پر حملہ ہو گیا، اسی طرح میمنہ والوں پر بھی یکا یک دھاوا کیا گیا۔ اس نقشہ جنگ نے فوج کو کامیاب کیا اور بہمنیوں نے کئی میل خلجیوں کو بھگا کر پڑاؤ پر قبضہ کیا اور پچاس ہاتھی چھین لئے مگر یہ سب لوٹ میں مصروف ہو گئے۔

نظام شاہ نے اب اپنی فوج کو متحرک کرنا چاہا جو بالکل صحیح رائے تھی مگر بقول فرشتہ خواجہ جہاں نے سکندر خاں کو بادشاہ کی حفاظت کے لئے چھوڑا اور آپ حملہ کیا۔ ہاں نمک حلالی یہی چاہتی تھی۔ کمسن بادشاہ کی حفاظت ضروری تھی۔ سلطان محمود خلجی پر ہول چھا گیا تھا۔ وہ سندھ واپس جانے پر آمادہ تھا مگر کچھ ساتھیوں نے روکا۔ یہاں فرشتہ کی تقریر الجھ جاتی ہے۔ وہ بیان

کرتا ہے کہ سلطان محمود کے ایک تیر سے سکندر خاں کا ہاتھی زخمی ہوکر اپنی فوج کو پامال کرنے لگا اور سکندر خاں نے ہاتھی کو قابو میں کر کے بادشاہ کو میدان جنگ سے دور ہٹا دیا جس کو بہمنی غارتگر فوج نے شکست سمجھا اور خود بھی بھاگ گئی اور فتح کو شکست ہوئی مگر اس بیان پر ایمان لانا دشوار ہے جب کہ ابھی تک میمنہ کی فوج چڑھی ہوئی لڑ رہی تھی اور میدان جنگ وسکندر خاں سے جو بادشاہ کے ہمراہ تھا کئی تیر کا پلہ تھا۔

یہاں 'طبقات اکبری' کا بیان صحیح ہے، جس نے کہا ہے کہ عین اس عالم میں سلطان محمود نظام شاہ کی پشت سے بارہ ہزار کی جمعیت سے ظاہر ہوا یقینا یہ فوج کمیں گاہ میں مقابل فوج کے علاوہ ہوگی جس نے پھیر کا راستا اسی عرصہ میں طے کیا ہوگا جس میں میمنہ ومیسرہ کا حملہ ہوا اور اب دوفوجوں کے درمیان میں میمنہ فوج کو پس جانے کے سوا کوئی راستا نہ تھا اور یہی بہتر تھا کہ بادشاہ کو بچایا جائے۔ چنانچہ خواجہ جہاں ترک بادشاہ کے گھوڑے کی لجام تھام کر لے نکلے اگرچہ فرشتہ نے بیان کیا ہے کہ سکندر خاں بادشاہ کو لے گیا اور اس نے ملکہ جہاں سے خواجہ جہاں ترک کی غیبت کی اور گویا یہ سمجھایا کہ میں نہ ہوتا تو خواجہ نے نظام شاہ کو قتل کرا دیا ہوتا۔ اس صلہ میں اس نے انعام پایا اور خواجہ جہاں ملکہ جہاں کی نگاہ سے گر گئے مگر اس تمام واقعے کو افسانہ ہی سمجھنا چاہئے۔ صاحب 'طبقات اکبری' نے اس طرف اشارہ بھی نہیں کیا ہے، نہ ملکہ جہاں کی دانش سے یہ امید ہوسکتی ہے اور اگر ایسا ہوتا تو نظام شاہ کے بعد خواجہ جہاں کو مزید عروج حاصل نہ ہوتا۔

نظام شاہ کی یہ شکست سلطان محمود کے لئے حوصلہ افزا ہوئی اور اس نے دار الخلافہ بہمنیہ احمد آباد بیدر پر قبضہ کر کے غارتگری کا کوئی پہلو ترک نہیں کیا، عمارات کو گرا دیا، مکانات میں آگ لگا دی، غرض شہر کو وحشت آباد کر دیا گیا۔ نظام شاہ ملکہ جہاں کی رائے سے مال واسباب کے ساتھ فیروز آباد منتقل ہو آئے۔ سلطان محمود قلعہ ارک کی فتح کے تدابیر میں مصروف ہو گیا جس

کی حفاظت ملوخاں دکنی کے سپرد تھی۔آخر سلطان محمود خلجی نے یکا یک فرار کیا۔خواجہ محمود گاوان نے تعاقب میں کسر نہ اٹھا رکھی اور ہزاروں فوجی قتل کئے، بھاگنے کے راستے بند کردئے۔آخر سلطان محمود مقدم کونڈوارہ کی رائے سے صحرا کونڈواڑہ کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کے مہیب راستے سے بھاگنے پرآمادہ ہوا یہ راستا جس قدر دشوار گذار تھا اتنا ہی بےآب وگیاہ اس پر مقدم کونڈوارہ نے پرانی دشمنی ظاہر کی یعنی راستے کے کنویں بند کرادئے بمشکل سلطان نے اس راستے سے عبور کیا۔مگر بارہ ہزار فوج اس بےآب وگیا جنگل میں کام آئی۔

سلطان محمود نے ۸۶۷ھ میں پھر دوسرے حملہ کی ٹھانی مگر سلطان محمود گجراتی کی امداد نے اس حملہ کو عالمِ وقوع میں نہ آنے دیا۔

سلطان محمود خلجی کو نہایت متقی و پرہیز گار بادشاہ بتایا جاتا ہے، چنانچہ اکل حلال کی فکر میں یہاں تک شغف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مطبخ خاص لشکر سے الگ ہوتا تھا اور جنس وسبزی کا یہاں تک انتظام تھا کہ بڑے بڑے تختوں پر کاشت کی جاتی تھی جو سفروں میں ساتھ رہتے تھے۔

عارضی قیام احمد آباد و بیدر میں یہ ترکاریاں غالباً کم ہوگئیں۔بادشاہ نے شاہ شمس الدین حق گو(۱) کو بلا کر پوچھا کہ آپ ذرا ان حلال زمینوں کا پتہ دیجئے جہاں سے اکل حلال حاصل ہو۔حق گو نے کہا کہ مسلم سلطنت پر حملہ مسلم بادشاہ سے جنگ کرنا اور حلال ترکاریوں کی خواہش عجیب بات ہے۔پہلے تلوار سے سرخی خون مسلم کا دھبہ دھوڈالو پھر حلال سبزی کی فکر کرو۔(۲)

سلطان محمود کے دوسرے حملہ کے بعد نظام شاہ نے دوبارہ احمد آباد کو آباد کیا اور اس کی

(۱) شاہ شمس الدین شاہ خلیل اللہ بن شاہ نعمت اللہ کی قبر کے مجاور تھے۔اسی مذکورہ واقعہ نے ان کو حق گو مشہور کیا۔

(۲) فرشتہ، ج۱ص ۳۴۴

زیب وزینت پہلے سے دگنی کردی۔اسی سنہ میں ملکہ جہاں نے اپنے اعزا میں سے ایک لڑکی منتخب کر کے نظام شاہ کا عقد ٹھہرایا لیکن شادی کا گھر ماتمکدہ بن گیا یعنی نظام شاہ نے دفعتًہ انتقال کیا۔تاریخ انتقال ۱۳/ذیقعدہ[۱] ۸۶۷ھ ہے۔موت کا سبب معلوم نہ ہوا۔[۲] بقول فرشتہ مدت سلطنت ایک سال وایک ماہ اورصاحب طبقات نے ایک سال گیارہ دن مقرر کئے ہیں۔ہسٹری آف انڈیا جان مارسمین میں ہے کہ دوسرے[۳] سال کے آخر میں انتقال کیا۔

پھول تو دو دن بہار زندگی دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

(۱)فرشتہ (۲) ہفت گلشن محمد شاہی قلمی (۳) ہسٹری آف انڈیا مترجمہ عبدالرحیم گورکھپوری مطبوعہ کلکتہ،ص ۴۰۱۴

❁❁❁

دینی تعلیم میں شیعوں کا مقام (حصّہ اول)

مصنف

علامہ سید مجتبیٰ حسن صاحب قبلہ کامونپوری

دینی تعلیم میں شیعوں کا مقام (حصّہ اول)

علامہ سید مجتبیٰ حسن صاحب قبلہ کامونپوری

کتاب وسُنّت میں علم وعلماء وطلبہ کا مقام

اِنسان یوں تو خاک کا ایک پُتلا ہے ۔ چند مشترک صفات میں وہ جمادات ونباتات وحیوانات کا شریک ہے لیکن انسان کل کائنات کے مقابلے میں ایک مستقل وجود بھی رکھتا ہے۔ فکر ونظر کی صلاحیت، خیر وشر کی تمیز لامحدود ترقی، خودشناسی، فرض شناسی، خداشناسی کے لحاظ سے کوئی مخلوق اس کی ہمسر نہیں ہے۔

ادراک وعلم کی کنجی اللہ نے اس کے ہاتھ میں دیدی، وہ فطرت کا رازداں بنتا جارہا ہے۔ قدرتی خزانے اُسکی آسائش میں اضافہ کررہے ہیں۔

''سورۂ علق''میں انسان پر جہاں آفریں، نے اپنی اس عظیم فیاضی کا ذکرفرمایا ہے۔

اے رسول ! اپنے پروردگار کا نام لیکر پڑھو۔جس نے ساری کائنات پیدا کی جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا؛ کیا۔ پڑھو!اورتمھارا پروردگار بڑا کریم ہے۔جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی،اس نے انسان کو وہ باتیں بتائیں جن کو وہ نہ جانتا تھا۔

(۹۶/۳۰)

اس آیت میں نعمت ایجادوتخلیق کے بعد نعمتِ علم کا ذکر آیا ہے۔منجمد خون ایک خسیس وحقیر مادّہ

تھا فیضان ربّانی سے وہ ترقی کرتے کرتے انسان کی صوری ومعنوی شکل اختیار کرتا ہے۔اس قطرہ میں وہ رفعت وجلالت پیدا ہو جاتی ہے کہ اسکی فکر سے علمِ ومعرفت کے چشمے اُبلنے لگتے ہیں۔

خدا ہی تو ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے، اور انھیں کے برابر زمین پیدا کی۔ان میں خدا کا حکم نازِل ہوتا ہے تا کہ ہم لوگ جانیں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

(۱۲/۳۸)

اس آیت میں عالم، سفلی وعلوی کی تخلیق کا یہ مقصد بتایا ہے کہ ان کے مطالعہ سے انسان کو خدا کی صفت قدرت وعلم کی معرفت ہو۔تاریکی ونور، باطل وحق، پست وبلند جس طرح برابر نہیں اسی طرح سب انسان بھی برابر نہیں ہیں۔علم وعمل کے فرق سے انسان ادنیٰ واعلیٰ میں تقسیم ہو جاتا ہے۔سورۂ مجادلہ میں ہے۔

جن کو علمِ عطا ہوا ہے خدا ان کے درجے بلند کرے گا۔ (۱۱/۲۸)

''سورۂ زمر'' میں ہے۔اے رسول! تم پوچھو کہ بھلا کہیں جاننے والے اور نادان دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ (۹/۲۳)

بے بصیرت و بے علم نہ خدا کے مہر وکرم کے مستحق بننے کے لئے سعی کرتے ہیں اور نہ اس کے جاہ وجلال اور عدل وانصاف ہی سے ڈرتے ہیں۔علماء خدا سے محبت بھی کرتے ہیں اور اس کے عدل سے ڈرتے بھی ہیں۔''سورۂ فاطِر'' میں ہے۔اللہ کے بندوں میں اس سے خوف کرنیوالے علماء ہی ہیں۔ (۱/۲۳)

علماء کا مقام نظر قدرت میں اتنا بلند ہے کہ اپنے عدل وانصاف سے کارخانہ عالم کو سنبھالنے کی گواہی میں اپنی ذات اور فرشتوں کے علاوہ علماء کا نام بھی لیا ہے۔آلِ عمران میں ہے''

عدل وانصاف کے ساتھ کارخانہ عالم کوسنبھالنے والا ہے۔

(۱۸/۱۳)

عالم وغیر عالم میں امتیاز ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے'' خدا کی مرضی اور اس کے جزا وسزا کا قانون عوام خود نہیں سمجھ سکتے اگر چہ اللہ کی کتاب سب کے لئے ہے مگر عوام اس کی گہری حکمت کو نہیں پاتے۔علماء اس سے فیض اٹھاتے ہیں ''سورۂ عنکبوت'' میں ہے''

ہم یہ مثالیں لوگوں کے سمجھانے کے لئے بیان کرتے ہیں اور اس کو تو علماء ہی سمجھتے ہیں۔

(۴۳/۳۰)

جن لوگوں کو خدا کی طرف سے علم عطا ہوا ہے ان کے دل میں قرار کی آیتیں واضح وروشن ہیں۔ (۴۹/۲۱)

قرآن مجید کے بعد حضرات معصومین علیہم السلام نے علم وعالم ومدرس ومتعلم کے مقام پر غیر معمولی روشنی ڈالی ہے۔علم کا مفہوم مقصد، معیاری علم، سائنسی علوم اور موقت لازمی تعلیم علم کی لامحدودیت، حصول علم کے لئے عقل کی ضرورت عبادت کے باوجود طلبِ علم سے فائدہ ہوتا ہے۔علم کے ساتھ عمل کی اہمیت، طریقہ تعلیم، طرز بیان، روزمرّہ کی زندگی میں تعلیم، طالب علم کی فضیلت، علم ایسی چیز نہیں کہ اُسے اندر کسی طرح بھر دیا جائے، بلکہ اس کا حصول صحیح طلب وتوجہ پر منحصر ہے، یہ تمام مسائل معصومینؑ کے ارشادات میں پھیلے ہوئے ہیں۔حضرت امیر المومنین علیہ السلام علم کے شرف پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔

علم کے ذریعہ سے اس کی عبادت واطاعت ہوتی ہے۔علم سے اللہ کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔ توحید سمجھ میں آتی ہے علم سے صلہ رحم ہوتا ہے۔علم سے حلال وحرام کی تمیز ہوتی ہے۔علم عقل کا امام ہے اور عقل اس کی تابع ہے سعیدوں کو علم کا الہام ہوتا ہے، شقی اس سے محروم ہوتے ہیں۔

(معالم الاصول۔شیخ حسن بن زین الدین م) ۱۰۱۱ھ

اسلام ضروری تعلیم کو جبری قرار دیتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اس کے سماج میں کوئی ایک فرد بھی ایسی نہ ہو جو نعمت علم سے بالکل ہی محروم ہو۔

امام جعفر صادقؑ اپنے جدّ اعلیٰ حضرت رسولخدا کی حدیث بیان فرماتے ہیں۔

ہر مسلمان پر تحصیل علم واجب ہے۔ اللہ علم کے طلب گاروں کو پسند فرماتا ہے۔

(معالم الاصول)

اسلام نہ تحصیل دولت کی کوئی حد مقرر کرتا ہے اور نہ کسی کو علم کی کسی منزل پر پہونچکر آگے بڑھنے سے روکتا ہے وہ مالی خوشحالی اور ذہنی ترقی کا حامی ہے۔ البتہ مال وعلم دونوں کے ذرائع کسب اور طریقہ صرف پر ضرور نظر رکھتا ہے۔

صرف دولت جمع کر لینا اور علم حاصل کرنا اس کی نظر میں کوئی فضیلت نہیں ہے۔ دونوں کے صحیح ذرائع اور صحیح مصارف کی اُسکی نظر میں بہت اہمیت ہے۔

امیر المومنین سے جناب رسولخدا کی ایک حدیث منقول ہے۔ دو کبھی سیر نہیں ہوتے، طالب دنیا اور طالب علم۔ جو مال کو جائز ذریعہ سے حاصل کرے گا وہ محفوظ رہے گا اور جو ناجائز ذریعہ سے حاصل کرے گا تباہ ہوگا۔ اگر توبہ کرلے گا تو بچ جائے گا۔ جو علم کو اس کے اہل سے حاصل کرے گا اور علم پر عمل بھی کریگا تو اس کی نجات ہوگی اور جو علم سے دنیا طلبی کرے گا تو دنیا ہی ملکر رہ جائے گی۔ (معالم)

علم خواہ لب ولہجہ میں کتنا ہی دینی ہو اگر خدا کی مرضی پر چلنے میں اس سے مدد نہیں لی جاتی بلکہ دنیاوی شہرت وجاہت وثروت اس سے مقصود ہے تو اس سے کوئی رُوحانی مقام حاصل نہ ہوگا۔ البتہ اگر خدا کی مرضی۔ اخلاق کی طہارت کردار کی صفائی انسان سے محبت کے پھل علم سے مل رہے ہیں تو اس سے دنیا وآخرت دونوں سنور سکتی ہے۔ نیت وفرض کے فرق سے علم کے نتائج

مختلف ہوجاتے ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں۔

جو علم اس لئے حاصل کرے گا کہ علماء سے مباہات کرے، فقہا سے اُلجھے یا لوگوں کو اپنی طرف مائل کرے تو وہ جہنم میں جائے گا۔

صادق آل محمد کا ارشاد ہے۔

جو حدیث سے دنیا کا نفع چاہے گا اُسے آخرت میں کچھ نہ ملے گا اور اگر آخرت کی بھلائی چاہے گا تو اللہ اُسے دنیا و آخرت دونوں کے فائدے سے بہرہ مند کرے گا (معالم)

سچّے اور مخلص علماء قرآن وسنت کے نظریہ زندگی کی اشاعت کرتے ہیں۔ انبیاء وائمہ کی سیرت کے نقش اُبھارتے ہیں اپنے علم وعمل سے حلال وحرام کے درمیان خط فاصل کھینچتے ہیں جو معرفت ویقین کے قافلے سے پیچھے رہ گیا ہے اُسے قافلے میں شامل کرتے ہیں۔ خیر وتقویٰ سے تعاون کے لئے فرد اور سماج کی ذہنی تربیت کرتے ہیں انکے کام کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ وہ عہد آفریں وکردار ساز ہوتے ہیں۔ اسی لئے اُمت کے طبقے میں انھیں سب سے اعلیٰ مقام دیا گیا ہے عابد وزاہد بھی اچھے انسان ہیں لیکن ان کی کوشش صرف اپنی نجات وفلاح کے لئے ہے۔ علماء کا عمل ذاتی فلاح کے ساتھ سماج کے معزز فلاح کے لئے بھی ہے۔ اس لئے عابدوں کی عبادت اور زاہدوں کے کو زہد کو میزان اعتبار میں ان کی فکر ان کی تعلیم ان کی تبلیغ کے مقابلے میں نہیں لایا جاسکتا۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں۔

جس عالم کے علم سے دوسروں کو نفع پہونچتا ہے وہ ستر ہزار عابدوں سے افضل ہے۔

(معالم)

معاویہ ابن عمّار نے امام جعفر صادق سے عرض کیا۔ ایک شخص آپ کی احادیث کا راوی ہے وہ

ان کی تبلیغ کرتا ہے اور شیعوں کے دلوں کو مضبوط کرتا ہے اور آپ کے شیعوں میں ایسے عابد بھی ہیں جنکے برابر اس راوی کی عبادت نہیں ہے۔ ان دونوں میں افضل کون ہے۔ امام نے فرمایا جو ہماری حدیث کا راوی ہے جس سے ہمارے شیعوں کے دل قوی ہوتے ہیں۔ ایسا راوی ہزاروں عابدوں سے افضل ہے۔ یہ شرف عالم باعمل کا ہے۔ (معالم)

صادق آل محمد فرماتے ہیں:

اگر کوئی عالم علم پر عمل نہیں کرتا تو اس کا موعظہ دلوں میں جگہ نہیں بنا تا جیسے چکنے پتھر پر پانی نہیں ٹھہرتا۔

صادق آل محمد فرماتے ہیں:

''جس نے علم حاصل کیا اور اللہ کے لئے اشاعت کی تو اُسے ملکوتِ آسمانی میں عظیم کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے اس نے اللہ کے لئے علم حاصل کیا۔ اللہ کے لئے عمل کیا۔ اللہ کے لئے تعلیم دی''

بیشک دین نے علماء کو بہت نمایاں امتیاز بخشے ہیں۔ لیکن یہ وہی علماء ہیں جن کا علم دنیا طلبی کا ذریعہ نہ رہا ہو جن کی نیت خالص ہو، دل پاک ہو، ایسے ہی علماء کے لئے امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے۔

عالم کا حق یہ ہے کہ اس پر سوالات کی یورش نکرو۔ جب اس کے پاس جاؤ اور دوسرے بھی وہاں موجود ہوں تو سب کو سلام کرو۔ اور اُسے مخصوص طور پر سلام کرو۔ اس کے سامنے بیٹھو، پیچھے نہ بیٹھو۔ اُس کی طرف آنکھوں کے اشارے نہ کرو۔ نہ ہاتھ سے اشارے کرو۔ نہ زیادہ باتیں کرو، نہ یہ کہو کہ فلاں فلاں نے آپ کے خلاف یہ کہا ہے۔ اس کے پاس زیادہ بیٹھ کر اُسے پریشان نہ کرو۔ عالم راہِ خدا میں جہاد کرنیوالوں سے افضل ہے۔ جب کوئی عالم مرتا ہے تو اسلام میں ایسا رخنہ پڑ جاتا ہے جو کسی طرح بھی پُر نہیں ہوتا (معالم) علماء کی ایک صف ''مدّرس'' کے حقوق خصوصی طور پر متعین کئے گئے ہیں۔ امام زین العابدینؑ حقوق کی

تقسیم کے موقع پر فرماتے ہیں۔

معلم کا حق یہ ہے کہ اس کی تعظیم کرو۔ اس کی مجلس کی توقیر کرو۔ اس کی بات اچھی طرح سنو، اس کی طرف متوجہ رہو۔ اس کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو۔ اس کی مجلس میں اگر کوئی کچھ پوچھے تو تم نہ بولو۔ اسی کو جواب دینے دو۔ اس کی مجلس میں کسی سے باتیں نہ کرو۔ اس کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرو۔ اس کے عیب چھپاؤ۔ اُس کی خوبیاں بیان کرو اس کے دشمن کے پاس نہ بیٹھو۔ اس کے دوست سے دشمنی نہ کرو۔ (معالم)

عرصہ تحصیل وطلب بڑا حوصلہ طلب وصبر آزما ہوتا ہے۔ جس مدت میں قطرہ گہر بنتا ہے بڑی بڑی قربانی بڑے بڑے اخلاص اور شدید عشق کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن جب یہ رہرو منزل تک پہونچ جاتا ہے تو پھر اس کی سعادت وخوشبختی کا کیا پوچھنا۔ پانی کے چند ذخیروں سے ندی بنی ہے۔ وہ پتھروں اور چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی جھاگ اڑاتی ہوئی ایک کشادہ میدان میں دریا کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

پھر وسیع و بے پایان سمندر میں ملکر وسیع تر ہوجاتی ہے۔ اسی لئے شرع پاک میں صرف علماء اور ''مدّرس'' ہی کی قدر افزائی نہیں فرمائی گئی ہے۔ بلکہ طالب علم کو بھی احترام کی نظر سے دیکھا گیا ہے اس لئے کہ آج کا طالب علم ہی کل کا عالم و مدرس ہوگا۔''

صادق آل محمد فرماتے ہیں:

جو ایسے راستے پر چلتا ہے جس سے علم حاصل ہوتا ہے تو وہ جنت کے راستے پر چلتا ہے۔ فرشتے اپنے بازو طالب علم کے پیروں کے نیچے بچھاتے ہیں۔ زمین کی کل مخلوق یہاں تک کہ دریائی مچھلیاں اس کے لئے دعا مغفرت کرتی ہیں۔

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

علم حاصل کرو۔ اس کا حاصل کرنا نیکی ہے۔ اس میں اس کا چرچا کرنا تسبیح ہے۔ اس کے متعلق بحث جاری رکھنا جہاد ہے اس کے ذریعہ سے اللہ سے قربت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس سے حلال وحرام کی پہچان ہوتی ہے۔ (معالم)

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے صحیح علم بیشمار برکت وسعادت کا سبب ہوتا ہے۔ صاحب علم اپنے لئے سماج کے لئے، سارے عالم کے لئے فرشتہ رحمت ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی علم موت وفنا کی طرف لے جارہا ہے سارے عالم کو بربادی ویرانی کی طرف ڈھکیل رہا ہے۔ خوشحالی وسلامتی ومسرت کے بجائے عالم میں بےچینی وانتشار ونفرت کا باعث بن رہا ہے تو وہ علم نہیں ہے۔ اُسے غلطی سے علم کا نام دیدیا گیا ہے۔

علم را برتن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

آج علم کی نمائش سرمایہ داری واشتراکیت کی معرکہ آرائی میں صرف ہورہی ہے۔ ساری دنیا دوحصوں میں تقسیم ہوگئی ہے کچھ سرمایہ داری کے حامی ہیں۔ کچھ اشتراکیت کے پرستار ہیں حالانکہ یہ دونوں نظریہ صحیح علم کے پھل نہیں ہیں۔ اشتراکیت فرد سے جائز آزادی واپس لے لیتی ہے۔ اوراس کے عوض میں روٹی کپڑا دینے کا وعدہ کرتی ہے اس نے ڈھونڈھورا پٹایا ہے کہ ہم قصیریت وسرمایہ داری کے جہنم سے نکال لائیں گے مگر اسے وہاں سے نکال کر ڈکٹیٹر شپ کے دوزخ میں ڈالدیا جاتا ہے اس سے پہلے قوی کمزور کو ستاتا تھا اور آج بہت سے کمزور ملکر دوسروں سے زندگی کا جائز حق چھیننے کے لئے متحد ہورہے ہیں۔

دولت مند سنگدل، بےمروّت وبےنیاز ہوگئے ہیں۔ اپنی اتھاہ دولت میں غریبوں کا کوئی حق نہیں سمجھتے۔

غریبوں کی مدد کرنا فضول سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آبادی دو حصوں میں تقسیم ہو رہی ہے۔ دولت مند۔ اور غریب حسد پیشہ زوال نعمت کے آرزومند۔ لیکن قرآن وسنت کا علم، امیر وغریب میں نزاع وکشمکش کے بجائے محبت واخلاص پیدا کرتا ہے۔ سرمایہ دار کو ایثار واتفاق و سخاوت وخیرات وصدقہ کی دعوت دیتا ہے اور غریب کو قناعت وتوکل وعزت نفس وجد وجہد کی تعلیم دیتا ہے۔

اسلامی علوم ایسا ذہن تعمیر کرتے ہیں جو زندگی میں تعاون اور سبقت کا خواہش مند ہوتا ہے۔ جسے رجعت پسندی اور جمود سے سخت انکار ہوتا ہے۔ وہ جسم وروح کی جو غذا تجویز کرتا ہے۔ اس سے انسان کو دنیا وآخرت دونوں جگہ اطمینان وسکون ومسرت کی دولت ملتی ہے۔

اسلامی علوم، اسلامی نظام ہر جگہ اور ہر عہد میں فطرت سے تعاون کا ذوق پیدا کرتے ہیں۔ اسلام نے اپنے آغاز سے آج تک علمی انکشافات کی ہمت افزائی کی ہے۔''

صنعت وحرفت زراعت وتجارت ہر ایک چیز میں تحسین وترقی ہو رہی ہے۔ علوم و فنون میں بھی بعض گوشوں میں غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ اسلام ان ترقیوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اسلام عالمی وآفاقی دین ہے۔ وہ کسی زمانہ یا ملک کا دین نہیں ہے، وہ ہر عہد کا دین ہے، وہ جمود کا دشمن ہے۔ حرکت وترقی کا داعی ہے، فطرت اپنے چہرے سے نقاب اٹھاتی جا رہی ہے۔ قوانین قدرت کا جیسے جیسے علم بڑھتا جا رہا ہے، اسلام کی دعوت ترقی وتکمیل کی اہمیت زیادہ سے زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ دور میں حیرت انگیز ترقیاں ہوئی ہیں لیکن اُسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ آج کے انسان نے کچھ کھویا بھی ہے۔ دینی مزاج اور دینی بصیرت کھوئی ہے۔ حقائق ومعارف سے وہ خدا پرستی ومآل اندیشی سیکھ سکتا تھا۔ لیکن آج علوم کی تعلیم اس طرح ہو رہی ہے کہ زندگی اطمینان وسکون سے محروم

ہوتی جارہی ہے۔محمد آل محمدؐ نے دنیا سے جہالت کے خاتمہ اورعلم ونظر کی فراوانی کے لئے بڑے خدمات انجام دیئے ہیں تعلیم وتربیت کی تاریخ میں ان کے کارنامے ہمیشہ انسانی شعورکوعلم وعمل،تقوی،صلاح،تعمیر وتنظیم کی دعوت دتیے رہیں گے۔

(کتاب العلم اصول کافی کلینی منتیہ المرید شہید ثانی شیخ زین الدّین نہج الادب مولانا محمد ہادی صاحب۔مرحوم سابق مدرس اعلیٰ جامعہ سلطانیہ لکھنؤ)

شیعوں کے بعض مشہور تعلیمی مرکز

رسالت مآب صلعم سے دنیا میں ایک نئے تعلیمی نظریہ کے دور کا آغاز ہوا تحصیل رضائے الٰہی تسخیر نفس تسخیر کائنات اورحقوق وفرائض عدل وانصاف ومساوات اور لامحدود ترقی کے مسائل پراس نظریہ تعلیم نے روشنی ڈالی۔رسولخدا کے فاضل شاگردوں میں حضرت علیؑ کی نظیر نہ تھی۔آپ نے قرآن وسنت فلسفۂ زندگی کوجس وسعت سے سمجھا اس کے اعتراف میں سرور انبیاء نے فرمایا میں علم کا شہرہوں اورعلیؑ اُس کا دروازہ ہیں۔جناب رسولخدا کی وفات کے بعد حضرت علیؑ نے تعلیم وتربیت اور تدوین علوم پر اپنی دلچسپی مرکوز کرلی۔تقریباً تاسیس علم نحو کی حضرت علیؑ کی طرف نسبت اجماعی ہے۔علامّہ ابن حجر نے اصابہ میں ازہری نے تہذیب اللغہ میں،ابن سیدہ نے محکم میں،ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں اس کا ذکرکیا ہے۔''

کوفہ کوحضرت علیؑ نے صرف سیاسی حیثیت سے دارالسلطنت نہیں بنایا بلکہ اُسے ثقافت دانش کا مرکزعظیم بنادیا آپ کے حلقۂ درس سے سینکڑوں رساذہن، روشن فکر، پاک دل وسیع النظر نکلے۔آپ کی وجہ سے کوفہ کی حیثیت ایک دارالعلوم کی ہوگئی تھی۔سینکڑوں نحوی،لغوی ومحدّث ومفسّر وفقیہ وادیب وشاعر پیدا ہوتے رہے۔ابوالاسود دوئلی،عبداللہ بن عباس وغیرہ اس مدرسہ کے ممتاز افراد ہیں۔

حضرت علیؑ کے بعد آپ کی اولاد اور شاگردوں نے علم کی اشاعت میں حصہ لیا۔

حضرت علیؑ کی شہادت اور امام حسنؑ وحسینؑ کے مدینہ واپس چلے آنے سے کوفہ کی وہ حیثیت تو نہ رہی لیکن حضرت علیؑ نے ذہن کے جو دریچے کھولدیئے تھے اس سے علم کی روشنی برابر پہونچتی رہی، کمیتؒ، دعبلؒ، جابرؒ وغیرہ نے اسی مدرسہ سے فیض پایا تھا۔

امام زین العابدین اور امام محمد باقر علیہما السلام نے حضرت علیؑ کی تحریک ترقی ثقافت کو کافی آگے بڑھایا امام جعفر صادقؑ کے عہد میں یہ تحریک معراج کمال تک پہونچ گئی، حضرت کو اپنے اسلاف واخلاف کی بہ نسبت کام کرنے کا کچھ موقع مل گیا۔ تھوڑی سی فرصت میں حضرت نے علم کی مختلف شاخوں کو برگ وبار سے پُر بہار بنادیا حسن بن علی وشاہ بجلی مسجد کوفہ کی طرف اشارہ کر کے کہتے تھے۔ میں نے اس مسجد میں نوسو (۹۰۰) شیخ پائے ہر ایک کہتا تھا حدثنی جعفر بن محمد الصادق، حافظ ابوالعباسؒ بن عقدہ ہمدانی کوفی نے صرف امام جعفر صادقؑ کے راویوں کے متعلق ایک کتاب ترتیب دی اور اس میں چار ہزار شیوخ کا ذکر کیا۔ غیبت کا پردہ گرنے کے پہلے ائمہ طاہرین مختلف ناسازگار ماحول میں علم ودین کی ممکن رہبری کرتے رہے۔ غیبت امام کے بعد علماء کی ذمّہ داریاں بہت بڑھ گئیں۔

اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اس ذمّہ داری کو بڑی شجاعت وشہامت سے انجام دیا۔"

مدرسۂ کوفہ ونجف اپنی زندگی تیسری ہجری تک قائم رکھ سکا۔ اُس کی عظمت کا اوج بادشاہ عضدالدولہ کے عہد میں کافی شاندار ہوگیا۔ ۳۷۱ھ میں عضدالدّولہ مشہد نجف میں آیا اور نجف کی مرکزیت سے متاثر ہوا۔ علویوں، مجاوروں، امام حسینؑ کے نوحہ گروں اور علماء کی اُس نے بڑی مدد کی۔ (فرحتہ الغری ابن طاؤس ۱۲۴)

علامّہ ابن طاؤس کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت نجف میں علماء کی اچھی

خاصی تعداد تھی ابو طالب بن احمد بن شہر یار عالم محدّث سے ابوجعفر طبری اور نجاشی صاحب رجال روایت کرتے ہیں۔ یہ شیخ طوسی کے پہلے مدرسۂ نجف میں کام کر چکے تھے۔

مدرسہ نجف کی تاسیس تقریباً ۵۰۲ھ میں داعی صغیر نے کی، دنیا کی دوسری پُرانی درسگاہیں اس کے بعد قائم ہوئیں۔ اٹلی کے مدرسہ بولونیا کی ۱۱۹ اء اور جامع ازہر مصر کی ۵۹۳ھ میں تعمیر ہوئی۔ عراق و ایران و ہند میں جو شیعہ علمی مرکز قائم ہوئے ان میں مدرسہ نجف کو ہمیشہ فوقیت رہی، اگر کسی عہد میں اس کی ساکھ جاتی رہی۔ تو پھر اس نے مناسب موقع پر اپنی حیثیت بنالی، مدرسہ نجف کے کارناموں کو اگر ہم تاریخی ادوار میں تقسیم کرنا چاہیں تو چار دور میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

دور اوّل

میں احمد بن عبداللہ غروی پیدا ہوئے جو ابان بن عثمان سے روایت کرتے تھے ابان امام جعفر صادق علیہ السلام کے مخصوص صحابی تھے۔ خود ان سے حسین بن سعید روایت کرتے ہیں۔ اسی دور میں شیخ فاضل محدّث صالح شرف الدین بن علی نجفی صاحب **کتاب آلایات الباهره فی فضل العترة الطاهره**، پیدا ہوئے (رجال مامغانی) اسی دور میں شیخ ابوطالب عبداللہ بن احمد بن شہر یار معاصر شیخ مفید پیدا ہوئے جن سے نجاشی اور ابوجعفر طبری روایت کرتے ہیں۔''

دور ثانی

شیخ الطائفہ ابو جعفر محمد بن حسن طوسی (۳۸۵ھ/ ۹۹۵ء، ۴۶۰ھ/۱۰۶۷ء)

۴۰۸ھ میں شیخ طوسی بغداد آ گئے تھے اور وہاں کے ناگوار حالات کی وجہ سے ۴۴۹ھ میں نجف اشرف آ گئے اور اجتہاد کا مدرسہ قائم فرمایا۔ حدیث وفقہ واُصول کی تعلیم دی اس مدرسہ کو اتنی ترقی دی کہ کچھ لوگ شیخ طوسی کو مدرسہ نجف کا بانی، لکھنے لگے۔ اگر بانی کا لفظ زیادہ ہو تو اس میں کوئی

شک نہیں کہ انھوں نے مدرسہ نجف کے نئے دور کا آغاز فرمایا، اس دور میں اس مدرسہ سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے، شیخ عبداللہ محمد بن شہریار (داماد شیخ طوسی) سید رضی الدین محمد آوی نجفی، شیخ ابوعلی بن طوسی ۴۶۰ھ میں شیخ طوسی کی وفات ہوگئی۔ ان کے بعد ان کے فرزند ابوعلی طوسی نے مدرسہ کو سنبھالا۔

حلّہ

ساتویں صدی ہجری میں نجف کے بجائے حلّہ کو علمی مرکزیت حاصل ہوگئی۔ رئیس العلماء شیخ الفقہا فقیہ الحکما وارث علوم ائمہ معصومین شیخ الاسلام والمسلمین فقیہ اکبر قائد اعظم شیخ الطائفہ امام ابوالقاسم نجم الدین محقق حلی ایسا عظیم انسان حلہ میں پیدا ہوگیا جو علم وفضل وفقہ، جلالت وتحقیق وفصاحت وشعروادب وانشاء تمام علوم انسانی ودینی وعقلی میں یکتائے روزگار تھا۔ شرائع الاسلام ومختصر نافع ومعتبر وشرح نکت النہایۃ ومسائل غریہ ومسائل مصریہ والمسلک فی اصول الدین، والمعارج فی اصول الفقہ والکہنہ فی المنطق ونہج الوصول الیٰ معرفتہ الاصول وغیرہ جن کے زندہ جاوید کارنامے ہیں۔

شرائع الاسلام نے تو وہ غیر معمولی مقبولیت حاصل کی کہ درس ومطالعہ وشروح و تعلیقات میں بیشمار علماء کی زندگیاں اسکی نذر ہوگئیں۔ محقق حلی کے ہمہ گیری اور فقہ میں حیرت انگیز مہارت اور علوم عربی اور اسلامیات میں بے نظیر نگاہ نے تمام شیعوں کا ان کو مرکز بنا دیا۔ ان کے کمالات اور درس وتصنیف نے حلہ کو کعبہ علم بنا دیا۔ نجف کی مرکزیت ادھر منتقل ہوگئی ۶۷۶ھ میں محقق کا انتقال ہوگیا۔ اگرچہ محقق کی وفات ہوگئی۔ لیکن حلہ کی خوش قسمتی تھی کہ ان کی جگہ پر ان کے فرزند ارجمند فخر الدین وفخر المحققین علامہ ابو طالب محمد بن حسن بن یوسف بن مطہر حلی

ایسے جلیل القدر عظیم المرتبت رفیع الشان کثیر العلم جید التصانیف بزرگ مسند آرا ہو گئے کہ حلہ کی علمی رونق میں کوئی کمی نہیں آئی حلہ کی مرکزیت فخر المحققین کی وفات ۷۷۱ھ تک رہی۔

حلہ کی مرکزیت اور نجف کے اس درمیانی سکون کے باوجود مدرسہ نجف کا علمی سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ نجم الائمہ محمد بن حسن استر آبادی عالم محقق شارح کافیہ وشافیہ وقصائد سبع علویات ابن ابی الحدید معتزلی اسی زمانہ فرقت میں پیدا ہوئے کافیہ شرح رضی کے متعلق علامہ سیوطی شافعیؒ مصری نے لکھا ہے۔

لم یوسف علی (الکافیه) بل ولافی کتب النحو مثله جمعاد تحقیتاً (لغبیه الوعاة ص ۲۴۸)

۶۸۳ھ میں موصوف نے کافیہ کی یہ مشہور ومعروف شرح لکھی۔ فخر المحققین کی وفات کے بعد پھر نجف کو پہلی سی علمی مرکزیت حاصل ہوگئی۔

جلائری وایلخانی سلاطین نجف کی علمی مرکزیت میں دلچسپی لیتے رہے۔ یوں ہی سلاطین کی طرح ان لوگوں نے بھی نجف میں مسجدوں اور مدرسوں کی تعمیر کی۔

مشہور سیّاح ابن بطوطہ (ابوعبداللہ محمد بن محمد بن عبداللہ طنجی ۷۷۹ھ نے ۷۲۷ھ نجف کی زیارت کی تھی وہ اس وقت یہاں کے مدارس کی عظمت سے متاثر ہوا وہاں کے علماء وفضلاء سے اس کی ملاقاتیں رہیں۔ (تحفۃ النظارق غرائب الامصار ۱۰۹)

جلائری اور ایلخانی عہد میں شیخ کمال الدین عبدالرحمن محمد بن ابراھیم عتایقی حلی (ابن عتایقی) نجفی پیدا ہوئے یہ بڑے عالم محقق تھے۔ طبقہ شہید اوّل کے معاصر تھے۔ انھوں نے نہج البلاغہ کی چار شرحوں (شرح ابن میثم۔ شرح قطب کیدری شرح قاضی عبدالجبار امامی۔ شرح ابن ابی الحدید معتزلی) سے اپنی ایک شرح تیار کی شرح ۷۸۰ھ میں ختم ہوئی ہندسہ وطب

وغیرہ میں کتابیں لکھیں۔اسی زمانہ میں شیخ ابوعبداللہ فاضل مقداد سیوری ۸۲۶ھ میں صاحب کتاب شرح باب حادی عشر پیدا ہوئے ایک مدرسہ آپ نے بھی قائم کیا تھا۔

تیسرا دور

یہ دور عالم ربانی فقیہ صمدانی ملا احمد بن محمد مقدس اردبیلی نجفی م ۹۹۳ھ سے شروع ہوتا ہے۔مقدس اردبیلی فقہ وکلام میں فرد تھے ان کا تقدس آج تک ضرب المثل ہے۔شرح ارشاد وحدیقۃ الشیعہ وغیرہ ان کی کتابیں مشہور ومعروف ہیں۔موصوف نے نجف کی علمی زندگی میں تازہ جان ڈال دی۔صفوی حکومت ان کی قدرداں تھی۔ان کے زیر اثر مدرسے تعمیر ہوئے۔ مسجدیں بنیں۔تعلیم وتربیت میں ان کا بڑا مقام ہے۔جب کوئی پیچیدہ علمی مسئلہ حل کرتے تو عالم وجد میں فرماتے یہ لذت سلاطین وامرا کو کہاں نصیب۔ان کے حلقہ درس سے بڑے نامور علماء نکلے۔ابومنصور جمال الدین شیخ المشائخ حسن بن زین الدین شہید ثانی صاحب معالم الاصول ان کے شاگرد تھے۔اصول فقہ حدیث ورجال میں جن کی عظمت آج تک دلوں پر باقی ہے۔علامہ سید محمد عاملی صاحب کتاب مدارک الاحکام اور شیخ ملا عبداللہ نجفی۔صاحب کتاب الحاشیہ فی المنطق بھی آپ کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔گیارہویں صدی ہجری کے آخر میں صفوی حکومت اور عثمانی حکومت میں تصادم ہوگیا۔عراق پر عثمانیوں کا قبضہ ہوگیا۔اس زمانہ میں نجف کی علمی ترقی میں ٹھہراؤ پیدا ہوگیا۔لیکن اس عہد میں بھی علماء پیدا ہوتے رہے۔عالم فاضل محدث فقیہہ شاعر۔

فخر الدین بن محمد بن علی بن احمد بن طریح نجفی ریاحی م ۱۰۸۵ھ اسی عہد کے نامور عالم ہیں جن کی کتاب مجمع البحرین لغت قرآن وحدیث میں برابر ہمارے کام آتی ہے اور ذاکرین جن کی کتاب المنتخب فی جمع المراثی والخطب سے خوب واقف ہیں تمیز مشترکات

میں جن کی جامع المقال فی تمیز المشتر کہ من الرجال پہلی کتاب ہے۔ان کے علاوہ کافی علم و دین و ادب کی خدمت موصوف نے کی ۔شیخ بہائی صاحب کشکول، علامہ مجلسی صاحب بحارالانواراور محقق کرالی نے عرصہ تک نجف میں تحصیل کی ۔

بارہویں صدی ہجری کے اوائل میں شیخ عاملی نجفی ۱۱۳۸ھ صاحب تفسیر مرأۃ الانوار، شیخ احمد جزائری نجفی ۱۱۵۱ھ صاحب آیات الاحکام ۔شیخ حسین بن عباس بلاغی صاحب تنقیح المقال فی علم الرجال اسی عہد میں پیدا ہوئے ۔

چوتھا دور

حضرت علامہ سید مہدی بن سید مرتضیٰ طباطبائی ۱۲۱۲ھ سے شروع ہوتا ہے۔اس عہد میں بڑے بڑے عالم پیدا ہوئے نجف میں تقریباً دس ہزار طلبہ اس وقت اکتساب کررہے تھے۔ اس دور میں شیخ اکبر شیخ الفقہا حجۃ الاسلام فقیہہ اہلبیت صاحب کشف الغطا جعفر بن خضر جناحی نجفی پیدا ہوئے ۔علم وفضل و ذہن رسا و اطلاع وسیع میں یہ آیت الٰہی تھے۔کشف الغطا ایسی حیرت انگیز کتاب علم واطلاع اور حافظہ کی مدد سے لکھا ہے۔ یہ کتاب سفر میں تالیف کی اس وقت موصوف کے پاس صرف ’’قواعد علامہ‘‘ تھی ۔موصوف کی فقہی یادداشت اور احاطہ نظر اور ملکہ فقہی کی یہ حالت تھی کہ خود ہی فرماتے تھے کہ (خدانخواستہ) اگر تمام فقہی کتابیں ضائع ہوجائیں تو میں اپنی یاد داشت سے طہارت سے دیانت تک کتاب تیار کردوں گا۔ شیخ العراقین شیخ عبدالحسین نے اپنے استاد صاحب جواہر الکلام سے کہا آپ نے کشف الغطا شیخ جعفر کی شرح کیوں نہ کی ۔اس کتاب میں دشوار مطالب ہیں ۔مشکل عبارتیں ہیں وہ آپ کے استاد بھی تھے۔ مرحوم نے فرمایا۔ مجھے قدرت نہ تھی کہ اس کتاب کے مدارک فروع کا استنباط کرتا اس میں بہت سے مقامات میں اوکذا اوکذا وہکذا ہے۔

ان کے حل کرنے میں بڑی محنت شاقہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

شیخ جعفر غریب نواز متواضع عابد و عارف تھے اپنے زمانے پر اپنے علمی روحانی کمالات کا موصوف نے بہت اثر ڈالا ۱۲۰۸ھ میں وفات ہوئی۔

اسی عہد میں محقق فقیہ جواد بن محمد حسنی حسینی عاملی غروی پیدا ہوئے۔ محقق بہبہانی و علامہ طباطبائی کے مائدہ علم پر سیراب ہوئے۔ قواعد علامہ کی شرح مفتاح الکرامہ کئی جلدوں میں تحریر فرمائی۔ یہ جلیل القدر کتاب بیروت میں شائع ہوگئی ہے تقریباً ۱۲۲۶ھ میں وفات ہوئی۔ اسی زمانہ میں عظیم فقیہ امام شیخ محمد حسن بن شیخ باقر نجفی پیدا ہوئے موصوف اسی عہد کے علماء کے عربی اور پدر روحانی تھے۔ موصوف نے جواہر الکلام لکھ کر فقیہوں پر ایسا عظیم احسان کیا ہے۔ جس کے بارسے ان کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں ۱۲۶۶ھ میں وفات ہوئی۔

اسی زمانے میں فخر الشیعہ اصولی عظیم شیخ مرتضیٰ انصاری ابن محمد امین تستری نجفی م ۱۲۸۱ھ سید کاظم یزدی صاحب عروہ وثقی مرزا نائنی وغیرہ بڑے بااثر و صاحب علم حضرات پیدا ہوئے

حکومت کی توجہ، علماء کی کوشش دولت مندوں کی فیاضی سے مدرسے تعمیر ہوئے۔ نجف کے علاوہ۔ دوسرے مقامات پر بھی مدرسے قائم ہوتے رہے مگر مدرسہ نجف کے مقابلہ میں کوئی نہ آسکا۔ نجف کی مرکزیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کربلائے معلیٰ کے مدرسے سے استاد اکبر مروج مذہب محقق ثالث علامہ ثانی شیخ المشائخ محمد باقر بن محمد اکمل بہبہانی م ۱۲۰۸ھ اور شیخ یوسف بن احمد بن ابراہیم بحرانی م ۱۱۸۴ھ شیخ محمد حسین بن عبد الرحیم طہرانی حائری ۱۲۶۱ھ صاحب الفصول فی الاصول وغیرہ پیدا ہوئے اور اپنے عہد پر اپنی عظمت وجلالت کی مہر ثبت کر گئے۔

کاظمیہ میں بھی مدرسہ قائم ہوا آل یٓسین اور آل صدر نے اس کی ترقی میں حصہ لیا۔ عظیم رہنما مرزا محمد حسن شیرازی ۱۳۱۲ھ نے سامرہ میں مدرسہ قائم کیا۔ قم میں شیخ عبدالکریم حائری

یزدی نے مدرسہ قائم کیا۔ ان مدرسوں نے بھی بڑے بڑے محقق و عالم پیدا کئے لیکن نجف کا علمی فیض بھی جاری رہا۔

تمام علمی مرکزوں میں علماء کی حیثیت صرف درسی کتابوں کے مدرس ہی کی نہ تھی بلکہ وہ قوم کی قیادت بھی کرتے۔ وہابیوں نے جب عراق پر حملہ کیا تو علماء نے ان کا مقابلہ کیا۔ عراق کی آزادی علماء کے جہاد حریت کا شاندار کارنامہ ہے۔ اخوند صاحب کفایہ سید ابوالقاسم کاشانی سید محمد سعید جنوبی و خالصی کبیر و علامہ جزائری و مصلح شہرستانی نے مجلس درس کے باہر بھی قوم کی (بہترین) طریقے سے رہنمائی کی۔

مرزا محمد حسین شیرازی کا فتویٰ

نجف، کوفہ، بصرہ، بغداد، جبل عامل وحلہ، قم وغیرہ میں شیعوں کے مدرسوں نے بڑے جاندار کام کئے ہیں۔ ہندوستان ان سب مقامات کا رہین منت ہے اس نے ان سب کے بوستان علم و فضل سے خوشہ چینی کی ہے۔

شیعہ زعما کے ثقافتی و تعلیمی ذہن کا
ایشیا اور مسلم ممالک کی فکری و سیاسی آزادی میں حصہ

مختلف دور میں ایسے مفکر پیدا ہوتے رہے ہیں جن کی غیر معمولی صلاحیتوں نے سیاست ثقافت تعلیم و تربیت کو شدّت سے متاثر کیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ مسلم ممالک میں ان کے افکار و کردار سے رفعت فکر و عمل میں مدد ملی ہے بلکہ اکثر دنیائے انسانیت کے سوچنے کے ڈھنگ میں تبدیلی ہوئی ہے۔ سید جمال الدین اسد آبادی (۱۲۵۴ھ۔۱۸۹۷ھ) جو بعض سیاسی مصالح کی بناء پر افغانی مشہور ہوئے حقیقتہ وہ ایرانی تھے عراق کے شیخ اجل اعظم اعلم خاتم الفقہا

و المجتہدین اکمل الربانین فخر علماء راسخین فخر الشیعہ الحاج شیخ مرتضیٰ انصاری (۱۲۱۶ء-۱۲۸۱ء) کے شاگرد رشید تھے عرصہ تک عراق میں شیعہ علماء سے اکتساب فیض کرتے رہے وہ ایک عظیم مفکر تھے ان کے نظریہ کا تعلق بین الاقوامی سیاست سے تھا۔ ان کی تحریک کا اثر ساری دنیا کی سیاست پر پڑا۔ موصوف استقلال وثبات جد و جہد کے مرد آہن تھے۔ انڈلف چرچل کے خیال میں وہ صاف گو، صاف باطن، اور صائب الرائے تھے۔

ارنسٹ دنیان نے لکھا ہے:

سید جمال الدین ایک محیر العقول ہستی تھے وہ ایک طوفان کی طرح عالم پر چھا گئے۔

براؤن کا خیال ہے:

وہ بڑے سے بڑے خطرہ کا مقابلہ ایک جری و شجیع کی طرح کرتے۔ حلیم الطبع، خوش اخلاق صاف گو شریف زبان تھے مشاہیر الشرق کے مصنف جرجی زیدان مسیحی مصری کا خیال ہے۔

''مشرق کے لئے وہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھے۔ مشرق نے ان کی ذات سے بہت فائدہ اٹھایا اور آیندہ بھی اٹھاتا رہے گا۔''

سید جمال الدین نے مصر و ترک، ایران وافغان و ہندوستان وغیرہ میں تعلیم کے مسئلہ پر قابل فخر کام کیا ہے۔ مسلمان تعلیم میں کبھی اقوام عالم کے رہبر تھے لیکن کچھ عرصہ سے وہ اقوام عالم سے بہت پیچھے ہو گئے۔

تنگ نظری و تعصب نے دل و دماغ سے قوت تخلیق وابداع وانکشافات سلب کر لی تھی۔

علوم عقلی کو ''شجرۂ ممنوعہ کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا تھا۔ سید جمال الدین نے پورے عالم اسلامی کو مسئلہ تعلیم پر غور وخوض اور مناسب تبدیلی کی دعوت دی۔ رفتہ رفتہ ذہن تبدیلی کے لئے آمادہ ہوتے رہے۔ آج مسلم ممالک میں اگر کہیں فکری آزادی اور عقلی علوم کے مطالعہ میں

دلچسپی پائی جاتی ہے تو یہ سید جمال الدین کے خواب کی ایک تعبیر ہے۔

انور معظم صاحب کے الفاظ میں سید جمال الدین کا تعلیمی نصب العین حسب ذیل تھا۔

جمال الدین تعلیمی نظام کے لئے ایک مقصد سامنے رکھتے تھے۔ وہ یہ کہ شخص کو قوم کا ایک جُز سمجھا جائے۔ اور اس کی تعلیم وتربیت اس طرح کی جائے کہ وہ قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر مقدم سمجھے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر جمال الدین انیسویں صدی کے مسلمانوں کی حالت کے مطابق ان کی تعلیم کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جمال الدین کے تعلیمی تصورات میں ہم ایک ایسے مصلح کی جھلک دیکھتے ہیں۔ جس نے پہلی بار مسلمانان عالم کو جدید سائنسی تعلیم کی شدید ضرورت کی توجہ دلائی۔ ان کے تعلیمی نصاب میں علوم اسلامیہ کے ساتھ کیمیا، طبعیات نباتات، ریاضی، علم ہندسہ وغیرہ پر بھی پورا پورا زور دیا گیا ہے۔

جمال الدین ان قدامت پرست اور دینی و مذہبی علماء میں سے نہیں جو قومی احیا کے لئے صرف عقاید کی درستی یا عبادت کی پابندی کی تلقین ہی سب کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ جمال الدین جس قدر دیندار ہیں اس قدر دنیادار بھی ہیں۔ وہ تمام تہذیبی کمالات اور معاشی خوشحالی سے مستفید ہونا چاہتے ہیں۔ دنیا کی راحتوں سے پوری طرح لذت پانے والے مادہ پرست کی طرح وہ کہتے ہیں۔

معیشت میں کمال اور زندگی میں رفاہیت کمال عقل ونفس کے لئے شرط اعظم ہے۔

یہی اوّلین سبب ہے انسان کی حرکات عقلیہ کا اور اُسے دائرہ حیوانات سے باہر نکالنے کا یہی بزرگ ترین موجب ہے قبائل کا اور امم کا بدویّت ووحشت کی حالت سے تہذیب وتمدن کی طرف انتقال کا یہی علت اوّل ہے۔ معارف کے انتشار اور علوم کی ایجاد، صنائع کے اختراع اور حرفت کے ابداع کا فوائد فلسفہ مقالات جمالیہ دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

مختلف علوم انھیں تہذیبی ضرورتوں کی تکمیل کے ذرائع ہیں۔ان علوم میں فلسفے نے جمال الدین کو بہت زیادہ متاثر کیا۔وہ لکھتے ہیں:۔فلسفے کے ذریعہ اخلاق فاضلہ اور محرکات رذیلہ میں تمیز کی جاسکتی ہے۔تاکہ اوّل الذکر سے اپنے آپ کو زینت دے اور موخرالذکر سے اپنے آپ کو بچا کر نفسیاتی کمال حاصل کیا جاسکے۔ (فوائد فلسفہ مقالات جمالیہ)

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

اگر کوئی علم بالکل متفرد ہو تو اس میں نہ ترقی کی جاسکتی ہے نہ پائداری۔اس لئے کسی ایک علم کو تمام علوم کی روح اور جامع ہونا چاہئے۔تاکہ ان کے وجود کی پاسبانی کر سکے۔

ہر علم کو اپنے کام پر لگائے اور ہر علم کی ترقی کا سبب بنے۔

وہ علم جو روح جامع،قوی محافظ ہو اور دوسروں کو باقی رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ فلسفہ ہے۔کیونکہ اس کا موضوع بحث عام ہے۔فلسفہ انسان پر فرائض انسان واضح کرتا ہے۔علوم کی ضرورت آشکارا کرتا ہے۔ہر علم کو اپنے مقصد پر لگاتا ہے۔

(لکچر در تعلیم وتعلم۔مقالات جمالیہ)

نہ صرف انفرادی طور پر فلسفے کا مطالعہ ضروری ہے بلکہ پوری تعلیم میں ایک فلسفی روح جاری و ساری رہنی چاہیے۔اگر کسی قوم میں حقیقی فلسفی روح پیدا ہوجائے چاہے اس قوم میں علوم کا پتہ بھی نہ ہو جس کے موضوع خاص ہیں بے شبہ یہی فلسفی روح ان تمام دوسرے علوم کے حاصل کرنے کی دعوت دیگی۔

محض علوم کا حصول کسی قوم کے لئے مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔تاوقتیکہ ان علوم کو قومی اصلاح کے لئے استعمال نہ کیا جائے اگر یہ احساس جسے وہ فلسفیانہ روح سے تعبیر کرتے ہیں موجود نہ ہو یا اس میں کمی یا کسی قسم کا نقص پیدا ہوجاتے تو پھر وہ قدرے مشترک غائب ہوجائے گی جس سے علم

کی بنیادیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔

سید صاحب کی نظر میں اسلامی ممالک کے تعلیمی نظام کے غیر موثر ہونے کا سب سے بڑا سبب فلسفے کی تعلیم کا فقدان ہے۔

وہ اس وقت (انیسویں صدی کے وسط) کے اسلامی تعلیم نظام پر تنقید کرتے ہیں۔

دولت عثمانیہ اور دولت خدیو مصر نے سات سال ہوئے علوم جدیدہ کی تعلیم کے لئے مدرسہ کھول رکھے ہیں۔لیکن اب تک ان علوم سے کوئی خاص فائدہ نہ اٹھا سکے۔

وجہ یہ ہے کہ ان مدرسوں میں علوم فلسفہ کی تعلیم نہیں ہوتی۔اگر ان مدارس میں روح فلسفہ موجود ہوتی تو وہ اس سات سال میں بلاد یورپ سے مستغنی ہوجاتے۔

علم کے بل پر اپنے ممالک کی اصلاح کرتے۔ہر سال اپنی اولاد یورپین ممالک نہ بھیجتے۔ اور اپنے مدارس کے لئے وہاں سے استاد نہ طلب کرتے۔

تجدیدیت کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے سید صاحب نے سب سے پہلے مسلمانوں کے نظام تعلیم کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔اور اس کی بنیادی کمزوری کو پہچانا۔اس میں شک نہیں ہے کہ اس سے سید صاحب کی مراد یہ تھی کہ عالم اسلام میں جدید علوم کی طرف توجہ کے لئے با قاعدہ تحریک چلائی جائے اور منظم طور پر اس کا کام آگے بڑھایا جائے مغربی ملکوں کے محض محتاج بن کر رہنے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔حصول تعلیم کے لئے بھی ہر ملک کو خود مکتفی ہونے کی ضرورت ہے۔ (رسالہ سویرا لاہور)

جس زمانے میں مولانا سید جمال الدین نے اسلامی ممالک اور ایشیاء کے مسائل سے دلچسپی لی تنگ نظر فقہا نے علوم عقلی کو حرام قرار دیا تھا۔ازہر یونیورسٹی اور دوسری درسگاہوں میں علوم عقلی کی تعلیم ممنوع تھی۔منطق وفلسفہ وکلام کی تعلیم کی اجازت نہ تھی۔سید جمال الدین نے

نصاب تعلیم کی اصلاح کی۔ ایشیا اور ممالک اسلامی میں تعلیم کو زندہ و کارآمد بنانے کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ اسلامی ممالک میں فقہا مصر و ترکیہ میں علوم عقلی سے دلچسپی سید جمال الدین کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے نصاب تعلیم میں وسعت پیدا کی۔ تمدنی علوم کو اس میں شامل کیا اور مسلمان مذہبی تعلیم یافتہ طبقہ کو دوسرے تمدنی علوم کے ماہرین کی صف میں کھڑا کرنے کے داعی بنے۔

غیر منقسم ہندوستان میں تشیع اور اسلامی تعلیم

متحدہ ہند سے شیعوں کے ذہنی و نسلی و تاریخی تعلقات

متحدہ ہندوستان (آج کا پاکستان اور بھارت) عرصہ سے آل محمدؐ کے طرز فکر سے آشنا ہے۔ ۹۳ھ میں سندھ میں تشیع کی تخم کاری ہو چکی تھی۔ شنشبؑ" کی عقیدت حضرت علیؑ کی محبت سے سر شار تھی۔ سرحدی مقامات پر ان کی حکومت تھی۔ شنشبؑ پہلے بدھ دھرم کے ماننے والے تھے بدھ دھرم ایک اصلاحی مذہب تھا۔ طبقاتی امتیاز کا مخالف تھا۔ حضرت علیؑ کے ذہن و کردار اور نظریہ زندگی نے ان کے دل پر قبضہ کر لیا۔ وہ اسلام اور تشیع کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

امیر المومنینؑ نے ان کو ان کے وطن کی حکومت پر باقی رکھا۔ شنشب کے قلمرو میں اہلبیت سے عقیدت میں گرمجوشی رہی جب اموی حکومت اور اسکی نو آبادی کے تمام منبروں پر حضرت علیؑ کو بُرا کہا جا رہا تھا شنشبؑ کی حکومت میں حضرت علیؑ کا ذکر خیر ہو رہا تھا۔

(طبقات ناصری)

ہندوستان کی جاٹ (زط) قوم کاروباری ضرورتوں سے عراق کی سرزمین تک پہونچ گئی تھی۔ امیر المومنینؑ کے غیر معمولی کارناموں سے واقف ہوئے۔ حضرت کی شجاعت، علم،

رحم دلی، خدا پرستی انسان دوستی سے یہ لوگ متاثر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔ جنگ جمل کے موقع پر امیرالمومنینؑ نے جب بصرہ فتح کیا تو جاٹوں کے ایک دستہ کو بصرے کے خزانے کا محافظ بنایا۔''

ان تمام ذرائع کا اگر جائزہ لیا جائے کہ متحد ہندوستان تشیع سے کس طرح واقف ہوا اور اس نے تشیع سے کیا کیا تو بہت سی کارآمد باتیں علم میں آئیں۔

آئمہ طاہرین اور شیعوں کے تعلقات زندگی کے مختلف گوشوں میں پھیلے۔ امام زین العابدینؑ کی ایک بیوی سندھی تھیں۔ جن کے بطن سے زید شہید ہوئے۔ (معارف بن قتیبہ)

حضرت زید کے مددگاروں میں سندھ کے عقیدتمند زیاد ہندی بھی تھے۔ ان کو بھی حضرت زید کے ساتھ سولی دی گئ۔

(مقاتل الطالبین)

آل محمد اور شیعہ اہلبیت جب اموی عباسی قلمرو میں جان کا خطرہ محسوس کرتے تھے تو ہندوستان میں پناہ گزیں ہوجاتے تھے۔ یہاں کے باشندوں نے ان کو پناہ دے کر اپنی جانیں خطرے میں ڈالدیں۔

تقریباً ۱۴۵ھ میں عبداللہ اشتر بن محمد بن عبداللہ حسنی جلاوطن ہو کر سندھ آئے۔ عبداللہ کے بیٹے محمد کو ایک ہندو راجہ نے پناہ دی۔ اس زمانے میں عباسی حکومت سے بنی حسن کے اختلافات انتہائی منزل پر پہونچے ہوئے تھے۔ منصور عباسی نے سندھ کے گورنر ہشام بن عمرو کو ایک دستہ فوج کے ساتھ مامور کیا کہ راجہ کی سرزنش کرے۔ گورنر نے راجہ کو قتل کر کے اس کی ریاست ضبط کر لی۔ (تاریخ کامل۔۲۳)

قاسم بن ابراہیم حسن ملتان میں پناہ گزیں ہوئے۔

(النزاع والتخاصم مقریزی)

''محمد اطرف'' حجاز سے جلا وطن ہو کر پناہ گزین کی حیثیت سے ملتان میں آئے۔ یہ ان کی قابلیت اور سیاسی صلاحیت تھی کہ ملتان نے ان کو اپنی حکومت کا سر براہ بنالیا۔ (عمدۃ الطالب)

صرف یہی نہیں کہ عراق وحجاز وایران سے سادات وشیعہ برابر ہندوستان آتے رہے بلکہ ہندوستان کے ہندو علماء بھی عرب کی علمی سیاحت میں ائمہ اہلبیت سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ بلکہ بعض تو ان کے ایسے عقیدتمند ہو گئے کہ اپنے مذہبی نقطہ نظر کو بدل کر ائمہ کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے اور فن حدیث میں اپنی خدمات چھوڑ گئے۔ بنراز طلحہ بن زید ابوالنحر اج ہندی میں فرح سندھی، خلاد سندی ابان بن محمد بجلی سندھی امام جعفر صادق کے شاگردوں میں تھے صباح بن نصر ہندی امام رضا علیہ السلام کے مسائل کی تبلیغ کرتے تھے۔

ہندوستان طب وہیئت وفلسفہ میں اس عہد میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ ایک ہندوستانی طبیب جو ویدانت کے بھی ماہر تھے امام علیہ السلام کے علم وفضل کے اتنے قائل ہو گئے کہ مسلمان ہو کر امام سے استفادہ میں مشغول ہو گئے (کتاب الاہلیلج، بحار مجلسی) امام جعفر صادق نے فرمایا چارستارے ہیں (سبعہ سیارہ کے علاوہ) جن کو کوئی نہیں جانتا سوان چارستاروں میں سے ایک کو ہندوستان میں ایک گھرانا بھی جانتا ہے۔

تیسری صدی تک ہندوستان تشیع سے مانوس ہو چکا تھا۔

(احسن التقاسیم مقدسی)

برابر عراق وحجاز وایران سے شیعہ ہندوستان کا رخ کرتے رہے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت و علم وفضل سے اس ملک کی خدمت کرتے رہے۔ کچھ ان کی نسل ملک میں پھیلی۔ اور کچھ یہاں کے قدیم باشندوں نے شیعہ مذہب قبول کیا اس طرح رفتہ رفتہ ملک شیعہ تہذیب وثقافت سے واقف ہوتا رہا۔ چھٹی صدی ہجری میں پیر پرواز ملا محمد علی (مدفون کھمبات) نے گجرات کے ہندو

تاجروں میں تبلیغ کی اور وہ شیعہ ہو گئے۔ بوہرے پہلے ہندو مسلک پر تھے، تجارت پیشہ تھے ملا محمد علی کی تبلیغ سے شیعہ ہو گئے۔ تبلیغ اور خدمت خلق کا جذبہ شیعوں میں ایسا سچا تھا کہ وہ ملک کے ہر طبقہ کو متاثر کرتا تھا۔ بے غرض خدمت امیر وغریب شاہ و گداسب کے دلوں میں جگہ بنا لیتی ہے جہاں گجرات کے تجارت پیشہ بوہرے شیعہ ہوئے وہاں گجرات کا راجہ سدھ راؤ جے سنگھ شیعہ مذہب پر ایسا فریفتہ ہوا کہ اس نے پُرانا مذہب چھوڑ کر شیعہ مذہب اختیار کر لیا۔

تشیع کی اس قدر ہر دلعزیزی و مقبولیت کو دیکھ کر دوسرے حلقۂ فکر کے بعض متعصب وسنگدل مسلمان تشیع کے دھارے پر بند باندھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس لئے جب حالات ناگوار ہو جاتے تھے تو یہ دھارا کبھی سست ہو جاتا تھا لیکن ذرا سا موقع مل جاتا تو پھر دھارے کے بہاؤ میں قوت پیدا ہو جاتی مبلغ ناگوار وخوشگوار حالات کے مطابق اپنے تبلیغی پروگرام بناتے رہے اور روز بروز ملک سے ان کے ذہنی رشتے مستحکم ہوتے رہے۔ اس گوشے پر بہت کم لکھا گیا ہے اور عراقی و ایرانی علماء کا حصہ ہندوستان کی تہذیب کے پروان چڑھانے میں نظر انداز ہوتا رہا ہے اس لئے سرسری طور پر چند نام لئے جاتے ہیں۔

میر فضل اللہ انجو صدر شیرازی مقتول ۸۲۲ھ شیراز کے عظیم المرتبت سادات انجویہ کی نمایاں فرد تھے ملا سعد الدین مسعود بن عمر بن عبداللہ ہروی شافعیؒ خراسانی م ۷۹۲ھ کے شاگرد رشید تھے۔ آپ نے تشیع کی بڑی خدمت کی ہندوستانی کو آپ کے فیض سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا۔ سلطان شمس الدین بہمنی نے ۷۹۹ھ میں اپنے بھتیجوں (فیروز خاں، احمد خاں) کا اتالیق مقرر کیا۔ (تاریخ فرشتہ مترجم ۱/۴۳۴) فیروز شاہ کی استعداد علمی آپ کے فیض تربیت سے بہت وسیع ہو گئی۔ فیروز شاہ، شعر وادب وتفسیر واُصول حکمت طبعی کا ماہر تھا۔ ہر چہار شنبہ کو زاہدی وشرح تذکرہ وشرح مقاصد وتحریر، اقلیدس ومطول وغیرہ کا درس دیا کرتا تھا۔ عالم تھا اور علم دوست تھا۔

اس نے اپنے عہد کو علماء کے وجود سے آراستہ کر رکھا تھا۔ دوسرے ممالک سے علم فن کے ماہروں کو دعوت دیتا تھا۔ مولانا لطف اللہ سبزواری، حکیم حسن گیلانی وغیرہ اسی عہد میں بلائے گئے۔

ملک کے گوشے گوشے میں مختلف اوقات میں باہر سے آنے والے مبلغ وعلماء شیعہ نے مذہب کی روشنی پہونچائی ۹۰۳ھ میں میر شہداد نے ملتان میں تشیع کی تخم کاری کی (مراۃ العالم بختاور خاں) سید راجو بن سید حامد بخاری نے علانیہ تشیع کی تبلیغ شروع کی۔

۱۴۹۳ء میں سلطان حسین مرزا والی خراسان کی طرف سے میر شمس الدین عراقی سفیر بن کر کشمیر آئے۔ میر صاحب کا آٹھ سال تک کشمیر میں قیام رہا۔ میر صاحب بظاہر بابا اسمعیل کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔ مگر در پردہ شیعہ عقائد سے متاثر کرتے رہے آخر بابا علی نجار کو اپنا معتقد اور شیعہ عقائد کا پیرو بنالیا۔ اس سے پہلے بھی کشمیر میں شیعہ موجود تھا لیکن گوشہ گمنامی میں تھا۔ ۱۴۹۵ء میں میر صاحب خراسان چلے گئے۔ سلطان حسن مرزا سے بعض اختلافات کی وجہ سے پھر ۸۹۸ھ ۹۰۷ھ کے درمیان کشمیر آئے۔ بابا علی نجار کا ان کو تعاون حاصل رہا اور تشیع کا جی چک اور ملک موسیٰ ابنہ میں پھیل گیا۔ شمس چک کی وزارت ۱۵۰۱ء سے خاندان چک کی سلطنت کے خاتمے تک کشمیر میں شیعہ برسر اقتدار رہے۔ رکن میں فضلاء شیعہ کا دار التبلیغ بنا ہوا تھا۔ عراق۔ حجاز۔ یمن ایرانی شیعہ وہاں آتے اور تشیع کے رسوخ کے سلسلے میں اپنے خدمات انجام دیتے۔

مولانا شاہ محمد طاہر بن مہدی کنی کی تشریف آوری بھی ملک کی ذہنی وتعلیمی ترقی میں بڑی مددگار ہوئی۔ موصوف اسلامی علوم وفنون کی معراج کمال پر فائز تھے۔ مصر و بخارا وسمرقند وقزوین وغیرہ ان کے کمالات کے قائل تھے۔

شاہ ایران اسمٰعیل صفوی سے ان سے کچھ کشیدگی ہو گئی وہ ۹۲۶ھ میں ہندوستان میں بیجاپور

آ گئے یہ اسمٰعیل عادل شاہ کی حکومت کا عہد تھا۔ان کے تقویٰ اور علم وفضل اور سادگی نے دلوں کو شدت سے متاثر کیا۔ برہان شاہ کے استاد پیر محمد کی جب موصوف سے ملاقات ہوئی تو حالانکہ وہ خود ایک بڑی پوزیشن رکھتا تھا لیکن مولانا نے اُسے اتنا متاثر کیا کہ وہ یہاں ایک طالب علم کی زندگی بسر کرنے لگا۔شاہ صاحب سے ان سے مجطی پڑھی اور ایک سال تک ان کی صحبت سے فیض اٹھاتا رہا۔ پیر محمد نے واپسی پر برہان شاہ سے شاہ صاحب کے متعلق کہا میں نے ایسا عالم ایران وتوران وہندوستان میں کہیں نہیں دیکھا۔

بُرہان شاہ کو ان کی قدم بوسی کا اشتیاق ہوا۔ دعوت دی گئ ۹۲۸ھ میں موصوف احمد نگر تشریف لائے ارکان واعیان سلطنت نے چارکوس تک ان کا خیر مقدم کیا۔ برہان شاہ بڑی عقیدت سے پیش آیا۔قلعہ احمد نگر کی جامع مسجد میں مجلس درس منعقد ہوئی۔موصوف ہفتہ میں دوبار علماء دارالسلطنت سے علمی گفتگو فرماتے ۔ بڑا اجتماع ہوتا تھا۔خود برہان شاہ بھی درس میں آ کر مودب بیٹھتا تھا۔حسن اتفاق کہ شاہزادہ عبدالقادر سخت بیمار ہو گیا کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ صحت سے مایوسی ہوگئی۔شاہ طاہر نے موقع پا کر فرمایا کہ شاہزادہ کی صحت کے بارے میں میری ایک تجویز ہے لیکن اس کے اظہار میں بیشمار خطرے ہیں۔ بادشاہ نے کہا آپ مطمئن رہیں کوئی گزند نہ پہونچے گا۔شاہ طاہر نے کہا۔ اگر شاہزادہ آج ہی اچھا ہو جائے تو آپ نذر مانیں کہ سادات کی خدمت کروں گا اور ائمہ اثنائے عشر کا عقیدتمند ہو جاؤں گا بادشاہ ائمہ اثناءعشر سے ناواقف تھا اس نے پوچھا کون ائمہ اثناءعشر شاہ صاحب نے ائمہ اثناءعشر کا تعارف کرایا۔ بادشاہ نذر ماننے پر آمادہ ہو گیا۔شاہ طاہر نے اب کھل کر کہا ابھی مجھے کچھ اور کہنا ہے۔آپ مجھ سے عہد کریں کہ اگر ناگوار ہو تو مجھے میرے عیال کے ساتھ مکہ چلے جانے کی اجازت دیدیں گے۔ بادشاہ نے عہد کیا۔قرآن اٹھایا۔قسم شرعی کھائی کہ ہرگز کوئی تکلیف نہ دوں گا۔تب شاہ نے فرمایا

آج شب جمعہ میں نذر کیجئے کہ حضرت باری تعالیٰ چودہ معصومین کی برکت سے آج ہی شب کو شہزادہ کو شفا بخشدے تو ائمہ طاہرین کے نام کا خطبہ پڑھوا کران کے مذہب کو رائج کروں گا۔ بادشاہ نے عہد کرلیا۔ ساری رات شہزادہ کے پلنگ کے پاس بیٹھا رہا اور یہ سمجھتا رہا کہ یہ رات شہزادے پر خیریت سے نہ گزرے گی۔ بادشاہ کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے خواب دیکھا کہ ایک بزرگ بارہ بزرگوں کے ساتھ تشریف لائے ہیں کسی نے بتایا کہ یہ رسولخدا ہیں اور یہ بارہ امام ہیں۔ آنحضرت نے فرمایا کہ بارہ اماموں کی برکت سے اللہ نے عبدالقادر کو شفا بخشی مگر تم میرے فرزند محمد طاہر کے کہنے سے تجاوز نکرنا بادشاہ کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تپ بالکل نہیں ہے۔ شہزادہ آرام سے سورہا ہے۔ بادشاہ نے خدا کا شکر کیا۔ ادھر شاہ طاہر سر برہنہ خضوع وخشوع سے شہزادہ کی صحت کے لئے دعا کررہے تھے۔ بادشاہ نے مولانا کو بلانے کے لئے آدمی بھیجا۔ جب آنے میں دیر ہوئی تو باری باری چھ سات آدمی بھیج دیئے۔ شاہ صاحب کے آنے کی اطلاع بادشاہ کو ہوئی تو وہ استقبال کو آیا۔ اپنا خواب بیان کیا اور درخواست کیا کہ مجھے مذہب شیعہ تعلیم فرمایئے۔

شاہ صاحب نے اسمائے معصومین تعلیم کئے اور ائمہ کے فضائل بیان کئے۔ شاہ صاحب کے مشورے سے بادشاہ نے ملا پیر محمد اور افضل خاں اور ملا داؤد دہلوی وغیرہ کو بلایا یہ اس عہد کے علماء تھے۔ مدرسہ شاہ طاہر میں یہ سب جمع ہوئے ہر ایک کو اپنے اپنے مذہب کی صداقت پر بحث کی دعوت دی گئی۔ شیخ احمد نجفی اثناء عشری عالم تھے۔ یہ غالب آئے بادشاہ نے عبدالقادر کے مرض اور وسیلہ صحت کا ذکر کیا۔ تقریباً تین ہزار اسی وقت شیعہ ہو گئے۔ سلطنت کا مذہب اثنائے عشری ہو گیا۔ بادشاہ نے قلعہ احمد نگر کے سامنے ایک چار دیواری بنوائی۔ اس کا نام لنگر دروازہ امام تھا اور کئی گاؤں اس کے نام وقف کردیئے۔ خزانہ شاہی سے عراق وخراسان بڑی

بڑی رقمیں بھیجی جانے لگیں۔ دکن کو شیعہ دارالعلماء بنا دیا۔ بڑے بڑے علوم وفنون کے ماہر مختلف مقامات سے بلائے گئے۔ شاہ طاہر کے بھائی شاہ جعفر۔ ملا شاہ محمد نیشاپوری، ملا استرآبادی، ملا رستم جرجانی، ملاعلی مازندرانی، ایوب ابوالبرکت، ملاعزیز اللہ گیلانی۔ محمد امامی استرآبادی وغیرہ کے علم وفضل سے احمد نگر ایک عظیم جامعہ علمیہ بن گیا۔ تصنیفات میں قلم متحرک ہو گئے۔ تبلیغ میں زبانیں شیوابیانی کرنے لگیں، شیعہ شعائر رسوم آثار وتاریخ کی گونج سے دکن کی فضا پُر ہوگئی۔ شہنشاہ ایران شاہ اسمعیل صفوی نے جب سُنا کہ بُرہان شاہ نے شیعہ مذہب قبول کرلیا ہے تو انہیں بڑی خوشی ہوئی ۹۵۰ھ میں بہت سے تحفے برہان شاہ کو بھیجے۔ شاہ طاہر کو بھی تحفے بھیجے۔ شاہ صاحب میں ایک مدبر حکیم مبلغ معلم ومصنف کے سب صفات جمع ہو گئے تھے۔ موصوف اخلاق کریمانہ کا سرچشمہ تھے۔ اور علم وادب کے امام تھے۔ ملت جعفری پر ان کا یہی احسان کیا کم تھا کہ انھوں نے ہندوستان میں ایک نئی شیعہ سلطنت پیدا کی۔ بانی سلطنت اور ایک استوار سلطنت میں کام کرنیوالوں کے مقام میں جو فرق ہوسکتا ہے وہ فرق ہندوستان کے دوسرے مبلغ علماء اور شاہ طاہر میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ موصوف کے قلم کے نقوش بھی ان کے مقام علمی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ شرح باب حادی عشر علم کلام میں شرح جعفریہ فقہ میں حاشیہ بیضاوی تفسیر میں، حواشی شرح اشارات ومحاکمات شفاء معقولات میں اور ایسے دوسرے مسائل پر آپ نے گراں قدر رسائل اور حواشی لکھے، ۹۵۶ھ میں موصوف نے انتقال فرمایا۔ قُدس اللہ روحہ وعطر مرقدہ آپ کی میت کربلائے معلیٰ دفن کے لئے بھیجی گئی۔

(تاریخ فرشتہ وغیرہ)

علماء شیعہ کا ایک سیلاب تھا جو عراق وحجاز وایران ویمن سے ہندوستان کی طرف بہتا ہوا چلا آرہا تھا آنیوالوں میں میر مرتضیٰ شریفی نبیرۂ میر سید شریف جرجانی بھی تھے موصوف شیراز سے

مکہ معظّمہ گئے۔ اور بین الاسلامی مطالعہ نظر کے لئے علامہ ابن حجر کے حلقہ درس میں شریک ہوئے اور علم حاصل میں کمال پیدا کیا پھر ۹۷۲ھ دکن تشریف لائے۔ دکن سے آگرہ آئے اور درس و تدریس میں حصہ لیتے رہے (طبقات اکبری) ۹۷۴ھ میں انتقال فرمایا۔ دلی میں امیر خسرو کے پاس دفن کئے گئے۔ یہ حضرات کس ماحول میں کام کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ میر صدر قاضی اور شیخ الاسلام نے حکم دیا کہ میر مرتضیٰ رافضی ہیں میر وخسرو کو ان کے قرب سے تکلیف ہوگی۔ لاش قبر سے نکالی گئی۔ آپ کے معتقدین نے میت مشہد مقدس دفن کے لئے بھیج دی۔ موصوف ریاضی و اقسام حکمت و منطق و کلام میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔

اہل نظر جو باہر سے ہندوستان آتے۔ جذبات خلوص سے ان کا دل پُر ہوتا وہ معقولات و منقولات کے شناور ہوتے۔ ان کے اخلاق میں دلکشی ہوتی وہ عقلوں پر چھا جاتے دلوں کو جیت لیتے۔ اور عقیدوں میں نئی جانیں ڈالتے۔

ایک فاضل سیاح ''صالح'' عراق سے ہندوستان آئے۔ ملا احمد ٹھٹھوی کو ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ ملا احمد کے آباء و اجداد فاروقی حنفی تھے۔

صالح نے احمد ٹھٹھوی کے دل و دماغ میں اپنے نظریات اس طرح اتار دیئے کہ ان کو شیعہ تہذیب و ثقافت سے عشق ہو گیا۔ بائیس سال کی عمر میں وہ تحصیل علم کے لئے مشہد مقدس روانہ ہو گئے۔ اس زمانے میں ایک ملک سے دوسرے ملک جانا اور ایک مدّت تک قیام کرنا جوئے شیر لانا تھا۔ ٹھٹھوی نے ماہرین فن کے گلستان سے خوشہ چینی کی۔

مولانا افضل نائنی سے کلام واحادیث شیعہ اور فنون ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر یزد و شیراز ہوتے ہوئے ملا کمال الدین حسین طیب اور ملا مرزا جان سے کلیات قانون اور شرح تجرید مع

حواشی کے پڑھی۔قزوین میں پہونچ کرشاہ طہماسپ صفوی کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔

پھر شاہ اسمعیل دوم شہنشاہ ایران کے زمانے میں عراق وعرب وحرمین کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں جاتے اہل کمال سے تمتع حاصل کرتے۔ پھر دکن میں آئے اور قطب شاہ والی گولکنڈہ سے ملے، پھر وہاں سے فتح پور سیکری آ گئے، اور اکبرؔ اعظم کے مقرب ہو گئے۔ تاریخ الفی کی تصنیف پر مامور ہوئے۔ جو لوگ ایک نقطہ نظر ترک کر کے دوسرا نقطہ نظر اختیار کرتے ہیں۔ ان میں نسبتاً جوش وخروش زیادہ ہوتا ہے۔ اوران میں جرأت اظہار بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ملا احمد ٹھٹھوی بھی اپنے مذہبی نقطہ نظر کے بیان میں جری تھے ۹۹۶ھ میں ایک متعصّب شخص مرزا فولاد نے اچانک آپ پر حملہ کیا اور آپ کی وفات ہوگئی۔

اکبرؔ کو اس حادثہ کی اطلاع ہوئی تو بہت رنجیدہ ہوا۔ اور مرزا فولاد کو عبرت ناک سزادی۔ اگر چہ آپ کی قبر پر فیضیؔ اور ابوالفضلؔ نے چند محافظ کر دیئے تھے پھر بھی چند جاہلوں نے آپ کی لاش قبر سے نکال کر جلادی۔

ہندوستان میں باہر سے آنے والوں اور یہاں اپنا گہرا نقش چھوڑنے والوں میں حکیم مسیح الدین ابوالفتح بھی مولانا عبدالرزاق گیلانی بھی ہیں۔ حکیم ابوالفتح علمی خانوادے کے رکن تھے ان کے بھائی حکیم ہمامؔ اور حکیم نورالدینؔ بھی غیر معمولی شہرت اور صلاحیت کے لوگ تھے۔ یہ اپنے بھائیوں کے ساتھ اپنے وطن سے ہندوستان آئے، اکبر نے ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ صدارت اور امین بنگال کا منصب عطا ہوا۔ روز بروز ان کی صلاحیت بادشاہ پر روشن ہوتی گئیں اور بادشاہ ان سے متاثر ہوتا رہا ۹۹۷ھ میں ان کی وفات ہوگئی۔ بادشاہ کو بڑا صدمہ ہوا۔ اکبرؔ کے نورتن میں شمار ہوتے تھے۔ عرفیؔ کے ممدوح تھے۔ آپ کے تصانیف میں ''فتاحی'' شرح قانونچہ شرح اخلاق ناصری اور چار باغ کشکول کے طرز پر ایک کتاب ہے۔

علوم عقلیہ میں ہندوستان کا معلم اول

شاہ فتح اللہ شیرازی غیر معمولی نظر وفکر کے بزرگ تھے۔ شیراز کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ پر اپنے علم وفضل کے لاثانی اثرات چھوڑ گئے۔ تاریخ فرشتہ میں ان کو افضل المناظرین خلاصہ اولاد سید المرسلین افضل واعلم علماء عصر شاہ فتح اللہ شیرازی لکھا ہے۔ موصوف علوم عقلی ونقلی کے امام تھے۔ حکمت وہیئت، وہندسہ ونجوم ورمل وحساب وجرّ اثقال وغیرہ میں اس عہد میں ان کے کمال کا طوطی بول رہا تھا۔ عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے۔ کہ انھیں ہیئت میں ایسا کمال حاصل تھا کہ اگر بادشاہ متوجہ ہوتا تو رصد باندھ سکتے تھے۔

چند سال آپ کا دکن میں قیام رہا۔ عادل شاہ آپ کا بڑا معتقد تھا۔

آپ ۹۹۰ھ فتح پور آگرہ بلائے گئے۔ شاہی حکم سے خانخاناں اور حکیم ابوالفتح گیلانی۔ آپ کے استقبال کو آئے۔ بادشاہ نے آپ کو منصب صدارت پر مقرر کیا۔ اور پرگنہ ''بساور'' جاگیر میں دیا۔ عضدالملک خطاب دیا موصوف اپنے عقائد کے اظہار میں جری تھے دیوان خانہ میں کسی کو علانیہ نماز کی اجازت نہ تھی۔ مگر آپ شیعہ طریقہ پر نہایت اطمینان سے وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔

''طبقات اکبری'' میں ہے نقلی وعقلی علوم وفنون میں خراسان وعراق وہندوستان میں کوئی بھی آپ کا ہمسر نہ تھا۔ علوم عربیہ میں کافی بہرہ رکھتے تھے۔ آٹا پیسنے کی چکی بنائی جو خود حرکت کرتی تھی۔ ایک آئینہ بنایا کہ اس میں طرح طرح کی صورتیں نظر آتیں۔ ایک گردش میں بندوق سے بارہ فیر کرتے۔ ایک قلعہ شکن توپ ایجاد کی۔

ابوالفضل کہتے تھے اگر دنیا سے علوم عقلی کی قدیم کتابیں نابود ہو جائیں تو شاہ فتح اللہ اپنے علم

سے پھرانھیں زندہ کر سکتے تھے۔

آپ کے تصانیف میں رسالہ حالات عجائب کشمیر ہے جسے اکبر نامہ میں شامل کیا گیا ہے **خلاصة المنهج اور منهج الصادقين** آپ کی تفسیر ہے۔

تاریخ الفی کی تصنیف میں شریک تھے۔ زیج جدید تاریخ۔۔۔۔ اکبر شاہی کا ایک حصہ آپ کی نگرانی میں لکھا گیا۔ آپ نے تنبیہ الغافلین کے نام سے نہج البلاغہ کا فارسی میں ترجمہ بھی فرمایا۔ ۹۹۷ھ میں کشمیر میں آپ کی وفات ہوگئی شیعوں میں علوم عقلیہ کے حامی ہر عہد میں رہے۔

برادران اہلسنت کی ہندوستان کی ثقافتی تاریخ کا پہلا دور ساتویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے اور دسویں صدی کے ابتداء میں ختم ہوتا ہے۔ اس وقت مدارس کے نصاب تعلیم میں فقہ واصول فقہ تفسیر وحدیث وتصوف ادب عربی اور کسی قدر منطق وکلام کی کتابیں داخل تھیں۔

دوسرا دور نویں صدی ہجری کے آخر سے شروع ہوتا ہے جب کہ شیخ عبداللہ وشیخ عزیز اللہ ملتان سے دہلی آئے۔ سلطان سکندر لودی نے ان کا خیر مقدم کیا۔

اور علوم کی تدریس ان کے سپرد کی۔ اس عہد میں نصاب میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا کچھ عقائد ومنطق و بلاغت کی طرف توجہ بڑھی۔ تیسرا دور علامہ شیخ فتح اللہ شیرازی کے نام سے معنون ہے۔ جناب سعید اعظمی ندوی صاحب نے رسالہ البعث الاسلامی نومبر ۱۹۶۲ء میں "نظامنا التعليمي" کے زیر عنوان لکھتے ہیں۔

ان بعض التعد يلا ت فى منهاج العهد الثانى زاد من اعمال الناس و بدوا يتطلعون الى رفع مستوى التعليم فوق ذالك وما ۔ ان جاء الشيخ فتح الله الشيرازى وقدم الى العلماء بعض الا قتراحات والزيادات فى المنهاج الموجودأ انذاك الا وتلقاها العلماء بالقبول و هنالك بدر العهد الثالث

للمنهاج التعليمي وصارله اتباع ومتحمسون رفعواقيمته ومواد كما يلي النحو، المنطق، الفلسفه ، الکلام ، الفقه، اصول الفقه، البلاغه،الهيئة ، الرّياضات، الطب، الحديث، التفيسر ،التصوف، السلوك(۴)

دوسرے عہد میں بعض تعدیلات نے اس سے بہتر مجار کی طرف نگاہیں توڑ دی تھیں جب شیخ فتح اللہ شیرازی تشریف لائے اور علماء کے سامنے بعض تجویزیں رکھیں۔اور اُس وقت کے مزاج تعلیم میں اضافہ کئے تو علماء نے اسے قبول کیا۔اس وقت سے تیسرا دورِ تعلیم کا شروع ہو گیا۔اور اس کے جوشیلے مددگار پیدا ہو گئے۔اس نصاب کا مواد یہ تھا۔

۴۔ چوتھے دور کے بانی ملا نظام الدین صاحب ہیں۔اس دور کا آغاز بارہویں صدی ہجری سے ہوتا ہے اور معمولی تعدیل واضافہ کے ساتھ آج تک ہندو پاکستان کے اکثر سنی۔شیعہ مدارس میں رائج ہے۔منطق وفلسفہ کی بے جان کتابیں اس نصاب کا اساسی مضمون بن گئی ہیں۔

قدیم عقلی علوم کی کتابوں کے متن یاد کئے جاتے ہیں اور اس پر دور از کار وفرسودہ بحثیں ہوتی ہیں۔ایک ہی مضمون کی پندرہ پندرہ کتابیں تعلیم کی ابتدائی دور سے انتہا تک پڑھائی جاتی ہیں۔منطق وفلسفہ کے مقابلے میں حدیث وتفسیر و فقہ اور آیت وتاریخ وسیرت ورجال وغیرہ کا حصہ معمولی رہ گیا ہے۔اس نصاب میں مضامین کے توازن کی سخت کی ہے ۔وسیلہ اور مقصد کا فرق نہیں ہے یہ نصاب عقم وعدم انتاج کے لحاظ سے اتنا بے اثر ہو چکا ہے کہ خود قدامت پسند طبقہ کے روشن خیال حضرات اس سے گھبرا اٹھے ہیں۔علماء اہل سنت میں شیخ محمد قاسم نانوتوی، شیخ امداد اللہ مہاجر مکی شیخ رشید احمد گنگوہی وغیرہ علوم عقلی کی تعلیم میں غلو وافراط کے خلاف آوازیں بلند کر چکے ہیں۔

شیعوں میں بھی پرانے نصاب تعلیم کے خلاف عراق وشام وہند کے علماء احتجاج کرتے رہے ہیں اس جمود کا ردعمل تھا کہ سرسید نے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی۔دہلی میں جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں آیا۔

لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کی بساط بچھائی گئی۔نجف اشرف میں مدرسہ منتدیٰ النشر کی اساس رکھی گئی۔اگر تمدن علوم کے ساتھ حدیث وفقہ وتفسیر وعقائد کو پڑھایا جائے۔تو ان کے حقائق کی جڑیں نئی زندگی کی گہرائیوں میں پھیل جائیں اور پرانے اور نئے تعلیم یافتہ کی آج جو تقسیم موجود ہے ختم ہو جائے اور قدیم تعلیم یافتہ اپنے عہد میں جو اجنبیت محسوس کرتے اور اپنے سماج سے نامانوس ہیں۔سماج کی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرنے لگیں اور سماج کا زندہ وبا اثر جز بن جائیں۔

اس اقتباس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں علوم عقلی کی اشاعت میں شاہ فتح اللہ کی حیثیت ''معلم اول'' کی ہے۔ ہندوستان کے تمام حکما علوم حکمت میں انھیں کی طرف ؎۱ اپنی نسبت کرتے ہیں۔خوشی کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے نصاب تعلیم میں اصلاح کا جھنڈا بلند کرنے والے شیخ فتح اللہ شیرازی تھے اور کل عالم اسلامی کے تعلیمی جمود کے خلاف آواز بلند کرنے والے مولانا جمال الدین اسدآبادی تھے۔

باہر سے آنے والوں میں شیخ محمد بن معین جزائری بھی تھے جن کا جلیل القدر علماء میں شمار ہوتا تھا۔ یہ ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئے۔ یہ شیخ فقیہ محدث ابوجعفر محمد بن حسن بن علی مشغری عاملی (سنہ ۱۱۰۴ھ) صاحب الوسائل کے معاصر تھے (نجوم السماء) باہر سے آنے والوں میں شیخ محمد بن علی بن محمود بن یوسف آملی شامی بھی ہیں۔موصوف محقق وادیب وشاعر تھے شیخ حر عاملی کے ہم عصر تھے شام کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے ایران چلے آئے تھے اور درس وتدریس میں مشغول تھے۔

آپ کے فضل وکمالات کی شہرت سن کر وائی حیدرآباد نے آپ کو بلایا اور قدر دانی سے پیش آئے امور دینی کا انتظام آپ کے سپرد کیا۔ سنہ ۱۰۹۰ھ کے بعد آپ کی وفات ہوئی۔
(نجوم السماء) امل آمل، خلاصۃ الاشرفی، اعیان القرن الحادی عشر)

محمد مومن سے حضرت غفرانمآب تک

جنت مکانی قطب الملک علامہ میر محمد مومن (۹۶۰ھ ۱۰۳۱ھ)

جناب پروفیسر محی الدین قادری حیدرآبادی مرحوم نے سنہ ۱۳۶۰ھ میں مولانا محمد مومن کی زندگی پر نہایت محنت ومشقت سے ایک مفصل کتاب شائع کی کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے ۔میر محمد مومن کی زندگی کے حالات ان لوگوں کے لئے ہمیشہ دلیل راہ ثابت ہوں گے جو دینوی

جاہ و اقتدار کے ساتھ حقوق عباد اور حقوق اللہ دونوں کا پورا پورا لحاظ رکھنا چاہتے ہیں دولت و عزت اور اعلیٰ اقتدار یہ تینوں نعمتیں شاید ہی ایک جگہ جمع ہوتی ہوں۔! اور بخت و اتفاق سے جب کبھی کسی کو حاصل ہوجاتی ہیں تو اس کے قلب و دماغ کی قوتیں اکثر و بیشتر گمراہی کی طرف راغب ہونے لگتی ہیں۔لیکن میر محمد مومن ایسے خوش بخت انسان تھے جو اپنا کردار آخر تک پاک وصاف رکھ سکے اور ثابت کر دکھایا کہ مردان باصفا دولت و اقتدار کی فراوانیوں کے باوجود مست نہیں ہوتے۔

علامہ محمد مومن کے تذکرے امل آمل۔لولوء البحرین۔عالم ارائے عباسی، تذکرۂ مجلس، حدیقۃ السلاطین و تاریخ فرشتہ، برہان مآثر، حیات محمد قطب شاہ، نجوم السماء وغیرہ میں ملتے ہیں لیکن ہمارا ماخذ پروفیسر زور کی کتاب ہے اصل نام میر محمد مومن تھا۔اور قطب شاہی تاریخوں میں انھیں کہیں نواب علامی فہامی پیشوائے اہل ایمان میر محمد مومن اور کہیں۔"

عالی حضرت سیادت اور مرتبت مشتری منزلت، خورشید اوج فضل و کمال مہر سپہر، عزت و اقبال مرتضائے ممالک اسلام، مقتدائے طوائف انام، الواثق بتائید المہیمن میر محمد مومن، رکن السلطنت پیشوائے دین و دولت خانہ" لکھا جاتا رہا ہے۔شاہ عباس صفوی نے ۱۰۲۰ھ میں ان کے نام ایک فرمان میں یہ القاب لکھے تھے۔سیادت و نقابت پناہ، افادت و اضافت دستگاہ، مستجمع الفضائل والکمالات شمس السیارہ والنقابۂ والدین۔

عبداللہ قطب شاہ والی دکن نے ان کی وفات کے بعد ۱۰۵۰ھ میں ایک فرمان میں ان کے لئے یہ القاب لکھے تھے۔

سیادت و نجابت پناہ افادت و افاضت دستگاہ۔قدوۃ المحققین اسوۃ المدققین مرتضی ممالک اسلام مقتدائے طوائف انام، خلاصہ اولاد رسول، زبدۂ احفاد قبول" یہ القاب بتاتے ہیں کہ

ایران و ہندوستان میں ان کا مقام کتنا بلند تھا۔

مولانا محمد مومن علیہ الرحمہ کے خاندان کا تعلق استرآباد کے مشاہیر سادات سے تھا۔ سلاطین وامراء ایران کی نظر میں ان کے اسلاف بڑے مغزز ووجیہہ تھے۔

مولانا کے والد کا نام سید علی شرف الدین سما کی تھا۔ موصوف کی ولادت کا زمانہ غالباً ۹۶۰ھ سے پہلے تھا۔

مولانا کی تربیت میں خاص توجہ صرف کی گئی اپنے ماموں سے علوم معقول ومنقول کی تعلیم پائی مولانا سید علی جعفر نورالدین موسوی شوشتری سے حدیث وادب میں تلمذ رہا اس کے علاوہ جفر ونجوم وغیرہ میں کمال پیدا کیا۔

تکمیل وفراغت کے بعد شاہ طہماسپ صفوی کے بیٹے شاہزادہ حیدر مرزا کے اتالیق مقرر ہو گئے ان کے ہمعصران کے علمی تبحر اوران کی مقبولیت کی وجہ سے حسد کرنے لگے۔ مولانا ان کی تنگ دلی سے دلبرداشتہ ہوکر حج وزیارت سے مشرف ہوکر ۹۰۶ھ میں دکن میں گولکنڈہ پہونچے۔ اس وقت تخت حکومت پر کمسن ونوعمر بادشاہ محمد قلی قطب شاہ مسند آرا تھا۔

موصوف کچھ عرصہ تک خاموش درس وتدریس میں مشغول رہے۔ لیکن عطر کی خوشبو کہاں چھپتی ہے۔ ۹۹۳ھ سے پہلے ہی محمد قلی قطب شاہ ان کی اصابت رائے وعلم وفضل سے متاثر ہو چکا تھا۔ اوراس نے ان سے پیشوائے سلطنت اوروکیل مطلق کے عہدہ کوآراستہ کیا تھا۔ پیشوائی کا عہدہ ملک میں بادشاہ کے بعد سب سے بڑا عہدہ تھا۔

پیشوا نائب بادشاہ ومشیر رہبر سلطنت ہوا کرتا تھا وہ ایک ساتھ قاضی القضاۃ، صدرالصدر وشیخ الاسلام وکیل سلطنت اور مدارالمہام تھے یعنی بادشاہ کے بعد ملک میں نمایاں تر مقام اسی کا تھا۔ مولانا کی تنخواہ۔ تقریباً ساڑھے چار ہزار روپیہ ماہانہ تھی۔ تمام امراء وعمائد واعزائے شاہی

دروازہ دولت خانہ عالی کے باہر ہی سواری سے اتر جاتے تھے۔ بادشاہ کے سوا کوئی بھی پالکی پر بیٹھا ہوا دروازہ کے اندر داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ مولانا محمد مومنؒ ہی کا اعزاز تھا۔ کہ تقریباً چالیس سال تک پالکی میں سوار ہوکر دولت خانہ عالی میں آتے جاتے تھے۔

مولانا محمد مومنؒ نے بادشاہ امراء عوام سب کے دل مسخر کر لیئے تھے۔ محمد قلی کے عقائد میں جو پختگی پیدا ہوگئی تھی اور اُس نے خادم اہلبیت رسول کے لقب سے شہرت کو اپنا شرف دیا اس کا سہرا مولانا محمد مومنؒ ہی کے سر ہے۔ سنہ ۱۰۰۰ھ کے لگ بھگ محمد قلی کا مذہب جعفری کی ترویج میں نمایاں حصہ لینا۔ عاشور خانے تعمیر کرنا۔ علم استادہ کرنا، عید بعثت نبیؐ، عید میلاد علیؑ عید غدیر میں جشن کا انتظام کرنا یہ سب مولانا محمد مومن کے عہدۂ پیشوا کے ثمرات تھے۔ سلطنت قطب شاہیہ کا پہلا علم محمد قلی خاں نے سنہ ۱۰۰۱ھ میں بنایا اور گولکنڈہ کے شاہی عاشور خانے میں استادہ کیا یہ علم ابھی محفوظ ہے اور ہر سال محرم میں استادہ کیا جاتا ہے۔ اس علم مبارک پر حسب ذیل عبارت ہے۔

وبشرہ المومنین۔ نصر من اللہ و فتح قریب۔ غلام علی محمد قلی قطب شاہ سنہ احدی والف اس میں پنجتن اور دوازدہ معصومین کے اسمائے گرامی بھی منقوش ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کا دیوان مذہبی شغف اور حضرات ائمہ اثنا عشر کے ساتھ غیر معمولی ارادت کا آئینہ دار ہے یہ سب کچھ مولانا محمد مومن کا باطنی فیضان کا اثر تھا۔

محمد قلی قطب شاہ نے حیدرآباد کو ایک متمدن و بارونق شہر بنانے کا جو نقشہ تیار کیا تھا اس کے بنانے میں پیشوائے سلطنت کی رائے بھی شریک تھی۔

چارمینار کی تعمیر، روضہ امام رضاؑ کی طرح شہر کے وسط میں بنایا جانا۔ اور اس کے چاروں طرف بڑی بڑی سڑکوں اور بازاروں کی تعمیر میں حضرت میر مومنؒ ہی کے مشورہ کو دخل ہوگا۔

کیونکہ میر صاحب جیسے متقی پیشوائے سلطنت کی موجودگی میں شہر کی بنیاد کے وقت کسی مذہبی تقدس یا مناسبت کا خیال پیدا ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ چار مینار کے تعزیہ نما ہونے اور حضرت امام رضاؑ کے مرقد منور کی طرح شہر کے وسط میں اس طرح بنائے جاتے کہ اس کی چاروں طرف سے سڑکیں آ کر ملتی ہوں) علاوہ اس کے بلند ترین حصہ میں ایک نہایت خوش نما وسیع مسجد کی تعمیر اس خیال کو ظاہر کرتی ہے کہ شہر میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ بلندی پر خانہ خدا کا تعمیر کیا جانا ضروری ہے اور ایسا اعلیٰ و پاکیزہ تخیل میر مومنؔ جیسے پیشوائے کل ہی کے نزدیک ذہن میں پیدا ہوسکتا تھا۔ شہر کے بازاروں محلوں مسجدوں، عاشور خانوں اور حماموں کے لئے مناسب مقامات کا انتخابات اوران کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اہل شہر کے لئے آبادی کے ایک طرف پاک و صاف قبرستان کی جگہ منتخب اور خرید کر میرؔ صاحب نے محفوظ کر لی اور اس جگہ کو اپنے صرفہ سے ایک خوش نما باغ کے طور پر سجایا اسے میرؔ صاحب کا دائرہ کہتے ہیں۔

حضرت مومن کی پیشوائی کے ابتدائی دس سالوں کا ایک اہم واقعہ محمد قلی شاہ قطب کے بھتیجے اور جانشین شہزادہ مرزا محمد سلطان کی پیدائش ہے۔ اس شہزادہ کی پوری زندگی میر مومن ہی کے زیر اثر گذری۔ اس کی تعلیم وتربیت اخلاق وشائستگی زہد وتقوی، شادی اور تخت نشینی جملہ امور میں میر صاحب نے حصہ لیا۔ اس تعلیم وتلقین نے ایک قطب شاہی شہزادہ کو شرافت ولیاقت کا مجسمہ بنادیا۔ مولانا کی گہری دلچسپی اورنگرانی کی وجہ سے سر زمین دکن کو ایک صاحب علم وفضل و پرہیز گار بادشاہ نصیب ہوا۔

شہر کی تعمیر وتزئین سے ان کے ذوق تعمیر کی سیری نہ ہوسکی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک کے اندرونی حصوں میں بھی ثقافتی ترقی ہو اور دیہات کے باشندے بھی اسلام سے روشناس ہوں اس لئے انھوں نے شہر کے باہر کئی زمینیں خریدیں اور ان میں تالاب مسجدیں عاشور خانے

سرائیں اور دیگر عمارتیں بنوائیں۔جن کے اطراف میں ثمر دار درختوں کے باغ لگوائے اور طرح طرح کی ترغیب وتحریض سے لوگوں کو آباد کیا۔ان کی مسجدیں عاشورخانے اندرون ملک کے پہاڑوں چٹیل میدانوں اور سُنسان جنگلوں میں دیہاتی زندگی بسر کرنیوالوں میں اب تک ایک خاص عظمت وعقیدت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور مسلمانوں سے زیادہ ہندو ان مسجدوں عاشورخانوں کا احترام کرتے ہیں۔

غیر مسلموں کے علاوہ میر صاحب خود عام مسلمانوں کے دلوں میں حُب اہلبیتؑ وائمہ معصومین وسادات کے احترام واہتمام کا خیال غیر ارادی طور پر پیدا کردینا چاہتے تھے۔ مسلم وغیر مسلم سب ان کے طریق کار سے مطمئن تھے مولانا نے اپنے گاؤں میر پیٹھ میں جو عاشورخانہ بنایا تھا اس کے منہدم آثار اب بھی ہیں۔ ہر سال ہندو حضرات ہی بڑے اعتقاد کے ساتھ علم بٹھاتے ہیں اسی طرح اطراف کے دیہاتوں میں ہندو مسلمانوں سے کم عاشور خانہ کا احترام نہیں کرتے۔

مولانا محمد مومن ایک انجمن تھے ایک عہد تھے۔ ہندوستان کے شیعوں کے لئے وہ پیر طریقت تھے تبلیغ و اشاعت کے تمام مناسب طریقے موصوف نے استعمال کئے۔تصنیف و تالیف درس وتدریس مواعظ وذکر عمارات وآثار سب کا مقصد دیرپا تبلیغ تھا۔موصوف نے خود بھی کتابیں لکھیں اور دوسروں سے بھی لکھوائیں۔ متعدد عالموں اور فاضلوں کو بھی اپنے غیر معمولی تجسس علمی سے فیض پہونچایا،خود سلطان محمد قطب شاہ کا ذہن انھوں نے اس طرح ڈھالا تھا کہ وہ علمی خدمات میں پوری طرح دلچسپی لیتا تھا اُسے کتابوں سے عشق تھا وہ کتابوں کو شوق سے پڑھتا اُسے اپنی یادداشت سے مزین کرتا۔رسالہ مقداریہ مولانا محمد مومن نے باشاہ ہی کی فرمائش سے تصنیف کیا تھا۔ بادشاہ مولانا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے کو نسخہ متبرکہ سمجھتا۔مولانا

سلطان کے لئے دور دور سے اچھی کتابوں کی نقلیں منگواتے۔

موصوف فارسی نثر کے بہت اچھے انشاء پرداز تھے۔شاہ عباس صفوی والی ایران کے نام ان کا خط اور کتاب کثیر المیامین کا دیباچہ ہی ان کے بہترین نثر نگاری کے ثبوت میں کافی ہے۔

مولانا نے مسئلہ رجعت پر بھی ایک کتاب لکھی تھی مولانا اعلیٰ پایہ کے محقق و عالم ہونے کے علاوہ بڑے اچھے شاعر بھی تھے مولانا نے اپنا فارسی دیوان مرتب کر لیا تھا لیکن اب وہ نہیں ملتا۔ ان کے بعض قصائد و قطعات غزلیں و رباعیاں آج بھی موجود ہیں۔مولانا کو شعر و سخن پر استادانہ اقتدار حاصل تھا۔ان کے شعر سے دلی تڑپ اور عاشقانہ درد ٹپکتا ہے کلام میں کافی روانی و شستگی، سوز جذبہ کی گہرائیوں کی وجہ ان کے شعر قاری و سامع میں ایک وجد کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔سنہ ۱۰۳۱ھ میں یہ رُشد و ہدایت کا روشن ستارہ ڈوب گیا۔

علامہ محمد مومن قدس اللہ سرہ کے عہد میں دکن شیعہ علما اور ایرانی فاضلوں کا مرکز بن گیا تھا۔ بڑے بڑے اہل علم اس وقت موجود تھے لیکن یہ ہمہ گیری کسی دوسرے میں نہ تھی۔ باہر سے آنے والوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔اور ہندوستان ان کے علم و فضل سے استفادہ کرتا رہا۔ انھیں آنے والوں میں مولانا سید نظام الدین احمد شیرازی تھے یہ عباس ثانی صفوی کے زمانے میں سنہ ۱۰۵۴ھ میں حیدرآباد گئے تھے یہ شاہ کے بہنوئی تھے۔علم و فضل میں نمایاں مقام تھا۔شعر و ادب میں بھی امتیاز تھا۔حیدرآباد کے امراء و روسا و علما و مومنین پر آپ کا بڑا اثر تھا شعراء نے آپ کی مدح و ثنا میں قصیدے کہے سنہ ۱۰۸۶ھ وفات ہوئی (نجوم السما۔امل امل۔ماثر الکرم سلافتہ العصر)

باہر سے آنے والوں میں شیخ محمد بن علی بن محمود املی شامی بھی تھے موصوف حر عاملی کے معاصر بھی تھے۔عالم و محقق و ادیب و شاعر تھے،شام میں آپ کی تعلیم و تدریس کا چرچا تھا۔والی

حیدرآباد نے دعوت خاص سے آپکو بلایا اور امور دینی کا انتظام سپرد کیا ۱۰۹۰ھ کے بعد وفات ہوئی۔ نجوم السماء سلافتہ العصر، خلاصتہ الاشرفی، اعیان القرآن الحادی عشر

مولانا شیخ مہذب الدین احمد بن رضا نے بھی ہندوستان کو سرفراز کیا آپ علم رجال کے ماہر تھے کتاب فائق المقال آپ نے ۱۰۸۵ھ میں تالیف فرمائی۔ شیخ حر عاملی کے ممتاز شاگردوں میں شمار تھا۔ ۱۰۸۵ھ میں حیدرآباد دکن تشریف لائے قیامت کا حافظہ پایا تھا بارہ ہزار حدیثیں بغیر سلسلہ اسناد حفظ تھیں۔ اور بارہ سومع سلسلہ اسناد حفظ تھیں فائق المقال کے علاوہ آپ نے نہج القیوم اور رسالہ قرات وغیر بھی لکھا۔ فاضل ملا علی گجرات میں آئے۔ آپ نے گجراتی زبان سیکھی وہاں پرعوام ایک پیر کبیر الس کے حلقہ اثر میں تھے۔ آپ نے اس سے اُنس پیدا کیا۔ رفتہ رفتہ ان کا ذہن تبدیل کرتے رہے وہ خود مسلمان ہوگیا اور اس کے پیرو بھی مسلمان ہو گئے ریاست کا وزیر بھی مسلمان ہوگیا بادشاہ بعض مجبورریوں کی وجہ سے زندگی میں اپنا مذہب چھپاتا رہا۔ مرنے کے وقت اس نے وصیت کردی تھی کہ میری لاش دفن کی جائے جولوگ مسلمان ہوئے تھے وہ تجارت پیشہ تھے انھیں بوہرہ کہتے ہیں گجراتی میں بوہرہ کے معنی ہیں تاجر۔

علم الاعلام حضرت قاضی نوراللہ شوستریؒ

۹۵۶ھ۔۔تا۔۔۔ ۱۰۱۹ھ

عظیم تر عالم قاضی نوراللہ حسینی مرعشی شوستریؒ ۹۵۶ھ میں شوستر میں پیدا ہوئے۔ ماہرین سے تکمیل علم کی ۹۹۵ھ میں ایران سے ہندوستان تشریف لائے ابوالفتح گیلانی کے مہمان ہوئے اکبر کے نورتن میں راجہ مان سنگھ۔ کچھواہہ، راجہ بیربل، راجہ ٹوڈرمل، عزیز مرزا، حکیم ابوالفتح گیلانی، حکیم ہمام، ابوالفضل، فیضی، خانخاناں تھے، ان میں پانچ شیعہ تھے۔

ابوالفتح نے حضرت نوراللہ شوستری کا اکبر سے تعارف کرایا۔ بادشاہ ان کے علم وفضل سے

متاثر ہوتا رہالاہور کے چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) کا عہدہ سپرد کیا۔موصوف نے یہ شرط کر لی تھی کہ میں خود اجتہاد کروں گا اور مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کی پابندی نہ کروں گا۔ بلکہ ان میں سے جس کے فتاویٰ جس موقع پر اپنے اجتہاد کے موافق پاؤنگا فیصلہ کروں گا۔قاضی نوراللہ کی فقہی اطلاع کی اورغیر معمولی بصیرت کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ وہ شیعہ اورسنی دونوں کے فقہ وحدیث وکلام ورجال کے بحر ذخار تھے۔قاضی صاحب کے علم وفضل وعدل وتقویٰ کا اعتراف اس عہد کے متعصب مورخوں کو بھی تھا۔

عبدالقادر بدایونی لکھتا ہے قاضی نوراللہ شوستری اگر چہ شیعہ ہیں لیکن بہت منصف وعادل و نیک نفس صاحب حیاوتقویٰ وعفّت اوراوصاف اشراف سے موصوف ہیں اورعلم،فہم،جودت طبع وصفات ذہن وذکا میں مشہور ہیں اوراعلیٰ تصانیف کے مصنف تھے۔ (منتخب التواریخ)

علماءشیعہ کی قابلیت وجوش تبلیغ کا اثر متحد ہندوستان پر بہت پڑ رہا تھا۔عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے۔شیعیان غالب وشیعیان مغلوب (۲/۳۱۵)

شیعوں کے اثر کو گھٹانے کے لئے شیعوں کے خلاف دوسرے ملکوں سے کتابیں منگائی گئیں۔اورخود ملک میں لکھی گئیں نوراللہ شوستری نے اس کے ردعمل پر نظر کرتے ہوئے چند کتابیں اس سلسلہ میں بھی لکھیں۔

مجالس المومنین ۹۹۸ھ میں شروع کی ۱۰۱۰ھ ہی میں ختم کی اس میں محبان اہلبیت کو بھی شیعوں کے ضمن میں ذکر کیا۔(ابن روزبہان کی ابطاباطل جو کشف الحق علامہ کی رد میں لکھی گئی تھی اس کے جواب میں احقاق الحق لکھا صواعق محرقہ ابن حجر ھیثمی شافعی کی رد میں صوارم محرقہ لکھی مرزا مخذوم نے نواقض الروافض لکھی تھی اسکی رد میں ۹۹۵ھ میں مصائب النواصب لکھی جہانگیر کے عہد میں ۱۰۱۹ھ مطابق ۱۶۱۰ء جہانگیر کے حکم سے متعصب

علماء کے فتوے سے سولی دی گئی۔

باہر سے آنے والوں میں ملا عصمۃ اللہ مشہور عالم تھے نابینا ہو گئے تھے مگر زندگی درس و تدریس میں وقف کر دی۔ تالیف و تصنیف میں بھی حصہ لیا ۱۰۳۹ھ میں انتقال ہوا۔

باہر سے آنے والوں میں مرزا فخر الدین محمد موسوی خاں بن مرزا فخر اقمی بھی تھے موصوف سادات قم کے ممتاز خاندان سے تھے ۱۰۵۰ھ میں پیدا ہوئے وطن میں تعلیم کے بعد دار السلطنت اصفہان آئے اور دس سال آقا حسین خوانساری کے حلقہ درس میں شریک رہے منقولات و معقولات میں کمال پیدا کیا ۱۰۸۲ھ میں پیدا ہوئے ۱۰۹۹ھ میں موسوی خاں خطاب ملا۔

ایک سال کے بعد دیوان ممالک کے رکن ہو گئے۔ شعر و سخن میں بڑی شہرت پیدا کی ۱۱۰۱ھ میں انتقال ہوا۔ باہر سے آنے والوں میں شیخ محمد حسن نبیرہ شہید ثانی۔ شیخ زین العابدین بھی تھے اور ادب فقہ و تفسیر و حدیث میں بڑا مرتبہ حاصل کیا تھا۔ ایران پر افغانیوں کا تسلط ہو گیا تو آپ وہاں سے چلے آئے۔ اور نجف اشرف میں مجاور ہو گئے۔ معاشی تنگی کی وجہ سے شاہجہان آباد آ گئے اور صفدر جنگ کے ملازم ہو گئے۔ پھر عظیم آباد گئے کچھ دنوں تجارت میں حصہ لیا۔ انتقال کے بعد پھر برہان الملک کے مقبرے کے نزدیک دفن ہوئے۔ ان کے شاگرد اخوند ابو القاسم کشمیری مزار کے مجاور ہوئے ۱۱۹۳ھ میں اخوند کا بھی انتقال ہو گیا اور وہیں دفن ہوئے۔ (سیرۃ المتاخرین)

علامہ سید محمد علی بن میر عبد اللہ بن ابراہیم یزدی ان کے والد یزد سے اورنگ آباد میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے تھے آپ ۱۱۱۷ھ میں پیدا ہوئے تحصیل علوم کے لئے عراق گئے بائیس سال وہاں قیام کیا۔ عراق و ایران کے علما سے مذاکرے رہے۔ اصفہان میں جب آئے تو طلبہ

نے ان سے استفادہ کیا۔

ایران سے حج کے لئے مکہ گئے وہاں سے سورت آگئے وہاں سے اورنگ آباد آئے وہاں سے حیدرآباد آئے وہاں سے بنگال آئے عظیم آباد وغیرہ ہوتے ہوئے لکھنؤ آئے۔ تصانیف میں فضائل خمسہ نجباء، حواشی شرح ملامحسن کاشی (فقہ) اخوان الصفا وخلان الوفا (حکمت)

ہندوستان پر نادرشاہ کے حملے کا یہی زمانہ تھا ۱۱۹۴ھ کے بعد تک زندہ رہے (سیرۃ المتاخرین) سید نعمت اللہ (سید اغائی) سبط سید نعمت اللہ جزائری شوستر سے عراق و خراسان آئے یہاں ماہرین سے علوم ریاضی کی تکمیل کی۔ فلسفے و ہندسے و ریاضی میں ماہر تھے۔ خراسان سے ہندوستان آئے محمد شاہ بادشاہ نے آپ کی قدر دانی کی پیشاور میں ۱۱۵۱ھ میں انتقال فرمایا۔

ملامحمد علی کشمیری (بادشاہ) کشمیر میں پیدا ہوئے وہیں تحصیل علم کی، فیض آباد میں آکر سکونت کر لی معقولات ومنقولات فروع واصول میں مہارت تھی ان علوم کا درس دیتے تھے۔ جمعہ و جماعت کے قیام میں بڑا حصہ لیا۔ ایک رسالہ نماز جماعت کی فضیلت میں لکھا۔ جناب غفرآنمابؒ مولانا دلدار علی صاحبؒ کے بنائے اقامت جمعہ کا باعث یہی رسالہ تھا اس میں آپ نے نواب آصف الدولہ شاہ اودھ اوران کے وزیر نواب سرفراز الدولہ صاحب ومرزا حسن رضا خاں کو جمعہ و جماعت کے قیام پر متوجہ کیا اور مولانا دلدار علی صاحب اوران کے بعض تلامذہ کی تعریف کی موصوف نے فیض آباد میں وفات پائی۔

(نجوم السماء تاریخ آئینہ حق نما، جہاں نما۔ تذکرۃ العلماء۔)

غفرآنماب مولانا دلدار علی صاحب سے شمس العلماء مفتی محمد عباس تک

مجدد شریعۃ حضرت غفرانمآب مولانا سید دلدار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(۱۱۶۶ھ۔۱۲۳۵ھ)

شاہان اودھ سے شیعہ مذہب کے فروغ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ مرزا محمد امین نواب سعادت علی خاں برہان الملک بہادر صوبہ اودھ کی صوبہ داری پر ۱۱۳۲ھ میں محمد شاہ رنگیلے کے حکم سے مقرر ہوئے یہ صوبہ بدانتظامی اور سرکشی میں ضرب المثل تھا۔ بادشاہ نے صرف صوبہ داری کا خلعت دیا۔لیکن فوج اور رسالے وغیرہ سے کچھ مدد نہ کر سکے۔ برہان الملک اپنی جرأت و مردانگی و تدبیر کے بھروسے پر آئے اور صوبہ پر اپنے حسن انتظام کا جھنڈا گاڑ دیا۔

پچیس برس تک نیکنامی سے حکومت کی ۱۱۵۰ھ میں وفات ہوگئی۔ ۱۱۵۰ھ میں نواب برہان الملک کے بھانجے اور داماد نواب صفدر جنگ وزیر ہوئے موصوف نے اپنا پایۂ تخت فیض آباد میں قائم کیا۔ ۱۱۶۶ھ میں آپ کا انتقال ہوگیا ۱۱۶۶ھ میں مرزا جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ بہادر مسند نشین ریاست ہوئے ۲۲ سال تک شان وشوکت سے سلطنت کی ۱۱۸۸ھ میں انتقال فرمایا۔ نواب آصف الدولہ مرزا یحییٰ علیخاں عرف مرزا امانی ۱۱۸۸ھ میں فیض آباد میں سریر آرائے سلطنت ہوئے سات سال تک فیض آباد میں پایۂ تخت رہا۔ اس کے بعد ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا۔ نواب آصف الدولہ نے چوبیس سال حکومت کی ۱۲۱۲ھ میں انتقال ہوا۔

۱۲۱۲ھ میں آصف الدولہ کے بعد نواب مرزا وزیر علی خاں مسند نشین وزارت ہوئے لیکن انگریزوں سے اختلاف کی وجہ سے زندگی بھر کلکتہ میں نظر بند رہے (۱۲۳۲ھ) میں انتقال فرمایا۔

۱۲۱۲ھ ہی میں ناظم الملک یمین الدولہ نواب سعادت علی خاں مسند نشین وزارت ہوئے سترہ برس حکومت کر کے ۱۲۲۹ھ میں وفات ہوئی۔ شاہ زمن غازی الدین حیدر مسند آرائے وزارت ہوئے اور چھ برس کے بعد ۱۲۳۵ھ میں گورنر جنرل کے مشورے سے تخت شاہی کو زینت بخشی۔ تیرہ برس آٹھ مہینے پانچ دن سلطنت کی اور ۱۲۴۳ھ میں انتقال کیا۔ ۱۲۴۳ھ میں نصیرالدین حیدر بادشاہ ہوئے❁ ۱۲۷۲ھ میں نو یا انتیس سال سلطنت کرنے کے بعد ملکہ وکٹوریہ کے حکم سے معزول کر کے کلکتہ بھیج دیئے گئے انتزاع سلطنت کے بعد دس سال تک زندہ رہے۔ ۱۳۰۲ھ میں انتقال کیا۔

❁ نوٹ: ایک صفحہ غائب ہونے کی وجہ سے چند بادشاہان اودھ کے بارے میں معلومات فراہم نہیں ہو سکیں۔ تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے چند سطریں تحریر کی جا رہی ہیں۔ اسیفؔ جائسی

نواب نصیرالدین حیدر بادشاہ نے دس سال پانچ دن حکومت کر کے ۳/ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ شب شنبہ مطابق ۲۰/اکتوبر ۱۸۳۷ء کو انتقال کیا اور ۴/ربیع الثانی کو اپنی نوتعمیر کربلا میں مدفون ہوئے۔ اس کے بعد مرزا رفیع الدین فریدوں بخت عرف محمد مہدی منا جان سریر آرائے سلطنت ہوئے مدتِ حکومت دو سال اور ۱۱/محرم ۱۲۶۲ھ مطابق جنوری ۱۸۴۶ء چنارگڑھ میں انتقال کیا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ سلطان زماں محمد علی شاہ نے پانچ سال دس دن حکومت کر کے ۵/ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ شب شنبہ مطابق ۱۸۴۲ء کو انتقال کر کے اپنے تعمیر کردہ امام باڑہ حسین آباد میں دفن ہوئے۔ عمر ستّر برس تھی۔ پھر ابوالفتح مصلح الدین، ثریا جاہ، سلطان عادل، خاقان زماں محمد امجد علی شاہ، بادشاہ ہوئے۔ آپ نے حکومت اودھ کو نائب امام سلطان العلماء سید محمد کے ہاتھوں میں دے کر خود ان کی نیابت میں بادشاہت کی یعنی برّصغیر کی تاریخ میں پہلی بار ولی فقیہ کا تصور قائم ہوا۔ اس لئے کہ سلطان العلماء پہلے نمبر پر اور بادشاہ دوسرے نمبر پر نظام سلطنت کے ذمہ دار ہوئے۔ اس سے پہلے کے برّصغیر میں جو علماء حکومت میں دخیل رہے وہ مصاحب یا مشیر رہے یا بادشاہ کے بعد دوسرے نمبر پر پیشوا و نائب السلطنت رہے۔ مجدد شریعت حضرت غفران مآبؒ کے لئے نواب سعادت علی خاں چاہتے تھے کہ وہ پیشوائے اودھ مگر نواب کے بعد کے درجہ پر نائب نواب کی صورت میں ہوں جس سے غفران مآبؒ نے انکار کر دیا۔ اس لئے کہ نائب امامؑ کی توہین ہے کہ وہ کسی دنیاوی بادشاہ یا حاکم کا نائب بنے۔ امجد علی شاہ نے چار سال دس ماہ تاریخ ساز شرعی حکومت کر کے ۲۶/صفر ۱۲۶۳ھ روز شنبہ مطابق فروری ۱۸۴۷ء کو انتقال کیا۔ لکھنؤ ماتم سرا بن گیا۔ چھاونی مینڈو خاں میں مدفون ہوئے۔ آپ اڑتالیس برس پانچ مہینے بارہ دن زندہ رہے بعد ازاں سلطان عالم واجد علی شاہ اختر بادشاہ ہوئے۔

اودھ کی شیعہ حکومت نے دین وانسانیت کی بڑی خدمت کی علم وادب کو پروان چڑھایا۔ آئین وشریعت کے رواج میں حصہ لیا۔ علماء کا احترام کیا۔ ان کو خوش حال اور مطمئن رکھا۔ عزاداری کو معراج ترقی پر پہنچادیا۔ اودھ کی سلطنت میں باہر سے بہت علماء وشعراء آتے رہے اور خود اس زمین سے علم وفضیلت کے بہترین پھول کھلے۔ دریائے جمنا سے فرات تک اور ہندوستان سے کوہ ہمالہ تک شیعہ علما اور اہل کمال کا ذکر پھیل چکا تھا۔ حکومت اودھ کے عہد میں ایک نیا ستارہ طالع ہوا۔ جس کی روشنی سے آنکھیں چکا چوندھ ہوگئیں اور جس کے علم وفضل وتقویٰ اور توفیقات الٰہی نے اُسے زندۂ جاوداں بنادیا۔ یہ بزرگ قدوۃ الفقہاء الفخام اسوۃ المتکلمین الا علام عماد الاسلام والمسلمین رکن الایمان ومقتدی المتقین، مرجع العلماء والمومنین، سید الخواص والعوام آیۃ اللہ فی الانام غفرانمآب جناب مولانا سید دلدار علیؒ جائسی ہیں۔ ۱۱۶۶ھ میں آپ کی ولادت ہوئی اور ۱۲۳۵ھ میں وفات ہوگئی۔

آپ کے معاصرین میں ملک کے مختلف حصوں میں صاحب اثر ارباب فضیلت موجود تھے۔

چونکہ ملا محمد رضا کشمیری فیض آبادی بڑے نیک نفس فاصل تھے سادی زندگی بسر کرتے، سلاطین وامرا سے دور رہتے۔ ایک دن یمین الدولہ وزیر لکھنو آپ کے مکان پر آئے، ملنا چاہا۔ ملنے سے انکار کردیا کہا۔ فقیر کے پاس کیا رکھا ہے۔ یہاں بوریئے کے سوا کیا ہے اسی زمانہ میں محقق لاثانی متکلم بے بدل مولانا حکیم مرزا محمد بن عنایت احمد خاں کشمیری دہلوی بھی تھے۔ جناب سلطان العلما مولانا سید محمد صاحب نے جن کے متعلق العالم المدقق والفاضل المحقق العریف الاکمل الخریر الابجل جامع المعقول والمنقول حاوی الفروع والاصول حافظ ثغور الملۃ القویمۃ الجعفریہ۔ قالع قلاع البلاغۃ الماتریدیۃ والاشعریہ۔ المتوقد الاوحد المرزا محمد طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ کے ایسے الفاظ کیسے ہیں۔ جو عظیم مفکر وبے نظر محقق کے لئے زیبا ہیں۔

مولف شذورالعقیان نے لکھا ہے آپ ہمیشہ درس وتدریس علوم اوراشاعت اصول وفروغ میں مشغول رہے، علامہ مرزا محمد بین الاسلام علوم کے ماہر ناقد نقاد تھے۔ مسلمانوں کے دوسرے مکاتب خیال کے اونچے مصادر پر ان کی وسیع نظر تھی اور شیعہ علوم وفنون کے ماہر و مصنف تھے۔

ایکه گوئی ایں وآن بہتر ز حسن
بارما این دارد و آن تیزہم

مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی (۱۱۵۹ھ ۱۲۴۸ھ) نے ایک آتشیں کتاب شیعوں کے خلاف تحفہ اثناعشریہ کے نام سے لکھی تھی۔ مولانا رحیم بخش دہلوی مرحوم مولف حیاۃ شاہ ولی اللہ دہلوی مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء میں شاہ صاحب کے ذکر میں لکھتے ہیں۔

ابتدائی زمانہ میں فرقہ اثناعشریہ نے تمام ہندوستان میں ایک خوفناک دندمچار کھی تھی جس سے بعض اہل تسنن کے عوام وجہال کے دلوں میں ایک طرح کا تر دد وتذبذب پیدا ہوگیا تھا۔ قریب تھا کہ ان کے عقیدے بگڑ جائیں کہ جناب شاہ عبدالعزیز صاحب نے اکثر ممتاز ومشہور علما کے التماس پر کتاب تحفہ اثنائےعشریہ لکھی جو اپنی انتہا درجہ کی شہرت کی وجہ سے محتاج بیان نہیں۔

شاہ صاحب نے اس وقت تصنیف کی جب کہ دہلی میں شیعوں نے ایک بہت بڑا دندمچار کھا تھا۔ اور یہ طبقہ مختلف خیالات وعقائد کا بزنگاہ بنا ہوا تھا۔ متعصب شیعہ حشرات الارض کی طرح چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے اور ہر طرف طوفان بےتمیزی کا اندھادھند جھکڑ چل رہا تھا ایسے زمانے میں شاہ صاحب نے ایک ایسی کتاب کا لکھنا رفضروری سمجھا (حیات ولی/ ۶۱۹۔ علامہ مرزا محمد کامل نے نزھۂ اثناعشریہ کے نام سے اس کے جوابات لکھے جس کی کئی جلدیں شائع

ہوگئی ہیں۔اس کتاب نے تحفہ کے شکوک کا پورا پورا ازالہ کر دیا تھا بادشاہ کے ایک متعصب عزیز نے ۱۲۳۵ھ میں زہر سے اس علم وفضل کے چراغ کو گل کر دیا۔

میر مرحوم نے تنویر الاشعار میں ان کی تاریخ وفات درج کی ہے۔ ؎

حیف میر زا محمد محتاط
ملک شرع رامه کامل
متکلم محدث وافقه
اورع عصر عالم عامل
ہم حکیم وطبیب وہم شاعر
کامل و ہم تخلص کامل
ناصر اہلبیت در دہلی
اسبت و پاک و صادق و عادل
نزہ اوست دردوازدہ جلد
کرد دعوائے تحفه را باطل
درجناں رفت پیش آلِ رسول
شد بدریائے معرفت واصل
سال مرگش چناں نوشت منیرؔ
ہائے افسوس فاضل کامل

(۱۲۳۵ھ)

حضرت غفرآنمابؒ کے اور دوسرے وسیع النظر و ماہر علوم معاصر ملک کے مختلف گوشوں میں

پھیلے ہوئے تھے اُنھیں میں علامہ تفضّل حسین خاں (۱۱۵۰ھ ۱۲۱۵ھ) تھے۔

آپ کے والد کا نام سعداللہ خاں تھا۔موصوف سیالکوٹ میں پیدا ہوئے موصوف کی ابتدائی تعلیم لاہور میں ہوئی۔اس زمانہ میں علوم وفنون کا مرکز دہلی تھا۔تیرہ سال کی عمر میں دہلی بھیجے گئے۔مولوی وجیہہ الدین سے معقولات اور قاضی رشید الدین خاں سے منقولات کی تعلیم پائی۔مرزا محمد علی ومرزا خیراللہ سے ریاضی وہیئت کی تعلیم پائی۔ان کے والد کا انتقال بیحد کمسنی میں ہوگیا تھا۔ان کے دادا کرم اللہ خاں ان کی تربیت کرتے تھے۔

فرنگی محل لکھنؤ کے عالم اسی زمانہ میں ملاحسن کے علم وفضل کا ڈنکا بج رہا تھا۔خان علامہ کو ۱۹ سال کی عمر میں تکمیل علوم کے لئےلکھنؤ بھیجا گیا۔موصوف سے شرح موافق ومیر زاہد کا درس ہوا۔تحفۃ العالم کے مصنف لکھتے ہیں کہ شیخ علی حزیںؔ سے بھی تعلیم پائی تھی شاید استفادہ بنارس میں ہوا ہو۔خان علّامہ کے علم فضل کا شہرہ لکھنؤ میں عام ہوگیا نواب شجاع الدولہ نے ان کو اپنے فرزند یمین السلطنت نواب سعادت علی خاں کا اتالیق مقرر کیا۔بعد وفات نواب شجاع الدولہ نواب آصف الدولہ منصب وزارت پر متمکن ہوئے۔لارڈ ہسٹنگز نے خان علامہ کو صما،ماہوار پر مقرر کر کے میجر پالمر کا مددگار بنادیا۔میجر پالمراس زمانہ میں رانا گوہار سے ملکی معاملات میں روپیہ کے متعلق کارروائی کر رہے تھے۔اس موقع پر موصوف نے بڑے کارنمایاں کئے کچھ دنوں کے بعد گورنر جنرل نے دوسری اہم ذمّہ داری سپرد کی مسٹر ڈیوڈانڈرسن سفیر کامل الاختیار کیساتھ ماڑاجی سندھیا کے پاس بھیجا۔یہاں بھی خان علامّہ نے بڑی خوبی سے کام کیا۔

نواب آصف الدولہ ان کو عہدہ سفارت دیکر کلکتہ بھیجا گیا۔یہاں خان علامہ نے ہیئت و ہندسہ میں مزید ترقی کی اور لاطینی یونانی زبان سیکھی۔وہ انگریزی بھی بہت اچھی جانتے تھے۔

ریاست میں نائب و پیدست کی جگہ خالی ہوئی۔نواب آصف الدولہ نے گورنر جنرل

سرجان شور سے کہا کہ اس جگہ کے لئے تفضّل حسین خاں سے بہتر کوئی شخص نہیں ہے۔ گورنر جنزل نے کہاں خاں علامہ ایک مسئلہ حکمیہ کے حل کرنے کی لذت اقلیم ہند کی حکومت سے بہتر سمجھتے ہیں۔ نواب آصف الدولہ نے عمادالسعادت کی عبارت کے مطابق موصوف سے اصرار بلیغ کیا۔

جناب وزارت مآب دست درگردنش حمائل کردو گفت کہ حالا حرمت من منحصر در بدل ہمت شما بقبول ایں امر ست۔ اگر پاس نمک من دردل دارید از اقبال این معنی پہلو تہی نباید کرد۔

مجبوراً خان علامہ نے یہ عہدہ قبول کیا۔ سید انشاء نے شاہ اودھ سعادت علی خاں کے سامنے ایک غزل پڑھی تھی جس میں کہا تھا عروس سلطنت کے جھومر مولوی دلدار علی صاحب اور کانوں کے جھمکے دونوں صاحبزادے اور گلے کا نولکھا ہار خان علامہ ہیں ۱۲۱۶ھ میں خان علامہ کا انتقال ہوگیا۔ تحفۃ العالم میں خان علامہ کے اعلیٰ تصانیف کیا۔ فہرست دی ہوئی جو مشکل علوم پر مشتمل تھی جن کے جاننے والے ملک میں بہت کم تھے۔ خان علامہ پہلے اپنے آباءواجداد پر سنی مسلک رکھتے تھے۔ حضرت غفران مآبؒ کی تبلیغ سے شیعہ ہوئے۔ عربی اور اسلامی علوم، معقول اور منقول میں خان علامہ فاضل و کامل تھے شیعہ علوم پر بھی مطالعہ سے دسترس حاصل کی وشیعہ سنّی فقہ کا درس دیتے تھے۔ سوانح عمری نواب مولوی تفضّل حسین خاں (خان علامہ) کے مولف نواب سید محمد علی خاں نے لکھا ہے مجدد شریعۃ سرکار غفرآنماب مولانا دلدار علی صاحب نے خان علامہ سے ریاضی شروع کی اور خان علامہ نے اصول فقہ امامیہ حضرت ممدوح سے پڑھا۔ جیسا کہ علامہ حلی رحمۃ اللہ علیہ نے معقولات محقق طوسیؒ سے حاصل کی اور محقق طوسیؒ نے اُصول فقہ علامہ حلی سے پڑھا۔

جناب غفرآنماب کو ایک نہایت پُرامید عہد ملا۔ شیعہ سلطنت کی تائید ان کو حاصل ہوئی۔

وسیع النظر معاصران کی کمک کے لئے موجود تھے۔ اللہ نے ان کوخلوص کی دولت بخشدی۔علم و حکمت کی توسیع اور دین کی تبلیغ واشاعت کے لئے ان کا شرح صدر کیا۔

اثر واقتدار، وجاہت وقیادت مقبولیت خاص و عام وعظ وافتا، فیصل خصومات، تالیف و تصنیف غرض ہر جہت سے وہ بیحد کامیاب انسان تھے۔ ہندوستان میں ان کے فضل وکمال نے جھنڈے گاڑ دیئے۔ان کے دانش و ہنر کا پھریرا لہرایا۔ ان کے اخلاق کریمانہ اس طرح چمکے جیسے فانوس میں شمع یا قمقمہ میں چراغ، ان کی عزت وشہرت کی بدولت لکھنؤ کی چوکھٹ کو بوسہ دیا جاتا تھا۔غفرانمآب، ہمعصر علماء وافاضل اور طلبہ کے قدرداں تھے۔ اپنی فیاضی سے ان کے حوصلے بڑھاتے تھے ان سے ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ جس طرح مولانا مومنؒ نے حیدرآباد دکن میں دین کے فروغ کی منظم کوشش کی تھی اسی طرح اودھ میں مولانا دلدارعلی صاحب نے دینی علوم وفقہ جعفری وعزائے امام حسینؑ کی اشاعت میں نہایت گرم جوشی سے حصہ لیااور پورے برّصغیر پر چھا گئے۔غفرآنمابؒ نصیرآباد جائس (ضلع رائے بریلی) کے رہنے والے تھے ۱۱۶۶ھ میں پیدا ہوئے۔ سندیلہ میں مولوی حیدر علی ابن ملاحمداللہ شارح سلم العلوم سے اور الہ آباد میں فاضل وکامل سید غلام حسین سے اور رائے بریلی میں مولوی باب اللہ سے علوم عقلی کی تحصیل کی۔

نواب سرفرازالدولہ مرزا حسن رضاخاں کی مدد سے آپ عتبات عالیات مزید تکمیل کے لئے گئے۔ استبصار و فوائد حائریہ آیۃ اللہ محمد باقر صاحب سے اور ریاض المسائل حجتہ الاسلام آقا سید علی بن محمد حسن طباطبائی سے اور بعض کُتب عالم ربانی سید محمد مہدی ابن ابی القاسم مولوی شہرستانی سے پڑھیں۔ بحرالعلوم آقا سید محمد مہدی طباطبائی سے وافی ومعالم الاصول وغیرہ پڑھی۔ مشہد مقدس میں آقا سید مہدی اصفہانی سے اکتساب فرمایا (شذورالعقیان

وورثۃ الانبیاء) تحصیل سے فراغت کے بعد نصیر آباد میں قیام فرمایا۔

(یہاں سے دو صفحہ مضمون کے غائب ہیں۔اسیف جائسی)

عالم عامل ، نبیہ لوزعی
ہادی کامل ، امام یلمعی
رہنمائے شاہراہ اقتصاد
نخلبند بوستان اجتہاد
گلبن شاداب گلزار علے
سید عریف ، دلدار علی
مالک اقلیم زہد و اتقا
حکمرانِ کشور حلم و حیا
(نان ونمک مرزا فصیح)

❁❁❁

شاہانِ اودھ اور اشاعتِ علوم

مصنف

مولانا مرتضیٰ حسین صاحب صدر الافاضل و فاضل مشرقیات

شاہانِ اودھ اور اشاعتِ علوم

مولانا مرتضیٰ حسین صاحب فاضل لکھنوی

اٹھارویں صدی کا آخری زمانہ ہندوستان کے لئے بہت زیادہ خطرناک تھا۔غیر ملکی سفید رنگ حکومت کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ بنگال کا جادو پھیل گیا تھا لٹیروں نے دلی کے گلی کوچے لوٹ لئے، کاشانے ویران، محفلیں برہم لوگ، تباہ، عزت دار پریشان، بادشاہ غلام، رہے سہے رئیسوں پر ادبار کے ہاتھوں عیش پرستی کا بھوت سوار، سیاست اور مکاریوں نے جڑیں پکڑ لیں، بے ہوشی اتنی عام کہ تخت نشین قید ہو گئے مگر اطمینان واپسی پر قسمیں کھا رہے ہیں۔

ایسے خلفشاری دور میں نواب آصف الدولہ بہادر لکھنؤ آئے۔ ۱۷۷۵ء کے قریب فیض آباد اور دلی کے بے آس و دل شکستہ کھنچ آئے، یہاں خزانے کھلے ہوئے تھے۔

سب سے پہلے ادیبوں کا استقبال کیا گیا میرؔ، سوداؔ، حسنؔ وغیرہ نے محفل جمائی۔

فرنگی محل کے علماء جو عالمگیر کے عہد سے یہاں موجود تھے، بڑی بڑی قدردانیوں اور انعامات سے سرفراز ہوئے۔

حضرت غفرانمآبؒ

اب لکھنؤ میں ادب، حدیث، فقہ واصول، منطق، فلسفہ کے بڑے بڑے حلقے قائم ہو گئے فرنگی محل سے حدیث، منطق، فلسفہ پر کتابیں لکھی جا رہی تھیں اور غفران مآبؒ و آل غفرانمآبؒ کلام فقہ، اصول، حدیث، ادب پر بڑے بڑے کام کر رہے تھے۔

میرؔ، سوداؔ، حسنؔ، انشاؔء، وغیرہ ادبی مشاغل میں سرگرم تھے اور اردو کی پرورش ہو رہی تھی، مولانا سید علی صاحب قبلہ جو غفرانمآب کے فرزند ارجمند تھے ان کے حساس دماغ نے سب سے پہلے اردو تفسیر لکھی جس کا نام 'توضیح المجید' ہے پھر اسی خاندان کے دوسرے محترم بزرگ حضرت تاج العلماء المتوفی ۱۳۰۲ھ نے قرآن مجید کا ترجمہ اور بے شمار اردو تصانیف سے مختلف خزانے اردو میں جمع کر دئے۔ عبرانی زبان کا تصرف اردو میں سب سے پہلے موصوف ہی نے فرمایا۔

مغل عہد میں اگر مکہ مکرمہ کے علمی ادارے مالی امداد سے مستفید ہوتے تھے تو نجف کی علمی بارگاہ اودھ کے ہدیوں سے مالا مال تھی۔ آپس میں بے تعصبی کی وجہ سے علمی حلقوں کی وسعت کا اندازہ دشوار ہے مسلمانوں کا ذکر کیا، ہندوؤں پر بادشاہوں کی عزت افزائیوں کا حال، ٹیکارام تسلیؔ، راجہ کندن لعل، وغیرہ سے پوچھئے۔ شخصی مدارس کے علاوہ بیس مدرسے شاہی اخراجات سے چلتے تھے۔ (نجم الغنی تاریخ اودھ ص۹)

نصیر الدین حیدر بہادر نے یورپ سے آلات رصد منگا کر بہت بڑے پیمانہ پر رصد خانہ بنوایا، جس میں کئی کئی ہزار کی تنخواہوں پر ماہرین کام کرتے تھے جناب مسعود حسن صاحب ادیب مدظلہ نے اپنے مضمون ''غدر سے پہلے لکھنؤ کے شاہی کتب خانے اور مطبع'' میں تحریر فرمایا ہے کہ ۱۸۴۹ء میں اس کے منشی ''کمال الدین حیدر'' تھے۔ نجم الغنی صاحب نے کہا ہے کہ امجد علی شاہ کے زمانہ میں پھر سے اس رصد خانہ کی اصلاح ہوئی۔ (ص۹ ج۵)

نواب غازی الدین حیدر نے ''سب سے پہلا مطبع لکھنؤ میں قائم کیا''۔ (ادیب) جس سے اشاعت کتب میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی اور نہ معلوم کتنی کتابیں اس سلطانی مطبع سے عوام تک پہنچیں۔ میں نے اس پریس کی شائع شدہ کتابوں سے تین کتابیں دیکھی ہیں۔

(۱)مناقب حیدریه، یہ کتاب غازی الدین حیدر المتوفی ۱۲۴۶ھ کی مدح میں ہے، صاحب نفحۃ الیمن احمد بن محمد یمنی شروانی کی عربی تصنیف ہے۔ اس کے ٹائیٹل پر یہ عبارت ہے۔

"قداستتب بعون رب البریة،طبع ھذاالکتاب المسمیٰ بالمناقب الحیدریه فی المطبعة المبارکة السلطانیة بدارالخلافه لکھنؤ المحمیة، نہارالسابع والعشرین من شھر ربیع الاول سنة الف مائتین وخمس وثلاثین من الھجرۃ النبویة"

(۲)فوائد حیدریہ: محمد صادق خاں اختر کی کتاب ہے۔ فارسی زبان میں شاہ زمن کی مدحت سرائی کی ہے یہ کتاب تاریخی طور پر سابق الذکر کتاب سے زیادہ مفید ہے۔ کتاب کے آخر میں ہے۔

"تم الکتاب بعون الملك الوھاب واستتب طبعه نہارالاحد غرۃ شھر شعبان المکرم سنة ثمان وثلاثین بعدالمائتین والالف من الھجرۃ النبویة بدار السلطنتة لکھنؤ"

(۳) ہفت قلزم یہ کتاب سات جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور غازی الدین حیدر بہادر کی تصنیف ہے۔ اس کی ترتیب وجمع آوری مولوی مقبول محمد کے ہاتھوں ہوئی۔ جنہوں نے خاتمہ کتاب میں لکھا ہے۔''الحمدلله والمنه که ہفت جلد کتاب فرہنگ رفعت که مسمّیٰ به ہفت قلزم از تالیف حضرت جہاں پناہ......

غازی الدین حیدر بادشاہ غازی..................

''روزے به تقریبے می فرمودندکه درروزاکثر امورمرجوعه مالی وملکی

فراغت گرفته ودادستم رسیدگان ومظلومان داده وحاجت جمیع حاجت منداں برآورده به تحریر مسوده یک کتاب از سرشام زمان برخواسته ایم که سپیده صبح دمید"

پیش نظر جلد روز عید وماہ سعید ذی الحجہ ۱۲۳۷ھ میں طبع ہوئی۔

(۴) چوتھی کتاب گلدستہ محبت ہے جو ۱۲۳۹ھ میں شائع ہوئی اس کے بعد برابر طباعت کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ۱۲۴۳ء میں سلیماں جاہ نصیرالدین حیدر بہادر تخت نشین ہوئے۔ شاہ موصوف کی علم پروری کا یہ عالم تھا کہ ''ٹرنر ماکن'' نے جب کمپنی سے اشاعت شاہ نامہ فردوسی کی درخواست کی تو کمپنی نے اس بارگاہ کا پتہ دیا چنانچہ کریم بادشاہ نے ہزار ہا روپیہ صرف کر کے شاہ نامہ شائع کرایا اس سے قبل دنیا میں شاہ نامہ شائع نہیں ہوا تھا۔

(اس شاہ نامہ پر ایک مفصل مقالہ سپرد قلم کر چکا ہوں)

اب تک شاہی پریس ٹائپ حروف میں تھا شاہ موصوف نے مسٹر ارچر کو ۱۸۳۰ء کے قریب کانپور سے بلا کر لکھنؤ میں سنگی مطبع قائم کرایا جس سے سب سے پہلے کتاب **بهجة المرضیه** شرح الفیہ المشہور بہ سیوطی شائع ہوئی جو حقیر کے پاس محفوظ ہے جناب ادیب نے تحریر فرمایا ہے:۔

''ڈاکٹر اسپرنگر کے قول کے مطابق ۱۸۴۸ء میں شاہی مطبعوں کے علاوہ بارہ غیر سرکاری مطبع بھی قائم تھے۔ ان میں حاجی محمد حسین اور محمد مصطفی خاں کے مطبع نہایت اچھے تھے۔''

۱۸۴۹ء میں یہ شاہی مطبع ٹوٹ گیا تھا لیکن حکومت کی طرف سے کتابوں کی اشاعت ہوتی تھی لیکن سلطان المطابع کی مہر سے کسی دوسرے پریس میں چھپتی تھی، میرے پاس متعدد قسم کی ایسی کتابیں ہیں جو ۱۸۵۷ء سے پہلے کی شائع شدہ ہیں۔

(۱) رسالہ رجعیہ مجلسی ۱۱۱۱ھ جس کے ٹائیٹل پر ہے۔

''حسب الحکم مہر ذیل مطبع کثیر المنافع المسمیٰ بہ سلطان المطابع باہتمام کپتان مقبول الدولہ مرزا محمد مہدی علی خاں قبولؔ، درکلاں کوٹھی بکارخانہ حاجی ولی محمد طبع شد۔''

تحریر الشہادتین میں ہے۔

''مطبوعہ ولی محمد واقع چوک قدیم لکھنؤ متصل دروازہ سرائے۔''

(۲) ''افسانہ عشق'' مثنوی حضرت واجد علی شاہ المتوفی ۱۳۰۶ھ اس میں ''حسب الحکم الخ'' والی عبارت نہیں ہے۔ بلکہ ''بہ مطبع سلطان باہتمام خانہ زاد قدیم مدد علی طبع شد''

(۳) سرور سلطانی ''رجب علی بیگ سرورؔ المتوفی ۱۸۶۷ء اس میں بھی حسب الحکم مہر کثیر المنافع'' نہیں ہے بلکہ ''در بیت السلطنت لکھنؤ بہ مطبع سلطانی بجانفشانی وعرق ریزی محمد حسین منطبع شد''

ان عبارتوں کو یکجا کرنے سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

(۱) سلطان المطابع کی مہر سے کتابیں شائع ہوتی تھیں لیکن بعض کتابیں بغیر مہر بھی چھپتی تھیں۔

(۲) شاہی کتابوں پر مہر طبع نہیں ہوتی تھی۔

(۳) اس مہر کے مہتمم مرزا مہدی علی خاں قبولؔ تھے، لیکن دو چیزیں تفصیل طلب ہیں۔

(۱) یہ حسب الحکم مہر کا کیا مطلب ہے؟

(۲) مرزا مہدی خاں قبولؔ کون صاحب ہیں؟

اس کے علاوہ اہل علم کی قدردانیاں انعامات وغیرہ نے لکھنؤ میں خاص طور پر اور پورے ملک میں اہل علم میں بہت بڑی حد تک اضافہ کر دیا تھا خود بادشاہ بھی علوم متعارفہ میں پوری

طرح ماہر ہوتے تھے جیسا کہ ان کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے۔

لکھنؤ کے ان مشاغل کو دیکھ کر اس وقت کے حیدرآباد، رامپور، بھوپال یا اور بڑی بڑی ریاستوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ لکھنؤ نے علم کی ترقی کے لئے جو انتظام کیا تھا وہ اس دور کے لحاظ سے محیرالعقول چیز تھی۔

(ماخوذ از ''الواعظ'' لکھنؤ، جون ۱۹۴۹ء)

❁❁❁

شاہانِ اودھ کی تاریخی علم پروری

مصنف

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمسؔ کراچی، پاکستان

شاہانِ اودھ کی تاریخی علم پروری

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمسؔ کراچی، پاکستان

خدا رحمت نازل کرے اودھ کے بادشاہوں پر، آج ان کے ساتھ بغض وعناد رکھنے والے کتنا ہی ان کی نسبت غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں کا طومار باندھیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کو علم و مذہب سے اتنی دلبستگی تھی کہ شاید و باید وہ اپنے تمام شان وشوکت سمیت ارباب علم کے سامنے سرِ نیاز خم کرتے تھے اور مذہب کا ہر طرح پاس ولحاظ رکھتے تھے۔

خاندان اجتہاد لکھنؤ کے مورث اعلیٰ مجدد مذہب جناب غفرآن مآب مولانا السید دلدار علی طاب ثراہ نے ۱۲۰۰ھ میں لکھنؤ میں اپنا مرکز علم وعمل قرار دیا۔ تب سے مذہب کو جو کچھ فروغ ہوا اس کا ان رہنمایان دین کے روحانی فیوض وبرکات کے بعد اگر سہرا تھا تو شاہان اودھ کے سروں پر، جو اپنے تئیں ایک صحیح حامی مذہب وشریعت ثابت کر رہے تھے۔

جناب غفران مآب طاب ثراہ کے لئے آصف الدولہ کا عہد ایسا تھا کہ وہ چاہتے تو ان کے لئے بہت بڑی جاگیر اور علاقہ کی ملکیت حاصل ہو جاتی مگر وہ ان فکروں ہی میں نہ تھے۔

ہاں نواب سعادت علی خان بہادر کے عہد میں بہو بیگم صاحبہ نے جو نواب آصف الدولہ بہادر کی ماں تھیں تبلیغی ضروریات کا احساس کر کے کچھ گاؤں ان کے پائے نام کر دیئے جس کو انہوں نے خدمات دینی میں کچھ سہولت پیدا ہونے کی غرض سے لے تو لیا لیکن قناعت پسندی اور کفایت شعاری کی بنا پر اس سے زیادہ کے طالب نہیں ہوئے۔ ان مواضعات کو واسطے انصرام امور خیر مسند اجتہاد سے مخصوص فرما دیا۔

ہم اس فرمان یا پروانے کی نقل ذیل میں درج کرتے ہیں جس کی بناء پر جناب غفران مآبؒ ان مواضعات پر قابض ہوئے۔ معافی کی نقل باضابطہ ہمارے پاس موجود ہے۔

جناب عالیہ متعالیہ نواب بہو بیگم صاحبہ دام اقبالہا

پروانہ بمہر خاص جناب عالیہ متعالیہ امۃ الزہرا بنت موتمن الدّولہ اسحاق خان مرحوم ہفتم شہر رجب ۱۲۲۰ھ۔

متصدیان مہمات حال واستقبال محالات روکھا وصحت گنج علاقہ جاگیر بدانند دروبست پنج مواضع حسب تفصیل ذیل برائے مدد معاش بنام فضیلت واجتہاد دستگاہ مولوی دلدار علی مجتہد العصر معاف ومرفوع القلم گشتہ تامداخل این صرف امور اجتہاد واجرائے مسائل شرع شریف سازند وباطمینان تمام مشغول ہدایت بندگان خدا باشند باید کہ مواضع مفصل الذیل راازدفتر خشو ومنہا ساختہ بتصرف وتعلق مشار الیہ واگذارند ومعاف مرفوع القلم دانستہ بوجہ من الوجوہ بعلت اخذ بھینٹ وبیگار ونذرانہ وضابطانہ وشحنگی وغیرہ ابواب فوجداری تعرض نہ نمایند کہ باطمینان تمام حاصلات آن را صرف معیشت خود نمودہ باجرائے کار افتاد اجتہاد اشتغال داشتہ بدعا گوئی ما بدولت ومشغول وموظف بودہ باشند وہر سال سند مجددانہ طلبند درین باب تاکید مزید دانستہ حسب المسطور بعمل آرند۔

از پٹہ .... از صحت گنج

کسی پور، چک بوجھی، بہولامئو، ۔ منئی ، نتھواپور

جناب غفران مآبؒ کی دادودہش پر نظر کرتے ہوئے یہ مواضع بھی غیر کافی نظر آئے تو دوسرا فرمان صادر ہوا جس میں چند مواضع اور معاف کئے گئے۔

ان تمام مواضع کی فہرست حسب ذیل ہے۔

بھٹہ مرتضی ونظام بھٹہ پرگنہ وتحصیل روکھا ضلع رائے بریلی

بوجھئی ؎ ؎

بھولا مئو 〃 〃

کمھئی پور 〃 〃

منئی 〃 〃

نتھوا پور 〃 〃

چک ٹاہ 〃 〃

لکھسرا پرگنہ رسیون رسول آباد، تحصیل نواب گنج، ضلع اناؤ

مدار پور کسیلی 〃 〃

مولوی کھیڑا پرگنہ و تحصیل موہان ''ضلع اناؤ''، لیکن ایک سخی کے لئے مال کی فراوانی اس کی سخاوت کی ترقی کا باعث ہوجاتی ہے۔ یہاں کیا تھا؟ آمدنی کے ساتھ دادودہش بڑھ گئی تو تیسرا فرمان صادر ہوا جس میں چھ ہزار روپیہ سالانہ بطور نذر خزانہ شاہی سے عطا ہوئے۔ موخرالذکر دونوں فرمان ہمارے پاس نہیں ہیں اس وجہ سے درج نہیں کئے جاتے اگرچہ ممکن تھا کہ ہم کتاب **فصل بعد الوصل لتوضیح الوصل بعد الفصل** سے یہ دونوں فرمان نقل کر دیتے۔ لیکن چونکہ پہلا فرمان ہمارے پاس موجود ہے جب ہم نے اس فرمان کا کتاب مذکور کے مندرجہ فرمان سے مقابلہ کیا تو بہت فرق پایا اس لئے ہماری نظر میں وہ دونوں فرمان بھی پایہ اعتبار سے ساقط ہوگئے لہٰذا صرف حوالہ کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔ جناب سلطان العلماء طاب ثراہ کے عہد میں اس خاندان کا اقتدار معراج کمال پر پہونچ گیا تھا۔ بادشاہ وقت کی تخت نشینی کے موقع پر تاج (۱) ان کے سر پر وہ

---

(۱) حیات رضوان مآب مطبوعہ تصویر عالم پریس ص ۲۸ میں مولانا سید علی اکبر صاحب نے اور رسالہ الواعظ لکھنؤ میں اس کے مدیر سابق مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی نے لکھا ہے لیکن اکثر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ باشاہ کے سر پر ریذیڈنٹ تاج رکھتا تھا۔ یہ ایک تاریخی غلطی ہے جس میں بعض مورخین مبتلا ہوگئے ہیں ہم اس غلط فہمی کو رفع کرنے کیلئے تحقیق کا سرمایہ پیش کرتے ہیں تاکہ خیالات کی یکسوئی آسانی سے ہوجائے اور اختلاف کا پردہ درمیان سے اٹھ جائے۔

رکھتے تھے۔ پہلے ہم ایک معتبر شاہد کا بیان پیش کرتے ہیں جس کی عینی شہادت کے بعد حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے شاہد خود شاہی خاندان کا ایک معزز رکن بھی ہے۔ ملک العلماء سید بندہ حسین صاحب اور تاج العلماء سید علی محمد صاحب کے درمیان انہی مواضعات کا جو جناب غفران مآب کو ملے تھے) مقدمہ چلا۔ ملک العلماء مدعا علیہ کی طرف سے بذریعہ کمیشن و بند سوالات معین الدولہ نواب امام علی خان صاحب بہادر کا بیان ہوا جس میں زیادہ تر سوالات اس قسم کے ہیں ہم اس میں سے انتخاب کر کے بعض سوالات مع جوابات کے پیش کرتے ہیں۔

سوالات

۱-آپ کو خاندان شاہی سے کیا تعلق ہے؟
۲-نماز عیدین مسجد شاہی میں کون پڑھاتا تھا؟
۳-بروقت تخت نشینی شاہ اودھ کے سر پر تاج کس کے ہاتھ سے رکھا جاتا تھا؟
۴-آپ کے علم میں سوائے شخص مذکور کے اور کسی مجتہد نے بھی کسی بادشاہ کے سر پر تاج رکھا؟
۵-آپ کو معلوم ہے کہ بادشاہ کے جنازے کی نماز کون پڑھاتا تھا یہ امر کس کے لئے مختص تھا یا جس نے چاہا پڑھا دیا؟

جوابات

۱-محمد علی شاہ اور غازی الدین حیدر دونوں حقیر کے چچیرے بھائی اور نصیر الدین حیدر حقیر کے بھتیجے ہیں۔
۲-سلطان العلماء سید محمد صاحب مجتہد پڑھاتے تھے۔
۳-سلطان العلماء سید محمد صاحب کے ہاتھ سے۔
۴-نہیں۔
۵-صرف سلطان العلما سید محمد صاحب کے واسطے مختص تھا۔
(سوالات از جانب وکیل ''تاج العلماء'' مدّعی)

۱-کس کس بادشاہ کے تاج رکھنے سے آپ بذات خود واقف ہیں؟
۲-بروقت تاج رکھنے کے صاحب ریذیڈنٹ بہادر لکھنؤ کس جگہ بیٹھتے تھے اور کیا کرتے تھے۔
۳-قبل سر پر تاج رکھنے کے تاج کہاں رہتا تھا؟
۴-مجتہد صاحب تاج کہاں پاتے تھے؟
۵-جس وقت غازی الدین حیدر بادشاہ کے سر پر تاج رکھا گیا اس وقت آپ موجود تھے یا نہیں؟
۶- اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟
۷-کس کی اجازت سے مجتہد بادشاہ کے سر پر تاج رکھتا تھا بادشاہ کی یا صاحب ریذیڈنٹ کی؟
۸-جب محمد علی شاہ کے سر پر تاج رکھا گیا تھا تو سید میرن صاحب موجود تھے یا نہیں اگر موجود تھے انہوں نے تاج کو چھوا یا نہیں؟
۹-سب سے پہلے کس بادشاہ نے یہ تینوں امر مولوی سید محمد صاحب سے متعلق کئے تھے۔

جوابات

۱-غازی الدین حیدر، نصیرالدین حیدر، محمد علی شاہ و امجد علی شاہ و واجد علی شاہ ان پانچوں بادشاہوں کے سر پر سید محمد صاحب مجتہد نے تاج رکھا۔
۲-سامنے بادشاہ کے کبھی کھڑے رہتے، کبھی بیٹھے رہتے تھے اور جب تاج رکھا جا چکتا تھا تب بیٹھتے تھے اور نذریں گذرتی تھیں۔
۳-مجھے نہیں معلوم۔
۴-کپتان فتح علی کشتی میں لایا کرتے تھے اس میں سے پاتے تھے یہ یاد نہیں کہ کپتان صاحب اپنے ہاتھ سے دیا کرتے تھے یا مجتہد صاحب خود اٹھالیا کرتے تھے۔
۵-ہاں موجود تھا۔
۶-قریب تیس برس کے عمر تھی بعدہ بیان کیا کہ تیس بتیس برس کی عمر تھی۔

۷-خواستگاری بادشاہ سے روبرو ریذیڈنٹ بہادر کے تاج رکھا جاتا تھا۔
۸-موجود تھے مگر تاج نہیں چھوا اور ان کو کچھ اس سے تعلق نہ تھا۔ تاج رکھنا اور عیدین کی نماز ولیعہد کو پڑھانا۔ نماز جنازہ کی پڑھانا یہ تین امر صرف مولوی سید محمد صاحب سے متعلق تھے۔
۹-دوامر ہمیشہ سے ان کے متعلق تھے اور تاج رکھنا غازی الدین حیدر نے ان کے متعلق کیا تھا۔

دوسرا بیان خود جناب رضوان مآب کا پیش کیا جاتا ہے جس کی نوعیت یہ ہے کہ ہنگامہ غدر کے بعد جناب رضوان مآب پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ ہنگامہ غدر جناب کے حکم جہاد کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بذریعہ چند سوالات جناب رضوان مآب کا بیان لیا گیا۔ دو سوال اس کے معہ جواب کے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

سوال

۱-سرکار بر جیس قدر میں آمد و رفت رکھتے تھے اور جیسا کہ دستور قدیم ہنگام تخت نشینی رہا ہے کہ آپ کے ہاتھ سے جلوس ہوتا تھا اور ہنگام تخت نشینی تنخواہ سادات کی اوّل آپ دستخط کراتے تھے اب بھی ہوا ہے یا نہیں؟

جواب

۱-چونکہ نائب شرف الدولہ سنی مذہب اور اکثر بدمعاش اسی مذہب کے تھے ہم کو کسی نے وقت جلوس کے نہیں پوچھا اور بے طلب میں کسی بادشاہ کے پاس نہ جاتا تھا اور بعد جلوس کے بھی ایک مدت دراز تک وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا مگر جب ممو خان اور پیروان شاہ جی نے اس سرکار میں کہنا شروع کیا کہ مجتہد العصر آپ کے جلوس سے راضی نہ ہوئے اور ان کو ناگوار ہوا اس حال میں اس جانب سے میری طلب میں شدت ہوئی اور مجھ کو بخوف جان و آبرو سوا جانے کے کچھ چارہ نہ ہوا۔ دو چار مرتبہ بجبوری جانا پڑا۔
۲-اگر یہ فرائض مرقومہٴ بالا جو نہیں ادا ہوئے تو کس وجہ سے کیوں کہ آپ ان کے پیش امام ہیں؟
۲-اختیار بدمعاشوں کا اور خلاف مذہبوں کا تھا اور ان کے پیشوا شاہ جی تھے ہم لوگوں کو نہ پوچھا۔

متعدد ادارات دیوانی وفوجداری ان کی نگرانی میں قائم تھے جن کے تحت میں ملکی نظم ونسق کا کام انجام پاتا تھا اور شرعی اداروں کی سرکردگی اس خاندان یا ان کے مقرر کردہ اشخاص سے متعلق تھی۔

جناب رضوان مآب خود بھی اجلاس فرماتے تھے، جناب کے اجلاس یا عہدہ کا نام ہم اس وجہ سے نہیں لکھ سکتے کہ ہم کو تاریخ کے صفحات پر کسی ملک اور کسی سلطنت میں کسی وقت سے آج تک اتنی بڑی عدالت یا اجلاس کے قائم ہونے کا پتہ نہیں لگتا شاہان اودھ کے لئے یہ بات یقینا قابل افتخار ہے اتنا بڑا عہدہ کسی کو دے دینا اور اتنے اختیار کا مالک بنا دینا یقینا انتہائی کسر نفس، کمال انصاف، عین ایمان مذہبیت کی دلیل ہے۔ چونکہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا اجلاس تھا جو دنیا کے سامنے پیش کیا گیا اس وجہ سے ایسا نام جو اس کی عظمت کو پورے طور پر ظاہر کرنے کا ضامن ہو نہ مل سکا تو مجبوراً محکمہ شرعیہ نام رکھا گیا۔

یہ نام ایک حد تک اس لئے مناسب تھا کہ حقیقتاً شرعی اجلاس یہی تھا اور جس طرح احکام شرعیہ شاہ وگدا سب پر بغیر رورعایت نافذ ہوتے ہیں وہی شان اس اجلاس کی بھی تھی لہٰذا ہر مناسبت سے اس کو محکمہ شرعیہ کہنا درست تھا کوئی اور نام اس پر صادق نہیں آتا۔ اگر اختیارات پر نظر کرتے ہوئے اس کو پریوی کونسل سے تعبیر کیا جائے تو یوں صحیح نہیں کہ پریوی کونسل میں کئی جج مل کے مقدمہ کی سماعت کرتے ہیں اور جناب رضوان مآب تنہا اجلاس فرماتے تھے۔ اس اجلاس کے احکام سے بادشاہ وقت بھی مستثنیٰ نہیں تھے، تمام عدالتوں کے فیصلوں کی اپیل جناب کے اجلاس میں ہوتی تھی اور جناب کے فیصلہ کی اپیل کہیں نہیں ہوسکتی تھی۔ ایک مرتبہ(۱) کسی شخص نے جسارت کر کے جناب کے فیصلہ کی اپیل خود بادشاہ کے یہاں دائر کی جس پر یہ حکم صادر ہوا:

فیصلہ مجتہد ناطق است و ''اپیل نہ دارد''

---

(۱) حیات رضوان مآب، ص ۲۹

پریوی کونسل میں کوئی مقدمہ براہ راست نہیں دائر ہوتا لیکن اس اجلاس میں بعض اہم مقدمات ڈائریکٹ بھی دائر ہوئے ہیں۔اس میں سب سے زیادہ اہم مقدمہ سلطان عالم محمد واجد علی شاہ کا ہے،جس کی نوعیت یہ ہے کہ سلطان عالم (۲) نے اپنی ولیعہدی کے زمانہ میں ایک کنیز کو اس کی مالکہ کی رضامندی بغیر محل سرا شاہی میں داخل کرلیا یہ عورت نائکہ تھی اور اس عورت کو نوچی بنانا چاہتی تھی ۔ جناب کے اجلاس میں استغاثہ دائر ہوا جناب نے مقدمہ کی سماعت فرمائی اور تحقیقات کے بعد مستغیثہ کو ڈگری دی۔تجویز کا خلاصہ ذیل ہے۔

قیّتش زنہج شرعی ثابت گردیدہ ولیعہد بہادر را حکم محکم صادر شود کہ ویرا بمالکۂ وے حوالہ فرمایند وبمالکش حکم محکم صادر شود کہ ویرا بحبالہ نکاح مومنے درآوردو پیرامون فجور نہ گردد۔

چونکہ اس عوت کا کنیز ہونا شرعی طور پر ثابت ہوگیا ہے لہٰذا ولی عہد بہادر کے نام حکم محکم صادر کیا جائے کہ اس عورت کو اس کی مالکہ کے سپرد کردیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی مالکہ پر لازم ہے کہ اس کنیز کا نکاح کسی مومن کے ساتھ کردے اور ہرگز کسب کروانے اور فسق وفجور کی باعث نہ ہو۔

صاحب تاریخ لکھتے ہیں کہ:۔

بادشاہ دین پناہ بمجرد ملاحظہ حکم آنجناب فوراً تعمیل آن حکم قضا شیم نمودہ کہ بہ تعمیل آن ماموروہمچنیں امضا یافت بعد چندے ہرگاہ ولیعہد بہادر سریر آرائے شاہی وتاجدار جہاں پناہی گردید ند بواسطہ بعض اراکین دولت پیغام فرستادند کہ در مقدمہ رقیت وے اگر گنجائش باشد نظر ثانی و تجویز ثانی فرمایند آنجناب ارشاد فرمودند کہ از طرف من عرضہ دارند کہ **حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَحَرَامُ مُحَمَّدٍ حَرَامٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ۔**

---

(۲) حیات رضوان مآب، ص۲۹

اس شرعی حکم کو دیکھتے ہی بادشاہ نے اس کی تعمیل کی۔ جب حضرت واجد علی شاہ خود سریر آرائے سلطنت ہوئے تو بعض ارکان سلطنت کی زبانی قبلہ وکعبہ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ اگر اس عورت کے کنیز ہونے میں شک یا شبہ کی گنجائش ہوتو جناب اپنے حکم پر نظر ثانی فرمائیں قبلہ وکعبہ نے ارشاد فرمایا۔ترجمۂ حدیث)

محمدؐ نے جو چیز حلال کی وہ تا قیامت حلال ہے اور محمدؐ نے جسے حرام قرار دیا وہ تا قیامت حرام رہے گی۔

اس میں لطیف نکتہ یہ ہے کہ جناب کا اسم گرامی بھی محمد ہے۔اسی طرح کا ایک اور مقدمہ بھی تاریخ پر نظر آتا ہے۔

امجد علی شاہ کا مقدمہ

حضرت (۱) امجد علی شاہ مرحوم نے کسی تاجر سے تیرہ لاکھ روپئے کا مسند، تکیہ خریدا کل قیمت تاجر کو دیدی گئی مگر قریب سوالاکھ روپئے کے عمال خزانہ نے دبا رکھا تاجر نے بہت دوڑ دھوپ کی جب شنوائی نہ ہوئی تو جناب کے اجلاس میں مقدمہ دائر کیا جو ثبوت کے بعد تاجر کو ڈگری دی گئی اور اس کا اجراء بھی کرادیا اس فیصلہ سے جناب کے عدل وانصاف کا سکہ بیٹھ گیا۔

ان حضرات (۲) نے امر شرعی میں کبھی کسی بڑی سے بڑی دنیاوی قوت کی پروانہ کی اور جو امر حق تھا۔ اس کے کہنے اور کرنے میں ذراسی بھی جھجک محسوس نہ ہوئی۔سیکڑوں واقعے ہمارے پیش نظر ہیں جن میں سے چند واقعے پیش کش انظار ہیں۔

---

(۱) تذکرہ بے بہافی تاریخ العلماء مطبوعہ جید برقی پریس دہلی، ص ۳۳۷

(۲) حیات رضوان مآب، ص ۳۹ منقول از تذکرۃ العلماء سید مہدی و رسالہ مبلغ غفران مآب نمبر، ص ۸۷ منقول از رسالہ الواعظؔ۔

محمد علی شاہ کا واقعہ

ایک (۱) مرتبہ فردوس منزل حضرت محمد علی شاہ بادشاہ اودھ نے مسجد تعمیر کرائی جب مسجد تیار ہو چکی تو جناب سے نماز عید کی استدعا فرمائی۔ جناب نے فرمایا کہ تھوڑی سی زمین ملکیت نعیم خان بھی اس میں شامل ہوگئی ہے لہٰذا جب تک شرعی طور پر اس سے مصالحت کا ثبوت مجھ تک نہ پہونچے گا اور معاملہ صاف نہ ہوگا میں نماز عید نہ پڑھاؤں گا۔ بادشاہ مرحوم نے اس کا انفصال جناب کے سپرد کیا جناب نے بعد تحقیقات شرعیہ ایک مناسب معاوضہ پر خان مذکور کو راضی کیا اور وہ معاوضہ بادشاہ سے دلوادیا اس کے بعد نماز عید ادا فرمائی۔

نصیرالدین حیدر کا واقعہ

نصیرالدین حیدر (۲) بادشاہ اودھ نے ایک نکاح پڑھنے کے لئے طلب کیا وہاں پہونچ کر صاف کہہ دیا کہ شرعی صورت سے افتراق شوہر اول سے ثابت نہیں اس لئے میں نکاح نہیں پڑھ سکتا۔ بادشاہ کا چہرہ غصہ سے متغیر ہوا۔ آپ لا حول ولا قوۃ الا باللہ کہہ کر کھڑے ہوگئے۔

بہر حال جناب سلطان العلماء کو جو اقتدار حاصل تھا اس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ راجہ درگا پرشاد بوستان اودھ میں حضرت امجد علی شاہ کی تخت نشینی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

" مجتہد العصر را اختیارات کلی بامور مملکت بخشیدند عدالت ممالک محروسہ بالتمام بایشان مرجوع گشت و حکم او برآب و باد روان شد-" ص ۱۳۵ شاہی حکم تھا کہ کوئی شخص سوائے قبلہ وکعبہ کے اور کچھ نہ کہے اور اہل دفاتر سلطان العلماء لکھیں اور بڑے قبلہ وکعبہ کہیں ایک مہر بھی کندہ کرا کے بھیجی تھی جس پر یہ عبارت تھی۔ "مجمع علوم دین مرجع سادات ومومنین حافظ احکام الہ مورد اعتقادات امجد علی شاہ مجتہد العصر سلطان العلماء سید محمد ابن سید دلدار علی۔"

---

(۱) حیات رضوان مآب، ص ۳۰ رسالہ مبلغ غفران مآب نمبر منقول از رسالہ الواعظ

(۲) حیات رضوان مآب، ص ۲۹، مبلغ غفران مآب نمبر منقول از رسالہ الواعظ۔

جناب(۱) نے اس مہر کو ملاحظہ فرمانے کے بعد کہلوا بھیجا کہ اگر بجائے مورد اعتقادات کے مورد عنایات بے غایات لکھ دیا جائے تو مجھے اس مہر کے قبول کرنے میں عذر نہ ہوگا چنانچہ بہت اصرار کے بعد حضرت امجد علی شاہ نے اس عبارت کو جناب قبلہ وکعبہ کی مرضی کے موافق بدل جانے کا حکم دیا۔ جب اس ترمیم کے بعد مہر پیش کی گئی تو جناب نے قبول فرمائی۔

یہ مہر سرکاری کاغذات اور مقدمات کی تجویزوں پر کی جاتی تھی۔ حضرت امجد علی شاہ کی وفات کے بعد حضرت سلطان عالم نے اپنی تخت نشینی کے پہلے ہی سال از راہ عقیدت مندی ویسی مہر اپنی طرف کھدوا کے پیش کی حضرت امجد علی شاہ کی عطا کردہ مہر کا عکس ہم کو کسی کاغذ پر نہ ملا لہٰذا صرف اس مہر کا عکس پیش کیا جاتا ہے۔

علی دلدار سید المرحوم بن

محمد سید العلماء سلطان مجتہدالعصر

حافظ احکام اللہ مورد عنایات حضرت امجد علی شاہ

مجمع علوم دین مرجع سادات و مومنین

محکمہ عدالت دیوانی اور فوجداری کے چیف جسٹس جناب سلطان العلماء کے خلف اکبر جناب مولانا سید محمد باقر صاحب مصنف تشیید المبانی تھے اور انہیں بادشاہ کی طرف سے منصف الدولہ، شرف الملک صفوۃ العلماء کا خطاب حاصل ہوا تھا اور آخر میں محکمہ آبکاری کا تعلق بھی جناب موصوف سے ہو گیا تھا۔ چنانچہ آپ نے انسداد مسکرات کی طرف بھی انتہائی توجہ فرمائی اور ایک روبکار صادر کیا کہ گانجہ، بھنگ، شراب اور اس طرح کے تمام مسکرات کے ٹھیکے توڑ دیئے جائیں۔ یہاں تک کہ تاڑ کے جتنے درخت مملکت محروسہ میں ہیں سب کاٹ ڈالے جائیں

حیات رضوان مآب (منقول از تذکرۃ العلماء) ص ۳۸؍

مسکرات کا استعمال سخت جرم قرار دیا اور ایک معتمد قابل اطمینان شخص کو اپنی جانب سے تمام مسکرات کا ٹھیکہ دیا کہ جس شخص کے لئے طبیب حاذق دواءاً تجویز کرے اور سند رکھتا ہو اس کو بقدر ضرورت وہ چیز دی جائے۔ اسی زمانہ میں جناب مشیرؔ نے جو لکھنؤ کے مشہور ہجو گو شاعر تھے ظریفانہ طور پر یہ شعر کہا۔

شراب جو نہ پیئے آج کل وہ ناری ہے
جناب قبلہ وکعبہ کی آبکاری ہے

اس کی اطلاع بادشاہ کو ہوگئی تو حکم ہوا کہ مشیرؔ کی زبان کھینچ لی جائے۔ مشیر مرحوم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو روپوش ہو گئے اور شب کو جناب سلطان العلماء کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قدموں پر گر کے رونے لگے جناب سلطان العلماء نے تسکین دی اور دوسرے دن بادشاہ کے یہاں خلاف وقت تشریف لے گئے اس بے وقت تشریف آوری سے بادشاہ سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو یہ مشیر کی سفارش کرنے آئے ہیں فوراً کہنے لگے کہ قبلہ وکعبہ سب کچھ فرمائیے گا مگر مشیر کی سفارش نہ کیجئے گا۔ جناب نے فرمایا میں مشیر ہی کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جہاں پناہ نے کہا قبلہ وکعبہ مشیر کی خطا ایسی نہیں کہ بخش دینے کے قابل ہو اس کی زبان درازی کی سزا یہی ہے کہ گدّی سے زبان کھنچوالی جائے۔ جناب سلطان العلماء نے فرمایا ہاں درست ہے لیکن مذہب کی بڑی توہین ہوگی۔ اس لئے کہ مخالفین کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ ہمارے اساطین دین کی ہجو نظم کرنے کی سزا پائی۔ آپس میں بغلیں بجاتے پھریں گے یہ کوئی نہ کہے گا کہ منصف الدولہ سے گستاخی کی یہ سزا ہے بادشاہ نے کہا کہ واقعی یہ خیال آپ کا بہت صحیح ہے مجھے اس طرف توجہ بالکل نہیں ہوئی اب ہرگز مشیرؔ سے تعرض نہ کیا جائے گا اور اسی وقت اپنا حکم منسوخ کیا۔

دوسرا محکمہ صدر الصدور تھا جس کے متعلق قضایا کا فیصلہ اور پولیس اور تھانے تھے۔ یہ محکمہ جناب سلطان العلماء کے دوسرے صاحبزادے جناب معلم رابع علم الہدیٰ مولانا سید مرتضیٰ صاحب قبلہ کے متعلق تھا۔ ان کو بادشاہ کی طرف سے ''خلاصۃ العلماء'' خطاب ملا تھا۔ ذیل کا واقعہ ان

کے کارنامۂ حیات میں جلی حرفوں میں ثبت رہے گا۔ اور دنیا کو پکار پکار کے کہے گا۔

ایک غافل قوم کی کھوئی ہوئی عظمت ہیں ہم
گوش عبرت سے سنو! افسانۂ عبرت ہیں ہم

واقعہ

علی نقی خان جو بعد کو اودھ کا وزیر اعظم اور آخری تاجدار کا سسرا بھی ہو گیا تھا اس کے جاہ وجلال سے کسی اور مقرب خاقان وزیر کو بھی آنکھ ملانے کی تاب نہ تھی۔ اس نے میر گھسیٹا کی زمین پر قبضہ کر کے ایک مکان بنوالیا۔ میر گھسیٹا بہت ہائے واویلا کرتے پھرے مگر علی نقی خاں کے مقابلہ میں غریب سید کی کون سنتا ہے۔ جب کہیں سے داد نہ ملی تو بیچارے نے گھبرا کے خلاصۃ العلماء کے اجلاس میں استغاثہ دائر کیا۔ ثبوت کافی پانے کے بعد میر گھسیٹا کو ڈگری دی گئی اور نواب علی نقی خان کو حکم دیا گیا کہ اپنا عملہ اٹھالیں علی نقی خان پر اس فیصلہ کا کچھ اثر نہ ہوا تو خلاصۃ العلماء نے پولیس کو حکم دیا کہ آج جا کے نواب علی نقی خان کو مکان سے بے دخل کر دو اور میر گھسیٹا کو قبضہ دلا دو۔ چنانچہ پولیس نے نواب کو بے دخل کر دیا اور میر گھسیٹا کو زمین پر قبضہ دلوایا۔ یہ تھے وہ حضرات جن کے نزدیک امیر وغریب شاہ وگدا سب برابر تھے۔

تیسرا محکمہ(۱) صدر الشریعہ جناب سلطان العلماء کے حقیقی بھتیجے اور داماد جناب مولانا سید محمد ہادی صاحب قبلہ کے متعلق تھا۔ اسی مناسبت سے ان کو عمدۃ العلماء صدر الشریعہ کا خطاب سرکار شاہی سے عطا ہوا تھا موصوف کی ماتحتی میں مفتیان(۲) ذی علم ممالک محروسہ میں مقرر تھے کہ وہ شرعی طور پر جناب رضوان(۳) مآب کے فتاویٰ کے موافق فیصلہ کر لیں اور جو مقدمہ(۴) دقیق ہو اور فیصلہ سے عاجز ہوں اس کو محکمۂ صدر الشریعہ میں ارسال کریں۔

---

(۱) **حیات رضوان مآب**، ص ۳۱ (۲) حیات رضوان مآب، ص ۳۱
(۳) حیات رضوان مآب، ص ۳۸ منقول از تذکرۃ العلماء
(۴) حیات رضوان مآب، ص ۴۳ منقول از رسالہ سوانح عمری مصنفہ جناب حکیم محمد کاظم صاحب مرحوم

ان مفتیوں پر احکام جناب ہی کے اجلاس سے صادر ہوتے تھے۔ ان میں پہلا نام(۱) جناب مفتی حافظ سید انور علی صاحب کا تھا جو سلطان پور اور ٹانڈے کے لئے مفتی مقرر کئے گئے تھے۔ ان کے بعد جناب مولانا مفتی محمد قلی خان صاحب (مفتی میرٹھ) اور جناب مولانا مفتی محمد عباس صاحب (مفتی لکھنؤ) کا نام تھا۔ ان حضرات کے علاوہ مفتی دلدار حسین صاحب بھی معروف شخص تھے۔

(ماخوذ از ماہنامہ حقائق لکھنؤ، جمادی الثانی ۱۳۵۴ھ ص ۲۵،۳۶)

علم دینیہ کی ترویج کے لئے بیس مدرسے جناب سلطان العلماء اور سید العلماء کی تحریک سے قائم ہوئے جو انہی کی نگرانی میں تھے، ایک بہت بڑا مدرسہ ''مدرسہ شاہی'' کے نام سے قائم ہوا جس کے مدرس اعلیٰ جناب سید العلماء کے دوسرے صاحبزادے مولانا سید محمد تقی صاحب قبلہ تھے۔ جن کو بادشاہ کی طرف سے ''ممتاز العلماء فخر المدرسین'' خطاب ملا تھا۔ آپ کی ماتحتی میں دیگر مدرسین مثل جناب مولانا سید احمد علی صاحب قبلہ محمد آبادی اور جناب مولانا مفتی محمد عباس صاحب قبلہ اور جناب مولانا شیخ علی اظہر صاحب قبلہ اور جناب مولانا سید حامد حسین صاحب قبلہ ایسے حضرات معقول تنخواہ پر ملازم تھے۔ اس مدرسہ کے افتتاح کے روز جناب سلطان العلماء اور سید العلماء کی مع ان کے اولاد و اصحاب و تلامذہ کے بادشاہ کی طرف سے دعوت کی گئی۔ مصنف تجلیات کا بیان ہے کہ ۲ جمادی الاول ۱۲۵۹ھ جناب سلطان العلماء و سید العلماء مع اولاد و اصحاب شہر کے تمام فضلا اور طلباء کو لیکر مہمانی سلطانی میں تشریف فرما ہوئے۔ دیر تک بادشاہ سے باتیں رہیں۔ آخر میں انعام و اکرام سلطانی پر فائز ہوئے۔ یہ دعوت نہایت پر تکلف تھی۔'' تجلیات، ص ۷۷ اس مدرسہ کی افتتاح کی تاریخ جناب مفتی میر عباس صاحب نے خوب نظم فرمائی ہے جس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

---

(۱) تذکرۂ بے بہا فی تاریخ العلماء و تذکرۂ حفاظ شیعہ حصہ دوم، ص ۱۳۶

چون باقبال سلیمان جہان شاہِ زمان
که پرش کاسۂ دریوزه گری آمد جم
تتق سلطنتش بسته سمک تابه سماک
بہرۂ مملکتش رفته عرب تابه عجم
شاه امجد علی آن سایۂ الطاف خدا
بانی عدل وکرم قابع بنیاد ستم
کرد تحریک درآن امر حسن شام و سحر
پیش نواب فلک رتبه وزیر اعظم
آن که رونق ده دین است وامین دولت
مه علم، مہر شیم ، زہره حشم چرخ ہمم
نیر برج ہدی وارث وہمنام حسین
آن که در علم وعمل گشته وحید عالم
تا پس از چہلم شاه دوسرا سبط نبی
مژدۂ مدرسه بگذاشت بدلہا مرہم
شد نہاں شاخ تمنا ز ہجوم دلہا
چوگل وغنچه میان قطرات شبنم
قوت نامیه بعد از دوسه مه از سر نو
برسر شاخ کہن میوه رسانید بہم
پنجشنبه دوم ماه جمادی الاولیٰ
که زعیش وطرب آورده بہار خرّم
شد بنا مدرسۂ تازه بامداد حسین

پس ہمیں مصرع تاریخ رقم کرد قلم

اسی مدرسہ کی ایک تاریخ جناب مفتی صاحب نے اور بھی نظم فرمائی ہے جس کا آخری شعر پیش کیا جاتا ہے۔

بیت معمور ہدیٰ مدرسۂ سلطانی

۱۲۵۹ھ بعد تعمیہ سہ عدد

نزهه گاه کملا مدرسه خاقانی

۱۲۵۹ھ بعد تعمیہ چہار عدد

جناب سلطان العلماء کی ترغیب وتحریک سے شاہی خزانہ پر ایک بہت بڑی رقم زکوٰۃ کی معین کی گئی جو ان کے پاس آیا کرتی تھی وہ رقم مساکین اور محتاجین پر تقسیم ہوتی تھی اور اس کے لئے ایک خاص محکمہ معین کیا گیا تھا جس کا انتظام جناب مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ خلف اصغر حضرت سید العلماء طاب ثراہ سے متعلق تھا اور ان کو ''زبدۃ العلماء معین المومنین'' خطاب عطا ہوا تھا اور وہ انتہائی احتیاط سے زکوٰۃ تقسیم فرماتے تھے اور اس خیال سے کہ کوئی شخص تغلب و تصرف نہ کرنے پائے بارہ مسدی ملازم رکھے تھے جن میں سے ہر ایک کے پاس ایک رجسٹر ہوتا تھا جو دوسرے رجسٹر کی نقل نہیں بلکہ اصل ہوتا تھا۔ اس لئے ہر زکوٰۃ لینے والے کو بارہ جگہ اپنا نام لکھوانا پڑتا تھا اور پھر وہ تمام رجسٹر مطابق کئے جاتے تھے اس چھان بین کی اصل غرض وغایت یعنی حفاظت اموال زکوٰۃ کے مقصد تک عام لوگوں کے فکر وخیال کی رسائی نہ تھی۔ وہ اس طرزِ عمل کی ظاہری سختی ودشواری سے عاجز تھے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں کسی نے کہا تھا۔

سید نقی کا ظلم و جفا وامصیبتا

بارہ مسدی ایک گلا وامصیبتا

یہ حضرات تو وہ تھے جن کے سپرد بادشاہ کی طرف سے کچھ عہدے اور مناصب تھے لیکن ان حضرات کے علاوہ بہت سے ایسے حضرات خاندانی برسر اقتدار تھے جنہوں نے کسی وجہ

سے کوئی شاہی عہدہ منظور نہیں کیا۔ ان میں سب سے پہلا نام جناب سلطان العلماء کے چھوٹے بھائی جناب سید حسین صاحب علیین مکان کا ہے آپ کے اوپر بھی شاہی نظر ویسی ہی پڑتی تھی جیسی سلطان العلماء پر چنانچہ مثل سلطان العلماء کے آپ کا بھی کوئی نام نہ لیتا تھا بلکہ چھوٹے قبلہ وکعبہ کہے جاتے تھے۔ حضرت امجد علی شاہ نے آپ کو بھی خطاب دیا تھا اور مہر خطابی کندہ کرا کے بھیجی تھی جس پر یہ عبارت تھی۔

''حاوی علوم دین حامی سادات ومومنین حافظ احکام الٰہ موردعنایات حضرت امجد علی شاہ سید العلماء مجتہد العصر مولوی سید حسین ابن المرحوم سید دلدار علی غفران مآب۔''

آپ کے بعد جناب سید بندہ حسین صاحب تھے جن کو سلطان عالم حضرت واجد علی شاہ کی بارگاہ سے ''ملک العلماء'' کا خطاب عطا ہوا تھا۔ آپ کی خطابی مہر پر یہ عبارت تھی۔

''ملک العلماء تاج الاتقیاء افسر المومنین رئیس المسلمین عرش کلاہ موردتفضلات بیغایات حضرت واجد علی شاہ مجتہد العصر والزمان نائب حبیب ایزدمنان مولانا سید بندہ حسین صاحب۔

آپ بھی علم وورع میں اپنے باپ اور چچا کے قدم بہ قدم تھے اور ان حضرات کی زندگی ہی میں آپ کو مرجعیت اور شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ آپ کے زہد وورع کا سکہ بھی اسی طرح دلوں پر بیٹھ چکا تھا یہاں تک کہ آپ کا نام لینا سوء ادب خیال کیا جاتا تھا بڑے قبلہ وکعبہ اور چھوٹے قبلہ وکعبہ سلطان العلماء اور سید العلماء کے لئے مخصوص ہو چکا تھا۔ اور مطلق قبلہ وکعبہ سے سلطان العلماء ہی مراد لئے جاتے تھے۔ اس وجہ سے آپ جناب کہے جانے لگے۔ جو رفتہ رفتہ ایسا مقبول ہوا کہ ہر ایک دارائے اجتہاد کو اپنے اپنے حلقہ اثر میں جناب کہا جانے لگا۔

ان حضرات کے علاوہ اور افراد خاندانی بھی ہیں جو شاہی خطاب سے سرفراز ہوئے۔ مثلاً جناب سید العلماء کے بڑے صاحبزادے جناب مولانا سید علی حسین صاحب قبلہ کو زین العلماء عضد الدین کا خطاب ملا تھا۔ اور جناب زبدۃ العلماء کے صاحبزادے جناب مولوی ہدایت حسین صاحب قبلہ کو نجم العلماء کا خطاب ملا تھا۔ اسی طرح اور حضرات بھی ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

جناب سلطان العلماء کا ذاتی وقار ارکان سلطنت اور عام افراد کی نگاہوں میں بادشاہ سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہ تھا۔ جس کا ثبوت اس واقعہ سے ہوتا ہے۔

واقعہ

ایک مرتبہ(۱) نصیرالدین حیدر بادشاہ ایک بات پر اس درجہ خفا ہو گئے کہ فوج کے افسر اعلیٰ (کپتان فتح علی خاں) کو حکم دیا کہ سلطان العلماء کا مکان توپ سے اڑا دیا جائے افسر مذکور نے دو توپیں لگوائیں ایک سلطان العلماء کے مکان پر دوسری بادشاہ کے محل پر جب یہ دونوں توپیں چڑھ گئیں تو بارگاہ معلیٰ میں پرچہ گذرا فوراً طلب کئے گئے اور سبب پوچھا تو کہا کہ آپ بادشاہ دنیا ہیں اور وہ بادشاہ دین آپ کا حکم میرے لئے واجب التعمیل ہے۔

اس لئے میں نے توپ چڑھوا تو دی لیکن میری حمیت ایمانی نے گوارا نہ کیا کہ بادشاہ دین کا مکان توپ کا نشانہ بنے اور بادشاہ دنیا کا محل سامنے کھڑا رہے لہٰذا میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ بادشاہ دین و دنیا دونوں کا مکان ایک ہی وقت میں اڑا دوں یہ سن کر بادشاہ بہت خوش ہوئے اور خلعت اور انعام دیکر رخصت کیا۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطان العلماء کبھی مسائل شرعیہ میں سلطان وقت کے جاہ وجلال سے مرعوب نہ ہوئے اور ہمیشہ اپنے وقار و تمکنت کو قائم رکھا اور اگر ضرورت ہوئی تو بادشاہ کے مقابلہ میں اپنی سطوت مذہبی کا مظاہرہ بھی کر دیا۔

چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ نصیرالدین حیدر بعض ان لوگوں کے بھڑکانے میں آ گئے جن کو جناب سلطان العلماء کے اقتدار سے ہمیشہ حسد رہتا تھا اور برابر بادشاہ کو جناب کے خلاف اشتعال دیتے رہتے۔ جہاں پناہ کبھی سن لیتے اور کبھی ڈانٹ دیتے۔

---

(۱) حیات رضوان مآب، تذکرہ بے بہائی تاریخ العلماء

لیکن حاسد مختلف طریقوں سے جہاں پناہ کو بھڑکاتے تھے۔ رفتہ رفتہ روز کے کہنے سننے سے یہ اثر ہوا کہ بادشاہ کے دل میں بھی سوئے ظن پیدا ہو گیا اور آخر یہ نوبت پہونچی کہ جناب کی اہانت (۱) کے خیال سے ایک مسئلہ پوچھنے کو بلوایا ایک کرسی پر خود بیٹھے ایک پر قلمدان رکھوا دیا دل میں یہ خیال کیا کہ جب جناب آئیں گے تو تعظیم نہ کروں گا اور چونکہ دوسری پر قلمدان رکھا ہوا ہے لہٰذا ان کو سامنے ہی کھڑا رہنا پڑے گا۔

جب جناب تشریف لائے تو بادشاہ بالاخانے پر تھے یہ بھی وہیں بلوائے گئے جب آخری زینہ پر قدم رکھا تو عصا ٹیک کے ذرا بلند آواز سے یا اللہ کہا اور بادشاہ کے سامنے آ گئے اس آوازہ توحید کا وہ اثر تھا کہ بادشاہ بے اختیار تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

جناب نے قریب پہنچ کر قلمدان اٹھا لیا اور بیٹھ گئے اس کے بعد بادشاہ نے ایک مسئلہ پوچھا جناب نے جواب دیا اور فوراً رخصت ہو گئے۔

جناب کے تشریف لے جانے کے بعد بادشاہ بہت نادم ہوئے اور کہا کہ واقعی ان کے عالم دین اور نائب امام ہونے میں کوئی شبہ نہیں میں نے ارادہ کیا تھا کہ تعظیم نہ کروں گا مگر جب وہ سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ کسی نے بغلوں میں ہاتھ دے کے کھڑا کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد سے بادشاہ کے دل میں جناب کی عظمت اور روحانیت کا سکہ بیٹھ گیا تھا اور اب کسی میں جرأت نہ تھی کہ مخالفت میں زبان کھول سکے آخر دوسری تدبیر سوچی گئی، اور بادشاہ کی محبوب بیوی کو اس پر آمادہ کر لیا کہ جہاں پناہ کو آپ کی طرف سے برگشتہ کریں انہوں نے ایک روز خلوت میں موقع پا کر کہا کہ آپ جو مجتہد صاحب سے بہت عقیدت رکھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آپ کے مزاج سے واقف ہو گئے ہیں وہ مسائل آپ کی مرضی کے موافق بتاتے ہیں آپ اسی کو حکم شرع سمجھتے ہیں اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو ایک دن تجربہ کے لئے امتحان کیجئے۔

---

(۱) تذکرہ بے بہا فی تاریخ العلماء

بادشاہ اگرچہ بارہا امتحان کر چکے تھے، مگر دشمن بدگوکو مجوج وساکت کرنے کی غرض سے امتحان لینے پرآمادہ ہوگئے اور مسئلہ ایسا میدان امتحان میں لایا گیا جو ہرشخص جانتا ہے اور اس کے خلاف حکم شرع کسی طرح نافذ نہیں ہوسکتا یہ اس لئے کہ تاویل کی گنجائش نہ رہے، اور بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے چنانچہ چوبدار خاص کے ذریعہ سے پوچھوایا گیا کہ ایک کنیز جو والد ماجد کے متعہ میں تھی اس سے میں متعہ کرنا چاہتا ہوں لہٰذا حکم شرع کیا ہے؟

جناب نے کہلوا بھیجا کہ قطعاً حرام ہے۔

بادشاہ نے مسئلہ کا جواب اپنی بیوی سے بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ مجتہد صاحب کو ابھی یہ معلوم نہیں کہ آپ کی دلی خواہش ہے اس وجہ سے انہوں نے جواب بھی ٹھیک ٹھیک دے دیا، لہٰذا آپ یوں کہلوائیے کہ جہاں پناہ کا اس پر دل آ گیا ہے، اس کے جواب میں جناب نے فرمایا کہ کسی کے دل آجانے کا اثر مسئلہ شرعی پر نہیں پڑتا۔

اس جواب پر بادشاہ کو بھڑکانے کا موقع مل گیا اور کہا گیا کہ آپ نے ان کو اس قدر سر چڑھا دیا ہے کہ اب آپ کا خوف ان کے دل میں باقی نہیں رہا لہٰذا ذرا سخت لہجہ اور عتاب آمیز الفاظ میں مسئلہ پوچھا جائے چنانچہ کہلوایا گیا کہ ذرا سمجھ کے جواب دیجئے۔ چنانچہ جناب نے فرمایا کہ میں کسی بات کا جواب بے سمجھے نہیں دیتا نہ کہ شرعی مسئلہ کا۔ اس جواب کے بعد سوال کے الفاظ اور سخت ودرشت کئے جانے پر اصرار کیا گیا اور کہلوایا گیا کہ اب آپ کو سردربار حاضر ہو کے جواب دینا پڑے گا۔

جب یہ پیغام سنا تو غصہ سے چہرہ سرخ ہو گیا اور فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے سپاہیانہ لباس زیب جسم کیا اور تمام اسلحہ آراستہ کئے اور فینس پر جاتے تھے آج گھوڑے پر سوار ہوئے سرخ عمامہ باندھا آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ خون ٹپک رہا ہے اس شان سے خلاف معمول گھر سے باہر قدم نکلا ہی تھا کہ سارے شہر میں یہ خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی کہ آج مجتہد صاحب بادشاہ سے لڑنے جارہے ہیں، دارالامارہ تک پہونچتے پہونچتے ہزاروں کا مجمع ہو گیا مومنین میں

ایک خاص جوش اور عظیم ہیجان تھا، جس کا مظاہرہ وہ صلوات کے نعروں سے کر رہے تھے ان پر جوش نعروں سے زمین آسمان ہل رہے تھے جس نے جہاں سنا وہ سیدھا محل سرائے شاہی کی طرف دوڑا۔ تھوڑی دیر میں محل سرا کے آگے ٹھٹھ لگ گئے، جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی سر ہی سر نظر آتے تھے مومنین کے جوش کا یہ عالم تھا کہ کوئی اپنے بس میں نہ تھا۔

ادھر جناب رضوان مآب بادشاہ کے سامنے پہونچ گئے جہاں پناہ اٹھ کھڑے ہوئے تعظیم کی اور متعجبانہ لہجے میں اس شان سے تشریف لانے اور باہر کے شور وغل کا سبب پوچھا جناب نے فرمایا کہ میں اب مسئلہ کا جواب تلوار سے دینے آیا ہوں یہ سن کر بادشاہ سمجھ گئے اور سارا واقعہ بیان کر کے بہت معذرت کی، جناب چونکہ مجمع کے انتشار اور جوش سے واقف تھے اس لئے فوراً واپس ہوئے اور مجمع کو مطمئن کیا اس وقت لوگ اپنے اپنے گھر واپس ہوئے۔

نصیر الدین حیدر کے بعد محمد علی شاہ اور ان کے بعد امجد علی شاہ تو جناب کی عظمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ حضرت (۱) امجد علی شاہ برابر آپ کے شریعت کدہ پر تشریف لاتے تھے اور نہایت تواضع وانکسار سے پیش آتے تھے۔

سلطان عالم حضرت محمد واجد علی شاہ نے بھی ان حضرات کی تعظیم میں کسی طرح کی کمی نہیں کی اور وہی حسن عقیدت تھا جو ان کے اسلاف کا تھا، جس کے گہرے نقش آج تک دلوں کے صفحوں اور تاریخوں کے ورقوں پر ابھرے ہوئے ہیں اور یہ اوصاف شاہان اودھ کے مٹ نہیں سکتے۔

شاہان اودھ چونکہ مذہباً شیعہ تھے لہٰذا ان پر ارشاد وہدایت کا یہ اثر پڑا کہ تاریخ کے صفحات ایسے سلاطین پیش کرنے سے عاجز ہیں، سلطنت مٹ گئی مگر چشمہ فیض آج بھی جاری ہے۔
(ماخوذ از ماہنامہ حقائق، لکھنؤ، رجب المرجب ۱۳۵۴ھ ۶۱-۶۲)

---

(۱) حیات رضوان مآب، ص ۳۸، تذکرہ بے بہا

خاندان اجتہاد کی داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ عراق و ایران تک آوازہ شہرت پہونچا ہوا تھا، اور وہاں کے علماء وارباب احتیاج کے خطوط برابر آتے رہتے تھے جن پر توجہ بھی مبذول ہوتی تھی، ان میں کے اکثر خطوط جناب مفتی میر عباس صاحب نے جمع کر کے ظل ممدود کے نام سے کتابی صورت میں شائع کئے ہیں۔

جناب رضوان مآب کی تحریک سے نواب غازی الدین حیدر نے تین کروڑ روپیہ ممتاز محل اور سرفراز محل کے نام سے حکومت انگریزی (ایسٹ انڈیا کمپنی) کے پاس محفوظ کرادیا جس کا سود دس ہزار تین سو روپیہ ماہوار آج تک عراق میں علماء اور طلباء اور مومنین ومجاورین کربلا ونجف پر تقسیم ہوتا ہے اس کا نام خیریہ اودھ ہے۔

نصیر الدین حیدر نے ایک خیرات خانہ جناب رضوان مآب کی سعی سے قائم کیا جس میں قوم کے یتیم اور بیوہ عورتیں پرورش پائیں یہ خیراتخانہ بھی آج تک قائم ہے۔

جناب سید العلماء نے حضرت محمد علی شاہ کو ترغیب وتحریص دلا کے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ نہر حسینی کی درستی کے لئے حاصل کر کے آقا سید ابراہیم صاحب ضوابط کے پاس ایک خط کے ساتھ بھیجا اس خط کے چند فقرات ظل ممدود کے، ص ۸۶ سے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

ابو الفتح معین الدین محمد علی شاہ خلد اللہ سلطنتہ مقرونۃ بالعز والجاہ حیث ان رغبۃ الی خدمات المشاهد الكريم سلام الله على اعتابها وعلى من جل بترابها لما سمع اخیر اختلال النهر الحسيني العطف طباعه الى تتميمه وتصفيه وترميمه دفعاً لمصرۃ السّائرين وجلباً لمسرۃ الزائرين فامرسدان خزانة العامرة واشار با نامله الهامرة الى ارسال مائة وخمسين الف روبية لكهنو ية وجعل امره وتولية اليك بالتماس اقل البرية وما هى مرسلة اليك بوساطة الانگلشية۔

بادشاہ معظم نے بسبب اس انتہائی رغبت کے جو انہیں مشاہدہ مشرفہ کی خدمت کے

ساتھ ہے جب نہر حسینی کے خلل پذیر ہونے کی خبر سنی تو توجہ مبذول فرمائی اس کی تکمیل وترمیم کی طرف لہٰذا خزانہ سرکاری کو حکم ہوا کہ ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ بہ سکہ لکھنؤ بھیجا جائے اور میری التماس سے اس کی نگرانی آپ کے متعلق کی اور انگریزی حکومت کی وساطت سے یہ آپ کو بھیجا جاتا ہے۔

اور تیس ہزار روپیہ روضہ حضرت ''ابوالفضل العباس'' علیہ السلام کے نقرئی دروازوں کی تجدید اور ایوان طلا کی تعمیر کے لئے بھیجے۔ روپیہ اور خط پہونچنے کے بعد صاحب ضوابط نے جو خط بھیجا تھا اس کا ایک ٹکڑا یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

ثم لا یخفی علی جنابکم ان المبلغ الذی تعطف باجماله وتلطف بارساله وتحمّل بفضله وتبجّل ببره وجوده وطوله الملك الافخم والسّلطان الاحشم الاکرم امیرالامراء العظام ظهیر العلماء الفخام حامی الشریعة الغراء ونصیر الفرقة الحقة المحقة شیعة الائمة النقبأ علیهم الأف التحیّة والثناء مدّ الله فی اطناب ظلاله علی مفارق المسلمین وعمر الله بجنود ملکه الشریف مدارس علمائه الاطیبین لاصلاح ماانکسر من روضة مولی الناس ابی الفضل العباس علیه السلام والتحیّة وهو ثلثون الف روبیة قد وصل وبمضّی مدة اشتغل باصلاح ذالك المحل کما رقم السّلطان الاجل ولعمر الله لنعم مافعل وحبّذ اما اهتدی فدل فانه اسم یبقی فی السنین والا عوام الی قیام القیام لا زال فی توفیق الله وعنایته مقضی المنی بحمایته وقد تسلمت قبض وصول المبلغ المرموز فی بغداد المستند الاخیار البا لیوز لعله ارسل ووصل ایضا المبلغ الّذی ارسلتموه من باب التلطف والاحسان لاهل الفقر والایمان سیّما الهند یین القاطنین فی هذه المظان وهو

ثلثة الاُف وثلاثمائة وثمان وستون روفية رائجة العراق فجعلته نصفين وراعيت فی ادائه علی الفريقين ماامرت قاصداً منه ابراء ذمة ذلك المويّد الموفق زيد مجده وتوفيقه من المستحقين وستصل الی جنابكم مع هذه الذريعة فيوضه كما وصل اليهم فيوضه والذی امر به السلطان الاعظم ادام الله احسانه للمومنة الهندية المسمّاة سكينه خانم وهو ثمان مائة واثنان واربعون روفيه برائجنا فقد وصل ايضا واو صلته اليها وسيصل اليكم قبض وصوله۔

(ظل ممدود، ص ۵۶)

مخفی نہ رہے جناب پر کہ وہ رقم جو بنظر مرحمت و احسان روانہ کی بادشاہ امیرالامراء ظہیرالعلماء حامل شریعت غرانصیر فرقہ حقہ شیعہ مدظلہ نے روضہ حضرت ابوالفضل العباس علیہ السلام کی شکست وریخت کی اصلاح کے لئے وہ تیس ہزار روپیہ پر مشتمل تھی وصول ہوئی اور کچھ مدت سے میں حضور بادشاہ کی تحریر کے بموجب اپنی نگرانی میں اس کام کو انجام دلا رہا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ ممدوح نے یہ بہترین خدمت انجام دی ہے جس سے ان کا نام قیام قیامت تک باقی رہے گا۔

میں نے اس کی رسید بغداد میں بالیوز کے سپرد کردی ہے غالباً انھوں نے بھیجی ہوگی نیز وہ رقم جو آپ نے از راہ لطف واحسان فقراء واہل ایمان کے لئے عموماً ہندوستانیوں کے لئے خصوصاً جو ان اطراف میں مقیم ہیں اور وہ تین ہزار تین سو اڑسٹھ روپیہ بسکہ رائج الوقت عراق ہیں وہ بھی وصول ہوئے اور میں نے اس کو آپ کی ہدایت کے بموجب ہندستانیوں اور غیر ہندستانیوں کے لحاظ سے دو حصوں پر برابر تقسیم کر دیا ہے اور اس کی بھی رسید آپ کو پہونچے گی۔ نیز بادشاہ معظم نے ہندوستانی ایک مومنہ سکینہ خانم کے لئے جو آٹھ سو بیالیس روپیہ ہمارے سکہ سے روانہ کئے ہیں وہ بھی پہونچے اور میں نے ان مومنہ تک اسے پہونچا دیا۔

جناب علیین مکان نے اس کا جو جواب لکھا ہے اس میں علاوہ ان رقموں کے رسید کی وصولیابی کے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ:

میں نے آپ کا خط بادشاہ کی خدمت میں پہونچا دیا اور انہوں نے مخصوص آپ کے لئے ایک ہزار روپیہ کی رقم عطا فرمائی ہے جو بطور ہدیہ آپ کو بھیجی جاتی ہے اور حکیم صاحب میرے ذریعہ سے آپ کو دو ہزار پانچ سو روپیہ بھیج رہے ہیں جنہیں آپ اہل علم پر تقسیم کر دیں۔

حضرت محمد علی شاہ نے جب حسین آباد کا امام باڑہ بنوایا تو جناب رضوان مآب نے مشورہ دیا کہ اس کے مصارف کے لئے کچھ روپیہ ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے پاس محفوظ کر دینا چاہئے، چنانچہ بادشاہ نے...... ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے پاس جمع کر دیا جس کے سود سے آج حسین آباد ٹرسٹ قائم ہے اس ٹرسٹ کے متعلق نہایت آسانی سے اتنا کہا جا سکتا ہے کہ آج دنیا میں اتنا بڑا وقف کوئی نہیں جس سے اتنے امورِ خیر انجام پاتے ہوں۔

حضرت سید العلماء نے محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ سے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ حاصل کر کے نہر آصفی کی ترمیم وتعمیر کے لئے صاحب جواہر کے پاس بھیجے جس سے نجف اشرف کے لوگوں کو پانی کی آسانی ہو اور پندرہ ہزار روپیہ حضرت مسلم وہانی کے روضہ کی تعمیر اور ''مسجد کوفہ'' کی مرمت کے لئے بھیجا۔

صاحب جواہر رحمہ اللہ نے جب نہر کھدوانا اور حضرت ہانی ومسلم روضہ کی تعمیر اور مسجد کوفہ کی مرمت کا کام شروع کیا تو اپنے رشید شاگرد اور باکمال شاعر حضرت شیخ ابراہیم قفطان آل یحییٰ العاملی کو حکم دیا کہ وہ ایک قصیدہ کہیں جو مدح بادشاہ اور مدح سلطان العلما وسید العلماء اور تاریخ تعمیر وتجدید مسجد کوفہ وغیرہ پر مشتمل ہو، موصوف نے حکم کی تعمیل میں ایک خط کے ساتھ وہ قصیدہ بھیجا، ہم اس کو ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے پیش کرتے ہیں۔

ثم لایخفی علیٰ جنابکم انه لما شرع جناب شیخنا ومولانا واستادنا المرحوم المبرور الشیخ قدّس سره بحفر النهر فی ظهر النجف

الاشرف وبناء حضرة مولانا مسلم بن عقیل رضوان الله علیهما سألنی ان انظم قصیدہ تحتوی علیٰ مدح السیدین الاجلین المولویین دام علاهما وعلی مدح السّلطان الاعظم ونجله الخاقان الفخم طیب الله ثراهما وعلی ذکر خواص النهر المذکور وبناء الحضرة المذکورة لیکون ذلك نورا علی نور وبوقتها امتثالا لامر جناب شیخنا المشار الیه رحمة الله علیه قد نظمت قصیدة عزاء وختمتها بتاریخ لتلك المادة فی هاتیك الحضرة العلیا واوّل القصیدة المزبورة هو هذا۔

واضح ہو کہ جب ہمارے استاد معظم شیخ صاحب جواہر نے نہر نجف اشرف کی پشت پر کھدوانا شروع کی اور جناب مسلمؑ کے روضہ کی تعمیر کا کام شروع ہوا تو مجھ سے خواہش کی کہ میں ایک قصیدہ نظم کروں جو دونوں جلیل القدر آقایان اور نیز بادشاہ معظم کی مدح اور نہر کے خواص اور روضہ مذکورہ کی تعمیر کے تذکرہ پر مشتمل ہو

لہٰذا میں نے موصوف کے حکم کا امتثال کرتے ہوئے یہ قصیدہ نظم کیا اور اس میں آخر میں مادہ تاریخ درج کیا ہے۔ ابتدا اس قصیدہ کی یہ ہے۔

قصیدہ

ان سلطان سلاطین الوریٰ
فخر ارباب المعالی والدول
ذوالنهی امجد علی شاة الذی
منح التاج وباالملك استقل
اصید کم من ملك سامی الذری
فی حمی ظل معالیه استظل

وملیك دین آل المصطفیٰ
عرفی ایامه والکفر ذل
واغر لاح فی افلاکه
کوکبا فضل بدامن غیر کل
مولیا نا المولویان ومن
کل فضل حویا من غیر کل
اورداه منهل العلم الذی
شربا من عذبه نهلا وعل
فجری جریا الیه فی العلی
والحیامن فیض کفه استهل
رمق الدّنیا فلما ان رایٰ
مررج الفضل بکو فان اضمحل
بذل الاموال الله وما
راح الا وهوا وفی من بذل

بادشاہ بادشاہان خلق۔فخر ارباب بلندی ودولت عاقل ودانشمند امجد علی شاہ جنہیں قدرت نے تاج عطا کیا اور وہ مستقل سلطنت کے مالک ہوئے۔ایسے بلند مرتبہ کہ نہ معلوم کتنے بادشاہ بلند درجہ والے ان کے سایہ اقبال میں پناہ لئے ہوئے ہیں۔

ایسے بادشاہ کہ دین نبوی نے جن کے زمانے میں عزت پائی اور کفر ذلیل ہوا، اور ایسے روشن چہرہ والے کہ جن کے آسمان میں دو ستارے علم وعمل کے طالع ہوئے ہمارے مولا وآقا دونوں آقایان کرام جنہوں نے ہر فضیلت کو بغیر کسی محنت ومشقت کے حاصل کیا انہوں نے بادشاہ کو پہونچا دیا علم کے اس گھاٹ پر جس کے شیریں پانی سے وہ خود بار بار سیراب ہو چکے تھے،

پس جاری ہوا فیض ان کا بلندی میں اور چشمے ان کے دست کرم کے ابل پڑے انہوں نے دنیا کی طرف نظر ڈالی اور جب دیکھا کہ فضیلت اور شرف کا محل کوفہ میں کمزور ہو گیا ہے۔ تو انہوں نے خدا کی خوشنودی کے لئے اموال صرف کئے اور ہر شخص سے زیادہ سخی ثابت ہوئے۔

ومنها

خط نهرا بين اكنا ف الحمیٰ
فاز بالبشرىٰ لديه من نهل
كوثر فی جنته حل بها
حيدر سيد سادات الملل
وسبيل واضح للخير بل
سلسبيل غلل الصادين بل
مااهتدىٰ يوماً له حظ امرء
غير سلطان اذا قال فعل
اى نهر عم نفعاً بالحمیٰ
وحما من حل فيه وارتحل
صان من كوفان انعاظالما
كان مرفا كل خوف ووجل
كم هما م زمام ذالصنع وما
مدباعانحوه حتى نكل
فانثنیٰ عن نيله مرتد يا
حلل العجز وايراد والكسل
هكذا فليعمل العامل او

فلیقف من دون غایات الامل

انہوں نے بنیاد قائم کی ایک نہر کی نجف کے اطراف میں، جو سیراب کرنے کی ضامن ہے، وہ ایک کوثر ہے اس جنت میں جہاں قیام کئے ہوئے ہیں امیر المومنین سید سادات خلق اور وہ ایک واضح راستہ ہے نفع کا جو پیاسوں کی پیاس کا بجھانے والا ہے۔ یہ ایسی خدمت تھی جو کسی کو نہ سوجھی سوائے اس بادشاہ کے جو اپنی بات پر عمل کرنے والا ہے۔

کیا کہنا اس نہر کا جس کا نفع اس شہر میں عام ہو گیا ہے اور اس نے حفاظت کی یہاں پر حاضر و مسافر کی جان کی۔ اس نے محفوظ رکھ لیا کوفہ کے ایک ایسے محل کو جو بہت خوف اور اندیشہ کا مرکز تھا۔

کتنے بلند مرتبہ لوگ ایسے تھے جنہوں نے اس کے بنوانے کا ارادہ کیا اور ہاتھ کے پہلے ہی قدم پیچھے ہٹا لیا اور اپنے مقصد سے باز آ گئے پہنے ہوئے عاجزی کا لباس اور سستی کی چادریں۔ بے شک اس طرح کا کام کرنا چاہئے کام کرنے والے کو اور نہیں تو ہوس ہی نہ کرے۔

(اس کے بعد موصوف نے درمیانی اشعار چھوڑ دیئے ہیں اور لکھا ہے کہ آخری حصہ یہ ہے)

ومنہا

شاد من ارکان اعلام الھدیٰ
ودعامات المعالی مانزل
وبنی فی الکوفة الغراء ما
طال فخراوعلی الشعریٰ اطل
حضرة القدس التی فی ضمنھا
مسلم بل مھجة الاسلام ھل
ناصر السّبط ووافیه ومن

کان له حساماً لا یغلّ
واستناراً لا فق من ماذنة
قد تسامت وبها الحسن اکتمل
کبر الذا کر فیها واحداً
احداً فرداً کبیراً لم یزل
وغداً یلهج فی تاریخها
علناً حیی علیٰ خیر العمل

انہوں نے مضبوط کیا ہدایت کے ارکان اور رفعت کے ستونوں میں سے اس کو جو نیچے گر گیا تھا، اور بنیاد قائم کی کوفہ میں اس عمارت کی جو فخر میں ستارہائے فلک سے آگے ہے، وہ مقدس بارگاہ جس میں حضرت مسلمؑ دفن ہیں، بلکہ اسلام کا دل، بلکہ سبط پیغمبرؐ کا مددگار، اور وہ کہ جو دین کے لئے نہ کند ہونے والی تلوار تھا اور افق آسمان روشن ہو گیا ایسے مینار سے جو بلند ہوا اور اس سے حسن کامل ہو گیا اس میں مؤذن عظمت کا اظہار کرتا ہے اس واحد احد خدا کی جو فرد ہے اور ہمیشہ سے موجود ہے اور وہ اس کی تاریخ کہتا ہے حی علیٰ خیر العمل۔

کیا کہنا ان سلاطین کا جنھوں نے خدمات دینیہ میں اپنی سلطنت و دولت کی بڑی طاقت صرف کی وہ اپنا نام زندہ چھوڑ گئے اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

[ماخوذ از ماہنامہ حقائق، لکھنؤ، شعبان المعظم ۱۳۵۴ھ ص ۷۳ / ۴۴]

❀ ❀ ❀

ابوالظفر بہادر شاہ کا تبدیل مذہب

مصنف

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمس، کراچی، پاکستان

ابوالظفر بہادر شاہ کا تبدیل مذہب

تاریخ کا ایک کھویا ہوا ورق اور ذوق جستجو کی ظفریابی

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمسؔ، کراچی، پاکستان

یہ تاریخی انکشافی مقالہ جو خاص حقائق کے لئے تحریر کیا گیا ہے شائع کرتے ہوئے باخبر وسیع المطالعہ حضرات سے تمنا کی جاتی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں جو کچھ ان کے معلومات ہوں انہیں بھی تحریر فرما کر حقائق کو مرحمت فرمادیں۔ تا کہ تاریخی واقعہ مکمل حیثیت سے محفوظ ہو جائے۔ (مدیر ماہنامہ حقائق لکھنؤ)

زمانہ کا ورق الٹتا ہے تو اپنے تمام نقوش اپنے ساتھ لیتا جاتا ہے کچھ دن تک حافظہ کے دفتر میں ان کی یادداشت قلمبند رہتی ہے پھر اس کی لکیریں بھی مدھم پڑتی جاتی ہیں اور یاد رکھنے والوں کا کارواں گذر جانے کے بعد پھر ان کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں رہتا۔

اگر یہ نہ ہوتا تو ہر ماضی اپنے مستقبل میں حال کی طرح پیش نگاہ ہوتا اور زمانہ کی بے ثباتی کا راز ہی نہ کھلتا۔

اس طرح نہ معلوم کتنے تاریخی اوراق ہیں جو اس وقت فنا ہو چکے ہیں اس طرح کہ ان کی حیات ثانیہ محال ہے اور دم عیسیٰ بھی ان میں جان ڈالنے سے عاجز ہے۔

بے شک بعض واقعات ایسے جنکے ساتھ کچھ تحریریں دستاویزیں بھی ہوں بہت دن تک کھوئے ہوئے رہتے ہیں اور پھر جستجو کی کاوش اور پائے طلب کے استقلال کی صورت میں

''جویندہ یابندہ'' کے مصداق کبھی مل جاتے ہیں اوراس کے بعدان کو اگرمحفوظ کر دیا جائے اور ان کی اشاعت ہوجائے تو زندگی جاوید حاصل کر لیتے ہیں۔ ان واقعات میں سے ایک ابوالظفر بہادرشاہ کا تبدیل مذہب ہے جس کے واقعات اس وقت اسی طرح گمشدہ ہیں جیسے سیمرغ کا وجود۔لیکن ہماری جستجو نے ان کا اس طرح پتہ لگایا ہے کہ وہ اپنے تمام اسباب و مقدمات اورنتائج وعواقب کے ساتھ یوں پیش نظر ہوجاتا ہے جیسے آج کا روز۔

اس نایاب ذخیرہ کا خزینہ دار جناب زبدۃ العلماء مولانا سید نقی صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ کا وہ بے مثال مجموعہ تھا جو آپ نے اپنے صاحبزادے جناب نجم العلما وسید ہدایت حسین صاحب قبلہ سے جمع کرایا تھا۔ یہ مجموعہ اس وقت لکھنؤ کے ممتاز طبیب اور باکمال ادیب جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہؔ کی ملکیت ہے۔جس میں سے ہم نے حسب ذیل دستاویزیں اپنے پاس نقل کر لی تھیں اورانہی سے اس واقعہ کے تمام تفصیلات کا علم ہوتا ہے۔

لکھنؤ میں خاندان اجتہاد کے شباب کا زمانہ جبکہ جناب سلطان العلماء اور سید العلماء علمی دنیا میں برسراقتدار تھے اوران حضرات کی ہدایت کی روشنی سے عالم کا چپہ چپہ منور ہورہا تھا دنیا مذہب حق کی طرف کھنچ رہی تھی۔کملائے روزگار اپنے آبائی مذہب کو ترک کرکے مذہب حق میں داخل ہورہے تھے۔

چنانچہ ہندوستان کا شیخ الرئیس حکیم بنّا مرحوم طبیب مع اپنے تین بھائیوں کے جناب رضوان مآب کی ہدایت سے شیعہ ہوا یہی زمانہ تھا کہ جب خاتم شاہان گورگانیہ حضرت ابوالظفر سراج الدین محمد بہادرشاہ شاہزادہ مرزا محمد حیدرشکوہ بہادر اورمرزا نورالدین بہادر کے ذریعہ سے ایک عریضہ اورایک علم رضوان مآب کے پاس بھیجا جس میں اپنے تشیع کا اظہار کیا تھا۔

اس خط کو کسی زمانہ میں اخبار امامیہ نے شائع کیا تھا اور صاحب تاریخ العلماء نے بھی جناب رضوان مآب کے حالات میں نقل کیا ہے لیکن ہمارے پاس پورا مواد موجود ہے جو مذکورۂ بالا مجموعہ سے نقل کیا جاتا ہے۔

بہادر شاہ کا خط سلطان العلماء کے نام

افضل الفقہا افقہ الفقہا سید السادات مقتدائے مومنین ومومنات مجتہد العصر والزمان سلطان (العلماء) دام برکاتہ بحمداللّٰہ والمنتہ کہ محبت وولایت اہلبیت بدل اختیار کردم واز کل اعدائے علی ابن ابی طالب علیہ السلام قطعی تبرّا نمودم وتعمیر امام باڑہ شروع گردیدہ است بعدہ تمامش مجالس تعزیت جناب سید الشہدا علیہ التحیۃ والثنا زیب و تزئین خواہد پذیرفت السّعی منی والاتمام من اللّٰہ مفصل مدارج دینیہ کہ برآن واضح ام بزبان برخوردار کامگار والاتبار سعادت اطوار مرزا محمد حیدر شکوہ بہادر کہ درین خصوص راز داراست دریافت خواہد گشت زیادہ برکات۔

اس خط کا خلاصہ ترجمہ یہ ہے

خدا کے فضل سے میں نے جو دل سے محبت وولایت اہلبیت علیہم السلام اختیار کی اور تمام دشمنان علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے قطعاً برأت وبےزاری کرتا ہوں۔

امام باڑہ بن رہا ہے، بن چکنے کے بعد دھوم سے مجلسیں سید الشہدؑا کی ہوں گی۔کوشش میرا کام اور اس کا پورا کرنا خدا کے ہاتھ۔

میرے جو اعتقادات ہیں ان کی تفصیل برخوردار مرزا محمد حیدر شکوہ بہادر کی زبانی جناب کو معلوم ہوگی جو کہ اس امر خاص میں میرے راز دار ہیں۔

اس خط کے لفافہ پر مہر شاہی ثبت تھی۔

مرزا محمد حیدر شکوہ بہادر مع اس خط کے حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بادشاہ کی خواہش ہے کہ قبلہ وکعبہ اپنے دست مبارک سے اس علم کو درگاہ ''ابوالفضل العبّاسؑ'' میں نصب کریں جو بادشاہ نے مرزا محمد حیدر شکوہ بہادر کے ہمراہ بھیجا تھا۔

جناب نے خط ملاحظہ فرمانے کے بعد دفتر ''بیت الانشائی سلطانی'' میں ایک روبکار مصاحب الدولہ بہادر کے نام بھیجا جس کی عبارت یہ تھی۔

شقه که از شاہجہاں آباد بنام این گمنام رسیده بملاحظه بندگان دارا دربان۔گذرانیده تہیه سامان جلوس ہمراه علم نمایند!

یہ روبکار دفتر ''بیت الانشائی'' سلطانی سے مصاحب الدولہ کے پاس اس طرح بھیجا گیا کہ قاعدہ کے موافق اس کے اوپر ایک چوڑی چٹ لگائی گئی اس کو دفتر کی اصطلاح میں کمر بند پرچہ لکھتے تھے اس پر یہ عبارت لکھی تھی۔

پیام مجمع علوم دین مرجع سادات ومومنین حافظ احکام الٰہ سلطان العلماء مجتہد العصر مولوی سید محمد صاحب یک قطعہ ۵ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ

مصاحب الدولہ بہادر نے حسب حکم اہتمام جلوس علم کیا اور جناب قبلہ وکعبہ نے عمائد شہر اور مرزا محمد حیدر شکوہ بہادر ومرزا انور الدین بہادر کے ہمراہ درگاہ جناب عباسؑ میں علم نصب کیا۔علم کے ہمراہ ایک نظم پڑھی گئی جو بہادر شاہ کی تصنیف تھی۔اور اس کے مضامین مصائب شہدائے کربلا اور تبرائے اعدائے دین پر مشتمل تھے۔

اس کے بعد جناب رضوان مآب نے بہادر شاہ کے خط کے جواب میں یہ خط بھیجا۔

عبارت لفافہ

بعونہ وعنایتہ وسبحانہ وعظم سلطانہ

بشرف ملاحظه معلائے بندگان دارا دربان زبدۂ سلاطین تاجدار صاحبقرانی نجبۂ خواقین کامگار گورگانی افتخار فرما فرمایان سلسله رفیعه شاہجہانی مرکز دوائر عظام سلطنت وجہان بانی مہبت فیوض ہدایت ربانی مسرح انوار عنایات سبحانی السلطان ابن السلاطین الخاقان ابن الخواقین لازال علم دولته علیّا وبالاقبال والاجلال حرّیا۔

(مشرف باد)

اللھمّ صلی علی محمّد وآل محمّد وانصر من نصر دین محمد وآل محمّد۔ گوہر شاہوارے کہ زرّانتاج کلام وواسطۃ العقدنظام باشد۔ حمدوثنائے مبدعی است کہ جبین جبین وبفحوی السّعید من سعد فی بطن امہ درظلمات اورعام بنقوش حسن انجام نگاشتہ وآبائے اخلاف رابموڈے یخرج ای من المیت باخلاف اشراف تاج شرف برسر گذشتہ ائے زدہ بر تراز حان خیمہ کبریائی را دست بتو کجا رسد عقل شکستہ پالی را دیگر متلاشی درود نامحدودنثارتارک مبارک صاحب مقام محمود مالک رقاب امم۔۔۔۔عجم کہ حلقہ بابش چرخ چنبری است وذرہ راہش خسرو خاوری۔

محمد عربی کابروے ہر دوسرا است
کسے کہ خاک درش نیست خاک برسر او

وتحیات وبہیّات صلوات زاکیات وتسلیمات نامیات پیشکش بارگاہ امام بحق ووصل مطلق نابدارم مذمل تی وشہسوار عرصہ لافتیٰ شیر شیر افگن غابات الشجاعۃ والجلاوہ۔ جالس چاربالش لوشغیت لی الو۔

امامیکہ بعد از وفات پیمبر
خلافت گذارد بہ ماتم نشیند
زہے نقش پائے کہ بردوش احمد
ز مہر نبوت مقدم نشیند

اما بعد در این زمان سعادت اقتران وآوان برکت تو امان از مطلع بادشاہ جمجاہ کیوان بارگاہ زبدہ سلاطین کا مگار گورگانی افتخار فرما فرمایان سلسلۂ رفیعہ شاہجہانی مرکز دوائر عظام سلطنت وجہان بانی

مہبط فیوض ہدایت ربّانی مطرح انوار عنایت سبحانی ابوالظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی لازال علم دولته علیا وبالا جلال والاقبال حرّیا علم آفتاب عالمتاب شقه خاص مکرمت اختصاص شقه کشا گردیدو باد بہاری جنت سرور برگلشن خواطر نزدیک ودور وزید سبحان اللّٰہ زہے منشور لا مع النور که مداوش بحار انوار یقین را بہترین وسوادش عیون رضا وقبول را کحل الجواہر بشارت اختیار ولائے اہل بیت طیبین که بمقتضائے کریمه قل لا اسئلکم علیه اجراً الا المودة فی القربیٰ۔ اجر رسالت است ورکوب سفینه متابعت ائمه معصومین که بموّدائے حدیث متفق علیه فریقین مثل اهلبیتی کمثل سفینة نوح من رکبها نجیٰ ومن تخلف عنها غرق وهویٰ موصل بساحِل نجات از ہلاکت مفرح قلوب مومنین گردیدواشارت برأت از اعادی دین مبین وموذیان روح مقدس حضرت سید المرسلین که ایذائے آن حضرت بمفاد حدیث فاطمة بضعة منی من اذاها فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللّٰہ موجب کفروایذائے رب العالمین است ارباب ایقان را جانی تازه و سرور بے اندازه بخشید لله الحمد والمنه که علم فیض شیم بدرگاه فلک اشتباه شبه روضه رضیه مقدسه علمدار میدان شہادت وشیر بیشه شجاعت وجلالت قوت بازوے خامس آل عبائے اطہار وہمدوش حضرت جعفر طیار سقّائے اہل بیت طاہرین حضرت ابوالفضل العباس ابن امیرالمومنین علیہم السلام اجمعین بدست این بے دست وپامنصوب گردید و آوازه ہمایون نام نامی وبلند نامی مانند جدامجد سمی سامی بندگان سکندر شان که در سیر متاخرین ومتقدمین مسطور ومزبور است به شش جہت رسید وتمامی اہل ایمان بمدح وستائش بندگان دارا دربان

رطب اللّسان وعذب البیان گردیدند وبمتمنیات روحانی ومتبغیات ایمانی رسیدند یقین است که بمیامن انفاس نفیسه بندگان معدلت نشان بمودای آیه وافی الهدایه اطیعوا اللّٰه واطیعو الرسول واولی الامر منکم که در تفاسیر جماہیر اہل سنت وجماعت ہدانا اللّٰه واباهم سواء الطریق وسقانا وایاهم رحیق التحقیق تفسیر اولی الامر بملوک وسلاطین بیّن گردید عنقریب شاہزادگان کامگار والا تبار وسائر رعایا و برایائے حدود آن بلاد وامصار ربقه تقلید آباء وامہات از رقاب برآورده مسلک شاہراه متابعت اہل بیت اطہار شوند چنانچه بندگان سکندر شان برونق تفسیر اہل بیت عصمت وتطہیر که مراد از اولی الامر حضرات معصومین علیہم السلام اندلوائے ولائے آنحضرت برافراخته اند۔الٰہی شموس توفیقات غیبی وتائیدات لاریبی از مطلع عنایت ربّانی ومشرق ہدایت سبحانی تابان باد بمحمد واله الامجاد صلوات اللّٰه علیہم الی یوم التناد۔

خلاصہ اس خط کا یہ ہے کہ آسمان شاہی سے مثل آفتاب عالمتاب کے ایک فرمان گرامی طالع ہوا جس نے دلوں کو روشن ومسرور کیا، اس فرمان میں بادشاہ جمجاہ کے زمرۂ موالی اہلبیت اطہار میں شامل ہونے کا مژدہ تھا جن کی محبت اجر رسالت ہے اور جو مصداق حدیث متفق علیہ ''سفینۃ نوح'' کی طرح سوار ہونے والے کو پار لے جانے والے اور منہ موڑنے والے کو ڈبونے والے ہیں، اس فرمان میں اشارہ اس طرف بھی ہے کہ سرکار شاہی نے ان دشمنان دین سے جنھوں نے روح سید المرسلین کو ایذا پہونچائی اور جو بمفاد حدیث سیدہ طاہرہ جگر گوشہ محمد مصطفیٰ کو ایذا اور دکھ پہنچا کے خدائے تعالیٰ کو دکھ پہونچانے کے مجرم ہوئے بیزاری وبرأت ظاہر فرمائی، یہ خوش خبری اور باعث ازدیاد مسرت اہل ایمان ہوئی۔ حسب حکم شاہی خدا کے فضل سے اس بے دست و پانے علم شبیہ روضہ حضرت عبّاس علیہ السلام میں نصب کر دیا۔

تمام اہل سنت آیہ ''وافی ہدایہ'' **اطیعوا اللہ واطیعواالرسول** کی تفسیر میں اولی الامر سے سلاطین زمانہ مراد لیتے ہیں لہٰذا امید ہے کہ شاہزادگان والا شان عنقریب اپنے اولی الامر (بادشاہ) کی فرمانبرداری امردین میں کریں گے، اور جمیع رعایا و برایائے شاہی بھی اس امر میں کہ حضور نے اولی الامر کی جو بموجب تفسیر اہلبیت معصومین ہیں متابعت اختیار فرمائی تقلید کریں گے۔

(ماخوذ از ماہنامہ حقائق، لکھنؤ، شوال، ۱۳۵۴ھ ص ۷ ۳ تا ۴۲)

دُور کے گذشتہ واقعات کی نسبت اظہار رائے کرنا یا کسی طرز عمل پر نکتہ چینی کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے اس لئے کہ ہنگامی اور وقتی مصالح انہی افراد کے پیش نظر ہوتے ہیں جو اس اقدام کے واقعی ذمہ دار ہیں، بعد والے لوگ نہ پورے طور سے ان حالات کا اندازہ کر سکتے ہیں اور نہ ان مصالح سے مطلع ہو سکتے ہیں مگر جہاں تک ظاہری حیثیت سے صورت حالات بتلاتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوالظفر بہادر شاہ کے اظہار تشیع اور علم چڑھانے میں ان مقامی مصالح کا لحاظ نہیں کیا گیا جو خود ابوالظفر کو اپنے دارالسلطنت دہلی کے ماحول اور اپنے گردوپیش میں درپیش تھے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ذرا اعلیٰ حضرت نظام حیدرآباد کی طرف سے تشیع نہیں بلکہ سرکار اہلبیت میں عقیدت کا کھلے الفاظ میں اظہار ہوتا ہے یا حضرت علی علیہ السلام کی افضلیت کے متعلق جس کے معتقد فرقہ اہل سنت کے اکابر واسلاف میں سے بھی کچھ کم لوگ نہیں ہیں کوئی تصریح ہوتی ہے تو متعصب اور تنگ نظر عوام کو وحشت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اعلیٰ حضرت کی نسبت طرح طرح کی منصوبہ سازیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں حالانکہ حیدرآباد وہ سلطنت ہے جہاں برسہا برس تشیع کی کھیتی لہلہائی ہے اور سرسبز و شاداب رہی ہے چہ جائیکہ دہلی جہاں شیعیت کا پھریرا کبھی مستقل طور پر لہرایا ہی نہیں وہاں کے لوگوں کو اس سے جس قدر بھی اجنبیت اور دوری نہ ہوتی کم تھی۔ علم آیا تھا تو خاموشی کے ساتھ چڑھا دیا جاتا اور بادشاہ کی منت پوری کر دی جاتی تو کچھ نہ ہوتا۔ بادشاہ بھی اطمینان کے ساتھ اپنے اس خلوص وعقیدت اور مذہب کے نئے جذبہ کو دل میں محفوظ رکھتے اور اسے نشوونما پانے کا موقع ملتا اگرچہ یہ جذبہ ایسا ہے کہ

پیدا ہونے کے بعد سیلاب کی طرح بڑھتا ہے اور اس کا مخفی رکھنا خود انسان کے لئے دشوار ہوتا ہے مگر پھر بھی واقعات کی رفتار خود بادشاہ کی صوابدید پر مبنی رہتی اور کوئی ناگوار صورت پیش نہ آتی مگر مرزا محمد حیدر شکوہ بہادر اور مرزا محمد نور الدین بہادر کو صورت حالات کے اندازہ میں دھوکہ ہوا یا خود ان کے جوش مذہبی اور بادشاہ کے اس اظہار کی خوشی نے صورت حال پر غور کرنے کا موقع نہ دیا بہرحال علم چڑھایا گیا اس ساز وسامان اور شان وشوکت کے ساتھ جس نے تمام حلقوں میں تلاطم پیدا کر دیا ہندوستان کا سب سے بڑا اسلامی شہنشاہ اس طرح مذہب میں تبدیلی کر دے کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لکھنؤ سے خطوط دہلی گئے اور دہلی میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مشائخ اور علماء نے دنیا سر پر اٹھائی۔ شورش اور بہت بڑی شورش۔ بادشاہ پر تحریری اور تقریری یورش اور انقلاب پیدا کرنے کے مکمل تدابیر آخر بادشاہ کو مجبوری ایک تحریر لکھنا پڑی جس میں گذشتہ واقعہ سے اپنی بے تعلقی کا اظہار اور اپنے سابقہ عقائد پر باقی ہونے کا اقرار کیا گیا تھا۔ امین الدولہ سمن فریز رصاحب بہادر دلیر جنگ ایجنٹ شاہجہاں آباد نے اس خط کو اپنے ایک خصوصی مکتوب کے ساتھ ایجنٹ مقیم لکھنؤ کے پاس بھیجا افسوس ہے کہ بادشاہ کی وہ تحریر جس کا حوالہ دیا گیا ہے پیش نظر نہیں ہے ورنہ اس کے الفاظ پر غور کیا جاتا کہ وہ کہاں تک ان کے مافی الضمیر کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان کے لب ولہجہ سے کچھ ان مصالح کا پتہ چلتا ہے جن کے ماتحت وہ تحریر لکھی گئی یا نہیں مگر امین الدولہ کی مذکورۂ بالا تحریر ہمارے سامنے موجود ہے جو درج ذیل ہے۔
یہ خط ۲۶ ردسمبر ۱۸۵۳ء کو لکھا گیا تھا۔

دریں ایام بملاحظه قطعات سوالات علماء ومشائخ ایں شہر بوضوح پیوسته که از روی اخبار وخطوط لکھنؤ بدریافت ایں مردم رسیده که بتاریخ ششم ربیع الاول سنه حال مرزا حیدر شکوه بہادر ومرزا نورالدین بہادر شیعی مزہب نبیرگان مراز سلیمان شکوه بہادر۔ در لکھنؤ علمی بکمال تجمل ہمراه عمائد آں شہر برداشته بدرگاه حضرت

عباس بروند وفضیلت پناہ سیادت دستگاہ سید محمد مجتہد شیعہ بدست خود علم مذکور را۔ دردرگاہ موصوف نصب نمودہ ومرزایان موصوف نسبت ابلاغ آں علم بہ بندگان والا کردند ونیز مرزا نورالدین بہادر بہ منبر برآمدہ مرثیہ بزبان اردو کہ متضمن بے ادبی صحابہ کرام رضوان اللّٰہ علیہم بودہ در مجمع کثیر بآواز بلند برخواندہ۔ در مطلع آں مرثیہ تخلص حضور پر نور درج کردہ وقطعہ شقہ مہری خاص مشعر ترک کردن مذہب اہلسنت واختیار نمودن مذہب اہل تشیع ووثوق ارادۂ تعمیر امام باڑہ واختیار تعزیہ داری بردوام موسومہ مجتہد مذکور ظاہر ساختہ بندگان والا را باختیار مذہب روافض متہم وبدنام ساختند چوں ایں ہمہ غلط وبے اصل ومحض افترا وبہتان است زیرا کہ بعنایت الٰہی در عقیدہ راسخہ حضور کہ آں بطریق اہل سنت و جماعت است ہرگز فتور وفساد راہ نیافتہ وکدام مرثیہ محتوی مضمون سب وطعن نسبت بخلفائے راشدین کہ اساطین ومقتدائی اھل یقین اند برزبان الہام بیان نرفتہ وشقہ خاص با شعار اختیار امور خلاف شرع بنام مجتہد مذکور ہرگز ریختہ کلک گوہر سلک نگردیدہ اینہمہ تصنع ودروغ آرائے مرزایان مذکور است کہ بحضور پرنور منسوب کردہ اند ولیکن بیاد می آید کہ ایشان ہنگام حضوری خود در اینجا ایں معنی بطریق حکایت و تذکرہ معروض داشتہ بودند کہ موافق مذہب خود علمے طیار ساختہ در شکریہ صحت حضرت اقدس بدرگاہ حضرت عباس خواہم داشت وسوائے ازیں، ہیچ مذکور نہ کردہ بودند و نیز اکثر شقہ جات در مقدمہ ذاتی خود ہا مسجّل بمہر خاص کنایندہ بودند لیکن بنام فضیلت پناہ مذکور (یعنی جناب سلطان العلماء)

کدام تحریر که بمہر خاص مزین باشد ہرگز بوقوع نیامده شاید مرزایان مسطور بنا برکدام مصلحت ومنفعت خود این افترا برحضور کرده باشند ومجتہد مذکور بمقتضائے نیک نہادی خود آنرا در پایۂ صدق دانسته شہرت داده باشند دریں صورت ملاحظه ان شقه که نزد آں سیاست دستگاه رسانیده اند ضروری افتاده تامعلوم شود که مضمونش چیست ونگارنده اش کیست وبعد دریافت ایں حال تدارک انسداد رخنه ایں فساد بطرز مناسب بعمل آید که بار دیگر کسے را جرأت ایں افترا پردازیہا نگردد لہذا زیب ارقام می یابد که آں امارت وریاست مرتبت بمقتضائے دولت خواہی و خیر اندیشی بجہت رفع ایں اتہام وبدنامی بندگان اقدس خط انگریزی خود بنام اجنٹ بہادر لکھنؤ بمزید تاکید برنگارند که شقه جعلی مہری خاص از مجتہد مذکور بہر نوع که تواند طلبیده زود تر ارسال دارد ہرآئنه ظہور این معنی موجب استرضائے خاطر عاطر خواہد شد۔

مشائخ وعلمائے دہلی کی درخواستوں سے جواس زمانہ میں آئی ہیں واضح ہوا کہ لکھنؤ کے خطوط اور خصوصی اطلاعات سے ان لوگوں کو معلوم ہوا ہے کہ ۶ ربیع الاول سال رواں کو مرزا حیدر شکوہ بہادر اور مرزا نورالدین بہادر نے جو شیعہ مذہب رکھتے ہیں اور مرزا سلیمان شکوہ بہادر کے پوتے ہیں لکھنؤ میں ایک علم بہت شان وشوکت کے ساتھ وہاں کے عمائد ورؤسا کی معیت میں اٹھایا اور حضرت عباسؓ کی درگاہ لے گئے اور فضیلت پناہ وسیادت دستگاہ سید محمد (صاحب) مجتہد شیعہ نے اپنے ہاتھ سے وہ علم درگاہ مذکور میں قائم کیا اور مرزایان مذکور نے اس علم کے بھیجنے کی نسبت اعلیٰ حضرت بادشاہ معظم کی طرف دی اور مرزا نورالدین بہادر نے منبر پر جا کر ایک مرثیہ اردو زبان میں جو صحابۂ کرام کی شان میں بے ادبی پر مشتمل تھا ایک بڑے مجمع میں بلند آواز سے پڑھا اور اس مرثیہ کے مطلع میں تخلص حضور پرنور کا درج کیا۔ اور

ایک خط بادشاہ کی مہر سے مزین اس مضمون کا کہ بادشاہ نے مذہب اہلسنت کو ترک کیا اور مذہب شیعہ کو اختیار کیا اور یہ کہ عنقریب وہ امام باڑہ بنوائیں گے اور تعزیہ داری ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ مجتہد صاحب مذکور کے نام ظاہر کیا اور اس طرح بادشاہ سلامت کو مذہب روافض کے اختیار کرنے کے ساتھ مورد اتہام اور بدنام کیا۔ چونکہ یہ سب غلط بے اصل اور محض افترا اور بہتان ہے اس لئے کہ خدا کی عنایت سے حضور کے مضبوط اعتقاد میں جو اہلسنت و جماعت کے طریقہ پر ہے ہرگز کوئی کمزوری اور خرابی واقع نہیں ہوئی ہے اور کوئی مرثیہ اس مضمون کا جس میں سب وشتم اور طعن حضرات خلفائے راشدین کی نسبت ہو، جو ارکان دین اور مقتدا اہل یقین کے ہیں، ہرگز زبان مبارک پر جاری نہیں ہوا ہے، اور کوئی خط جس میں خلاف شرع باتوں کے اختیار کرنے کا اظہار ہو، مجتہد صاحب مذکور کے نام ہرگز بادشاہ کے قلم سے لکھا نہیں گیا ہے، یہ تمام بنوٹ اور جھوٹ مرزا یان مذکور کا ہے جو حضور پرنور کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن اتنا یاد آتا ہے کہ ان دونوں آدمیوں نے جب وہ یہاں حاضر ہوئے تھے تو اس امر کو بطور تذکرہ بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ وہ اپنے مذہب کے موافق ایک علم تیار کر کے حضرت کی صحت کے شکریہ میں درگاہِ حضرت عباسؑ میں چڑھائیں گے سوائے اس کے کوئی ذکر نہیں ہوا تھا اور اکثر خطوط انہوں نے اپنے ذاتی مقدمہ کے سلسلہ میں بادشاہ سے حاصل کئے تھے اور مہر خاص سے مزین کرائے تھے لیکن مجتہد صاحب مذکور کے نام کوئی بھی تحریر جو مہر خاص سے مزین ہو ہرگز لکھی نہیں گئی۔ شاید مرزایان مذکور نے کسی اپنی مصلحت اور منفعت کیلئے یہ افترا حضور پر کیا ہے اور یہ بے اصل و باطل تحریر مرتب کردی ہے اور مجتہد مذکور نے اپنی نیک نہادی کے سبب سے اس کو سچ سمجھ لیا اور مشہور کردیا۔ اس صورت میں اس فرمان کا دیکھنا جو سید صاحب مذکور (سلطان العلماء) کے پاس پہنچایا گیا ہے ضروری ہے تاکہ معلوم ہو کہ مضمون اس کا کیا ہے اور اس کا لکھنے والا کون ہے؟ اور دریافت حالت کے بعد اس فساد کا انسداد اور سد باب کیا جائے تاکہ دوبارہ پھر کسی کو جرأت ان افترا پردازیوں کی نہ ہو لہٰذا تحریر

کیا جاتا ہے کہ آپ خیر خواہی اور وفاداری کی بناء پر اعلیٰ حضرت سے اس تہمت کو دفع کرنے کے لئے انگریزی خط ایجنٹ بہادر کے نام بہت تاکید کے ساتھ لکھیے تاکہ وہ جعلی تحریر مجتہد صاحب مذکور سے جس طرح بھی ممکن ہو حاصل کر کے جلد ارسال کیجئے۔ یقیناً اس امر کا ظاہر ہونا اعلیٰ حضرت بادشاہ کی خوشی اور رضامندی کا باعث ہوگا۔

یہ خط سلطنت دہلی کے نمائندہ مقیم لکھنؤ کے پاس آیا اور انہوں نے اس خط کو اپنے مکتوب کے ساتھ جو درج ذیل ہے حکومت برطانیہ کے ایجنٹ جانسن صاحب کے پاس بھیجا اس خط کی تاریخ ۳ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ ہے۔

(ماخوذ از بحوالۂ ماہنامہ حقائق، لکھنؤ، شوال ۱۳۵۴ھ ص ۳۷ / تا ۴۲، ذیقعدہ، ۱۳۵۴ھ ص ۶۰ / تا ۶۴ء
شعاع عمل لکھنؤ جون ۲۰۱۴ء)

❁ ❁ ❁

آصف الدولہ کا عہد

اور لکھنؤ کی زبان و شاعری

مصنف

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمس لکھنوی

آصف الدولہ کا عہد

اور لکھنؤ کی زبان وشاعری

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمس لکھنوی

آصف الدولہ کا عہد لکھنؤ کی زبان وشاعری کی تشکیل میں خاص اہمیت رکھتا ہے، ان کا لکھنؤ کو دارالحکومت بنانا دولت کی افراط ان کی الوالعزمی، سخاوت، شہر کی آرائش، تعمیر کا شوق، شاعری سے ذوق، اہل کمال کی قدردانی، تعزیہ داری سے والہانہ عقیدت، غفرانمآبؒ کی تحریک ان کے عہد کے اہم واقعات ہیں، جن کا اثر تہذیب وتمدن اور زبان وشاعری پر بہت گہرا ہوا اور اس کا ذکر لکھنؤ کی زبان وشاعری کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ لکھنؤ صدیوں سے علوم ظاہری وباطنی کا مرکز اور ایک زمانہ سے صوبہ کا صدر مقام تھا۔ شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اپنا مستقر بنایا تو ساری دنیا وہاں کھینچ کے آ گئی مگر لکھنؤ کے بیشتر علماء کی نگاہ استغنا نے ادھر نہیں دیکھا اور وہاں علمی مرکزیت اور درسگاہوں کی چہل پہل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آصف الدولہ نے لکھنؤ کو پھر دارالحکومت بنایا تو فیض آباد اپنی پوری جوانی ورعنائی کے ساتھ لکھنؤ آ گیا اور وہاں کی دنیا بدل گئی۔

میر علی لطفؔ جو آصف الدولہ کے متوسلین میں ہیں بیان کرتے ہیں:

ایک ایک کمال کا ہزارہا آدمی موجود تھا (گلشن ہند)

دفعتاً ایک شہر کے لکھنؤ منتقل ہو جانے سے بہت سے نئے محلے بس گئے۔ شررؔ نے ان کے نام یہ لکھے ہیں:

امانی گنج، فتح گنج، رکاب گنج، بیگم گنج، نواب گنج، ٹکیت گنج، وزیر گنج، ترمنی گنج، حسن گنج،

بھوانی گنج، بالک گنج، نواز گنج، تحسین گنج، علی گنج، محبوب گنج، عنبر گنج، خیالی گنج، نخاس، خانساماں کا احاطہ، ٹکیت رائے کا بازار، حسین الدین خان کی چھاؤنی، کشمیری محلہ، صورت سنگھ کا احاطہ، نگریا، توپ دروازہ، جھاؤلال کا پل۔

دولت کی افراط اور آصف الدولہ کی سخاوت

آصف الدولہ نے انگریزوں کے مشورہ سے فوج کم کردی، اس کے صلہ میں انہوں نے روہیل کھنڈ پر ان کا قبضہ کرادیا۔ اس سے دولت کی افراط ہوگئی اور انہیں دل کھول کے روپیہ خرچ کرنے کا موقعہ مل گیا۔ ان کے جتنے مشاغل تھے، ان سے رعایا پر زر و جواہر کی گھٹائیں جھوم جھوم کر برسا کرتی تھیں۔ اس سے ایسی خوشحالی پیدا ہوگئی جو اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ کتنے مفلس و نادار ان کی ایک نگاہ کرم سے دولت مند بن گئے۔ جہلا اور خاص طور پر ہنود جو حکمران کو ''دیو'' کہتے ہیں، کہا کرتے تھے۔

''جسے نہ دے مولا، اسے دے آصف الدولہ''

آصف الدولہ کی جدت پسندی اور اولوالعزمی

وہ ایک جدت پسند اور اولوالعزم آدمی تھے، جو کام کرتے تھے اس میں نئی راہ نکالتے تھے اور دل کھول کے کرتے تھے۔ سخاوت کی، تو اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ شکار کا شوق کیا تو نشانہ کی ایسی مشق کی کہ شیر، ہاتھی اور ارنا بھینسے ایک گولی میں اپنی جگہ سے نہ ہل سکے۔ شیر اتنے مارے کہ ان کی کھالوں کا شامیانہ بنوایا اور ہاتھی اتنے شکار کئے کہ ان کے دانتوں سے ایک مکان بنوایا جس میں لکڑی کا کہیں نام نہ تھا۔ ایک مکان شیشہ کا بنوایا۔

لکھنؤ کی ترقی

شہر کی ترقی پر توجہ کی تو باون گاؤں ملا کے اس کو وسیع کیا اور ایرانی طرز کے چار سو باغ

بنوائے، جن میں عالیشان عمارتیں حوض، فوارے، روشیں، کیاریاں اور درختوں کی قطاریں سبھی کچھ تھا۔ انگریز اس کو گارڈن آف انڈیا (garden of india) کہتے تھے۔ میر علی لطف کا بیان کہ آصف الدولہ ہر روز ایک تازہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے تھے، امراء اور اہل شہر کو بھی عمارت کا شوق پیدا ہوا اور لکھنؤ عالیشان عمارتوں کا شہر بن گیا۔ ایک سیاح لکھتا ہے:

''لکھنؤ کی عمارتوں میں طلائی گنبد اور گھڑیاں وغیرہ اس کثرت سے ہیں کہ جب سورج کی روشنی ان پر پڑتی ہے تو سارا شہر جگمگا اٹھتا ہے۔''

عبدالحلیم شررؔ بیان کرتے ہیں:

''ان دنوں لکھنؤ ایسی رونق پر تھا کہ ہندوستان ہی نہیں، شاید دنیا کا کوئی شہر لکھنؤ کے اوج و عروج کا مقابلہ نہ کر سکتا ہوگا۔ شجاع الدولہ جو روپیہ فوج اور جنگی تیاریوں پر صرف کرتے تھے، اسے آصف الدولہ نے اپنی عیش طلبی اور شہر کی آرائش اور خوشحالی میں صرف کرنا شروع کیا اور چند ہی روز میں ساری دنیا کی دھوم دھام اپنے یہاں جمع کر لی۔ ان کا حوصلہ بس یہی تھا کہ نظام حیدرآباد ہوں یا ٹیپو سلطان، کسی کے دربار کا کرّ وفر اور شان و شوکت وحشمت میرے دربار سے زیادہ نہ ہو سکے۔''

اس الوالعزمی کی ایک مثال شررؔ کی زبانی سنیے:

''وزیر علی خاں کی شادی میں انہوں نے ایسا حوصلہ دکھایا کہ برات کا تزک و احتشام تاریخ ارض کے تمام تکلفات سے بڑھ گیا۔ برات کے جلوس میں بارہ سو ہاتھی تھے، دولہا جو شاہی خلعت پہنے ہوئے تھا۔ اس میں بیس لاکھ کے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ محفل طرب کے لئے دو عظیم الشان شامیانے بنوائے گئے تھے جن میں ہر ایک ساٹھ ساٹھ فٹ بلند تھا اور ایسا نفیس وعمدہ وقیمتی کپڑا لگایا

گیا تھا کہ ان دونوں کی تیاری میں سلطنت کے دس لاکھ روپے صرف ہو گئے تھے۔'' (گذشتہ لکھنؤ)

آصف الدولہ اور تعزیہ داری

اسی الوالعزمی سے وہ تعزیہ داری بھی کرتے تھے، ان کا امام باڑہ ہندوستان کی مشہور عمارتوں میں ہے، جس کا رومی دروازہ، باؤلی، بھول بھلیاں اور لداؤ کی چھت، عمارت کی وسعت، شان و شوکت اور فنی اہمیت سیاحانِ عالم کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔''

اس کی آرائش کی طرف توجہ ہوئی تو ایسا سجایا کہ آدمی دیکھتا ہی رہے مرزا ابوطالب کا بیان ہے کہ:

''اس عمارت کے اندر دورویہ دیوار پر قد آدم آئینے لگے ہوئے ہیں، سونے چاندی کی گھڑیاں اور جواہرات جڑا ہوا ہے، سونے کا آرائشی سامان کثرت سے لگا ہوا ہے۔ چار پانچ سو بلوری جھاڑ چھتوں میں لٹکے ہوئے ہیں اور دو ہزار فرشی جھاڑ زمین پر رکھے ہیں۔ ان میں بے شمار کافوری شمعیں روشن کی جاتی ہیں۔ جب ان کی روشنی میں طلائی مرصع سامان آرائش کا عکس پڑتا ہے تو نور کا دریا لہریں مارتا ہے۔''

(تفضیح الغافلین)

۱۸۲۴ء میں بادری ہیبر (Heber) سیاحت لکھنؤ کے لئے آئے تھے وہ لکھتے ہیں:

''اس مقدس عمارت میں کثرت سے جھاڑ لٹک رہے ہیں، جنکی روپہلی سنہری ڈالوں، پھل دار ترشی ہوئی قلموں کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ جو جھاڑ بہت وزنی اور لٹکانے کے قابل نہیں ہیں، وہ فرش پر رکھے ہیں۔ ان

کا نچلا حصہ بہت گھیردار اور اوپر کی جانب گاؤدم ہے بیچ بیچ میں سنہرے اور روپہلے تعزیئے آٹھ آٹھ دس دس فٹ اونچے رکھے ہیں۔ ان کے علاوہ نوابان اودھ کے زربفتی پٹکے جن پر آیات قرآنی کڑھے ہوئے ہیں، لٹک رہے ہیں، بڑے بڑے نقرئی وطلائی علم، ڈھالیں، تلواریں، بھالے مرصع جن جن پر آیات قرآنی اور اسمائے الٰہی لکھے ہوئے ہیں نصب ہیں، مشہور سپہ سالاروں کے عمامے رکھے اور بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے ہیں۔''

مورخین لکھتے ہیں کہ سامان آرائش کی اتنی کثرت تھی کہ لوگ اندر نہ جا سکتے تھے، چبوترے سے زیارت کرتے تھے۔

لاکھوں روپیہ کا سامان آرائش اور سونے چاندی کے تعزیے یورپ سے بن کے آئے تھے اور یہ سب کسی مختصر جگہ نہیں بلکہ ساٹھ فٹ چوڑا ۱۰۲۳ فٹ لمبا اور تریسٹھ فٹ اونچا صرف بیچ کا ہال ہے جس میں کوئی ستون نہیں، اردگرد کی صحنچیاں، شہ نشین اور آگے کا دالان جو اسی مناسبت سے لمبا چوڑا ہے، اس کے علاوہ ہیں، یہ سب زمین سے لے کے چھت تک سامان آرائش سے بھرا تھا۔

وہ تعزیہ داری بڑی عقیدت سے کرتے تھے، اپنے امام باڑہ کے علاوہ اور تعزیوں پر خود جا کے نذریں چڑھاتے اور منتیں مانتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی فرقہ ایسا نہ تھا جو تعزیہ نہ رکھتا ہو اور کوئی کوچہ ایسا نہ تھا جہاں تعزیہ نہ رکھا جاتا ہو۔ دولتمند ہندوؤں نے عالیشان امام باڑے بنوائے جن میں مہاراجہ جھاؤلال، راجہ ٹکیت رائے، راجہ بلاس رائے، راجہ مہرا، راجہ میوہ رام، کے امام باڑے مشہور تھے۔ موخرالذکر کا امام باڑہ امتیاز خاص رکھتا تھا۔ تین لاکھ روپیہ سالانہ اس کا خرچ تھا۔ اس زمانے کے امام باڑے تعزیوں اور سامان آرائش سے بھرے ہوتے

تھے، روشنی اور شیرینی کی تقسیم پر سارا روپیہ خرچ ہوتا تھا، مجلسوں پر زیادہ توجہ نہ تھی۔

غفرانمآبؒ کی تحریک

اس وقت تک ہندوستان میں شیعہ بحیثیت قوم کوئی وجود نہ رکھتے تھے، اہل سنت کے ساتھ ضم ہو کے رہتے تھے۔ مرنا جینا، شادی بیاہ، نماز روزہ، سب انہیں کے ساتھ تھا۔ اس حالت میں باہر سے آئے ہوئے شیعہ تو شیعہ رہے مگر ان کی اولاد اپنے مذہب سے بے خبر ہوتی گئی اور خاندان کے خاندان سنی ہو گئے۔ جو شیعہ رہے وہ برائے نام تھے۔ صرف تحقیقی صلاحیت رکھنے والے اہل علم تک شیعیت محدود تھی، جیسے تفضیل حسین خاں علامہ اور میر شمس الدین فقیر، مصنف حدائق البلاغہ اپنی تحقیق سے شیعہ ہو گئے تھے۔

سادات جائس و نصیرآباد کے علمی خاندان کے ایک فرد سید دلدار علی جو مرنے کے بعد غفرانمآبؒ کے لقب سے مشہور ہوئے ایک مفکر، حساس اور مضبوط ارادے کے آدمی تھے انہوں نے شیعوں کی قومی تشکیل اور مذہبی تبلیغ کا تہیہ کر کے علوم عقلیہ میں کمال حاصل کیا اور لکھنؤ کے سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں وزیر اعظم سے مل کے اپنے خیالات سے ان کو متاثر کیا اور اپنا مؤید بنا کے پانچ ہزار روپیہ ان سے لے کے عراق گئے۔ وہاں پانچ برس کامل قیام کر کے علوم دینیہ میں مہارت حاصل کی اور لکھنؤ واپس آ کے اپنا رابطہ عوام سے قائم کیا۔ حکومت اور اس کے معاملات سے علیٰحدہ رہے۔ ان کی اس بے نیازی سے آصف الدولہ بھی ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ اگرچہ ان کی نماز و موعظہ میں کبھی کبھی آتے تھے مگر نہ ان کو کوئی عہدہ دیا، نہ منصب، نہ جاگیر، نہ خطاب، نہ انعام و اکرام سے کبھی سرفراز کیا، نہ انہوں نے خواہش کی۔ اس دور عشرت میں وہ عسرت سے زندگی بسر کرتے تھے اور خوش تھے۔ انہیں اپنے مقصد کے علاوہ کسی اور طرف توجہ نہ تھی۔ انہوں نے اپنی درسگاہ قائم کی جس میں معقول و منقول، فقہ و اصول کے ساتھ

کلام ومناظرہ اورادب کی تعلیم بھی جاری کی، ان کا بڑا کمال یہ تھا کہ تمام علوم کے وہ تنہا معلم تھے۔ان کے شاگردوں میں جس علم سے جومناسبت رکھتا تھا وہ اس میں کامل بن کے نکلا۔کوئی معقولات کا بحر نا پیدا کنار تھا،کوئی حدیث وتفسیر میں بے مثل تھا،کوئی فقہ واصول میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا،کوئی کلام ومناظرہ کا مرد میدان تھا اور کوئی بزم ادب وشعر کا صدرنشین۔خود ان کی تصنیفیں بھی اسی طرح مختلف النوع ہیں اور ہرایک بلند پایہ۔معقولات میں حاشیۂ صدرا، علم کلام میں عمادالاسلام فقہ و اصول میں اساس الاصول مناظرہ میں صوارم الالٰهیات و ذوالفقار وغیرہ،حدیث میں اثارۃ الاحزان۔

۱۲۰۰ھ تیرہ رجب کو شیعوں کی نماز جماعت اور ۲۷ رجب کو نماز جمعہ قائم کی اوراس کے وجوب پرایک استدلالی کتاب لکھی۔اخباریت کی رد میں اساس الاصول اورصوفیت کی رد میں شہاب ثاقب لکھی جس میں صوفیا کو بدعقیدہ، وحدت وجود کو کفر، مراقبہ، سلوك، جذب، کشف، حجاب وغیرہ کو بے معنی اور اسلام کے خلاف قرار دیا، پیری مریدی عرس قوالی چادر وغیرہ کے خلاف تقریر وتحریر کے ذریعہ مہم کا آغاز کیا اور باور کرایا کہ سوائے ائمہ اہلبیتؑ کے کوئی مرکز عقیدت بننے کے قابل نہیں، جوان کی تعلیم وسیرت سے ہٹ کر کچھ کہے وہ گمراہ ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیری مریدی،عرس قوالی، شیخ سدّو کا بکرا وغیرہ شیعوں نے قطعاً چھوڑ دیا۔ بھنگ نوشی کا عام رواج تھا کہ اس کے خلاف بھی انہوں نے جدوجہد کی۔ علامہ کنتوری لکھتے ہیں کہ انہوں نے بھنگ نوشی کے چبوتروں پر سجّادے بچھوا دیئے اور نذرونیاز میں شیخ سدّو کا بکرا، شیخ فرید کی شیرینی، احمد کبیر کی گائے......وغیرہ کے بجائے عمل گوسفند اور جناب عباسؑ کی حاضری اورعلم وتعزیئے بنام شہدائے کربلا جاری کرائے۔

محرم کے رواسم میں انہوں نے انقلاب پیدا کر کے شیعوں اورسنیوں کی تعزیہ داری میں

فرق پیدا کیا۔ مجلسوں کے انعقاد پر زور دیا۔ خود بھی امام باڑہ بنوایا اور اس کو سامان آرائش سے بھرنے کے بجائے مجلسوں کا اہتمام کیا اور حدیث خوانی پر زیادہ توجہ کی۔ اس وقت شاعری کا زور تھا۔ نثر کو اتنی مقبولیت نہ ہوئی لیکن مجلسیں گھر گھر ہونے لگیں جن میں واقعہ کربلا زیادہ تر نظم میں پڑھا جاتا تھا اور ہندوستان کا ہزار سالہ ذوق شاعری لکھنؤ میں معراج کمال پر تھا۔ ان دونوں کا اتفاقی طور پر یکجا ہو جانا ایسا نہ تھا کہ مرثیہ اپنے قدیم رنگ پر باقی رہتا۔ اس نے ایک نئے فن کی حیثیت اختیار کی۔ سوداؔ، میرؔ ایسے استادان فن مرثیہ کہنے لگے۔

گداؔ، مسکینؔ، حزیںؔ، غمگینؔ، محمد تقی، نظر علی، نعیمؔ، عاجزؔ، محبؔ، محزونؔ، احدؔ صوفی ایسے بہت سے مرثیہ گو پیدا ہو گئے۔ بہتوں نے اسے خاص اپنا فن بنالیا، میاں سکندرؔ نے اس میں ایک نئی روح پھونکی اور اب بگڑا شاعر مرثیہ گو نہیں رہا۔ حکمراں کا شیعہ ہونا، اہلبیتؑ رسولؐ کے فضائل و مصائب کے بیان سے دلچسپی لینا، غفرانمآبؒ کی سرگرمیاں شیعی معتقدات پھیلانے کا سبب ہوئیں اور بہت سے ہندو مسلمان شیعہ ہو گئے۔ غفران مآبؒ نے باہر کے شیعہ طلبا پر زیادہ توجہ کی اور انہیں عالم بنا کے مستقل قیام کے لئے اطراف ہندوستان میں بھیجا، جہاں انہوں نے شیعوں کی جمعہ و جماعت قائم کی اور شیعوں میں من حیث القوم ایک علیحٰدہ جماعت ظاہر کرنے کی جرأت پیدا کی۔ ان کے مذہبی امور کی انجام دہی اپنے ذمہ لی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ نماز، نکاح، دفن و کفن ان کے طریقے پر ہونے لگا۔ مذہبی رواسم، لٹریچر، سیاسی نظریات اہل سنت سے بالکل مختلف ہو گئے اور وہ ایک قوم کی حیثیت سے پورے ہندوستان میں نمایاں ہو گئے اور لکھنؤ ان کا مرکز بن گیا۔

لکھنؤ کا عروج اور دہلی کا زوال:

ادھر آصف الدولہ کی داد و دہش نے لکھنؤ کو عیش و عشرت کا گھر بنایا۔ ادھر دہلی میں

سلطنت کی کمزوری سے ملک کی جنگجو قوموں نے یورش کی، لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ نہ دن کو امن نہ رات کو چین۔ نوکری مفقود، روزگار نایاب، ہر وقت خوف و ہراس۔ انشاؔ جو اسی زمانہ کے آدمی ہیں بیان کرتے ہیں:

''شاہجہاں آبادیاں در شہر خود بیشتر محتاج بنان شبینہ وکمتر نان می خورند''

(دریائے لطافت)

مثل مشہور تھی:

''شاہ عالم ثانی، نہ چولہے پہ توا، نہ گھڑے میں پانی''

اس ابتری اور ہلچل سے دہلی میں بھگدڑ مچ گئی اور قافلے کے قافلے لکھنؤ کی طرف روانہ ہو گئے اس طرح دہلی کی برسوں کی کمائی ایک دم سے لکھنؤ کے ہاتھ آ گئی، رام بابو سکسینہ کا بیان ہے کہ:

''اس عالم بدامنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اپنا وطن چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ وہ شاعر جو سلطنت کے دامن دولت سے وابستہ تھے مثلاً میرؔ، سوداؔ، میر حسنؔ، انشاؔء وغیرہ انہوں نے دہلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کیا، جو اس وقت ان کا قدر شناس اور ان کے لئے دولت خیز خطہ تھا اور علم کی قدردانیوں میں دربار دہلی کے قدم بقدم چلنا چاہتا تھا۔ اس طور پر دلی کا نقصان لکھنؤ کا نفع ثابت ہوا۔

شعرائے دہلی کو اہل لکھنؤ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے ساتھ نہایت اخلاق و محبت سے پیش آئے۔ سلطنت کی طرف سے ان کے واسطے جاگیریں، وظائف، انعام و اکرام مرحمت ہوئے۔ نازک مزاجیاں اور بددماغیاں تک بہت کشادہ پیشانی سے برداشت کی جاتی تھیں بلکہ اکثر انہیں اوصاف کی

تعریف کی جاتی تھی۔ سلسلہ روابط کو مضبوط کرنے کے لئے نوابان عہد اور امرائے وقت نے اکثر شعراء کو دامن دولت سے وابستہ کرلیا اور ان کو اپنا رفیق و مصاحب بنالیا۔"

(تاریخ ادب اردو، ص ۲۸۸)

مولوی عبدالحلیم شرؔر لکھتے ہیں:۔

"اس دور کی مہذب ترین سوسائٹی کے جتنے نامور اور بزرگ تھے سب لکھنؤ کے اندر جمع تھے۔ دہلی کی سبھا وہاں سے اکھڑ کے لکھنؤ میں جم رہی تھی اور لکھنؤ میں ایسا جوش قدردانی تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے۔"

(گذشتہ لکھنؤ، ص ۷۷)

یہاں تک نوبت پہنچی کہ شاہی خاندان کے افراد بھی لکھنؤ آ کر آباد ہونے لگے مؤلف تذکرۂ گل رعنا لکھتے ہیں:

"پہلے مرزا جواں بخت شاہ عالم کے ولی عہد لکھنؤ آئے، یہ کچھ دنوں رہ کے بنارس چلے گئے، پھر ان کے بھائی مرزا سلیمان شکوہ آئے۔ وہ یہیں رہ پڑے۔"

مرزا سلیمان شکوہ کو حکومت کی طرف سے اتنا ملتا تھا کہ وہ شاہانہ تزک و احتشام سے رہتے تھے اور بڑے بڑے شعراء ان کے دربار سے وابستہ تھے۔

آصف الدولہ خود باکمال شاعر، تمام اصناف سخن پر قادر اور صاحب دیوان تھے۔ ان کا کلام اس زمانہ میں میرؔ و سوداؔ کے کلام کی طرح مقبول و مشہور تھا۔

سعادت یار خاں رنگینؔ نے دو واقعے 'مجالس رنگینؔ' میں لکھے ہیں جن سے ان کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(ا) کانوڑا [1] سے نواب نجف خاں نے نواب مرزا جعفر کو دہلی بھیجا اور مجھے دوسو سواروں کے ساتھ ان کے ہمراہ کیا۔ جب ہم ریواڑی پہنچے تو وہاں کے راجہ مترسین نے بڑی پر تکلف دعوت کی۔ کھانے کے بعد محفل رقص و سرود گرم ہوئی۔ نواب نے مغنیہ سے غزل گانے کی فرمائش کی۔ اس نے وزیر الملک نواب آصف الدولہ بہادر کی یہ غزل گائی ؎

جہاں تیغ اس کی علم دیکھتے ہیں
وہاں اپنا سر ہم قلم دیکھتے ہیں

ہم نواب اسمٰعیل خاں کی فوج کے ساتھ نارنول پہنچے۔ وہاں ایک صاحب ملے، کہنے لگے آپ کا ذکر میں نے اجمیر میں سنا تھا۔ اتفاق سے ملاقات بھی ہوگئی۔ مجھے نواب آصف الدولہ بہادر کے اس شعر کے دوسرے مصرع کی بہت دن سے تلاش ہے ؎

نہ لگی آنکھ جب سے آنکھ لگی

ان دونوں واقعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام دور دور مشہور تھا۔ لوگ اشتیاق سے سنتے اور محفوظ رکھتے تھے۔ ارباب نشاط ان کی غزلوں سے محفلیں گرم کرتے تھے۔ اس مقبولیت کی وجہ ان کے کلام کی روانی، برجستگی اور سادگی ہے، ایک رباعی ان کی مشہور ہے جو سادگی کے ساتھ پرکاری اور تصنع کے ساتھ برجستگی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایسی رباعی وہی کہہ سکتا ہے جو شاعری پر استادانہ قدرت رکھتا ہو ؎

اے یار جو کسی کو کلپاوے گا
یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پاوے گا

---

[1] ریاست پٹیالہ میں ایک قصبہ مہیندر گڑھ ہے یہ پہلے کانوڑ تھا۔

اس دار مکافات میں سن اے غافل
بیداد کرے گا آج تو کل پاوے گا

غزل کی سلاست، روانی اور برجستگی ملاحظہ ہو ؎

ہم نے قصہ بہت کہا دل کا
نہ سنا تم نے ماجرا دل کا

آصف الدّ ولہ کی بیوی دلہن بیگم نواب شمس النساء شرمؔ بھی باکمال شاعرہ اور صاحب دیوان تھیں۔ اکثر آصف الدّ ولہ کی غزلوں پر غزلیں کہا کرتی تھیں۔ نواب کی وہ مشہور غزل ؎

جہاں تیغ اس کی علم دیکھتے ہیں
وہاں سر ہم اپنا قلم دیکھتے ہیں

اس پر شرمؔ نے بھی غزل کہی تھی جو آصف الدولہ کی غزل سے کسی طرح کم نہیں۔ دونوں کی غزلیں ملاحظہ کیجئے ؎

ا؎ یہ شعران کی آپ بیتی ہے، نواب نے ان سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ ساری زندگی انہوں نے علیٰحدہ مکان میں حزن وغم میں گذاری، یہ نواب قمرالدین خاں وزیراعظم دہلی کی پوتی تھیں جو احمد شاہ ابدالی کے پہلے حملے میں مارے گئے۔

آصفؔ	شرمؔ
جہاں تیغ اس کی علم دیکھتے ہیں	خوشی دل میں ہم اپنے کم دیکھتے ہیں
وہاں سر ہم اپنا قلم دیکھتے ہیں	اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ہیں
جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں	نہ قطرہ کوئی خوں کا باقی ہے دل میں
خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں	نہ آنکھوں میں ہم اپنی نم دیکھتے ہیں
بہت جھوٹے وعدے کئے تو نے ہم سے	نگاہ کرم جس جگہ پر کرے تو

بھلا ہم تو تیری قسم دیکھتے ہیں ہم اس جا پہ باغ ارم دیکھتے ہیں
جو چاہیں کہ لکھیں کچھ احوال دل کا کرم سے ترے شاد وخرم ہیں یہ سب
تو ہاتھوں کو اپنے قلم دیکھتے ہیں مگر ایک ہم ہیں کہ غم دیکھتے ہیں[1]

بتوں کی گلی میں شب و روز آصفؔ کہاں تاب ہے غیر کو دیکھنے کی
تماشہ خدائی کا ہم دیکھتے ہیں اگر دیکھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں

شرمؔ کا دیوان مفقود ہے۔ یہ دونوں غزلیں دیوان جہان مصنفہ منشی بینی نرائن کے قلمی نسخے سے ماخوذ ہیں جولندن کے عجائب خانہ میں رکھا ہوا ہے۔

اودھ کے تمام فرمانروا چاہے کچھ اور نہ رہے ہوں مگر شاعر، عاشق، سپاہی، قدردانِ علم وفن اور مذہب کے دلدادہ ضرور تھے۔

آصف الدولہ بھی بڑے بہادر تھے۔ روہیل کھنڈ کی جنگ میں شجاع الدولہ کے ساتھ تھے۔ مورخین کا بیان ہے کہ انہوں نے بڑی بے جگری سے حملے کر کے بڑے بڑے مورچے توڑ دیئے۔

محمد حسین آزادؔ نے 'آب حیات' میں سوداؔ اور مرزا فاخر مکینؔ کے جھگڑے میں لکھا ہے کہ جب سعادت علی خاں نے آصف الدّولہ سے کہا کہ والد مرحوم نے مرزا سوداؔ کو برادر من مشفق مہربان لکھ کے بڑی آرزو سے بلوایا تو انہوں نے کہا کہ وہ میرے چچا ہیں اور فوراً ان کی حمایت کو تیار ہو گئے۔

اس عزت افزائی اور قدردانی کا نتیجہ تھا کہ جہاں بھی جس طرح کا کوئی صاحب فن تھا اس نے لکھنؤ کا رخ کیا اور بقول لطفؔ ایک ایک کمال کا ہزار ہا آدمی موجود تھا۔ شعراء کا اتنا مجمع تھا، جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔ یہاں ان شعراء کے نام لکھے جاتے ہیں جو دہلی اور دوسرے مقامات سے لکھنؤ آئے۔

میر تقی میرؔ، اشرف علی خاں فغاںؔ، صلاح الدین پاکبازؔ، خواجہ حسین علی روشنؔ، شاہ مجنون مجنونؔ، محمد علی راحمؔ، میر حیدر علی حیرانؔ، میر ولی اللہ محبؔ، میر محمد حسین منشیؔ، کاظم علی جوانؔ، میر قدرت اللہ رخصتؔ، مرزا جعفر علی حسرتؔ، میر محمد یعقوب عیاشؔ، مرزا اثمر علی ثمرؔ، رائے سرپ سنگھ دیوانہؔ، شیخ عبدالرحیم رعناؔ، میر قمر الدین منتؔ، میاں عبدالرحیم زیباؔ، مرزا محمد علی شہرتؔ، محمد حیات بیتابؔ، مرزا اسمٰعیل طپشؔ، سعادت یار خاں رنگینؔ، مرزا فاخر مکینؔ، محمد علی وہمؔ، خواجہ حسن حسنؔ، حسن علی خاں یاسؔ، میر غلام حسین برشتہؔ، مرزا اشرف الدین وفاؔ، شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ، مرزا محمد حسن قتیلؔ، انشاء اللہ خاں انشاؔ، میر امانی اسدؔ، میر شاہ علی خان دہلی سے آئے۔

قیام الدین قائمؔ چاند پور سے، اسلام اللہ خاں تسلیمؔ کشمیر سے، میر امام علی صاحبقران مزاحیہ گو، بلگرام سے محمد خاں آگاہ، مرزا اصفی الدین صفائیؔ، مرزا اکبر علی مونسؔ، مرزا امامی واصلیؔ ایران سے لکھنؤ آئے۔

ان شعراء میں اگر ان کو بھی شامل کر لیجئے جو شجاع الدولہ کے زمانہ میں فیض آباد آئے اور پھر آصف الدولہ کے ساتھ لکھنؤ تو ایک جم غفیر ہو جاتا ہے۔

مصنف شعرالہند کا خیال ہے کہ لکھنؤ کو اس زمانہ میں مرکزیت حاصل ہوگئی تھی وہ لکھتے ہیں:

> ''انہوں (آصف الدولہ) نے نہایت فراخ حوصلگی سے شعراء کی قدردانی کی اور ان کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کیں، اس لئے اب بجائے دہلی کے لکھنؤ شاعری کا مرکز بن گیا۔ عام طور پر منتخب اور برگزیدہ لوگوں نے لکھنؤ کا رخ کیا اور اس طرح جو مرکزیت اس کو حاصل تھی وہ لکھنؤ کو بھی حاصل ہوگئی۔''
>
> (ص ۳ ج ۲)

لیکن یہ مرکزیت دہلی والوں کے آنے سے پیدا ہوئی تھی اور دہلی سے علیٰحدہ کوئی چیز نہ تھی۔

لکھنؤ کے تمدن کا آغاز

اس میں شک نہیں شجاع الدولہ کے زمانہ سے دہلی کے ارباب کمال یہاں آ کے اطمینان سے بیٹھے تو اپنے اپنے فن میں خوبیاں اور دل فریبیاں پیدا کرنے لگے جس سے لکھنؤ کا تمدن دہلی سے ممتاز ہونے لگا، اس کا اثر زبان وشاعری پر بھی ناگزیر تھا۔

شجاع الدولہ کی جنگی تیاریوں اور سپاہیوں کی کثرت سے عام طور پر لوگوں میں انکڑ تکڑا اور بانکپن پیدا ہو گیا تھا۔ لوگ سپاہیانہ وضع میں رہتے تھے، گوٹا لچکا جو دہلی کے مردوں کی پوشاک کا جز تھا یہاں معیوب سمجھا جانے لگا، قرابین (تینچہ) ڈھال، تلوار، کٹار وضع میں داخل ہو گئی۔

اگر چہ آصف الدولہ نے فوج کم کر دی مگر سپاہیوں کا ٹھکانا سوائے لکھنؤ کے اور کہیں نہ تھا۔ ہندوستان کی جنگ جوئی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا کچھ انگریزی فوج میں ملازم ہو گئے، باقی رئیسوں کی سرکار میں کھپ گئے۔ اس طرح فوج ٹوٹنے پر بھی لکھنؤ میں سپاہیوں کی کمی نہ رہی اور سپہ گری کا فن یہاں ترقی کرتا رہا۔

آصف الدولہ نے فوج کم کرنے کے بعد اپنے جنگ جویانہ جذبات کی تسکین کے لئے شیر اور ہاتھی کی لڑائی کا تماشا دیکھنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ اس میں اور جدت پیدا کی گئی اور مرغ و بٹیر بھی لڑائے جانے لگے۔ یہ دونوں لڑائیاں ایسی تھیں جن سے عوام بھی دل بہلا سکتے تھے۔ چنانچہ مرغ بازی اور بٹیر بازی لکھنؤ میں عام ہو گئی۔ شطرنج اور چوسر کے بھی لوگ شائق تھے۔

شجاع الدولہ کے زمانہ سے دہلی اور دور دراز مقامات سے ارباب نشاط آ کے آباد ہو گئے تھے اور لکھنؤ حسین و مہ جبین عورتوں سے پرستان بن گیا تھا۔

موسیقی کو اتنا عروج ہوا کہ لکھنؤ اس کا مرکز بن گیا۔ علم و دانش کے پرستاروں نے اس کے آگے سر نیاز جھکا دیا۔ تفضّل حسین خاں علامہ جن کے متعلق محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزادؔ

کی رائے ہے کہ ابوالفضل کے بعد اگر علامہ کا خطاب کسی کو زیب دیتا ہے تو وہ تفضّل حسین خان ہیں، یہ موسیقی کے زبردست ماہر تھے۔

'اصول النغمات الآصفیہ' موسیقی میں معرکہ آرا کتاب لکھی گئی۔ رفتہ رفتہ اس فن کو اتنی ترقی ہوئی کہ لکھنؤ اور بنارس موسیقی کے دو اسکول آج بھی تسلیم کئے جاتے ہیں۔

طب یونانی کے بڑے بڑے کامل جمع ہو گئے تھے، جن کی بدولت لکھنؤ یونان بن گیا تھا۔

علماء میں مولوی مخدوم، شیخ اعظم ثانی، مولوی اعظم سندیلوی، مولوی عبدالحق مخدوم زادہ، مولوی حیدر علی اور مولوی اکبر علی پسران مولوی حمداللہ، مولوی احمد علی داماد مولوی حمداللہ۔

علمائے فرنگی محل میں، ملا عبدالحق، ملا حسن، ملا حسین، ملا اولوالرحم ایسے علماء تھے جن کا مثل ہندوستان میں نہ تھا۔

علمائے فرنگی محل کو قضا وافتیٰ کی مسند پر سابق کی طرح بحال رکھا۔ ان کے علاوہ ملا احمد علی کو بھی قاضی مقرر کیا۔

حکومت کی سرپرستی اور علماء کی کثرت نے لکھنؤ کو علوم عربیہ کا مرکز بنا دیا۔ معقول ومنقول فقہ واصول اور کلام ومناظرہ میں بے مثل کتابیں لکھی گئیں اور دور دراز مقامات سے طلبائے علوم اس سرچشمہ علم سے سیراب ہونے کے لئے پہنچنے لگے۔

دولت کی فراوانی، اطمینان اور بے فکری نے روساء، شعراء، علماء، سپاہی، داستان گو، صناع دستکار اور مے فروشان جمال کو یکجا کر دیا۔ اس اجتماع رنگا رنگ سے ایک خاص معاشرہ پیدا ہو گیا۔ ہر رئیس کی سرکار سے طبیب، شاعر، شہ سوار، سپاہی اور ارباب نشاط کا وابستہ ہونا ضروری تھا اور رئیس صرف تماشائی نہ تھا بلکہ خود بھی شاعر، شہ سوار اور عاشق مزاج تھا۔ امرد پرستی عیب تھی۔ مہذب اور شائستہ گانے والیوں سے دلبستگی، حسن خلق، خوش پوشا کی، خوش

خورا کی، وضع میں داخل تھی۔ نفاست پسندی اور جدت طرازی ہر شعبۂ زندگی میں کارفرما تھی۔ بانکپن کے ساتھ تواضع، فروتنی اور حسن خلق کا دلکش امتزاج تھا۔ شریف پروری اور ہمدردی کا جذبہ عام تھا، اہلبیتؑ سے عقیدت اور مودت، ان کے مصائب کا بیان، تعزیہ داری اور مجلس بہترین کار خیر تھا اور ان کے دشمنوں سے بیزاری جزو یمان۔

اس کا اثر زبان و شاعری پر یہ ہوا کہ میرؔ و سوداؔ کا انداز بدل گیا۔ ان کی آہ و زاری اور دنیا سے بیزاری کم ہوگئی۔ انہیں آنکھوں میں شراب کی مستی اور ہونٹ گلاب کی پنکھڑی نظر آنے لگے۔ غزلوں میں بھی اہلبیتؑ کی منقبت میں اشعار کہے جانے لگے اور تصوف کے مضامین کم ہو گئے۔

بھونڈی لفظیں اور بھدی ترکیبیں محسوس ہونے لگیں۔ سجن، سریجن موہن، پی، پیا، پیتم، پریتم (معشوق) درپن (آئینہ) اچھے (سے) سین۔ سیتی (سے) کدھین (کبھی) وغیرہ متروک ہوگیا۔ اور ان اصلاحوں کو دہلی والوں نے بھی بے تامل قبول کیا، کیونکہ اصلاح کرنے والے دہلوی تھے۔ اس طرح دہلی میں لکھنؤ کی اصلاحوں کو قبول کرنے کی بنیاد پڑی۔

(ماخوذ از نگار پاکستان، اگست ۱۹۶۷ء)

❁ ❁ ❁

مرثیہ (بند ۲۷۵ر)

دراحوال شیعیانِ ہند
وفضائل ومصائب حضرت علی اصغرؑ وسید الشہدا حضرت امام حسینؑ

مصنف

خطیب اکبر، لسان الشعراء سید الاباء
مولانا سید اولاد حسین نقوی شاعرؔ اجتہادی

مرثیہ (بند ۲۷۵)

دراحوال شیعیانِ ہند وفضائل ومصائب حضرت علی اصغرؑ وسید الشہداء حضرت امام حسینؑ

خطیب اکبر، لسان الشعراء سید الادباء مولانا سید اولاد حسین نقوی شاعرؔ اجتہادی

(۱)

حق نے اسلام کو جو دی تھی وہ دولت نہ رہی
شکرِ نعمت نہ کیا ہم نے تو نعمت نہ رہی
تاجِ شاہی نہ رہا، شوکت و حشمت نہ رہی
اس قدر بگڑے کہ پہلی سی طبیعت نہ رہی
خویش کُش نام ہوا، غیر کے محتاج ہوئے
جن کے سر رہتے تھے قدموں پہ وہ سرتاج ہوئے

(۲)

مرشدآباد کی دولت کو مٹایا ہم نے
خود سراجِ رہ بنگالہ بجھایا ہم نے
شیرِ میسور کو کانٹوں میں پھنسایا ہم نے
راستہ قلعہ کا غیروں کو بتایا ہم نے
شعلہ ور نار حسد ہوگئی غدّاری سے
اپنا گھر پھونک دیا اپنی ہی چنگاری سے

(۳)

نہ کیا پاسِ سپہ داریِ آلِ تیمور
سلطنت جتنی جھکی اتنا بڑھا اور غرور
پئے تاج اک ہوا محتاج بنا اک فغفور
پا کے پہلو میں جگہ بن گئے دل کا ناسور
حشر کیا ہوگا الٰہی سرِ محشر اپنا
بعض سینوں میں بھنکا رہ گیا خنجر اپنا

(۴)

لکھنؤ شوکتِ اسلام کا بابِ عالی
اِس کے شاہوں نے غریبوں کے بھرے گھر خالی
کیا محمد علی ایسے کہیں گزرے والی
اب بھی برمائی نہیں جس کی سنہری تھالی
مر کے احسان کرے، دم یہ کسی اور میں ہے
آپ ساقی نہیں پیمانہ مگر دور میں ہے

(۵)

اے سلیمانِ اودھ مالکِ ملکِ خیرات
لے وثیقہ ترا منجملۂ اسبابِ حیات
گومتی ہے تری امواجِ سخاوت سے فرات
تیرا در بابِ اماں، تیری گلی راہِ نجات
تیرا میخانہ تھا مخصوص شریفوں کے لئے
میرے ہاتھوں جو ہوا عام حریفوں کے لئے

(۶)

دخترِ والیِ گجرات بہو بیگم نام
بنتِ شہ جس کا لقب، قلعۂ دہلی میں قیام
اخترِ برجِ اودھ، خنکیٔ چشمِ اسلام
اتنی بھولی کہ دہی لے کے گہر دیتی تھی دام
مقبرہ رہ گیا، ہل چل گیا کاشانے میں
جس کا قرآن ہے پٹنہ کے کتب خانے میں

(۷)

جس کی شادی میں رنگیلے نے گھٹا برسائی
رو نمائی میں ہر اک صوبے سے دولت پائی
وہ دولہن جو در و گوہر کے عرابے لائی
جس نے زہراؑ کی طرح سوکھی سی روٹی کھائی
خواب میں جس نے دوا پائی تھی بیماری کی
جس نے شبیرؑ کے کہنے سے عزاداری کی

(۸)

فیض آباد میں جو کچھ ہے وہ سب اس کا ہے
تذکرہ تا حدِ ایران و عرب اس کا ہے
مائی جی قریہ و ہر دہ میں لقب اس کا ہے
جو غریبوں کا ہو، سچ پوچھو تو اب اس کا ہے
نسلوں تک پہنچی وہ مضبوط نمک خواری ہے
ملکہ سو گئی، تنخواہ مگر جاری ہے

(۹)

قرضۂ جنگ کے چنگل نے یہ دولت لے لی
جو غریبوں کے لئے تھی وہ بضاعت لے لی
نام کچھ اور نہ ہو اس سے یہ حکمت لے لی
صاحبِ مال نے زر دے دیا، جنت لے لی
جس پہ یہ تاجِ مرصع تھا وہ سر کیسا تھا
عورتیں ایسی تھیں جس گھر کی وہ گھر کیسا تھا

(۱۰)

ہم نے لٹوائے یہ گھر توپوں میں پتھر بھر کے
ہم نے کٹوائے یہ سر آپ اشارے کر کے
ہم ہی بھیدی، ہمیں غدّار بنے اس گھر کے
دلِ اربابِ وفا پر ہیں ابھی تک چرکے
کب زمینوں سے غمِ سوزِ نہاں اٹھتا ہے
آج تک سنتے ہیں قبروں سے دھواں اٹھتا ہے

(۱۱)

خویش کُش، ننگِ وطن، نانِ دغا کے بھوکے
تیغ جن کی نہ رگِ جانِ پدر پر چوکے
نام پر ان کے اٹھیں نارِ سقر سے لوکے
تھوک ہو اس کا نجس جو لحدوں پر تھوکے
مقبروں سے جو کبھی ان کے ہوا آتی ہے
لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِمْ کی صدا آتی ہے

(۱۲)

ملک و ملت سے کبھی شہر سے غدّاری کی
کبھی تلوار کبھی زہر سے غدّاری کی
ایک اسلام نہیں، دہر سے غدّاری کی
فرقِ دیں جھک گیا اس قہر سے غدّاری کی
گرچہ سید تھے مگر رہ نہ سکے حرؑ بن کے
نسل سے غدر کیا، خان بہادر بن کے

(۱۳)

اولیا ، کافر و مشرک کو بنایا ہم نے
حکم قرآں کا پسِ پشت چھپایا ہم نے
اپنا گھر کفر کے قدموں میں بسایا ہم نے
اپنا تن کر دیا اغیار کا سایا ہم نے
ٹھوکریں کھا کے بھی مداح و ہوا خواہ رہے
پاؤں تھامے ہوئے ہر راہ میں ہمراہ رہے

(۱۴)

قتلِ سادات سے کب لوگوں نے بیزاری کی
سنتِ شمر و بنِ سعد یہاں جاری کی
جیسے ان لوگوں نے اسلام سے مکّاری کی
کوفیوں نے یونہی شبّیرؑ سے غدّاری کی
پاسِ خاطر نہ ہوا باپ کا جلادوں کو
انہی تلواروں نے مارا تھا نبیؐ زادوں کو

(۱۵)

انہی غداروں سے کھلبل ہوئی بنیانِ وفا
معدنِ غدر ہے دل، لفظ ہیں عنوانِ وفا
روپ میں حضرت آدم کے ہیں شیطانِ وفا
حلق میں خون ہے، ہونٹوں پہ ہے قرآنِ وفا
قتلِ حمزہؑ سے غرض نکلے تو کچھ عار نہیں
ہونٹ یوں سادے ہیں، جیسے کہ جگر خوار نہیں

(۱۶)

اس زمانے میں ہے بیکار جو مکار نہیں
سرد بازارِ وفا ہے کہ خریدار نہیں
زہدِ مقدادؓ نہیں، جراتِ عمارؓ نہیں
خواہشِ تخت ہے اور ہاتھ میں تلوار نہیں
غیر سے دبتے ہیں، اپنوں سے دغا کرتے ہیں
خواب گاہوں میں ترقی کی دعا کرتے ہیں

(۱۷)

ہیچ ہر رنگ میں ، انساں بھی نہیں، حر بھی نہیں
سنگ پھر مہدِ جواہر ہے یہ پتھر بھی نہیں
حجرِ مکہ و سنگِ درِ خیبر بھی نہیں
حیدری نعرے ہیں اور زور میں عنتر بھی نہیں
جم کے لڑتے تو ، سپاہی تو کسی ڈھب بنتے
گر علیؑ ہو نہیں سکتے تھے تو مرحب بنتے

(۱۸)

ہائے جو حق نے عطا کی تھی وہ سیرت نہ رہی
غیر کا دخل نہیں، اپنی بدولت نہ رہی
صاف گو، آئینہ، جو تھی وہ صداقت نہ رہی
اپنا منہ دیکھنے کی اب کوئی صورت نہ رہی
محویت اتنی بڑھی دستِ خرد چھوٹ گیا
میرے ہی ہاتھ سے آئینہ مرا ٹوٹ گیا

(۱۹)

ریگزاروں کا مرے واسطے راج اچھا تھا
مگسِ شہد جو لاتی تھی خراج اچھا تھا
گوشہ گیروں کا وہ چھوٹا سا سماج اچھا تھا
سادہ سادہ تھا عمامہ مرا ، تاج اچھا تھا
شعر سے لطف اٹھاتے تھے سناں چلتی تھی
ہاتھ رک جاتے تھے تو تیغِ زباں چلتی تھی

(۲۰)

گلہ بانی تھی، زراعت تھی، شتربانی تھی
چوٹ کھاتا تھا فلک، ایسی زباں دانی تھی
آگ روشن تھی چمکتی ہوئی مہمانی تھی
غیرت و جرأت و ہمت کی فراوانی تھی
آپ سمجھے تھے کسی غیر کے سمجھائے نہ تھے
پردہ دستور تھا احکامِ حجاب آئے نہ تھے

(۲۱)

ملک میں کچھ نہ تھا ،اغیار سے پھر بھی نہ تھے کم
فیلِ ہندی سے، عرب گھوڑوں کو ٹکراتے تھے ہم
کعبہ سے بڑھ کے تھا کچھ جشن گہہِ روم و عجم
رشکِ گنگا تھا، کٹورا سا ہمارا زم زم
اسلحے کس کے تھے دمدار یہ اغیار سے پوچھ
کیا تھی شمشیرِ عرب چین کی دیوار سے پوچھ

(۲۲)

میرے گہوارہ سے بیدار ہوئے کتنے جلیل
آلِ عمرانؑ و بنی لوطؑ و بنی اسمٰعیلؑ
میری ہی خاک کی دو شکلیں ہے کعبہ و خلیل
میرے بھاگے ہوئے بھائی ہیں بنی اسرائیل
کس کے عیسیٰؑ نے بنایا ہے مزاجِ مغرب
میری اتری ہوئی دستار ہے تاجِ مغرب

(۲۳)

طور کہتے ہیں جسے، ہے وہ وطن کی دیوار
نام موسیٰؑ ہے، مگر ہے مری چشمِ دیدار
میرا سر دیکھ کے بدلا کیا خالق دستار
مجھ کو جبریلؑ نے دی لا کے اخیری تلوار
تاجِ اسلام ملا، رشکِ شہنشاہ ہوا
ہاتھ میرا بڑھا اتنا کہ ید اللہ ہوا

(۲۴)

طعن ، میخواری و اولادکُشی کے تاچند
این گناہیست کہ در شہر شما نیست کنند
ہم سیہ کار نہ چوری میں نہ ڈاکہ میں تھے بند
لاکھ جرموں پہ بھی تھا جذبۂ شنوائی پند
پھر نہ کچھ حسرتِ بت سازِ دراندازِ سنی
سب کو چھوڑ آئے، محمدؐ کی جو آواز سنی

(۲۵)

اس نے قرآں میں مقدر کا لکھا جوڑ دیا
ہم نے تغئیرِ جہالت کا ورق موڑ دیا
اسے جس جس نے کیا منع، اسے چھوڑ دیا
ساغرِ کبرِ خدائی تھا جبل توڑ دیا
توبہ کی ، رندِ سیہ کفر نے خاور پایا
میکدہ صاف ہوا، ساقئ کوثر پایا

(۲۶)

نامِ کعبہ پہ ہوا دیر ، یمن کا ویراں
کئے ناقوس ، بلالِ حبشیؓ پر قرباں
غیر اپنے ہوئے، جس میں کہ ہیں بھائی سلماںؓ
شاعری بھول گئے، ہاتھ میں لے کر قرآں
چھٹ گئیں شعر کے اذکار کی راتیں ہم سے
جب سے ہونے لگیں جبریلؑ سے باتیں ہم سے

(۲۷)

دشمنیِ بنی اعمام و برادر چھوڑی
عادتِ قتلِ زن و دختر و خواہر چھوڑی
چشمِ پیمانہ شکن پر مئے احمر چھوڑی
قوم سنورے ہوئے گیسو کی طرح کر چھوڑی

جوشِ ایماں سببِ عزتِ رندانہ بنا
جب سے قرآن کا ہر دائرہ پیمانہ بنا

(۲۸)

رشک ، ہشیار کو آنے لگا دیوانے پر
اب تو جھکنے لگی دنیا مرے میخانے پر
جام قربان تھے انگور کے ہر دانے پر
چشمِ زہاد بھی پڑنے لگی پیمانے پر

رنگ ، جیحون نے حاصل کیا میخانے کا
نیل دھبہ تھا جھلکتے ہوئے پیمانے کا

(۲۹)

نورِ زُہرہ ہوا خود دیدۂ یونان میں کم
دوشِ جعفرؑ پہ گیا تا بہ حبش میرا علم
بندگانی میں برسنے لگا نیسانِ کرم
سبز جمنا ہوئی یوں مل گیا آبِ زمزم

نعرۂ حق سے جو دُھن مل گئی گمرا ہوں کی
بانسری ہچکیاں لینے لگی چرواہوں کی

(۳۰)

ہند میں پہنچا جو خمخانۂ یثرب کی پیئے
تعزیہ سر پہ رکھے، ہاتھ میں قرآن لئے
میں نے بھائی کی محبت کے مزے خلق کئے
تعزیہ خانوں میں کھنچ آئے عقیدت کے دیئے
قصے کہنہ تھے وفا کے نئے آئین لئے
نامِ عباسِ وفادار نے دل چھین لئے

(۳۱)

ستم و جور پہ راضی نہ تھے اربابِ وطن
میں نے سمجھایا کہ ہے صبر محمدؐ کا چلن
حال سن سن کے یہ شبیرؑ کا سمجھے بامن
ایک ہی باپ کے بیٹے تھے یزید و راون
زندگی نام پہ خالق کے کوئی کھو نہ سکا
سبطِ احمدؐ نے کیا، غیر سے جو ہو نہ سکا

(۳۲)

میں نے چھلکا دیئے مینائے دکن، جامِ اودھ
زلفِ بنگالہ کو خوشبو بنا پیغامِ اودھ
سن کے غل ہائے حسینا کا سرِ بامِ اودھ
روز منہ ڈھانپتی ہے پچھلے پہر شامِ اودھ
تشنہ کاموں کا سنا حال تو عشرت نہ رہی
فق ہے منہ، صبحِ بنارس کی وہ رنگت نہ رہی

(۳۳)

عہدِ احمد ہی میں گو ہند کا پایا تھا سراغ
ساتھ مصحف کے ضروری تھا مرے دل کا بھی داغ
ظلمتِ جہل میں دشوار تھا پڑھنا بہ فراغ
میں نے قرآں کے قریں رکھ دیا زہراؑ کا چراغ
ذکرِ شبیرؑ بڑھا ملک میں تقدیروں سے
رزم کو بزم بنایا انہیں تدبیروں سے

(۳۴)

اب ملچھ ہم کو نہیں کہتے جو پہچان گئے
مختصر یہ شرفا کو شرفا جان گئے
نامِ اکبرؑ پہ، جواں ہند کے قربان گئے
راجپوتانے بھی عباسؑ کو دل مان گئے
جیسے پہلے ہی سے تیار تھے بھاری سہرے
نامِ قاسمؑ کے ہوئے نذر بہاری سہرے

(۳۵)

شادیوں میں تو مسلمانوں کی کم اٹھتے ہیں
ساتھ دینے شرفا غم میں بہم اٹھتے ہیں
کاندھے جڑ جاتے ہیں، ہمراہ قدم اٹھتے ہیں
جن پہ بت اٹھتے تھے، اب ان پہ علم اٹھتے ہیں
لَو تو حق سے لگے کعبہ نہیں سینا ہی سہی
لا الٰہ نہ سہی ہائے حسینا ہی سہی

(۳۶)

لذتِ درد سے آگاہ نہ تھے بیگانے
ساز کو سوز کیا میں نے چھڑائے گانے
میں نے بنوا دیئے ماتم کدے، عشرت خانے
چوڑیاں توڑنا کیا کوئی سہاگن جانے
نامِ قاسمؑ سے المناک کیا دنیا کو
رانیاں رونے لگیں کھول کے سرگُبراؑ کو

(۳۷)

میں نے زرتار کو راجاؤں کی بنوایا سیاہ
قدر سے آہ کی بے قدر ہوئی صنعتِ واہ
نام اسلام کا پہنچا دیا اللہ گواہ
کر دی چوٹی سے ہمالہ کے قریں عرش کی راہ
کیف، عشرت گہہِ نیپال میں کس نام کا ہے
اب تو اندور میں بھی دور مرے جام کا ہے

(۳۸)

زینتیں کردیں ضریحوں سے جو ایوانوں کی
رہ گئیں دیکھ کے منہ کلسیاں بت خانوں کی
ہمنوائی ہے کسانوں میں مسلمانوں کی
کہیں گیہوں کی ضریحیں ہیں، کہیں دھانوں کی
سبزیِ جامۂ سادات ہے زر تاروں میں
بارہ دن ماتم شبیرؑ ہے سرکاروں میں

(۳۹)

ابلا پڑتا ہے ذرا سندھ کے ویرانے کو دیکھ
کس کے آنسو ہیں یہ پنجاب کے پسرانے کو دیکھ
جھاؤ لال اور غمِ شاہؑ کے افسانے کو دیکھ
پاس مسجد بھی بنا دی ہے عزاخانے کو دیکھ
لکھنؤ جا کے محبت کا پتا ملتا ہے
جس کو شبیرؑ ملیں، اس کو خدا ملتا ہے

(۴۰)

لعل دلوائے چہر سُو اَڑے پتھر میں نے
راہ گیروں سے الگ کر دیئے رہبر میں نے
بحرِ ظلمات میں چمکا دئے خاور میں نے
خضر اُبھارے ہیں، ڈبوئے ہیں سکندر میں نے
روشنی صورتِ فانوس دلِ روس میں ہے
باختر چمکے نہ کیوں، شمع مری طوس میں ہے

(۴۱)

نور نے میرے جو مکے میں چمک دکھلائی
شمعِ آتش کدۂ ملکِ عجم لہرائی
روم و ایراں کے گرے قصر، زمیں تھرائی
کتنی اونچی گئی چھوٹی سی مری انگڑائی
خوب پہچانتے ہیں دجلہ و جیحوں والے
صاحبِ شقِ قمر کہتے ہیں گردوں والے

(۴۲)

میں وہ ہوں، مجھ سے کیا نطق کے خالق نے خطاب
وہ مرے دستِ رسا عرش سے لے آئے کتاب
درس گہہ سے مرے سیکھے حکما نے آداب
عرش کے ذہن سے اونچا ہے مرے علم کا باب
درسِ اسرار دئے واقفِ تنزیل کیا
میرے دروازے نے جبریلؑ کو جبریلؑ کیا

(۴۳)

یوں تو تخلیقِ زمیں اور زماں میری ہے
مجھ سے معبود کا ہے ذکر ، اذاں میری ہے
موجدِ امن ہوں، آوازِ اماں میری ہے
حریت عبد کی بے شک و گماں میری ہے
مول میں نے ہی لیا میں نے ہی دولت بخشی
میں نے سلماں کو مدائن کی خلافت بخشی

(۴۴)

کر دیا عبد کو آزاد کرم گاری نے
اور آزاد کو بندہ کیا دلداری نے
سونے والوں کو جگایا مری ہشیاری نے
پھونک دی کبر کی دنیا مری چنگاری نے
جو خذف ہاتھ لگا دُرِ نجف کر ڈالا
میں نے خدمت کو غلاموں کی شرف کر ڈالا

(۴۵)

میں نہ اٹکا کہیں ، گزرا ہوں اٹک سے آگے
میں ثریا سے ہوں اونچا تو سمک سے آگے
میرا رہوار گیا بالِ ملک سے آگے
ہاں وہی ہوں میں بشر، تھا جو فلک سے آگے
گردشِ ارض کہاں چرخ کا بھی دور نہ تھا
میں وہاں تھا جہاں خالق کے سوا اور نہ تھا

(۴۶)

میری چادر ہے فلک ، صاحبِ عظمت میں ہوں
مہر و عیسیٰؑ سے جو اونچی ہے وہ رفعت میں ہوں
مظہرِ نورِ خدا مظہرِ وحدت میں ہوں
میرا خالق ہے خدا، خالقِ کثرت میں ہوں
آسماں میرے ہی قدموں کے نشاں بنتے گئے
ایک سے دو بنے اور دو سے جہاں بنتے گئے

(۴۷)

منتہا شرق کا جس جا ہے، وہاں تک پہنچا
غرب میں مہر درخشاں کے مکاں تک پہنچا
نام محبوب تھا میرا ، رگِ جاں تک پہنچا
کوئی جبریلؑ سے پوچھے کہ کہاں تک پہنچا
خیر گذری کہ پرِ روحِ امیں جل نہ گیا
میری نعلین سے آگے کوئی مرسل نہ گیا

(۴۸)

لختِ دل لعل بنے اور گئے کہساروں میں
چشمے پیدا کئے اشکوں نے مرے غاروں میں
پھول شرما گئے وہ رنگ بھرا خاروں میں
نام اللہ کا پہنچا دیا گہواروں میں
ذہنیت یوسفِ عرفاں کی خریدار بنی
ہر رگِ جانِ بشر، مصر کا بازار بنی

(۴۹)

کبر کے تاج اتارے گئے درباروں میں
زہد پیدا ہوا دولت کے نمک خواروں میں
چاپلوسی نہ خوشامد رہی گفتاروں میں
کاسۂ صدق کھنکنے لگے بازاروں میں
منقلب فطرتِ دنیا ہوئی اعجاز کیا
میں نے مظلوم کو ظالم سے سرافراز کیا

(۵۰)

میں نے اصلاب میں پہنچا دیا پیغامِ اخیر
میرے ہی عہد میں اعظم ہوا انسانِ حقیر
ہیچ کی میں نے جہاں میں طلبِ تاج و سریر
میرے بل بوتے پہ شاہوں سے اکڑتے ہیں فقیر
پاک مغروروں سے روما کا چمن کر ڈالا
میں نے زر تار قباؤں کو کفن کر ڈالا

(۵۱)

میں نے انسان کو انساں کا بنایا بھائی
میرے قانون سے دولت پہ تباہی چھائی
وجہ معراج نہیں ہے شرف و رعنائی
میں نے انساں کو رسائی کی جگہ بتلائی
اس لئے نقشِ قدم عرشِ علیٰ تک پہنچے
میرا پیرو ہو جو دل سے ، وہ خدا تک پہنچے

(۵۲)

ہائے اسلام کو کیوں چھوڑا مسلمانوں نے
ہائے کیوں شمع کو گل کردیا پروانوں نے
ہائے کیوں میکدہ خالی کیا پیمانوں نے
اپنا سر پھوڑ لیا آپ ہی دیوانوں نے
اپنوں کو ذبح کیا غیر پہ قربان گئے
روحِ اسلام ہی تم میں نہ تھی ، ہم جان گئے

(۵۳)

تم نہ مسلم ہو، نہ مومن ہو، نہ سید، نہ شریف
تم ہو دو فصلے، برابر ہے ربیع اور خریف
میگساروں کے ردیف اور پیمبرؐ کے حریف
ماشاء اللہ جو قرآں پہ ہنسیں، ایسے ظریف
شانِ تعمیر ، مبارک ہو خرابی کے لئے
لو ، کلیدِ درِ مسجد ہے شرابی کے لئے

(۵۴)

متقی سے کہیں زائد ہے گنہگار کی مانگ
تان کی مانگ ہے اب جا چکی تلوار کی مانگ
عقلمندی ہے کہ پوری ہو خریدار کی مانگ
بھولئے حشر کو اور دیکھئے بازار کی مانگ
آدمی وہ ہے جو دنیا کی تجارت سمجھے
کس کو سودا ہے کہ جنت کی حقیقت سمجھے

(۵۵)

قتلِ شبیرؑ کا باعث ہوئی صہبائے پلید
بے پئے جس کے نہیں ہوتی مسلمانوں کی عید
حلق میں بادے کی بو، دل میں تولّائے شدید
میں کہوں ان کو حسینی کہ طرفدارِ یزید؟
کوثری جو نہ کہے ان کو وہ دیوانہ ہے
تعزیہ سر پہ ہے اور ہاتھ میں پیمانہ ہے

(۵۶)

چھوڑنے والے شرابی کے، بہتر نکلے
بیعتِ فسق نہ کی، چھوڑ دیا گھر، نکلے
بال بھر صدق کی سرحد سے نہ باہر نکلے
روح قائم رہی بازار میں گو سر نکلے
آلِ احمدؐ نے رکھی ساکھ مسلمانوں میں
میکدوں میں نہ گئے مر گئے زندانوں میں

مطلع ثانی (۵۷)

صادق القولؑ نے بیعت سے جب انکار کیا
پسر سعد نے افواج کو تیار کیا
شہؑ نے مطلق نہ غمِ قلتِ انصارؑ کیا
شاہؑ بیٹے کو، برادر کو علمدار کیا
باجوں نے واں پسر سعد کی توقیر کہی
علی اکبرؑ نے ادھر جھوم کے تکبیر کہی

(۵۸)

تیر آنے لگے ، جانے لگے مرنے والے
گھس گئے موت کی آنکھوں میں، نہ ڈرنے والے
سر جو نیزوں پہ چڑھے بولے گذرنے والے
یوں ابھرتے ہیں زمینوں سے ابھرنے والے
لاکھ طوفان اٹھایا کریں جینے والے
ڈوب سکتے نہیں احمدؐ کے سفینے والے

(۵۹)

شہؑ نے گودی کے پلے دشت میں بسمل دیکھے
رہِ مقصد میں حجابات نہ حائل دیکھے
بچے ہنستے ہوئے روتے ہوئے قاتل دیکھے
موت چلائی کہ ایسے نہ کبھی دل دیکھے
خون سے رنگ زمانے کا بدلنے والو
واہ سیدانیوں کی گود میں پلنے والو

(۶۰)

قتل سب ہو گئی اولادِ عقیلؑ و جعفرؑ
خون برسا گئے میداں میں حسنؑ کے دلبر
بعدِ عباسؑ مٹا نام و نشانِ لشکر
ایک ہل چل تھی جو دنیا سے سدھارے اکبرؑ
بے خدم خاک نشیں شاہؑ ہو ، دربار لٹے
اس طرح سے نہ الٰہی کوئی سرکار لٹے

(۶۱)

چرخِ بے مہر نے تا ظہر یہ جلادی کی
خانۂ حضرتِ شبیرؑ کی بربادی کی
وقت سر دینے کا اور فکر نبی زادی کی
شاہؑ جاتے تھے جدھر یاد تھی آبادی کی
دیکھتے تھے کہ رفیقِ غمِ جاں کوئی نہیں
خاک اُڑ اُڑ کے یہ کہتی تھی یہاں کوئی نہیں

(۶۲)

نہ رفیقِ غمِ جانکاہ نہ احباب و کفیل
دل کا مقصود بڑا، وقت زمانے کا قلیل
اور تو کوئی نہ تھا نزدِ شہنشاہِ جلیلؑ
آنسو آنکھوں میں بھرے پاس کھڑے تھے جبریل
کہتے تھے دم لے ذرا ٹھوکریں کھانے والے
بیٹھ جا، اے غمِ دنیا کے اٹھانے والے

(۶۳)

ہاں کمر باندھ، فلک کا کہیں بڑھ جائے نہ زخم
گہری سانسیں لے تو کچھ بوجھ کلیجے کا ہو کم
اشک پی لے کہ ذرا سرد ہو جلتا ہوا دم
اب تو اندھیر ہے دنیا، تری آنکھوں کی قسم
کس کا دل غم میں دہائی نہیں دیتا شبیرؑ
مجھ کو بھی صاف دکھائی نہیں دیتا شبیرؑ

(۶۴)

یہ بھی کہنے کی نہیں بات کہ آرام کرو
بڑے نامی کے ہو فرزند بڑا نام کرو
کام کا وقت زیادہ نہیں، کچھ کام کرو
دور منزل بھی نہیں، راہ میں کیوں شام کرو
اہلِ فردوس کو یاد آپ کی تڑپاتی ہے
واری کب آؤ گے، زہراؑ کی صدا آتی ہے

(۶۵)

سج چکیں جنتیں، رضوان کھڑا ہے در پر
اُبلے پڑتے ہیں تری یاد میں جامِ کوثر
نکل آئے ہیں علیؑ شوقِ لقا میں باہر
انبیاؑ پیچھے ہیں اور آگے نبیؐ خاک بسر
پردۂ عرش کو کب شوق میں چین آتا ہے
کلکِ قدرت کی صدا ہے کہ حسینؑ آتا ہے

(۶۶)

وقت کوئی نہ کبھی کرب و بلا سا آیا
اہلِ جنت کو نہ آرام ذرا سا آیا
حوریں کہتی ہیں کہ دو روز کا پیاسا آیا
ہے خدیجہؑ کی صدا، میرا نواسا آیا
تیرا گہوارہ جھلانے کئی بار آئی ہیں
تڑپی جاتی ہیں وہ حوریں، جو تری دائی ہیں

(۶۷)

جا بہن پاس غمِ دل جو اجازت دے دے
ایسا سمجھا کہ خوشی سے تجھے رخصت دے دے
اے مسیحا! دلِ بیمار کو راحت دے دے
تجھ کو کیا چاہیئے ہے علمِ امامت دے دے
تجھ کو درکار ہے کیا چیز جو تو لے لے گا
جس کا بندہ ہے وہ خود تجھ کو کفن دے دے گا

(۶۸)

دوست کی سن کے صدا رنگ خوشی کا چھایا
چومنے کو لبِ تشنہ کے تبسم آیا
سر کو جنبش دی بڑھا بنتِ نبیؐ کا جایا
درِ خیمہ پہ قدم رکھتے ہوئے فرمایا
کیوں نہ ہو، تم نے مرے جد کی رفاقت کی ہے
برسوں پالا ہے مجھے گود میں، خدمت کی ہے

(۶۹)

ذکر یہ تھا کہ صدا رونے کی گھر سے آئی
لٹی جاتی ہوں میں، بی بی یہ کوئی چلّائی
ہائے، اک بوند نہ بے شیر نے رن میں پائی
ہم مسلمانوں کو کس دیس میں قسمت لائی
اہلِ کیں ہوں نہ مسلمان، تو انسان تو ہیں
ہم کو سادات نہ مانیں تو ، مسلمان تو ہیں

(۷۰)

میرے سرتاج مرے وارث و آقا آؤ
بیٹے ہو عقدہ کشا کے مرے مولا آؤ
ماں کی گودی سے چھٹا جاتا ہے بچہ آؤ
علی اصغرؑ کا ڈھلا جاتا ہے منکا آؤ
آخری بس یہ سہارا غمِ جانکاہ کا ہے
طاقتِ دل ہے مری ، نام کو چھ ماہ کا ہے

(۷۱)

شہؑ نے جبریل کے چہرے پہ نظر اک ڈالی
سر اٹھاکر کہا، جو تیری رضا اے والی
بلکیں بانو، ہوں مگر شاد رسولِ عالی
خلد ، امت سے بھرے، گھر ہو ہمارا خالی
امتِ جد پہ تصدق علی اصغرؑ ہوجائیں
داغ سینہ کے اکہتر ہیں، بہتر ہوجائیں

(۷۲)

جو بشر پاس ہے وہ تیرا دیا ہے یا رب
کوئی تا حشر جئے گا نہ جیا ہے یا رب
تجھ کو وہ دے دیا جو تجھ سے لیا ہے یا رب
میں نے کیا ایسا بڑا کام کیا ہے یا رب
تیرے ہی تحفہ مقبول تجھے نذر دیئے
باغ سے تیرے چنے پھول تجھے نذر دیئے

(۷۳)

تو خداوندِ جلیل اور میں اک عبدِ ذلیل
یہ تری شان کہ جھولے میں جھلائیں جبریلؑ
مجھ سے دن آج کا کٹتا جو تو ہوتا نہ کفیل
تیری نعمت ہے بڑی ، میری بضاعت ہے قلیل
مانگے تو ، اِس کو دریدہ دہنی کہتے ہیں
میں ہوں محتاج، تجھے ربِ غنی کہتے ہیں

(۷۴)

تو نے بخشش نہیں کیا روشنئ شمس و قمر
کیا کروں ناز، جو دوں اکبرؑ و اصغرؑ سے پسر
میں ندامت سے گرا جاتا ہوں اٹھتا نہیں سر
چار خیمے ہیں اِدھر اور ادھر خلد سا گھر
اپنے دامن میں مجھے ڈھانپ لے اور سب لے لے
مجھ کو منظور ہے ہاں چادرِ زینبؑ لے لے

(۷۵)

اپنی طاقت پہ نہیں عبد کو تیرے وسواس
کانٹوں میں تولتی ہے کوثر و تسنیم کو پیاس
مجھ سے اٹھ سکتا غمِ اکبرؑ و رنجِ عباسؑ
کس کی طاقت ہے کہ اب تک مرے قائم ہیں حواس
مرحلہ اصغرؑ و ناوک کا ہو طے ممکن ہے
اِس سے ڈرتا ہوں کہ بے شیر بہت کمسن ہے

(۷۶)

کہہ کے یہ آئے قریں بانوئے ذی جاہ کے شاہؑ
دیکھ کر بیٹے کو فرمایا کہ انّا لِلّٰہ
اس میں اب کیا رہا، مہمان ہے دم بھرکا یہ ماہ
کہاں چھ ماہ کا بچہ، کہاں رنجِ جانکاہ
پیاس کا غم کسی بچے سے کہاں اٹھتا ہے
مجھ سے بوڑھے کے کلیجے سے دھواں اٹھتا ہے

(۷۷)

لاؤ بے شیر کو لے جاؤں ستمگاروں میں
ذکر معصوم کا کر آؤں گنہگاروں میں
کیا عجب اشک ملیں خون کے فوّاروں میں
سنتے آئے ہیں کہ پانی بھی ہے تلواروں میں
اِن کو تسکین دمِ تشنہ دہانی دے دے
شاید اللہ کا بندہ کوئی پانی دے دے

(۷۸)

کانپتے ہاتھوں کو مادر نے اٹھا کر یہ کہا
جاؤ واری تمہیں اللہ کو میں نے سونپا
سیر و سیراب کرے حق تمہیں اے ماہ لقا
راستا دیکھے گی ماں، دشت سے جلدی آنا
قحط پانی کا ہے، سب اہلِ مدینہ کے لئے
تم سے بچ جائے تو لے آنا سکینہؑ کے لئے

(۷۹)

شہؑ نے آغوشِ محبت میں لیا اپنا پسر
ماں نے زینبؑ سے کہا جاتے ہیں گھر سے اصغرؑ
تم بزرگوں میں ہو اے دخترِ شاہِ خیبرؑ
بی بی دم کر دو ذرا نادِ علیؑ بازو پر
زور آندھی کا ہے اور تیروں کا فرّاٹا ہے
جی دھڑکتا ہے کہ میدان ہے سنّاٹا ہے

(۸۰)

ہٹ گئی پڑھ کے دعا پاس سے بنت زہراؑ
دی سکینہؑ نے صدا دور سے بھیّا بھیّا
ٹھہرو آ جائے تمہیں پالنے والی بھینا
سن لو اک بات تو جاؤ طرفِ دشتِ وغا
پھر نہ وہ آئے جو اس گھر سے سدھارے بھیّا
تم مجھے بھول نہ جانا مرے پیارے بھیّا

(۸۱)

باجی بھولی تو نہ ہوگی تمہیں اے ماہ لقا
وہی بیمار، وطن میں جو پڑی ہے تنہا
مجھ سے کی ہے یہ وصیت کہ سنو اے بھیّا
گھر سے بے شیرؑ کو لے جائیں جو تنہا بابا
بھول جانا نہ سکینہؑ یہ کہا خواہر کا
چوم لینا مری جانب سے گلا اصغرؑ کا

(۸۲)

کہہ کے یہ دوڑ کے چوما جو گلا اصغرؑ کا
شاہِؑ دیں یاس سے منہ تکنے لگے خواہرؑ کا
حال ابتر جو ہوا عترتِ پیغمبرؐ کا
پردہ تھرا کے ہٹا خیمہ گہِ سرورؑ کا
گھر سے اصغرؑ کو لئے یوں شہؑ والا نکلے
جس طرح سینہ زخمی سے کلیجہ نکلے

(۸۳)

بولے جبریلؑ کہ ہاں مادرِ موسیٰؑ ہیں کدھر
دیکھیں، یوں دیتے ہیں بچہ کو رہِ خالق پر
نیل میں اُن کا سفر، خاک پہ ہے اِن کا سفر
تکیوں پر رکھا تھا صندوق میں کیوں رو رو کر
وعدہ ان سے تھا پلٹ آئیں گے دریا والے
نذرِ ناوک کو لئے جاتے ہیں زہراؑ والے

(۸۴)

پا پیادہ ہوا راہی جو وہ خورشید کرم
دل سے اصغرؑ کو لگائے ہوئے رو کے ہوئے دم
کوہ بھی بھولیں ثبات اپنا، وہ مضبوط قدم
موت کہتی تھی یہ تمکین ہے خالق کی قسم
زلزلے آئیں، ہلے عرش خدا، ممکن ہے
دلِ شبیرؑ لرز جائے، یہ ناممکن ہے

(۸۵)

تو مری آل کا ہے فخر یہ کہتے تھے خلیلؑ
اپنے ماتھے سے عرق پوچھتے تھے اسماعیلؑ
چلی آتی تھی یہ آوازِ خداوندِ جلیل
شیر ایسے بھی ہوا کرتے ہیں کیوں میکائیلؑ
درس ہے کرب و بلا چشم بصیرت کے لئے
کہو اب کون مناسب ہے خلافت کے لئے

(۸۶)

تھی خدیجہؑ کی صدا صدقے ہو نانی تجھ پر
میرا وارث، مری جاں، کہتے تھے یہ پیغمبرؐ
مرحبا مرحبا فرماتی تھی روحِ حیدرؑ
چھوٹے نے کام کیا کہتا تھا سبطِ اکبرؑ
بات میری رکھی، واری میں دعائیں دے لوں
تھی صدا ماں کی کہ ٹھہرو تو، بلائیں لے لوں

(۸۷)

عرش کہتا تھا بڑھا دی مری عظمت تو نے
خاک کہتی تھی کہ رکھ لی مری عزت تو نے
کعبہ کہتا تھا مجھے دے دی شرافت تو نے
قولِ احمدؐ تھا کہ چمکا دی رسالت تو نے
علم آدمؑ کا کھلا، جائے مباہات رہی
حق بھی کہتا تھا فرشتوں میں مری بات رہی

(۸۸)

میں نے مانا کہ خلافت مری ہاں پائے ملک
مگر اس وقت کے جب خاک بنے جائے ملک
میری مرضی کے لئے کچھ تو پیئے کھائے ملک
لختِ دل ہاتھوں پہ اس ٹھاٹھ سے پھر لائے ملک
خانہ ویراں ہوا اور عذر نہ کچھ لائے حسینؑ
سن لو اب حکم مرا وہ ہے، جو فرمائے حسینؑ

(۸۹)

جس گدا کے لئے ایما ہو شہِ کل کر دو
گر اشارہ ہوپئے خار تو بلبل کر دو
عرش اور فرش کو قربانِ توکل کردو
ہونٹ سوکھے ہیں بہت نارِ سقر ، گل کر دو
کیا ہے یہ نہرِ لبن صدقۂ اصغرؑ کر دو
مجھ کو شرم آتی ہے اک جام میں کوثر بھر دو

(۹۰)

اس طرف دشت میں دوڑے چلے آتے تھے حسینؑ
بڑھتا جاتا تھا جو دل، ٹھاٹھ دکھا تے تھے حسینؑ
شکر اللہ کا ہر دم کئے جاتے تھے حسینؑ
ایسا ہنستے تھے کہ دنیا کو رلاتے تھے حسینؑ
خواہش چرخ تھی، پانی کسی پہلو بن جائے
ہفت قلزم کو تھا ارمان کہ آنسو بن جائے

(۹۱)

زیرِ پا خاک کی جا تھا فلکِ مینائی
حُجبِ عرش کی تھی گرد میں سب رعنائی
بزمِ وحدت تھی مجاہد کے لئے تنہائی
غیب کی بات سنی کوئی صدا جب آئی
کوئی منزل جو نہ تھی صبر و رضا کے آگے
یہ سمجھتے تھے کہ آ پہنچا خدا کے آگے

(۹۲)

گرم رو مرضئ حق پر تھے اُدھر تو سرورؑ
مہر جھک آیا تھا ڈھل کر پئے تسلیم اِدھر
کرنیں سیدھی جو پڑنے لگیں رخساروں پر
شاہؑ نے زیرِ عبا کرلیا جسمِ اصغرؑ
مسکرانے کے لئے ہونٹ ذرا کھول دیئے
بچے کے سینے کے سب بندِ قبا کھول دیئے

(۹۳)

تکمۂ گردنِ بے شیرؑ جو میداں میں کھلا
ایک ہلچل پڑی، ہلنے لگے ارکانِ سما
فرطِ حیرت سے بگولوں نے بھی منہ کھول دیا
ہچکیاں لینے لگی تپتے ہوئے بن کی ہوا
رُخ پہ دیکھا جو عرق ہو کے خجل بیٹھ گیا
پانی گھٹنے لگا دریاؤں کا ، دل بیٹھ گیا

(۹۴)

وہ زمیں گرم وہ تنہا مرا آقا توبہ
غش سے بے شیر کو ممکن تھا افاقا توبہ
ٹکڑے ہو سنگ وہ گرمی کا تڑاقا توبہ
پیاس دو روز کی دو روز کا فاقا توبہ
شہؑ تو اس پیاس میں ارکانِ جہاں رو کے تھے
وہ بڑے جی کے تھے جو منہ میں زباں روکے تھے

(۹۵)

آب جوشیدہ میں مچھلی کو نہ آتا تھا قرار
ٹوٹا پڑتا تھا تری دیکھ کے دریا پہ غبار
سایہ میں گھوڑوں کے زیں چھوڑ کے بیٹھے تھے سوار
پنکھے جھلتی تھی ہوا، نہر کو آیا تھا بخار
موج کو درد کی ایذا تھی گراں پانی پر
پٹّی رومال کی باندھی گئی پیشانی پر

(۹۶)

رنگ دریا کا اُڑا جاتا تھا جیسے سیماب
کرنیں مہر کی ماہی کے لگاتی تھیں کباب
ہچکیاں لیتے تھے منہ کھول کے ساحل کے حباب
ڈھونڈھتا پھرتا تھا دریا میں کسی چیز کو آب
اس کی تدبیر ہے ممکن جو سقر پیاسا ہو
پیاس کیوں کر بجھے خود آب اگر پیاسا ہو

(۹۷)

حدتِ مہر سے تھے مردمِ آبی بیتاب
چھتریاں کھولے تھے دریا کے بچانے کو حباب
گر یونہی اہلِ زمانہ کو رہی خواہشِ آب
آشیاں موج کے تنکوں پہ بنائے گا عقاب
عمر پوری تو کرے گی کسی صورت اپنی
برف میں آگ چھپا دے گی حرارت اپنی

(۹۸)

مہر کو آپ نہ تھی اپنی تمازت کی جو تاب
منہ پہ ڈالے تھا بھگویا ہوا دامانِ سحاب
مثل شبنم کے ٹپکنے لگا اڑکر سیماب
کھول کر معدنِ فولاد بنے تھے تالاب
پردۂ گرد تھے افلاک کے کاشانے میں
زمہریر آپ چھپا بیٹھا تھا خسخانے میں

(۹۹)

جس چمن میں گئی پھونک آئی ہوائے گستاخ
شعلۂ نارِ سقر بن گئی اشجار کی شاخ
اس قدر گرم ہوئی تھی نظرِ چشمِ فراخ
مردمِ دیدہ کے سینے پہ تھی لوہے کی سلاخ
گرم آنکھیں ہوئیں حدت سے جو گلخن کی طرح
پتلیاں لال ہوئیں تابۂ آہن کی طرح

(۱۰۰)

چھن سے شیشے کی طرح ٹوٹے حبابوں کے ایاغ
نقشِ آبی تھا سرِ بحر کے جل جانے کا داغ
آنکھیں گرمی سے ابل آئیں نہ ممکن تھا فراغ
پانی میں جل رہے تھے دیدۂ ماہی کے چراغ
حدتِ مہر سے بے حال ہوئی جاتی تھیں
مچھلیاں تہہ میں تھیں پر لال ہوئی جاتی تھیں

(۱۰۱)

دلِ غمگیں جو بنا گھٹ کے بخارات سے بن
بھاگے جاتے تھے دھواں دیکھ کے میداں سے ہرن
شیر پانی سے اٹھاتے ہی نہ تھے اپنے دہن
علقمہ کہتی تھی اُف اُف کہ جلا جاتا تھا تن
نیلے خیمے سپہ کفر نے کب چھائے تھے
آبلے سینۂ گیتی کے ابھر آئے تھے

(۱۰۲)

ریت تپتی تھی، سنہرا تھا بیابانِ عراق
نام ہی نام تھا باقی نہ تھے بستانِ عراق
تا کمر پانی میں بیٹھے تھے جوانانِ عراق
اور سسکتے تھے پڑے خاک پہ مہمانِ عراق
خونِ سادات کے افلاک و زمیں پیاسے تھے
تپ کئی دن سے تھی، سجادِ حزینؑ پیاسے تھے

(۱۰۳)

لو کی ماری وہ ہوا اور وہ گرمی کا اثر
جھونکے وہ تیز وہ سادات کے گرتے ہوئے گھر
ہر گھڑی خانۂ برباد کے لٹ جانے کا ڈر
بچوں کو ماں کی خبر ماں کو نہ بچوں کی خبر
چار سو شور کہ پردیس میں بے آسے ہیں
ہم مدینے کے مسلمان ہیں اور پیاسے ہیں

(۱۰۴)

شاہؑ اصغرؑ سے یہ کہتے تھے کہ سنتے ہو یہ شور
مہر میں ماں کے یہ دریا ہے مگر کچھ نہیں زور
مالکِ مال تو محتاج ہے، خوش حال ہیں چور
کچھ ہمیں پر نہیں، گھر بھر ہے ہمارا لبِ گور
دیس بھی دور ہے بیکس یہ کدھر جائیں گے
ہائے کیا ہوگا جو ہم دونوں بھی مر جائیں گے

(۱۰۵)

لو مری جاں حدِ منزل ہے سفر ختم ہوا
تم بھی سنبھلو تو کروں فوج سے پانی کا گلا
کہہ کے یہ شہؑ نے عروج ایک بلندی پہ کیا
مصحفِ فاطمہ شبیرؑ کے ہاتھوں پہ کھلا
کروٹیں لینے لگا عرش بھی بسمل کی طرح
شہؑ نے اونچا کیا اصغرؑ کو حمائل کی طرح

(۱۰۶)

پھر یہ آواز دی اے فرقۂ بیداد گراں
ذلتِ مسلم و توقیر ربائے انساں
آلِ شیطان و فریبندۂ اہلِ قرآں
میرا بچہ نہیں ہے آیتِ آلِ عمراں
آپ اسلام کا نقصان ہوا جاتا ہے
ذبح تلواروں سے قرآن ہوا جاتا ہے

(۱۰۷)

قید میں جہل کی تھے، تم کو چھڑایا ہم نے
سب فساد اہلِ قبائل کا مٹایا ہم نے
قتلِ اولاد سے تم سب کو بچایا ہم نے
زندگی تم کو دی، خون اپنا بہایا ہم نے
ہم تمہیں شان تحمل کی دکھاتے ہی رہے
سنگباری میں بھی قرآن سناتے ہی رہے

(۱۰۸)

مسجدِ کوفہ میں کیا ظلم نہ ڈھایا تم نے
زہر دے کر مرے بھائی کو ستایا تم نے
دُرِ دندانِ محمدؐ کو گرایا تم نے
جگرِ حضرتِ حمزہؓ کو چبایا تم نے
اس کو راحت نہ دی جس نے تمہیں آرام دیا
تم نے چرکے دیئے، ہم نے تمہیں اسلام دیا

(۱۰۹)

خط پہ خط بھیج کے یثرب سے بلایا مجھ کو
مادر و جد و برادر سے چھڑایا مجھ کو
کیا بگاڑا تھا کسی کا جو ستایا مجھ کو
انتہا ہو گئی پانی نہ پلایا مجھ کو
زور سے حیدرِؑ صفدر کے ڈرے بیٹھے تھے
روزِ بعثت ہی سے تم جیسے بھرے بیٹھے تھے

(۱۱۰)

لاش پر لاش گراتے رہے تم صبح سے آج
میرا خوں دولتِ اسلام کا کر ڈالا خراج
لٹ گیا خانہ احمدؐ، کرو اب شوق سے راج
وہ تمہارا تھا مزاج اور یہ ہمارا ہے مزاج
اب بھی کہتے ہو کہ احمدؐ کا تمہیں ڈرنہ رہے
رحم بچے پہ کرو تا غمِ محشر نہ رہے

(۱۱۱)

گھونٹ پانی میں نہ گھٹ جائے گا دریائے فرات
پانی پینے پہ بھی دشوار ہے اصغرؑ کی حیات
بھاری گذری ہے مرے لال پہ گذری ہوئی رات
یہ بچے یا نہ بچے تم کو تو مل جائے نجات
کیا نہ پاؤگے دعا دیں گے جو اصغرؑ تم کو
چار بوندوں میں ملا جاتا ہے کوثر تم کو

(۱۱۲)

سچ یہ ہے گر کہو، تھا صبح سے انصارؑ کا ڈر
نہر کیوں چھوڑتے ، تھا اکبرؑ جرار کا ڈر
یہ تو عباسؑ نہیں ہیں کہ ہو تلوار کا ڈر
کیا الٹ سکتا ہے صف نرگسِ بیمار کا ڈر
یہ طلب کرتے ہیں، میں تم سے طلبگار نہیں
میرا نادان تو باندھے ہوئے ہتھیار نہیں

(۱۱۳)

میرے نانا نے اُخوت سے بنایا کیسا
نسبی رشتوں سے مضبوط تھا دیں کا رشتا
تم بھی اولاد کی جا، میں بھی نبیؐ کا بیٹا
کیا شرافت ہے کہ گھر لوٹتے ہو بھائی کا
چڑھ کے دیوار پہ گل لوٹ لئے بیلوں نے
یوں ستایا نہ تھا یوسفؑ کو بھی سوتیلوں نے

(۱۱۴)

قرب ، اغیار سے اور اہلِ محبت سے فراق
شہدِ اسلام کہاں اور کہاں زہرِ نفاق
جو دعا گو ہیں شب و روز حیات ان کی ہے شاق
یہ ہی ہوتا ہے بگڑتا ہے جو دنیا کا مذاق
جس کی بنیاد کھدے کیوں وہ عمارت رہ جائے
مجھ کو سید نہ سمجھنا جو حکومت رہ جائے

(۱۱۵)

آخری ہے یہ نصیحت مری فریاد نہیں
پانی رستے میں جو میں نے دیا وہ یاد نہیں؟
رحم بے شیر پہ امداد ہے بیداد نہیں
فوج بھر میں کوئی کیا صاحبِ اولاد نہیں؟
پانی دینے کے لئے نہر سے آئے کوئی
بچہ مرتا ہے مسافر کا بچائے کوئی

(۱۱۶)

پانی دو عترتِ اطہارؑ پہ احسان کرو
حمزہؑ و جعفرؑ طیار پہ احسان کرو
جاہلو! حیدرِ کرارؑ پہ احسان کرو
حافظو! احمدؐ مختار پہ احسان کرو
نامِ مسلم سے نبیؐ حشر میں شرمائے گا
بچے کو مار کے قرآن نہ کام آئے گا

(۱۱۷)

مجھ کو اللہ ہے تم کو ہے سہارا پانی
ایک بچہ کہیں پی سکتا ہے سارا پانی
گر یہ ڈر ہے کہ میں پی لوں گا تمہارا پانی
بے اجازت مجھے ہوگا نہ گوارا پانی
جلتی ریتی پہ لِٹا دوں خلفِ حیدرؑ کو
آؤ تم آپ پلا جاؤ علی اصغرؑ کو

(۱۱۸)

میں سخی زادہ ہوں خود تم سے طلبگار نہیں
مانگے انسان سے انساں، میں روادار نہیں
زعمِ باطل سے تمہارے مجھے کچھ عار نہیں
باپ مجرم سہی، بیٹا تو گنہگار نہیں؟
نام شبیرؑ ہے میں موجدِ آزادی ہوں
ایسی کچھ بن گئی ہے مجھ پہ کہ فریادی ہوں

(۱۱۹)

سن کے یہ پڑ گئی افواجِ ستم میں ہلچل
آگے بڑھ آئے تھے جو، ہٹنے لگے پیچھے وہ دل
تھرتھرانے لگی گھبرا کے زمینِ مقتل
اِدھر اصغرؑ بھی گئے باپ کی گودی میں سنبھل
بات کہہ جاؤں گا گو قہر کا پیاسا ہوں میں
چپ ہوں کیوں ،مرسلؐ امی کا نواسا ہوں میں

(۱۲۰)

باپ کے کاندھے پہ اونچا جو کیا پھول سا سر
ساتھ آنسو کے ڈھلا آنکھ کا کاجل رخ پر
ضعف یہ تھا کہ سنبھالے نہ سنبھلتی تھی نظر
تھرتھرانے لگے دیکھا جو اِدھر اور اُدھر
بات کوئی نہ کہی رازِ سخن کھول دیا
خشک ہونٹوں پہ زباں رکھ کے دہن کھول دیا

(۱۲۱)

تمتمائے ہوئے گرمی سے وہ گلگوں رخسار
ہونٹ سوکھے ہوئے، ریشم کی گلابی دستار
ماں کے پہنائے ہوئے طوق گلے میں دو چار
باپ کے کاندھے سے خیمہ پہ نظر ہر ہر بار
تھا یہ مقصود کہا تھا جو زبانی مانگا
دور سے ماں کو سناتے تھے کہ پانی مانگا

(۱۲۲)

ان کے دل آب ہوئے جن کے تھے اطفال صغیر
پانی دے دینے پہ آمادہ ہوئے بعض شریر
حال یہ دیکھ کے بے شیرؑ سے بولے شبیرؑ
بڑھ گئی ہم سے بھی اے لعل تمہاری تقریر
آیتِ حق ہو ابھی پارۂ قرآں ہوگے
بچ گئے آج تو نانا سے زباں داں ہوگے

(۱۲۳)

دین، مالک کی تھی جس جس نے لیاقت پائی
عہدِ طفلی ہی میں یحییٰؑ نے نبوت پائی
تجھ سے کمسن تھے جو عیسیٰؑ نے طلاقت پائی
تیرے قربان کہ دادا کی فصاحت پائی
شاد، ماں ہو جو نیا آپ کا اعزاز سنے
گھر میں جاؤ تو پھوپھی باپ کی آواز سنے

(۱۲۴)

یاں یہ باتیں تھیں، بنِ سعد اُدھر گھبرایا
حرملہ دور تھا، نزدیک اسے بلوایا
بولا، تقریر نے بے شیرؑ کی دل برمایا
سنگ دل جو کہ تھے مشہور انہیں رلوایا
ڈال دے عذر نہ تاثیرِ بیاں اصغرؑ کی
چھید دے تیر سے ننھی سی زباں اصغرؑ کی

(۱۲۵)

حرملہ نے کہا سر اپنا ہلا کر کہ ابھی
تیر ترکش سے لیا اور کماں دوش سے لی
آڑ میں اسپ بنِ سعد کے بیٹھا جو شقی
بائیں گھٹنے کو ٹکایا نظرِ قہر اٹھی
نہ خدا سے نہ محمدؐ سے حیا کرتا ہے
چلہ کھنچ کھنچ کے یہ چلایا کہ کیا کرتا ہے

(۱۲۶)

اس طرف بچے سے فرماتے تھے گفتار حسینؑ
دل کا اصرار تھا اور کر رہے تھے پیار حسینؑ
مکر فن بن چکا ہے تھے نہ خبردار حسینؑ
بولے جبریلؑ کہ تیر آتا ہے، ہشیار حسینؑ
چھپ نہ جائے کہیں آنکھوں سے اجالا گھر کا
ڈہانک لو اپنے عمامے سے گلا اصغرؑ کا

(۱۲۷)

یاں چھٹا تیرِ ستمگار یدِ دشمن سے
خود بخود ہو گیا واں ماں کا کلیجا سن سے
برگ گل سا وہ گلا لڑ نہ سکا آہن سے
تیرِ جلاد ہوا پار رگِ گردن سے
کیا کہوں گردنِ اصغرؑ کے سوا کیا چھیدا
مرنے کے بعد بہتر کا کلیجہ چھیدا

(۱۲۸)

منقلب ہو گیا گودی میں جو سرورؑ کی وہ ماہ
جھلملانے لگی ان نرگسی آنکھوں میں نگاہ
بچہ جب کھینچ کے دم ہچکیاں لینے لگا آہ
خاک پر بیٹھ کے شہؑ نے کہا انّا لِلّٰہ
ساتھ بھائی کا دیا باپ کا دل توڑ چلے
تم بھی اے اصغرِؑ بے شیر ہمیں چھوڑ چلے

(۱۲۹)

کہہ کے یہ چٹکی سے شبیرؑ نے پیکاں پکڑا
دوسرے ہاتھ سے اصغرؑ کے گلے کو تھاما
تیر نکلا تو بہا خون کا اک پرنالا
لے کے چلّو میں لہو عرش کی جانب دیکھا
پھر کہا کچھ نہ تھا سامان زر و گوہر کا
امتِ جد کے نچھاور ہے لہو اصغرؑ کا

(۱۳۰)

پھر یہ چاہا کہ لہو پھینک دیں رن میں سرورؑ
ارض چلّائی، حذر اے مرے شبیرؑ حذر
میں ہوں پانی پہ نہ اٹھے گا یہ مجھ سے لنگر
ناخدا تو ہے زمانے کا، ترس کھا مجھ پر
جس کو طوفاں میں سنبھالا ہے بہ کد، ڈوب نہ جائے
ہے سفینہ پہ مرے امتِ جد، ڈوب نہ جائے

(۱۳۱)

عذر سن کر شہ اکرمؐ نے فلک کو دیکھا
دی صدا چرخ نے، اے ماہرِ خلقِ دنیا
یہ ہے ہستی مری ہوں دودِ کثیفِ دریا
خم جو در پر ہوا تیرے تو فلک نام ملا
کب بٹا سکتا ہوں ہاتھ اے مرے مولا تیرا
ہاتھ لرزا نہ ترا یہ تھا کلیجا تیرا

(۱۳۲)

شہؑ نے ناداں سے کہا حال سناتا ہے حسینؑ
لے ترے خون کو ماتھے پہ لگاتا ہے حسینؑ
ہمت انسان کی کیا شیے ہے دکھاتا ہے حسینؑ
آسماں سے جو نہ اٹّھا وہ اٹھاتا ہے حسینؑ
وزن کا ذکر نہیں تذکرہ تاثیر کا ہے
یہ کوئی عرش نہیں خوں مرے بے شیرؑ کا ہے

(۱۳۳)

بیٹھے جاتے ہیں فلک عرش اٹھانے والے
کیا امانت تھی یہ اب سوچیں زمانے والے
ایسے ہوتے ہیں پیمبرؐ کے گھرانے والے
مرحبا عظمتِ انساں کے بڑھانے والے
قدر میں سب سے فزوں لال اسد اللہ کا ہے
آسماں دب گئے اور سن ابھی چھ ماہ کا ہے

(۱۳۴)

ہے بڑا وسعتِ کونین سے قلبِ شبیرؑ
خون چلو میں ہے اور گود میں یہ کشتۂ تیر
کوئی لیتا نہیں ہاتھوں سے مرے خونِ صغیرؑ
جس پہ مرتا ہے بشر یہ ہے وہ دنیائے حقیر
خونِ ناحق کو رسائی نہیں دو بوندوں کی
ظرف دنیا میں سمائی نہیں دو بوندوں کی

(۱۳۵)

منہ پہ کیوں ملتا جو اس خوں کا ٹھکانا ہوتا
آرزو کرتا تو تاریک زمانا ہوتا
سہل دنیا کو نہ یہ بار اٹھانا ہوتا
میں نہ ہوتا جو یہاں ، تو مرا نانا ہوتا
بارِ غم مول لیا، صبر دکھایا میں نے
اپنا سر دے کے محمدؐ کو بچایا میں نے

(۱۳۶)

دیکھا نادان نے جب باپ کے گھبرانے کو
مسکرانے لگا شبیرؑ کے بہلانے کو
بولے شہؑ یہ نہ کہا کچھ مرے سمجھانے کو
کس طرح ماں سے کہوں آپ کے مر جانے کو
صبر میں ہاجرۂ عہد و زماں ہیں بانو
پھر بھی اے میرے دلارے تری ماں ہیں بانو

(۱۳۷)

کہا بے شیرؑ نے دے دیجئے گا صاف خبر
غم میں گھر سے نکل آنے کا نہ فرمایئے ڈر
ہاجرہؑ نکلیں تو نکلا کریں کھولے ہوئے سر
انبیاؑ سے کہیں اونچا ہے مگر آپ کا گھر
یہاں آنے کی نہیں گرچہ تپاں ہیں بابا
میں سمجھتا ہوں انہیں وہ مری ماں ہیں بابا

(۱۳۸)

ذکر ابھی کا تو ہے جب ہاتھ جو اس سے دھویا
قتلِ اکبرؑ پہ فلک روئے، زمانہ رویا
موت کی نیند جوانی میں برادر سویا
کیا نکل آئیں، جب اٹھارہ برس کا کھویا
آبرو آپ کی ہیں فاطمہؑ خو ہیں امّاں
اور کیوں نکلیں کہ زہراؑ کی بہو ہیں امّاں

(۱۳۹)

تھیں یہ باتیں کہ رُکا سینۂ بے شیرؑ میں دم
ماں پکاری درِ خیمہ سے کہ یا شاہِ اممؑ
آپ کیا کرتے ہیں مضطر پئے اصغرؑ ہیں حرم
بولے شہؑ مرتا ہے بے شیرؑ لئے جاتے ہیں ہم
بولیں بانو کہ ہے کچھ نور بھی کم آنکھوں میں
شاہؑ چلائے کہ اصغرؑ کا ہے دم آنکھوں میں

(۱۴۰)

باپ کو دیکھ کے رخصت ہوئے اصغرؑ تو ادھر
گر پڑی پہلوئے سجادؑ میں ماں غش کھا کر
خواب میں مقتلِ اصغرؑ پہ تھی عابدؑ کی نظر
بولا بیمار کہ ہے ہے مرا پیارا اصغرؑ
پاس دادی کے گئے آپ بھی سونے کے لئے
سارے کنبے میں ہمیں رہ گئے رونے کے لئے

(۱۴۱)

یونہی رن سے جو گئے آپ بڑھائے ہوئے گام
راستے میں کہیں مل جائے گا اکبرؑ کا مقام
لشکر شاہ کے سردارؑ کو دینا یہ پیام
خاتمہ ہوچکا کچھ دیر میں آتے ہیں امامؑ
گھر کے لٹنے کا ہے ڈر وقت بہت تھوڑا ہے
ماں کی چادر کے بچانے کو کسے چھوڑا ہے

(۱۴۲)

ہاں میں زندہ بھی ہوں اور وارث کرار بھی ہوں
مالک زورِ امامت بھی ہوں، جرار بھی ہوں
صاحب تیغ بھی ہوں، مرنے پہ تیار بھی ہوں
جنگ کا حکم بھی مجھ کو نہیں، بیمار بھی ہوں
وہ لڑے ،جنگ تھی جن شیروں کی تقدیروں میں
ہم کو پیدا کیا جکڑا ہوا زنجیروں میں

(۱۴۳)

سوئے خیمہ جو بڑھے لشکر کیں، کوئی تو ہو
آگ جب گھر میں لگائیں یہ لعیں، کوئی تو ہو
جب لٹے مادر ناشاد و حزیں، کوئی تو ہو
بچے جب دوڑتے پھرتے ہوں کہیں، کوئی تو ہو
ساتھ کنبہ کا ہے اور حالتِ تغئیر مری
کاش تم ساتھ ہو تھامے ہوئے زنجیر مری

(۱۴۴)

اس طرف مر گئے اصغرؑ تو اٹھے سرورِ دیں
تاکہ چھوٹی سی لحد رن میں ہو تیار کہیں
منتخب دیدۂ بے نور سے کی ایک زمیں
ذوالفقارِ اسد اللہ سے بولا وہ حزیں
تجھ کو انکار ہو اے تیغ تو الزام نہیں
دفن کرنا کسی بچہ کا ترا کام نہیں

(۱۴۵)

تجھکو جبریلؑ سا مقبول ملک لایا تھا
بھائی کے ہاتھ سے بھائی نے تجھے پایا تھا
جب تو آئی تھی مرا ذکر بھی کچھ آیا تھا؟
سچ بتا کچھ شہِ کونینؐ نے فرمایا تھا
تجھ کو گنوائے تھے جب تیرے اُٹھانے والے
تجھ کو معلوم تھا ہم ہیں ترے پانے والے

(۱۴۶)

سیف اللہ ہے تو ، تھا تجھے معلوم انجام
تونے پوچھا تھا کہ کیا تیغ سےمظلوم کو کام
کیوں کرے جنگ جو ہو فدیۂ اہلِ اسلام
بولی شمشیر کہ اے بیکس و مظلوم امامؑ
ساتھ شبیرؑ کا دینا یہ نصیحت کی تھی
مجھ سے شرما کے پیمبرؐ نے وصیت کی تھی

(۱۴۷)

جب یہ ذکر آیا تھا تو روئے تھے حضرت بیحد
مجھ سے بولے ہے ترا کام رسولوںؐ کی مدد
وقت پڑجائے تو چھوٹی سی بنا دینا لحد
کیونکہ اصغرؑ کے جنازے پہ نہ ہوگا احمدؐ
قبر ہم سے نہ بنی ، غم یہ لئے جاتے ہیں
ذوالفقار! اپنا تجھے کام دیئے جاتے ہیں

(۱۴۸)

بولے شہؑ، مستعد اپنا دلِ آگاہ بھی ہے
ساتھ اللہ بھی ہے تیغِ یداللہ بھی ہے
یہ مرا رشکِ قمر فاطمہؐ کا ماہ بھی ہے
قبر کھودوں گا اگر چہ غمِ جانکاہ بھی ہے
یہ دن آیا نہیں اب تک کسی مرسل کے لیے
میں بھی ٹھانے ہوں کہ کچھ اُٹھ نہ رہے کل کے لیے

(۱۴۹)

کہہ کے یہ قبر بنانے لگے رن میں سرورؑ
یہ زمیں کھود تے تھے، اُڑتے تھے ناوک سر پر
کہتی جاتی تھی یہ شمشیرِ علیؑ رو رو کر
قبرِ اصغرؑ کا بنانا ہے جہادِ اکبرؑ
آہ کا ساتھ دیا اور رہی تکبیر کے ساتھ
میرا بھی نام چلے گا مرے شبیرؑ کے ساتھ

(۱۵۰)

قبر تیار ہوئی، اُٹھّے شہنشاہِ زمنؑ
روحِ صبر آنکھ میں آنسو تھے نہ ماتھے پہ شکن
کھودنے سے جو زمیں کے ہوئی محسوس تھکن
ہاتھ خود اپنے بٹانے لگی تھی دوربہن
بولے، وا دیکھا جو بے شیرؑ کی چشمِ نم کو
دیکھے جاتے ہو ابھی تک علی اصغرؑ ہم کو

(۱۵۱)

ہاں وہی باپ ہوں ، پانی جو تمہیں دے نہ سکا
رکھ سکا پھول سی گردن پہ نہ میں اپنا گلا
خاک پر لیٹے ہو، سامان نہ بستر کا ہوا
خوں بھرے چہرے کے صدقے، نہ تمہیں غسل ملا
باپ محتاج ہے سامانِ محن تک نہ دیا
جا کے دادی سے نہ کہنا کہ کفن تک نہ دیا

(۱۵۲)

ہونٹ سوکھے ہوئے اور خون سے بھیگے ہوئے گال
جس کو بانو نے سنوارا تھا وہ اُلجھے ہوئے بال
زرد منہ ، سبز قبا، طوقِ گلو خون سے لال
آج تو تم پہ سمٹ آیا ہے دنیا کا جمال
ماں کی جاں ، باپ کا دل درد ہیں کتنے تم کو
وقت ہوتا تو ابھی دیکھتے رہتے تم کو

(۱۵۳)

کہہ کے یہ شاہؑ نے دامانِ قبا میں دی شکن
اور کہا اے مرے گل پیرہن و غنچہ دہن
اور تو کچھ مجھے ممکن نہیں سامانِ کفن
لیتے جاؤ مری جاں قبر میں میرا دامن
پھر نہ دقّت تمہیں اس راہ میں جانی ہوگی
جس جگہ جاؤ گے ہمراہ نشانی ہوگی

(۱۵۴)

کہہ کے یہ خاک سے سرورؑ نے اُٹھایا لاشا
منہ پہ منہ رکھ دیا اور زخم گلے کا چوما
قبر میں رکھنے لگے لاش تو سرورؑ نے کہا
دہنِ قبر سے آواز ہے بھیّا بھیّا
کوئی کہتا ہے کہ روتے ہیں کھڑے تربت میں
ہم تمہارے لئے اب تک نہ گئے جنت میں

(۱۵۵)

راہ تکتے رہے ہم مر کے بھی پیارے اصغرؑ
شہؑ کی آنکھوں کے نہیں قبر کے تارے اصغرؑ
یہ سمجھتے تھے کہ ہیں ماں کے دلارے اصغرؑ
جانتے تھے کہ اکیلے ہیں ہمارے اصغرؑ
قید ہونے کے لئے کیوں رہو مانجائی کے ساتھ
آؤ گودی میں چلو خلد بریں بھائی کے ساتھ

(۱۵۶)

جھک کے شہؑ بولے کہ تم بھی ہو یہاں اے اکبرؑ
اب تو دُکھتا نہیں کیوں اے مری جاں زخمِ جگر
قولِ احمدؐ سے بڑا بھائی ہے چھوٹوں کا پدر
اُنگلی تھامے ہوئے ہمراہ رہیں گے اصغرؑ
کہنا دادی سے کہ رگ ٹوٹی گلے کی باندھیں
بیٹا محتاج کا ہے، زخم میں پٹی باندھیں

(۱۵۷)

آئی آواز کہ اے سبطِ نبیؐ ، عاشقِ رب
عالمِ عرش سے تافرش ہے اک عام تعب
اہلِ جنت کو ملے چین یہ آسان ہے کب
جمع ہیں باحسنؑ و حیدرؑ و پیغمبرؐ سب
سب کو منظور زمانے میں تری خاطر ہے
بولی زہراؑ کہ یہ ماں کوکھ جلی حاضر ہے

(۱۵۸)

سونپ کر بیٹے کو دل باپ کا لیتا نہ تھا چین
ہاتھ ٹیکے ہوئے بیٹھا تھا بنِ شاہِ حنینؑ
آہ ہونٹوں پہ نہ تھی اور زباں پر نہ تھے بین
دیکھے جاتے تھے فقط قبر میں جھک جھک کے حسینؑ
تھام کر دل لحدِ نورِ نظر بھرتے تھے
مٹی کب ڈالتے تھے زخمِ جگر بھرتے تھے

(۱۵۹)

بارِ غم اُٹھ نہ سکا رن میں شہِؑ خوشخو سے
بیٹھا جاتا نہ تھا تربت پہ کسی پہلو سے
خلق اندھیر تھی چھوٹے جو تھے اس مہرو سے
رکھ کے منہ خاک پہ چھڑکاؤ کیا آنسو سے
پھر کہا، یاد جو تشنہ جگری تھی اصغرؑ
باپ نے دے دی جو آنکھوں میں تری تھی اصغرؑ

(۱۶۰)

لے تری ننھی سی تربت کو خدا کو سونپا
خود مٹاتا ہوں نشاں، حشر میں کرنا نہ گلا
ماں یہاں آئے نہ آئے مجھے ڈر ہے اس کا
کھود ڈالے نہ لحد کو تری فوجِ اعدا
ذبح میں نکلے نہ گردن سے لہو اے اصغرؑ
دکھ نہ جائے کہیں پھر زخمِ گلو اے اصغرؑ

(۱۶۱)

کہہ کے یہ قبر سے اٹھے شہؑ والا تنہا
دہنے بائیں نظر آئے نہ عزیز و رفقا
نہ تو قاسمؑ کا پتہ اور نہ اکبرؑ کا پتا
دفن اصغرؑ کو کیا، فرض ہوئے رن میں ادا
ہاتھ جھاڑے ہوئے رخصت شہؑ ذی ہوش ہوئے
گود خالی ہوئی، شبیرؑ سبکدوش ہوئے

(١٦٢)

دل نے آواز دی اب عصر میں کیا باقی ہے
ساتھ کوئی ہے نہ جینے کا مزا باقی ہے
ہے فنا سب کے لئے ایک خدا باقی ہے
بولی شمشیر علیؑ میرا صلہ باقی ہے
کچھ نہ کچھ وقت بھی ہے ہاتھ ہلا دو مولیٰ
قبر اصغرؑ کے بنانے کی جزا دو مولیٰ

(١٦٣)

جب سے کھودی ہے لحد میان میں آرام نہیں
ساتھ بیکس کا دیا تھا یہ مرا کام نہیں
فوجیں کٹ جائیں تو مجھ پر کوئی الزام نہیں
نام رہ جائے تو تلوار مرا نام نہیں
منتقم کی ہوں میں تلوار یہ معلوم نہیں
تم تو پیدا ہوئے مظلوم، میں مظلوم نہیں

(١٦٤)

ہوں رفیقِ نبیؐ ، اللہ کی بھجوائی ہوں
سمجھی بوجھی ہوں کہ کرّار کی سمجھائی ہوں
حکمِ اللہ سے آگے بڑھوں سودائی ہوں
دیکھنے تین زمانوں کو یہاں آئی ہوں
دوسرا دور ہے یہ غیظ کی شدت ہوگی
دست مہدیؑ میں جو چمکی تو قیامت ہوگی

(۱۶۵)

چاہتے یہ ہو کہ دنیا مجھے بیکار کہے
قبر کَن نام رکھے کوئی نہ تلوار کہے
کس دکھاؤں جو مرا مالک و مختار کہے
پھر زمیں کانپ کے یا حیدرؑ کرار کہے
مدتوں تیغ اٹھائیں گے نہ حیدرؑ والے
آج دو ہاتھ ذرا دیکھ لیں خیبر والے

(۱۶۶)

عابدؑ اشکوں کو پئے دیدۂ نم لے لیں گے
نشرِ دیں باقرؑ و صادقؑ بحشم لے لیں گے
سیف کو چھوڑ کے ہاتھوں میں قلم لے لیں گے
ہم بھی تابوت سکینہ ہی میں دم لے لیں گے
ساتھ کاظمؑ کے کہاں جاؤں گی ویرانوں میں
میرا کیا کام ہے گرتے ہوئے زندانوں میں

(۱۶۷)

چار دن کی ہے ولی عہدیِ سلطانِ عجم
مسندِ علم پہ دکھلائیں گے دادا کا حشم
نہ تقیؑ اور نقیؑ کاندھے پہ رکھیں گے علم
عسکریؑ نام ہے لیکن نہ سپہ ہوگی بہم
دورِ قائمؑ میں بپا کرنا ہے فتنہ مجھ کو
حشر تک سوؤں تھکا دیجئے اتنا مجھ کو

(۱۶۸)

شرم آئی ہے مجھے خون علی اصغرؑ سے
لوں گی بدلا ابھی شیطان کے اس لشکر سے
میں کڑک کر ذرا اٹھوں تو ، لہو تو برسے
تو سہی نام کو اولاد کے کوفہ ترسے
میرے لوہے سے زمینوں کے طبق کٹتے ہیں
نسلوں کو کاٹ دوں یوں، جیسے ورق کٹتے ہیں

(۱۶۹)

شیر، ضرغامِ الٰہی کا جو رن میں ڈٹ جائے
روئیں تن، سنگ بدن سامنے آکر کٹ جائے
دل مرا اور بڑھے بھیڑ جو پیچھے ہٹ جائے
گہرا خندق ہے جو کوفے کا زمیں تک پٹ جائے
بڑے ساونت نہ سنجوگ نہ بیراگے ہیں
میرے پہچانے ہیں، خندق کے یہ سب بھاگے ہیں

(۱۷۰)

سرِ قاسمؑ کی قسم زن کا جو شوہر رہ جائے
مجھ کو عباسؑ کی سوگند جو یاور رہ جائے
منہ نہ زینبؑ کو دکھاؤں جو برادر رہ جائے
جانا خیمہ میں میسر نہ ہو جو گھر رہ جائے
شہر کیا شئے ہے محلے نہیں بازار نہیں
قفل ڈلوا نہ دوں کوفہ میں تو تلوار نہیں

(۱۷۱)

سن چکی ہوں بنِ مرجانہ کا بگڑا ہے دماغ
تھا نہ کم ظرف کہ چکرا گیا پایا جو ایاغ
بادِ شمشیر سے ہے دور ابھی لالۂ باغ
ایک جھوکے میں بجھا سکتی ہوں دنیا کا چراغ
برق ریزی ، فلکی تیغ کی کچھ دیر رہے
کوفہ میں آگ لگے شام میں اندھیر رہے

(۱۷۲)

برق بن جاؤں چھپیں جا کے ابھی تاروں میں
اژدہا بن کے سماؤں جو رہیں غاروں میں
قلعہ بنوائیں اگر خوف ہے بازاروں میں
تیغ کا ہے کی، جو درکر نہ دوں دیواروں میں
جو کیا ہے وہ نکیرین کو بتلاؤں گی
قبر میں جائیں تو ہمراہِ علیؑ جاؤں گی

(۱۷۳)

چوم کر تیغ کا قبضہ کہا شہؑ نے بس بس
کہاں یہ عترتِ مظلوم کہاں اہلِ ہوس
بوڑھے ہیں ، پیاسے ہیں، اب ہمتیں کیا چند نفس
یہی مرضی ہے تو پھر دیکھ لے ان ہاتھوں کا کس
خبر آجانے کی خود کوفیوں کو دے آئیں
کہہ دے جبریلؑ سے دلدل کو مرے لے آئیں

(۱۷۴)

آیا اصطبلِ محمدؐ کا جو وہ زُہرہ جبیں
برق پا، کوہ کَفَل، نور فلک ، حُسن زمیں
ایک انگڑائی لی اور بیٹھ گئے شاہِ مبینؑ د
اشہب ، انگشترِ خاتَم یہ امامت کا نگیں
قدمِ اسپ اُٹھے، شہؑ کا اشارا پایا
تاج کو لعل ملا، عرش نے تارا پایا

(۱۷۵)

سہل ہے اسپ سبک رو کو ہوا کہہ ڈالیں
برق و بوئے گل و آہو و صبا کہہ ڈالیں
زورِ پروازِ تخیل میں ہما کہہ ڈالیں
ہم یہ سب چھوڑرہے ہیں، شعرا کہہ ڈالیں
خود جوانی تو نہیں، یاد جوانی ہے ابھی
گر چہ بوڑھا ہوں طبیعت میں روانی ہے ابھی

(۱۷٦)

نقشِ نعل اس کا ستارہ جو زُحل سے مافوق
کنڈا گردن کا وہ پیارا کہ پری پھینک دے طوق
سینہ میں دل کی جگہ دیجئے، کہتا ہے یہ ذوق
آنکھیں کہتی ہیں کہ قربان ترے دیدۂ شوق
پاؤں اس ناز سے گیتی پہ دھرے جاتے ہیں
چوٹ کھائے ہیں جو دل پر وہ مرے جاتے ہیں

(۱۷۷)

لاکھ دکھ ہوں ، ہے مگر ہجر فرس کا دشوار
پاؤں سے اُٹھتا ہے اور پاؤں پہ گرتا ہے غبار
ذرّے دبنے پہ بھی کیلوں کو کیئے جاتے ہیں پیار
سنگ ریزے جو پسے، آئیں صدائیں ہر بار
یہ مقدر کہ کچلتے ہیں کچلنے والے
تو سلامت رہے اے دل کے مسلنے والے

(۱۷۸)

تو فلک ہی سہی رستے مگر احسان کے چل
مرضِ جانِ بشر عشق ہے یہ جان کے چل
دوست ،دشمن ہیں بہت جان کے پہچان کے چل
ہم بھی دل رکھتے ہیں، سینے کو نہ یوں تان کے چل
روح سینوں میں جو بالیدہ ہوئی جاتی ہے
استخوانوں کے کڑکنے کی صدا آتی ہے

(۱۷۹)

پہلی ہی جست میں لشکر کا علم پیچھے تھا
گول دنیا ہے، قدم آگے، عدم پیچھے تھا
بس زمانہ تھا، جو رفتار میں کم پیچھے تھا
حشر نزدیک تھا قدموں سے قدم پیچھے تھا
نسلِ تازیِ رسولِ عربیؐ تک پہنچا
منزلِ علمِ الٰہی سے نبیؐ تک پہنچا

(۱۸۰)

شور قرنا کا پسِ پشت رہا دف پیچھے
حد سے بڑھ آئی تھی جو صف وہ رہی صف پیچھے
جو ابھی منہ میں تھا خود رہ گیا وہ کف پیچھے
کوئی بدعت نہ کہے گر، تو تھا رف رف پیچھے
ساٹھ سال آگے ہے دن آج کا اور آج کی رات
خاکِ پا ڈھونڈھتی ہوگی کہیں معراج کی رات

(۱۸۱)

درِ احمدؐ سے شہِؑ عقدہ کشا تک پہنچا
اور نجف سے حسنؑ سبز قبا تک پہنچا
جب مدینہ سے چلا کرب وبلا تک پہنچا
اور دو گام میں، دم بھر میں خدا تک پہنچا
حال شبیرؑ کا عابدؑ کو سنانا ہے اِسے
گھر میں پہنچا کے خبر، خلد میں جانا ہے اِسے

(۱۸۲)

فخر اس پر کہ ہمیشہ سے ہوں میں پنجتنی
میرے رہنے کی جگہ فاطمہؑ کے در پہ بنی
مجھ کو کہیئے نبوی و علوی و حسنی
ظلِ شبیرؑ کی اب پشت پہ ہے چھاؤں گھنی
ناز اس پر ہے کہ تا رحمتِ باری لایا
دوشِ احمدؐ سے جو اتری وہ سواری لایا

(۱۸۳)

تیغ کاندھے پہ رکھی، باگ لی ، رہوار چلا
لو کا جھونکا بھی سنبھالے ہوئے رفتار چلا
غل ہوا جان کا دشمن کی خریدار چلا
ہنسے جبریلؑ کہ یوسف سرِ بازار چلا
اب کوئی دم میں سنبھلتا ہے دماغِ لشکر
مصر کی طرح سے بجھتے ہیں چراغِ لشکر

(۱۸۴)

ہاں زلیخائے اجل آ ، سرِ دروازۂ زخم
ماری ماری نہ پھرے گرد ، بنے غازۂ زخم
ہاتھ میں تیغ نے خود لے لیا اندازۂ زخم
دھار کا ڈورا نہ ابتر کرے شیرازۂ زخم
صفیں بسمل ہوں، رسالوں کے ورق اُڑ جائیں
بولے جبریلؑ ، زمیں کے نہ طبق اُڑجائیں

(۱۸۵)

جو جری حد سے زیادہ ہو اسے کہتے ہیں شیر
شیر توہین ہے جس ذات کی ، آیا وہ دلیر
سالکِ مسلکِ حق، راہ میں جن کی نہیں پھیر
یہ وہ ہیں جن سے زبردست ہیں جنّات کے زیر
نار کا زور نہ اس خاکِ قدم سے اُبھرا
یہ نشاں اُس کا ہے جو بیر علم سے اُبھرا

(۱۸۶)

وہ زبردست ہیں جو آگ سے پانی لے لیں
آسمانوں کی قبائیں یہ شہانی لے لیں
تیغرانی کی ملائک سے نشانی لے لیں
اہلِ جنت سے جو چاہیں تو جوانی لے لیں
صاحبِ جود بھی ہیں ، مالک و مختار بھی ہیں
کہ جوانانِ جناں کےیہی سردار بھی ہیں

(۱۸۷)

فیل کے قتل سے رستم ہے جہاں میں رستم
اور یہاں فیلِ تنہ افلاک کے سر ہوتے ہیں خم
زال کی قوس اُٹھے دس جو بہادر ہو ں بہم
ہے کماں سام کی ان کو پرِ ناوک سے بھی کم
ختم دنیا ہو اگر ترک مروّت کر دیں
بل جو یہ ڈال لیں ابرو پہ ،قیامت کردیں

(۱۸۸)

جد انہیں کے تھے جو گلچیں بنے انگارو ں میں
اژدہے چیرے ہیں ان لوگوں نے گہواروں میں
ان کی شوکت کے نشاں ہیں کئی دیواروں میں
نڈر ایسے ہیں کہ سوجاتے ہیں تلواروں میں
فرضِ حق فرشِ پیمبرؐ پہ ادا کرتے ہیں
پائتیں اِن کے ملک ذکرِ خدا کرتے ہیں

(۱۸۹)

شہؑ نے فرمایا رجز پڑھ چکے میری جبریلؑ
جو خردمند ہیں، ان کو ہے بہت مدح قلیل
کہہ دو آئیں نہ گواہی کے لیے میکائیلؑ
اب جو سمجھے نہیں، سمجھائیں گے وہ عزرائیلؑ
ہاں بڑھو ، ٹوٹے ہوئے ہاتھ کی طاقت دیکھو
جس پہ نازاں ہے شجاعت، و ہ شجاعت دیکھو

(۱۹۰)

دیکھو وہ سر گئے، وہ ہاتھ گئے، دم نکلے
دیکھو دھنس دھنس کے صفِ فوج میں یہ ہم نکلے
جن رسالوں پہ نظرڈالی وہ بر ہم نکلے
تم میں بودے تو بہت نکلے، جواں کم نکلے
خندق و بدر میں روکا تھا جو اب روکو گے
کیوں پسر مردہ ہمیں جان کے پھر ٹوکو گے

(۱۹۱)

ہم جو روئے سرِ قبرِ علی اصغرؑ تادیر
تم یہ سمجھے کہ حسینؑ ابنِ علیؑ ہوگیا زیر
سوچتے دل میں کہ ناداں نہیں ہوتا ہے دلیر
بچہ مرجائے تو کچھ اور بھڑک جاتا ہے شیر
عصر تک لڑنے کی بازو میں توانائی ہے
ذوالفقار اب تو مجھے فوج میں لے آئی ہے

(۱۹۲)

اس کو صف کہتے ہو تم جو خطِ مسطر بھی نہیں
لو یہ افسر بھی نہیں، صف بھی نہیں ، سر بھی نہیں
سیلِ خوں دیکھ کے لب تشنہ یہ مضطر بھی نہیں
دامنِ تیغِ یداللہ ابھی تر بھی نہیں
پی لیا تیغ نے خوں ، جو یہ کہے جھوٹا ہے
زنگ رکھی ہوئی تلوار کا کب چھوٹا ہے

(۱۹۳)

ایک بڑھتا نہیں تو دو بڑھو اور چار بنو
بھاگتے کیوں ہو؟ نہ افسر کے گنہگار بنو
مجھ سے منہ موڑا تو لشکر کے وفادار بنو
جیسے قسمت ہی میں لکھا ہے کہ غدار بنو
نہ کسی شخص کے بیٹے ہو نہ تم بھائی ہو
تیغ بھی تم پہ نہ تھوکے گی کہ ہرجائی ہو

(۱۹۴)

ساتھ ان کا نہ دیا، تھے جو نبوت والے
اب جو بھاگوگے تو پیٹیں گے حکومت والے
ہاں ڈرو کا ہے کو،کچھ تم نہیں عزت والے
رکھ ہی لیں گے کہیں دوٹکڑو ں پہ دولت والے
عزتِ نفس ڈبو آئے ہیں کھو آئے ہیں
نانِ جو لے کے مجھے مارنے جو آئے ہیں

(۱۹۵)

جس پہ مہریں ہیں پئے قتل وہ نامے دیکھوں
علما بھی تو ہیں، آئیں کہ عمامے دیکھوں
جنسے شرماتا ہے تقویٰ بھی، وہ جامے دیکھوں
کہیں ایسا نہ ہو دل فوج کو تھامے دیکھوں
دھوکے کیا کیا نہ دیئے تم نے مسلمانوں کو
آج تلوار میں ہم تولیں گے ایمانوں کو

(۱۹۶)

یہ چلی ہتھکٹی، افسر کی کلائی نہ رہی
سائے سے ڈھال کے یہ کیوں نکل آئی، نہ رہی
طاقتِ فوج اگر پیاسے پہ چھائی نہ رہی
کھیل اس جنگ کو پھر سمجھو، لڑائی نہ رہی
میری پرچھائیں جدھر جاتی ہے ڈرجاتے ہو
میں تو چھایا ہوا ہوں تم پہ، کدھرجاتے ہو

(۱۹۷)

بودے ہی بودے ہیں سب تم میں، جواں کوئی نہیں
اب علمدار پئے فوجِ گراں کوئی نہیں
دور تک دیکھ رہا ہوں کہ نشاں کوئی نہیں
کہتی ہے تیغ کی جھنکار، بیاں کوئی نہیں
دیدِ مہماں کو یہ بے تاب و تواں آپہنچا
حرؑ کو نیند آئی تھی جس جا میں وہاں آپہنچا

(۱۹۸)

صاف دل ، دوست کو ہاتھوں کی صفائی دکھلاؤں
اک سپاہی کو سپاہی کی لڑائی دکھلاؤں
فوج کس طرح سے پیاسے نے بھگائی، دکھلاؤں
چوٹ بے شیرؑ کے ہمراہ جو کھائی دکھلاؤں
ناوکِ گردنِ اصغرؑ کا اثر کاری ہے
تیغ اُس ہاتھ میں ہے جس سے لہو جاری ہے

(۱۹۹)

اے ہراول مرے، اے پہلے سپاہی !اے حرؑ
تونے دم بھر کی ملاقات نباہی اے حرؑ
میزبانی مری قسمت نے نہ چاہی اے حرؑ
چھانٹ دی فوجِ ستمگر کی سیاہی اے حرؑ
تجھ سے ملنا تھا مجھے ، فوج بھگا کر آیا
پھر بھی میں تیرے رسالے کو بچا کر آیا

(۲۰۰)

عصر کا وقت ہے اور کوفے کا رستہ ہے بعید
کئی بار اُکھڑے قدم جم گئی پھر فوجِ یزید
ان کو درکار ہے تلوار کی اک ضرب شدید
بھول جانا نہ دعا میں مجھے اے میرے شہید
پیاسے ہیں ، بوڑھے ہیں اور چرخ کے تڑپائے ہیں
علی اصغرؑ کو ابھی گاڑ کے ہم آئے ہیں

(۲۰۱)

فوج پھر جم گئی ،لے تجھ کو خدا کو سونپا
اب نہ پلٹیں گے کہ ہے زیرِ قدم راہِ رضا
میرے مہماں کو حفاظت سے رکھ اے کرب و بلا
تھم کے زخمی کے قریں سے گذر اے رن کی ہوا
حشر کے روزجواب اس کے تجھے دینا ہیں
اپنے بکھرے ہوئے موتی مجھے پھر لینا ہیں

(۲۰۲)

کہہ کے یہ باگ کو سیدھا کیا ، جھپٹے شہؑ دیں
گھوڑا یوں تیز چلا مل گئی سینے سے زمیں
ہاتھ اُونچا کیا سر رکھ کے کنوتی کے قریں
آنکھیں ابلی ہوئیں، لب دانت میں ،تازہ سی جبیں
زندگی کے لئے اب لشکرِ کیں ترسے گا
لال عمّامہ یہ کہتا ہے لہو برسے گا

(۲۰۳)

کُرتا اُڑ اُڑ کے پسِ پشت ہوا دیتا تھا
پیپلا تیغ کا بجلی سی گرا دیتا تھا
سرکو گھوڑےسے بہادر جو ملادیتا تھا
سبزہ پر لالہ کا پھول اور مزا دیتا تھا
گرد کی آڑ سے حملے کئے شہؑ جاتے تھے
اہلِ کیں چارطرف دیکھ کے گھبراتے تھے

(۲۰۴)

ناگہاں قلب میں لشکر کے ہوا شورِ نشور
بوق نے دم بھرا ، لشکر میں پھنکا حشر کا صور
طبل چلایا، بنِ سعد کا ڈھاتا ہے غرور
جھانجھ بولا، وہ سمٹ آئیں سپاہی جو ہیں دور
ہم تو حیراں رہے اور تیغ علیؑ کی ٹوٹی
میرِ لشکر ہے جہاں پر وہاں بجلی ٹوٹی

(۲۰۵)

گھوڑا پیاسے کا ہے اور دھوپ میں گرمایا ہے
صفیں پھراتا ہوا اسپِ حسینؑ آیا ہے
نعرۂ یا اسداللہ نے گھبرایا ہے
شیرگرجا ہے سنانوں کا جہاں سایا ہے
سرمکھ آکر علمِ فوجِ پریشاں کاٹا
ایک بجلی نے نیستاں کا نیستاں کاٹا

(۲۰۶)

تیر گھوڑے پہ جو بیٹھے تو بنا اور پری
خود میں گھستی ہے تلوار ہے لوہے کی کھری
ہول چھایا ہے جو تیغ اُٹھی تو گرتی ہے پھری
تھے جو رودار جواں ہو چکے پہلے نظری
جو اُٹھا، تیغ کا وہ کھاکے تھپیڑا بیٹھا
یہی جھونکے ہیں تو پھر فوج کا بیڑا بیٹھا

(۲۰۷)

شمر کب میمنۂ فوج لڑا سکتا ہے
بنِ حجاج کہیں بائیں پر آ سکتا ہے
پہلواں کوئی قریں شاہؑ کے جا سکتا ہے
حق اُبھارے جسے کون اس کو دبا سکتا ہے
خود پسیں گے جو دبائیں گے زمانے والے
بہت اونچے ہیں محمدؐ کے گھرانے والے

(۲۰۸)

سر کو بتلا کے اُڑا دیتے تھے جب بندِ کمر
آپ ہنس دیتے تھے شبیرؑ جھکائی دے کر
سارے لشکر کو تھی باندھے ہوئے سرورؑ کی نظر
آنکھ جھپکائی اِدھر اور اُدھر اُڑ گیا سر
ڈھال میں چھپ کے نہ کچھ حُسن میں بل آتا تھا
ابر ہٹ جاتا تھا خورشید نکل آتا تھا

(۲۰۹)

پیپلے بھونک دیئے زور میں سینے توڑے
پاؤں کافر کے کٹے دیر کے زینے توڑے
کلغیاں سر پہ جو دیکھیں تو نگینے توڑے
صفیں تر بھر ہوئیں لشکر کے سفینے توڑے
بادِ شمشیر بصد عز و شرف باندھے ہوئے
فوج کو لے چلے کوفے کی طرف باندھے ہوئے

(۲۱۰)

سر اُٹھائے تھے جو خیمے وہ زمینوں پہ گرے
ٹھاٹھ دم بھر کے لئے ، فوج میں احمق تھے نرے
جن کو بھیجا تھا جہنم کو ، وہ رن میں نہ پھرے
خاتمہ ہو گیا باقی نہ دُھرے تھے نہ سِرے
تیغ نے لشکر و سردار کا طے جھول کیا
مورچہ توڑکے شبیرؑ نے اک غول کیا

(۲۱۱)

فوج کیں بھاگی ظفریاب ہوا جانِ علیؑ
کج عمامہ جو ہوا آئی نظر شانِ علیؑ
خون کی بو سے مہکتا تھا گلستانِ علیؑ
لے چلا مور کے لشکر کو سلیمانِ علیؑ
ترکِ دنیا نہ کریں حق کے جو عارف کی طرح
تخت کوفہ کا منگا لیں ابھی آصف کی طرح

(۲۱۲)

رعب نے ڈال دی لشکر کے کناروں پہ لکیر
ٹڈی دل فوج کی اک سمت روانہ تھی بہیر
سب سے آگے تھے جو، کہتے تھے وہ آئے شبیرؑ
شورتھا ہو گیا پھر آج بنِ سعد فقیر
دولت رے نہ ملی لاج نظر کی کھوئی
پوری لینے کو چلے، آدھی بھی گھر کی کھوئی

(۲۱۳)

آگے تو فوج تھی اور پشت پہ تھی شیر کی دھاڑ
سر اُٹھائے ہوئے ان نعروں کو سنتے تھے پہاڑ
ابتری فوج کی اور اس پہ مقدر کا بگاڑ
راہ کی بستیاں قسمت سے ہوئیں مفت اُجاڑ
رعب سینوں میں دماغوں میں خلل بیٹھ گیا
تا بہ کوفہ در خیمہ سے عمل بیٹھ گیا

(۲۱۴)

طبل خاموش ہوئے رک گیا قرناؤں کا دم
اللہ اللہ کی صدا دیتے تھے کوفے کے صنم
ہاتھ اُٹھائے تھے اماں کے لیئے لشکر کے علم
وہ مصیبت تھی کہ بکھرائے تھے گیسو پرچم
چنگ و شہنا میں تھے جو صبح کو، وہ راگ گئے
تالیاں جھانجھ بجاتے تھے کہ سب بھاگ گئے

(۲۱۵)

طبل کہتا تھا مجھے بھاگنے کا کیوں ہو قلق
سینہ کوبی جو مری کرتے تھے دل ان کے ہیں شق
آسماں کہتا تھا باطل گیا اور آ گیا حق
لال پہنوں گی میں جوڑا یہ تھا اصرار شفق
صدق کی فتح، ہزیمت ہوئی کاذب کی طرف
سجدہ کو مہر بھی جھکنے لگا مغرب کی طرف

(۲۱۶)

تیغِ شہؑ بیچ میں خوں اُڑ رہا تھا دھاروں میں
یا نہاتی تھی پری رنگ کے فواروں میں
الاماں کا تھا بپا شور ستمگاروں میں
عورتیں کوفہ کی چلّاتی تھیں بازاروں میں
برق تھی فرق پہ، حیراں تھے جوانِ کوفہ
جب کڑک ہوتی تھی، ہلتے تھے مکانِ کوفہ

(ساقی نامہ) (۲۱۷)

ناسخِ مشربِ رندانہ تھی شمشیرِ امامؑ
تھا حلال ، آبِ اجل، زیست کا بادہ تھا حرام
مل گیا شہر کی دیوار سے جب لشکرِ شام
یوں ہلا قلعہ کہ یاد آنے لگی جنبشِ جام
گر پڑے مست تو رمزِ دلِ مستانہ کھلا
پٹ گئی راہ کی خندق ، درِ میخانہ کھلا

(۲۱۸)

ہاں زباں چاشنئ بادۂ عرفاں دے دے
ایک ہی جام میں کونین کا ساماں دے دے
جو کہ اونچا ہے اس ایماں سے وہ ایماں دے دے
پڑھنے کا وقت گیا گھول کے قرآں دے دے
مومنِ رند کی ہربات کو صادق کردے
نطقِ قرآن سے مرے جام کو ناطق کردے

(۲۱۹)

ہاں وہ بادہ جسے سربند عدم نے رکھا
جان کر یہ کہ امانت ہے، ارم نے رکھا
(برق) میں لوح کی جس مئے کو قلم نے رکھا
تیرہ سو سال جسے سینہ میں ہم نے رکھا
وہ جو مکہ نے غرور نسبی سے کھینچی
گل رخسار رسول عربیؐ سے کھینچی

(۲۲۰)

پیتا ابلیس بھی تو آب صمد مل جاتا
اسی کثرت میں **هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ** مل جاتا
باغِ جنت میں نہ یہ ثمرہَ بد مل جاتا
ڈٹ کے پی لیتے جو آدمؑ تو ابد مل جاتا
خلد و فردوس کا دو دن کو قبالا پایا
تھوڑی کیوں پی تھی اسی سے تو نکالا پایا

(۲۲۱)

ہم ہیں مستانِ خُم ہاشم عالی درگاہ
شہر والوں میں ہیں بوطالبؑ والا آگاہ
قریہ میں دستِ حلیمہ سے ملی ہے سرِ چاہ
یومِ **اِقْرَأْ** مرے پینے کی ہوئی بسم اللہ
سیر نیّت تھی جو ، مئے دیکھ کے منہ پھیر لیا
پر جبریلؑ کے میخانہ نے خود گھیر لیا

(۲۲۲)

بانٹ دی مالِ خدیجہؑ سے تجارت کر کے
رند ، راہب بنے ان ہاتھوں پہ بیعت کر کے
کام کیا جبر کا، پلوائی محبت کر کے
حلق کے نیچے اُتاری گئی دعوت کر کے
ساغر و بادہ و خُم کچھ نہ چھپایا میں نے
کون ساقی ہے بالاعلان بتایا میں نے

(۲۲۳)

شبِ ہجرت بھی نہ چھوڑی مئے احمر میں نے
بیچ کر جان کو پی لی سر بستر میں نے
روزِ آشوب نہ کی ہیبت خیبر میں نے
آنکھوں سے پی سر زانوئے پیمبرؐ میں نے
وادیِ خم میں بڑا مجمعِ رندانہ رہا
میرے ہی ہاتھ یہاں بھی مرا پیمانہ رہا

(۲۲۴)

میں نے کب منبر ومحراب میں چھلکا کے نہ پی
پینا کس کام کا رندوں کو جو دکھلا کے نہ پی
تو سہی دست ِپیمبرؐ سے جو ڈھلوا کے نہ پی
رند کا ہے کے ، حرم ہی میں اگر جاکے نہ پی
سن کے آواز تری کعبہ کے میخانے سے
منہ لگائے رہا ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

(۲۲۵)

وہ صراحی مئے **اَلْیَوْمَ** کی ڈھلوائی ہوئی
پر جبریلؑ کی مانجی ہوئی چمکائی ہوئی
مئے وہ دیدے پئے خلت تھی جو رکھوائی ہوئی
دامنِ آتشِ نمرود میں چھنوائی ہوئی
گرم جس مئے نے دلِ انس و جن و جان کیئے
جس کے اک چھینٹے نے آتشکدے ویران کیئے

(۲۲۶)

ہاں وہ مئے، زہد میں جو بوذرؓ و سلمانؓ کو حلال
پانچ وقت اس کو اذاں دینے میں پیتے تھے بلالؓ
ہاں وہ مئے، جس سے ملا احمدؐ و حیدرؑ کو کمال
اک کے چہرے کا جمال، ایک کے چہرے کا جلال
خانۂ فاطمہؑ میں دور چلا کرتا تھا
یہ چراغ آڑ میں کملی کے جلا کرتا تھا

(۲۲۷)

پاک ہیں جس کے سبو، جام ہیں کورے جس کے
رنگ میں نہرِ جناں آنکھ کے ڈورے جس کے
نہ پھٹکتے تھے کبھی پاس چھچھورے جس کے
بی بیاں پیتی تھیں بھر بھر کے کٹورے جس کے
موجِ مئے تھی یہی جو آیۂ تطہیر بنی
اسی برقاب کی گھٹی پئے شبیرؑ بنی

(۲۲۸)

ہے اسی بادہ سے رنگیں فلکِ مینائی
عرش کی راہ میں خنکی جو نبیؐ نے پائی
کہکشاں کہتی ہے محبوب نے لی انگڑائی
پھر تو شرمائے بہت حق نے مگر پلوائی
میزبانی کی تمنا دمِ اصرار بڑھی
ہاتھ پردے سے نکل آیا یہ تکرار بڑھی

(۲۲۹)

ہر قدم میکدہ ہے پی لی جہاں یاد آئی
کبھی کاندھے پہ کبھی فرش نبیؐ پر پائی
تا بہ ہند و عجم و روم و ختن بھجوائی
فوجِ رنداں کی رسد قدرتِ حق خود لائی
حد یہ ہے گھول دی مئے راہ کے دریاؤں میں
آبلے ساتھ تھے ساغر لئے صحراؤں میں

(۲۳۰)

میکدے دہر کے چھلکائے سبو سے اپنے
غسل گرجا کو دیا آبِ وضو سے اپنے
پوچھو آئینہ سے یا چہرہ و رو سے اپنے
منہ زمانے کا دھلایا ہے لہو سے اپنے
مئے جرأت نہ عطا کرتے جو طٰہٰ والے
پاؤں لٹکائے تھے تربت میں مسیحا والے

(۲۳۱)

پھانسی کے تختے پہ پی، جشن گہہِ یار میں پی
دار کی نوک پہ پی، ہند کے گلزار میں پی
قید خانوں میں ملی، شاہ کے دربار میں پی
چھپ کے مسجد میں، تو اعلان سے بازار میں پی
رند ہیں تیرے بری اور بھلی کاٹتے ہیں
یاد ہے اتنا مزا اب بھی ، کہ لب چاٹتے ہیں

(۲۳۲)

آج کا حال سنو! بیچ کے گھر بار کو پی
گریۂ خویش کو اور خندۂ اغیار کو پی
جمعہ کو بھول گئے اِس قدر اتوار کو پی
اور اب بھی کوئی کہتا نہیں بیکار کو پی
ڈوبے ہیں دب کے زمانے سے یہ پیمانے میں
ہم کو کیا ہم تو ڈٹے بیٹھے ہیں میخانے میں

(۲۳۳)

یہ مریدانِ غرض پیتے نہیں پیر کے ساتھ
جو اُڑیں نشہ میں وہ جائیں گے کیا تیر کے ساتھ
موج مئے چل نہیں سکتی کسی شمشیر کے ساتھ
منہ تو دکھلاؤ تمھیں جاؤ گے شبیرؑ کے ساتھ
نام عباسؑ پہ مرنا ہے ہمیں جینا ہے
کیوں پئیں مشک سکینہؑ سے جنہیں پینا ہے

(۲۳۴)

تج دو جب گھر تو درِ آل عبأ ملتا ہے
خونِ دل بہنے سے رستے کا پتا ملتا ہے
شائقِ دید کا خنجر سے گلا ملتا ہے
بڑی مشکل سے مسلماں کو خدا ملتا ہے
بندۂ زر ہوں مسلمان کچھ آسان نہیں
جان کا کھیل ہے ایمان کچھ آسان نہیں

(۲۳۵)

مکرِ ابلیس نہیں ان میں کہ طاغوت نہیں
نام داؤدؑ ہے اور قاتلِ جالوت نہیں
وہ حسینی نہیں جو عشق میں مبہوت نہیں
شہہؑ کو دیکھو کہ غم تربت و تابوت نہیں
پٹری مضبوط ہے رہوار کو گرمائے ہیں
مثلِ خورشید اکیلے ہیں مگر چھائے ہیں

(۲۳۶)

سَن سے جب تیغ چلی، سیکڑوں سر اُڑتے ہیں
ہاتھ اُٹھتا ہے سبک تیروں کے پر اُڑتے ہیں
فوج میں غُل ہے کہ لوہے سے شرر اُڑتے ہیں
خیمے تو اُڑ چکے اب کوفے کے گھر اُڑتے ہیں
شمر سے کیا ، نہ خدا ہے نہ خدائی اُس کی
جس کے نانا کی ہم امت ہیں دہائی اس کی

(۲۳۷)

لگ گئے کشتو ں کے انبار، مرے اہلِ ہوس
اتنا بھاگے کہ زبانوں کو نکالے ہیں فرس
پھر بھی تیغِ شہؑ دیں کر رہی ہے قطعِ نفس
عرش سے آتی ہے آواز کہ بس پیاسے بس
اہل کیں دیکھ چکے طاقتِ غازی دم لے
عصر کا آ گیا ہنگام نمازی دم لے

(۲۳۸)

دلِ صد لخت سے ہاں ہم کو سنادے تکبیر
یوں مرا نام لے، ہو نام میں بھی خوں کی لکیر
ہاں قیام ایسا کہ گیتی ہلے ، خم ہو نہ ضمیر
ہم بھی سمجھیں کہ محمدؐ کا ہے پالا شبیرؑ
تاج سے ٹکریں لیتی ہے محبت میری
سر جو دیتے ہیں وہ پاتے ہیں امامت میری

(۲۳۹)

جن کو بُو کہہ سکیں وہ رہتے ہیں گلزاروں میں
جنسِ یوسفؑ سے نہیں ہم ، جو ہوں بازاروں میں
سوزِ دل دیکھتے ہیں ہم تو خریداروں میں
ہم کو وہ پائیں گے جو لوٹیں گے انگاروں میں
روحِ سوز اور نہ خوشبوئے گداز آتی ہے
وہ کروروں میں ہیں گے، جن کو نماز آتی ہے

(۲۴۰)

عبدیت رنگ بھرے خون کے فوارو ں میں
ان کو محراب بنا ، خم ہے جو تلواروں میں
جھنڈے تکبیر کے گڑ جائیں ستمگاروں میں
ڈنکے بجوا دے اذاں تیغ کی جھنکاروں میں
سجدۂ شوق کچھ اس طرح ادا ہوجائے
سجدہ گاہِ دو ، جہاں خاکِ شفا ہوجائے

(۲۴۱)

شہ ؑ نے فرمایا کہ میں اور عبادت تیری
یاد دلوائی نماز اُف ری عنایت تیری
رب ہے تو، بندہ نوازی یہ ہے عادت تیری
مجھکو درکار ہے اب کچھ تو محبت تیری
فکرِ اولاد نہیں رنجِ غم و جور نہیں
دل جو گھر ہے ترا ، اب اس میں کوئی اور نہیں

(۲۴۲)

دل کو آمادہ کئے بہرِ سفر ہے شبیرؑ
صبح سے مستعدِ ہدیۂ سر ہے شبیرؑ
پھر بھی اے خالقِ غفار ، بشر ہے شبیرؑ
اُٹھ گیا ہاتھ کہ اصغرؑ کا پدر ہے شبیرؑ
تیرے بندوں کی عدو فوجِ ستم آرا ہے
میرے چھ ماہ کے بچے کو ابھی مارا ہے

(۲۴۳)

مجھکو کیا لڑنے سے، ہوں مفلس و نادار وغریب
نہ اعزّہ مرے زندہ ہیں نہ باقی ہیں حبیب
گھر بھی ہے دور، شناسا بھی نہیں کوئی قریب
کیا عجب مر کے کفن بھی نہ ہو جنگل میں نصیب
قبر کی فکر کرے کوئی وفاکوش نہیں
بچ گیا ہے جو پسر، تپ سے اسے ہوش نہیں

(۲۴۴)

کئے ہیں ذرۂ بے قدر پہ احساں کیا کیا
باپ حیدرؑ سا دیا، بھائی حسنؑ سا بخشا
جد دیا خیرورا، مادرِ عالی، زہراؑ
بیٹا عابدؑ سا ملا حاملِ صد رنج و بلا
بنتِ شہ، بانوئے عالم سی دولہن کس کو ملی
بھائی عباسؑ سا، زینبؑ سی بہن کس کو ملی

(۲۴۵)

شکر تیرا جو امانت تھی وہ تجھ کو دے دی
پاس اب کچھ نہیں، لے دیکھ ہے دامن خالی
بندہ راضی ہے ترا، جو ہو رضا مالک کی
دور ہوں قافلے سے، مجھ کو ہے خود بھی جلدی
تیرا بندہ سرِ در بندہ نواز آپہنچا
سچ تو فرماتا ہے تو، وقتِ نماز آپہنچا

(۲۴۶)

مڑ کے پھر فوج سے فرمانے لگے آپ کہ آؤ
ٹکریاں باندھو ،صفیں ٹھیک کرو، فوج بڑھاؤ
وقت وہ اور تھا اب خوف نہ شبیرؑ سے کھاؤ
اب میں لڑنے کا نہیں آؤ مرا خون بہاؤ
میں شجاعت کی طرح صبرِ جلی رکھتا ہوں
نہ ڈرو میان میں شمشیرِ علیؑ رکھتا ہوں

(۲۴۷)

ذوالفقارِ اسد اللہ کی فرمائش سے
لڑنا پیشہ نہ تھا مظلوم کا پر خوب لڑے
کیا بری چیز ہے غصہ ، کئے حملے اتنے
اب کھلا ، خیمہ سادات سے دور آنکلے
پلٹو، تاعصر کہ واجب کا سرانجام ملے
اپنی منزل پہ پہنچ جائیں تو آرام ملے

(۲۴۸)

کہہ کے یہ جانبِ مقتل چلے شبیرؑ اُدھر
اِس طرف شمر نے تیار کیا کل لشکر
اٹھی شمشیر، چمکنے لگے پھر نیزوں کے سر
تیر پڑنے لگے بیکس کے تنِ لاغر پر
تیغیں رستے میں نہ تیرِ ستم آگیں ٹھہرے
ڈھونڈھ کر ایک جگہ خاص شہِؑ دیں ٹھہرے

(۲۴۹)

برچھیاں چلنے لگیں، پڑنے لگے تن پہ تبر
بھالا کھایا جو نکالا کوئی ناوک جھک کر
دودھ زہراؑ کا بہا دامنِ صحرا ہوا تر
دل پہ نیزہ جو لگا ہوگئی حالت ابتر
تیر کھینچا تو کلیجے سے ہوا آنے لگی
زخم سے اَشْهَدُ اَنْ لَا کی صدا آنے لگی

(۲۵۰)

تیغ سر پر پڑی، عمامہ پیمبرؐ کا کٹا
تابہ ابرو ہوا سر سرورِؑ والا کا دوتا
سانس رکنے لگی گردن پہ جو اک تیر پڑا
جھونکے لینے لگے مرکب پہ شہ کرب و بلاؑ
تیر گردن پہ جو کھایا تو یہ فرمانے لگے
پھر ہمارے علی اصغرؑ ہمیں یاد آنے لگے

(۲۵۱)

یہ جو سمجھے کہ ٹھہر سکتے نہیں گھوڑے پر
شاہؑ نے کاندھے سے زہراؑ کی اتاری چادر
رکھ کے حمزہؑ کی زرہ ، حضرتِ جعفرؑ کی سپر
رکھا عمامہ پیمبرؐ کا بھی بوسہ دے کر
تھا یہی حکم نہ فوجوں کے خطر سے کھولی
ذوالفقارِ اسد اللہ کمر سے کھولی

(۲۵۲)

رکھ لی چادر میں جو شمشیر ، گرہ دی کس کر
گردنِ اسپِ وفا دار میں باندھی چادر
پھر یہ فرمایا کہ اے اسپ نبیؐ و حیدرؑ
یہ امانت بحفاظت مری پہنچا گھر پر
چھین لیں گے یہ لعیں دم بھی نہ لینا دلدل
یہ تبرّک ہے بہن کو مری دینا دلدل

(۲۵۳)

دینا ایک ایک کو اس بیکس وتنہا کا پیام
کہنا عابدؑ کو دعا، زینبؑ و فضہؑ کو سلام
کہنا خواہر سے کہ جل جائینگے دم بھر میں خیام
پاسِ بیمارؑ رہے، اب ہے وہی سب کا امامؑ
حکمِ خالق ہے یہی، رنج نہ کھانا زینبؑ
میں جہاں بیٹھتا تھا، اس کو بٹھانا زینبؑ

(۲۵۴)

ہوچکے رن میں جو تکمیل غم و بربادی
یہ تبرّک اسے پہنانا بصد آزادی
جانشینی کی اسی غم میں منانا شادی
میری جانب سے بھی دے دینا مبارک بادی
صبر کے ساتھ اسیری کا الم لازم ہے
یہ بھی کہنا کہ اماموں کو کرم لازم ہے

(۲۵۵)

یہ بیاں تھا کہ لگا فرق پہ اک اور تبر
شاہؑ جھکنے لگے گھوڑے پر اِدھر اور اُدھر
اسپ سمجھا کہ سنبھل سکتے نہیں اب زیں پر
چوٹ آئے گی کھڑے قد سے گریں گے یہ اگر
تیر کی طرح کلیجے میں نفس بیٹھ گیا
ٹیک کر گھٹنے اُسی جا پہ فرس بیٹھ گیا

(۲۵۶)

سر ہلا کر کیا گھوڑے نے اخیری جو سلام
چوم کر خوں بھرے ماتھے کو اُتر آئے امامؑ
بولا دلدل، مرے مظلوم ، شہِ عرش مقامؑ
ڈیوڑھی برباد اگر ہو تو کہاں جائے غلام
مجھ کو حیدرؑ نے امام دوسرؑا کو سونپا
بولا وہ تشنہ جگر ہم نے خدا کو سونپا

(۲۵۷)

کہہ کے یہ غش ہوئے میداں میں شہ عرش وقارؑ
گھوڑے نے تھام کے بازو کو جگایا کئی بار
ہوسکے آپ نہ جب پشت پہ دلدل کی سوار
بھر کے سید کا لہو ماتھے پہ رویا رہوار
پھر کہا، کیا نہ ستم دشت میں جھیلے مولاؑ
ساتھ ہم آئے تھے جاتے ہیں اکیلے مولاؑ

(۲۵۸)

اس طرف اسپ گیا ہوش ادھر پھر آیا
خاک پر بیٹھا تیمّم کو نبیؐ کا جایا
زیرِ لب دیکھ کے اُس خاک کو یہ فرمایا
تونے اے کرب و بلا ہم کو بہت تڑپایا
مرد جو کرتے ہیں وعدہ وہ وفا کرتے ہیں
تجھ پہ لے آخری سجدہ بھی ادا کرتے ہیں

(۲۵۹)

شغلِ سجدہ میں تھے مصروف ابھی سرورِؑ دیں
صفِ لشکر سے نکل آیا اُدھر شمرِ لعیں
موزے پاؤں میں تھے اور ہاتھ میں تھا خنجرِ کیں
گر کہوں حال بہ تفصیل اُلٹ جائے زمیں
مختصر یہ ہے کہ اک حشر بپا کر ڈالا
سجدہ میں سر کو نمازی کے جدا کر ڈالا

(۲۶۰)

قبرِ احمدؐ کی ہوئی شمع جو میدان میں گل
کہی جلادنے تکبیر، ہوا فتح کا غُل
بجے اس سمت تو قرنا و دف و چنگ و دُہل
اس طرف پہنچا درِ سیدِ دیںؑ پر دلدل
سن کے آوازِ فرس بولی سکینہؑ آئے
لو مبارک ہو پھوپھی شاہِؑ مدینہ آئے

(۲۶۱)

بولا دلدل، میں اکیلا ہوں، نہیں آئے حسینؑ
قتل بچہ جو ہوا گود میں، شرمائے حسینؑ
آپ ہی آئے نہ میت ہی کو یاں لائے حسینؑ
فاطمہؑ روتی ہیں، آتی ہے صدا ہائے حسینؑ
فوج آکر نہ پیمبرؐ کی بضاعت لے لے
کہہ دو زینبؑ سے برادر کی امانت لے لے

(۲۶۲)

بی بیاں گھر سے نکل آئیں صدا یہ سن کر
سب کے آگے تھی بہن شاہؑ کی کھولے ہوئے سر
بولی گھوڑے سے لپٹ کر شہِ دیںؑ کی دختر
کچھ بتا دلدلِ احمدؐ مرا بابا ہے کدھر
بولا دلدل کہ غم تشنہ دہانی پایا
بولی بیٹی، کہ دمِ ذبح تو پانی پایا

(۲۶۳)

لئے زینبؑ نے تبرک جو نکل کر آئی
پوچھا گھوڑے نے کہ کیوں بی بی امانت پائی
کہا زینبؑ نے امانت تو مجھے پہنچائی
یہ بتا، جب تو چلا، کر رہے تھے کیا بھائی؟
بولا وہ، غش تھے، نہ شبیرؑ کی آواز سُنی
ہاں مگر راہ میں تکبیر کی آواز سنی

(۲۶۴)

بولیں زینبؑ ہے دمِ عصر پڑھی ہوگی نماز
طولِ سجدہ کا ہے خواہاں دلِ عابدؑ کا گداز
کیا عجب ہے ابھی زندہ ہو وہ سلطانِ حجاز
دور سے سُن لوں میں تکبیر نبیؐ کی آواز
ہاشمی لہجہ و گفتار کو سن لے زینبؑ
قرأتِ احمدِؐ مختار کو سُن لے زینبؑ

(۲۶۵)

ناگہاں رن کو روانہ ہوئیں تفتیدہ جگر
ننگے پا، گرم زمیں، بھیڑ پہ لشکر کی نظر
ہوش باقی نہ تھا، کھنچتی تھی زمیں پر چادر
تھے تپاں صورتِ دل کان کے دونوں گوہر
ختم کرنا نہ عبادت یہی چلاتی ہے
بھیّا بہنا تری مشتاقِ نماز آتی ہے

(۲۶۶)

مجھ کو آواز سنا اپنی جہاں کے رہبر
بڑھ گیا ضعف ہوئے قتل جو دونوں دلبر
جب سے اکبرؑ اُٹھے آتا نہیں کچھ صاف نظر
جو سکت رہ گئی تھی لے گئے وہ بھی اصغرؑ
ٹھوکریں کھاتے ہیں یہ قدر ہے مہمانوں کی
راہ روکے ہوئے ہے فوج مسلمانوں کی

(۲۶۷)

میرے سید مرے وارث میرے والی بھائی
آرہی ہے یہ بہن چاہنے والی بھائی
آج سادات کی دنیا ہے نرالی بھائی
آنکھوں میں خونِ شہیداں کی ہے لالی بھائی
کچھ دکھائی جو نہیں دیتا تو دل پھٹتا ہے
چپ ہو کیوں ، تیغ سے کیا رن میں گلا کٹتا ہے

(۲۶۸)

بد دعا کرتی ہے زینبؑ نہ عدو سے ڈرنا
مجھکو دیدار دکھا دو تو لہو میں بھرنا
مرنا مقصد ہے تو زانو پہ بہن کے مرنا
سنّتِ جد میں دمِ ذبح بچھونا کرنا
اے ذبیحِ شہِ لولاک بہن آتی ہے
کچھ بچھانے کو سرِ خاک بہن آتی ہے

(۲۶۹)

یہ بیاں تھا کہ بجے فوج میں باجے یکسر
غُل ہوا کاٹ لیا شمرنے شبیرؑ کا سر
سارے لشکر نے کہی زور سے تکبیر اُدھر
اِس طرف گر گئی سرور کی بہن تیورا کر
رن میں خواہر نے نہ دیدارِ برادر دیکھا
آنکھ کھولی تو سناں پر سرِ سرور دیکھا

(۲۷۰)

بولی زینبؑ نظر آیا جو سرِ شاہِ زمن
بدرِ زہراؑ تجھے کیا جلد لگا رن میں گہن
نہ ملا ذبح میں بھی آب کہ تھا خشک دہن
تیرا لاشہ ہے کہاں ڈھانک دے چادر سے بہن
بے کفن وہ ہے نظر آتا ہے لاشہ جس کا
ایک دکھیا یہ کرے گور و کفن کس کس کا

(۲۷۱)

اِن کھلی آنکھوں کے ہوجائے یہ ماں جائی نثار
چشم پُر خوں سے مجھے دیکھ رہے ہو ہر بار
ذبح میں چاہتے تھےتم بھی بہن کا دیدار
رخِ پُر نور سے ہے حسرتِ دل کا اظہار
لکھا تقدیر کا دونوں نے برابر دیکھا
میں نے سر نیزے پر اور تم نے کھلے سر دیکھا

(۲۷۲)

لبِ اعجاز سے فرمانے لگے یہ سرورؑ
ہوچکے وعدے ہمارے تو وفا اے خواہر
امتحاں اب ہے تمہارا، نہ ہو اتنا مضطر
بد دعا کرنا نہ زینبؑ جو لعیں لیں چادر
جاؤ گھر رنجِ جہاں کا نہ اثر لو زینبؑ
بچ گئے ہیں جو یتیم ان کی خبر لو زینبؑ

(۲۷۳)

بولیں زینبؑ مجھے کیوں رنج وبلا کو سونپا
حفظِ خالق میں سرِ شاہ ہدٰا کو سونپا
لاشہ بے گور و کفن کرب وبلا کو سونپا
آئی آواز تمہیں جاؤ خدا کو سونپا
کاٹنا ہے ابھی اک سال ستمگاروں میں
کل ملیں گے تمہیں ہم کوفے کے بازاروں میں

(۲۷۴)

شاعرؔ اب آگے نہ کہہ حالِ امامؑ دوسرا
ضعفِ پیری نے ترا زورِ قلم چھین لیا
تھا جو دو روز کا وہ مرثیہ دس دن میں کہا
کر دعا حق سے ثواب اس کا ہو ذاخرؔ کو عطا
یادِ جاویدؔ رہے اور غمِ فاخرؔ مجھکو
ایک ایک لفظ پہ یاد آئے ہیں ماہرؔ مجھکو

(۲۷۵)

ذوالفقارؔ آئینہ مرتضویؔ ہو بہ صفت
انجم آرا رہے دنیا میں سپہر رفعتؔ
مہرؔو ناہیدؔ و قمرؔ سے ہو جہاں کی زینت
پئے اخترؔ ہو عطاؔ مثلِ ثریاؔ شوکت
چترؔ برجیسؔ رہے عظمتِ خورشیدؔ رہے
شان و اقبال رضاؔ خلق میں جاوید رہے

❁❁❁

مرثیہ ۷/ دسمبر ۱۹۴۲ء کو ختم ہوا۔ پہلی نقل سید تعظیم حسن صاحب ساقیؔ سلمہ نے کی۔ مجھے نظر ثانی کا موقع نہ ملا، یہاں تک کہ یکم جون ۱۹۴۳ء کو کوہِ منصوری سے میں نے ملازمت سے استعفیٰ دیا۔ ۱۱/ اگست ۱۹۴۳ء جوہری محلہ لکھنؤ میں پہلی مجلس کا حضرت عمدۃ العلماء و سید العلماء و حکیم محمد قاسم صاحب وایڈیٹر روز نامہ 'سرفراز' کی طرف سے اعلان ہوا اور نصف آخر کے لیے نواب کربلائی حسین صاحب نے مجلس کی۔ میں نے سیّد شمس الحسن سلمہ تاجؔ کے لیے ایک حد تک صاف کیا بند ۲۷۴ میں حضرت ذاخرؔ میرے والدِ مرحوم کا تخلّص اور جاویدؔ و فاخرؔ و ماہرؔ مرثیہ گویان خاندانِ اجتہاد کا نام ہے۔ بند آخر میں نواب صاحب رام پور کے خانوادے کے اسماء مذکور ہیں۔

اولاد حسین شاعرؔ بقلمہ ۱۱/ اگست ۱۹۴۳ء

(ماخوذ از ماہنامہ شعاع عمل لکھنؤ دسمبر ۲۰۱۵ء)

مرثیہ تعداد بند(۱۰۳)

قطب شاہ سے ساحر تک

مصنف

شاعر اہلبیت مولوی سید قائم مہدی نقوی ساحرؔ اجتہادی، کراچی پاکستان

مرثیہ تعداد بند (۱۰۳)

قطب شاہ سے ساؔحر تک

شاعر اہلبیت مولوی سید قائم مہدی نقوی ساحؔر اجتہادی، کراچی پاکستان

(۱)

ذوقِ سخن تجلیٔ ایوانِ زندگی
شانہ کشِ عروسِ شبستانِ زندگی
زیبائشِ بہارِ خیابانِ زندگی
عطرِ حیات ، روح نفس ، جانِ زندگی
سارا شرف کلام کی شائستگی سے ہے
انسان کائنات میں افضل اسی سے ہے

(۲)

شیریں کلام ، لہجۂ عجز و نیاز میں
جیسے صدا بلال کی صحنِ حجاز میں
ناواقفانِ رمزِ سخن ، بزمِ ناز میں
ایسے ہیں جیسے ٹوٹے ہوئے تار ، ساز میں
گونگے ہیں ، خوف جہل سے لب کھولتے نہیں
منہ میں زبان رکھتے ہیں اور بولتے نہیں

(۳)

لطفِ حیات ، لذتِ شعر و سخن میں ہے
تاثیرِ ذکر ، فکر ہی کے بانکپن میں ہے
بوئے لباسِ حور اسی پیرہن میں ہے
رعنائیٔ خیال اسی انجمن میں ہے
اہلِ نظر کی بزم میں اُس کا گذر نہیں
جس کو یہاں سلیقۂ عرضِ ہنر نہیں

(۴)

عرفانِ کردگار ہے عنوانِ شاعری
خالق کی حمد ، مطلعِ دیوانِ شاعری
نعتِ رسولؐ ، منزلِ ایمانِ شاعری
پھر اس کے بعد مدحِ علیؑ ، جانِ شاعری
زہراؐ کی ہو ثنا کہ صفت ان کے لال کی
تطہیر ، نفس کی ہے طہارت ، خیال کی

(۵)

وہ حمد ہو کہ نعت ، وہ مدحت ہو یا ثنا
ہر ایک کا ہے اپنی جگہ اپنا مرتبا
لیکن یہ کہہ رہے ہیں تنوع ، اثر ، ادا
ہر ایک صنفِ شعر پہ حاوی ہے مرثیا
میدان اس کا اتنا وسیع و بسیط ہے
اصنافِ کل سخن پہ یہ تنہا محیط ہے

(۶)

اس میں غزل کا حسن ، قصیدے کی دل کشی
مدحت کی آن بان ، عقیدت کی چاشنی
حمدِ خدا کا لطف بھی ، نعتِ رسولؐ بھی
پھیلاؤ میں ہے نظم ، تسلسل میں مثنوی
غم بھی ہے ، بزم و رزم بھی ہے ، ہمہمہ بھی ہے
یہ داستانِ درد بھی ہے ، زمزمہ بھی ہے

(۷)

مومن کے حق میں رحمتِ باری ہے مرثیہ
گوشِ ستم پہ ضربت کاری ہے مرثیہ
دربارِ فن میں پنج ہزاری ہے مرثیہ
ملکِ سخن میں لاکھ پہ بھاری ہے مرثیہ
اک ضربِ عشق ہے دلِ بیدار کے لئے
اک سان ہے ضمیر کی تلوار کے لئے

(۸)

دریائے فکر و فن کی روانی ہے مرثیہ
تیغِ زبانِ شعر کا پانی ہے مرثیہ
لیلائے شاعری کی جوانی ہے مرثیہ
تاریخ نے کہی وہ کہانی ہے مرثیہ
ہے فردِ جرمِ فوجِ ضلالت شعار بھی
کردارِ اہلِ بیتؑ کا آئینہ دار بھی

(۹)

میت کا ذکرِ خیر ، لغت میں ہے مرثیا
لیکن یہ اصطلاح میں ہے ذکرِ کربلا
وہ کربلا جو سب سے بڑا حق کا معرکا
وہ معرکہ جو معرکۂ صدق و کذب تھا
حق پر نثار ہونے کا جس نے سبق دیا
عزت کے ساتھ جینے کا انساں کو حق دیا

(۱۰)

وہ شام کے اندھیرے سے نورِ خدا کی جنگ
اہلِ دغا و مکر سے اہلِ وفا کی جنگ
طاغوتیت کے اوج سے عرشِ عُلا کی جنگ
اسلام کی بقا کے لئے کربلا کی جنگ
وہ صرصرِ سموم سے پھولوں کی جنگ تھی
نیکی میں اور بدی میں اصولوں کی جنگ تھی

(۱۱)

اک سمت تھا یزیدِ بد اطوار و بد قماش
بے دین و بے اصول و بد اخلاق و بد معاش
اسلام دستِ ظلم سے جس کے تھا پاش پاش
کاندھے پہ رکھ کے عظمتِ انسانیت کی لاش
ٹھوکر کتابِ پاک پہ بھی مارتا ہوا
آیا تھا حق کے سامنے للکارتا ہوا

(۱۲)

اور دوسری طرف تھا محمدؐ کا نورِ عینؑ
قرآن و وحی و دین و شریعت کی زیب و زین
انسانیت کی آنکھوں کی ٹھنڈک ، جگر کا چین
ایثار و صبر و عشق و صداقت کا دل ، حسینؑ
حق کی بقا کا عزم مصمم کئے ہوئے
انسانیت کے اوج کا پرچم لئے ہوئے

(۱۳)

انسانیت کا دل ، جگرِ سرورؑ نجف
زہراؑ کی جان ، احمدؐ مختار کا خلف
کعبہ کا افتخار ، براہیمؑ کا شرف
آیا جو کارزارِ شہادت میں سر بکف
سب خاک میں غرورِ حکومت ملا دیا
مظلومیت کے نام کا سکہ چلا دیا

(۱۴)

تاریخ ساز وہ سرِ میدانِ کربلا
ظلم و ستم کے منھ پہ طمانچہ حسینؑ کا
آئینِ سرفرازیٔ انساں جو بن گیا
تشریحِ معتبر ہے اسی کی یہ مرثیا
فرقِ ملوکیت کے لئے ضربِ سنگ ہے
ہر ظلم کے خلاف یہ اعلانِ جنگ ہے

(۱۵)

اس جنگ کا نقیب ، قطب شاہِ حق پناہ
مولا کا وہ فقیر ، دکن کا وہ بادشاہ
اردو ادب میں اس نے نکالی نئی یہ راہ
کی ابتدائے مرثیہ گوئی بہ اشک و آہ
یہ گلشنِ سخن میں نئی داغ بیل تھی
ورنہ غزل ازل سے تماشہ تھی ، کھیل تھی

(۱۶)

لے کر اٹھے تھے جس کو قطب شاہِ ذی حشم
تاریخ آگے بڑھنے لگی لے کے وہ علم
اس کے تلے گدؔا و سکندرؔ ہوئے بہم
بڑھتا رہا وہ جانبِ منزل قدم قدم
مسکینؔ ، فن کی شمع فروزاں لئے ہوئے
چشم و نظر میں عترت و قرآں لئے ہوئے

(۱۷)

جذبے نے تجربات کی گودی میں پال کے
تیور جوان کر دیئے اس نونہال کے
ہیئت بدل کے ، اک نئے سانچے میں ڈھال کے
تنقید کے بھنور سے نکالا سنبھال کے
میرؔ اس کو زیبِ میری و درائی کر گئے
سوداؔ تو اک زمانے کو سودائی کر گئے

(۱۸)

اس صنف میں کمال فصاحت تو دیکھئے
لہجے کے بانکپن میں متانت تو دیکھئے
منظر کشی میں ذہن کی جودت تو دیکھئے
جذبات کے بیاں میں حقیقت تو دیکھئے
مضمونِ حرب و ضرب ہے اس آن بان کا
آہنگ ہے سخن میں کڑکتی کمان کا

(۱۹)

آغاز میں کلام کے شاعر بہ آب و تاب
چہرے سے مرثیے کے اٹھاتا ہے جب نقاب
چشمِ خیال دیکھتی ہے کچھ عجیب خواب
یہ ہے چمن ، وہ دشت، یہ دریا تو وہ سراب
تڑکا یہ نور کا وہ سیاہی ہے شام کی
وہ لشکرِ یزید تو یہ فوج امامؑ کی

(۲۰)

منظور ہو نمودِ سحر کا اگر بیاں
کھینچے کچھ ایسے حسن سے وہ صبح کا سماں
بانگِ صریرِ کلک بنے نعرۂ اذاں
انگڑائی لے کے جاگ اٹھے پیرِ آسماں
لیلائے شب نقاب سے منہ ڈھانکنے لگے
گھونگھٹ سے صبحِ نو کی دلھن جھانکنے لگے

(۲۱)

گرمی کا ہو بیاں تو لرز جائے ہر نظر
نقطوں پہ ہو گمان کہ اڑ کر گرے شرر
لفظیں ہوں سب سیاہ یہ سوزش کا ہو اثر
لکھے ''سفر'' تو دیکھنے والا پڑھے ''سقر''
حدّت سے کھول جائے سیاہی دوات کی
عشرے کو جیسے دھوپ سے موجیں فرات کی

(۲۲)

رنگِ وغا جو بزم میں یہ اہلِ فن جمائیں
کانوں میں گونجنے لگے تیروں کی سائیں سائیں
سن سن سے تیغِ فکر کی جی سب کے سنسنائیں
کمزور دل تو چیخ اٹھیں کہہ کے ''ہائیں ہائیں''
دستِ خیال بندِ نظر کھولنے لگے
گوشِ تصورات میں رن بولنے لگے

(۲۳)

چھڑ جائے ذکر غم تو فضائیں ہوں سوگوار
نکلے جو آہِ سرد ، ہوائیں ہوں بے قرار
نوحے کی جو بلند صدائیں ہوں بار بار
پامالیٔ چمن پہ گھٹائیں ہوں اشک بار
آنسو امڈ کے آئیں خیالات کی طرح
بارش ہو اشکِ درد کی برسات کی طرح

(۲۴)

قدرت یہ فکر و فن پہ ، قلم پر یہ اختیار
افضالِ پنجتن ہے بتائیدِ کردگار
اس رتبۂ بلند پہ ہے مرثیہ نگار
ملکِ سخن پہ اس کا مکمل ہے اقتدار
دنیائے شاعری پہ حکومت اسی کی ہے
دینِ سخنوری میں امامت اسی کی ہے

(۲۵)

دلگیرؔ سے ہوئی اس امامت کی ابتدا
پہلے بھی مرثیہ تھا مگر یہ مزہ نہ تھا
پھر فیض ہے فصیحؔ و خلیقؔ و ضمیرؔ کا
وہ جن سے مرثیے کو ملا دبدبہ نیا
بخشا صلہ انہیں یہ جنابِ امیرؑ نے
چمکا دیئے ہیں نام انیسؔ و دبیرؔ نے

(۲۶)

دونوں نے مرثیے کو عجب مرتبا دیا
جیسے گدا کو خلعتِ شاہی پنہا دیا
چیونٹی کو اوج دے کے سلیماں بنا دیا
ایک بوریا نشیں کو فلک پر بٹھا دیا
یہ نظم صنفِ شعر کی سرتاج ہوگئی
گویا براقِ فکر کو معراج ہوگئی

(۲۷)

ان کی روش پہ اور بھی اہلِ ہمم چلے
عشقؔ سخن میں انسؔ و تعشقؔ بہم چلے
مونسؔ بہت نفیسؔ روش دم بدم چلے
کاملؔ بھی تھے رشیدؔ بھی جو ذی حشم چلے
ایسا وحیدؔ عصر جو ہر راہبر ہوا
اوجِؔ سخن پہ فکر و نظر کا گذر ہوا

(۲۸)

پھولا پھلا جو اور یہ مولاؑ کا گلستاں
پہنچی صدائے مرثیہ گوئی کہاں کہاں
ہر قوم ، ہر قبیلے میں کیا کیا تھے خوش زباں
نانکؔ، ریاضؔ، شادؔ، قلقؔ، وحشیؔ و بیاںؔ
خوشبو شمیمؔ کی چمنستانِ فن میں تھی
برجیسؔ کی ضیا بھی اسی انجمن میں تھی

(۲۹)

فائقؔ تھا ہر چمن سے چمن زارِ لکھنؤ
تھا کیا رفیعؔ طرۂ دستارِ لکھنؤ
فائزؔ اس اوجِ فکر پہ سرکارِ لکھنؤ
اخترؔ کا فیض جلوۂ دربارِ لکھنؤ
مثلِ قطبؔ قدیمؔ روش پر سجا ہوا
ایسا عروجِؔ حسن کہ دولہا بنا ہوا

(۳۰)

کیسی بہار پر تھا گلستانِ لکھنؤ
اپنے پرائے سب تھے ثناخوانِ لکھنؤ
ثابتؔ کہ اک ستارۂ تابانِ لکھنؤ
وہ آرزوؔ کہ حاصلِ ارمانِ لکھنؤ
ایسے خبیرؔ بابِ خبر جن پہ باز تھا
ایسے ذکیؔ کہ جن پہ فراستؔ کو ناز تھا

(۳۱)

تہذیبِ مرثیہ سے مہذبؔ وہ باشعور
ہوکے مودبؔ آئے تھے اس بزم کے حضور
عارفؔ کے روئے فکر پہ تھا معرفت کا نور
آشفتہؔ و جلیلؔ کا شہرہ تھا دور دور
ہر ایک اپنے فن میں جو فردِ فریدؔ تھا
اس نظم کے بیاں میں اثرؔ بھی شدیدؔ تھا

(۳۲)

ہیں ان کے ماسوا بھی کئی سو وہ نیک نام
جن کو ملی ہے مرثیے سے عظمتِ دوام
کچھ فن کے مقتدی ہیں جو ان میں تو کچھ امام
کچھ نجمؔ ہیں فلک کے تو کچھ ہیں مہِ تمام
ہیں پاس کے بھی ، دور سے آئے بھی ہیں بہت
اپنے ہی سب نہیں ہیں ، پرائے بھی ہیں بہت

(۳۳)

اپنے ہوں یا پرائے ، سب اس بزم کے جلیسؔ
یا پیروِ دبیرؔ ہیں یا پیروِ انیسؔ
افکار ، پاک و صاف ، زباں سادہ و سلیسؔ
مضمون پرشکوہ ، سخن نادر و نفیسؔ
یوں ہے نگاہِ شوق میں ان کے سخن کا حسن
دولہا نے جیسے دیکھ لیا ہو دلہن کا حسن

(۳۴)

اک میرے جد ، وہ حضرت فاخرؔ سے ذی وقار
میرے لئے شرف تو بزرگوں کا افتخار
ماہر تھے فنِ شعر میں ماہرؔ کی یادگار
مداح ان کے لاکھ تو شاگرد بے شمار
چلتی تھی ان کی تیغِ قلم ہر زمین میں
جبریل فن کے ڈھونڈھتی تھی پر زمین میں

(۳۵)

میرے بزرگ اور بھی تھے شاد و بامراد
امیدؔگاہ علم و ہنر جن کا اجتہاد
خورشیدؔ سے عقیلؔ و فہیمؔ و ادب نہاد
ذاخرؔ ، حسینؔ ، شاعرؔ و جاویدؔ حق نژاد
میں نے مذاقِ شعر جو پایا ، انہیں کا ہے
ورثہ یہ ہاتھوں ہاتھ جو آیا ، انہیں کا ہے

(٣٦)

کچھ اور بھی یہاں تھے ثنا خوانِ با ہنر
اب گوشۂ مزار ہے تا حشر جن کا گھر
شوکتؔ ، ظریفؔ ، اطہرؔ و بنیادؔ مقتدرؔ
زیباؔ ، محبؔ ، ندیمؔ ، ثمرؔ ، نجمؔ اور قمرؔ
آغاؔ کہ خود سخن بھی ثنا و صفت کرے
منظورؔ اور وصیؔ کی خدا مغفرت کرے

(٣٧)

محبوبؔ اور فارغؔ و زائرؔ سے بے بدل
صابرؔ ، نسیمؔ ساکن معمورۂ اجل
اصغرؔ ، شہیدؔ ، حبؔ ، نظرؔ و حرؔ ہیں آج کل
جوہرؔ ہیں اور عظیمؔ سخندانِ باعمل
یہ سب بفیض آلِ محمدؐ وحیدؔ ہیں
حسبِ مذاق و فکر قدیمؔ و جدیدؔ ہیں

(٣٨)

رائقؔ ، جمیلؔ و فیضیؔ و شاداںؔ سے اہل فن
سردارؔ و اعظمیؔ و اثرؔ ، نیرؔ و حسنؔ
دانشؔ ، رئیسؔ ، صفدرؔ و حسانِ خوش سخن
قیصرؔ ، قسیمؔ ، امیدؔ ، رضیؔ ، سب کا یہ چلن
تابشؔ الگ الگ ہے مگر نور ایک ہے
اِس آسماں پہ جو بھی ستارہ ہے ، نیک ہے

(۳۹)

خاکیؔ و ہاشمیؔ و ہنرؔ بدرؔ اور ہلالؔ
فیضؔ و صباؔ و نوریؔ و کرارؔ خوش خیال
یاورؔ ، نفیسؔ ، شاہدؔ و منظرؔ شکر مقال
جوشؔ و رضاؔ و عزمؔ و ظفرؔ جیسے باکمال
مرشد مرے نسیمؔ حقیقت نگار ہیں
یہ گلشنِ ادب میں نسیمِ بہار ہیں

(۴۰)

صد شکر ، آج ان میں مرا بھی شمار ہے
ناچیز پر یہ رحمتِ پروردگار ہے
فکر جواں جو حسنِ سخن کا نکھار ہے
عزمِ ثنائے اکبرؑ عالی تبار ہے
اس میں مرا معین جو حق کا حبیب ہو
بزمِ سخن میں نور کا منبر نصیب ہو

مطلع ثانی (۴۱)

اکبرؑ ریاضِ حسنِ پیمبرؐ کے پھول ہیں
نخلِ شباب یہ ہیں ، وہ اصلِ اصول ہیں
یوسفؑ دعائے حسن ، یہ حسنِ قبول ہیں
صورت میں ، چال ڈھال میں ،بالکل رسولؐ ہیں
اس آئینے میں دیکھئے جلوہ رسولؐ کا
قامت کے رنگ روپ میں سایہ رسولؐ کا

(۴۲)

ان کو اگر بٹھائیں محمدؐ کے رو برو
بالکل حضور ہی کا سراپا ہے مو بمو
شہرہ یہی ہے سارے زمانے میں کو بکو
یہ ہم شبیہ، احمد مرسلؐ ہیں ہو بہو
باتوں میں معرفت کے گہر رولتی ہوئی
تصویر ہے رسولؐ کی منھ بولتی ہوئی

(۴۳)

منھ بولتی ہوئی ہے یہ تصویر بے گماں
گویا دہن میں ان کے محمدؐ کی ہے زباں
عاشور کی وہ صبح ، تقدس کا وہ سماں
صحرا میں گونجتی ہوئی پر کیف وہ اذاں
ایک موج بن کے اشہد ان لا الہٰ کی
آواز آ رہی تھی رسالت پناہ کی

(۴۴)

جب دے چکا اذان وہ بانو کا مہ لقا
بڑھ کر نمازیوں نے مصلّٰی بچھا دیا
مولاؑ نے کی امامتِ انصارِ باوفا
اتنے میں فوجِ شر سے چلے تیر بے خطا
کیا کیا خوشی نہ تھی سپہِ فتنہ ساز میں
کچھ ناصروں نے پائی شہادت نماز میں

(۴۵)

فارغ ہوئے نمازِ سحر سے جو تشنہ کام
روئے حسینؑ دیکھ کے ظلمِ سپاہِ شام
مڑ کر کہا ، دفاع کا جلدی ہو انتظام
پاکر امامِ وقت کی جانب سے اذنِ عام
انگڑائی لے کے ، جوشِ شجاعت میں جھوم کے
عباسؑ اٹھے حضور کے قدموں کو چوم کے

(۴۶)

جھپٹے جلال میں صفتِ شیرِ خشمگیں
تیوری پہ بل ، نگاہ میں غصہ ، جبیں پہ چیں
الٹی ہوئی وہ غیظ میں کہنی تک آستیں
حکم امامؑ ہو تو الٹ دیں ابھی زمیں
تیور بتا رہے ہیں جلالت پناہ کے
یہ ہیں ہزبر ، بیشۂ شیرِ الٰہ کے

(۴۷)

اکبرؑ یہ دیکھ کر ہوئے بے چین جو کمال
آئے حضورِ سرورؑ دیں صورتِ سوال
کی عرض ہاتھ جوڑ کے ، اے سیدہؑ کے لال
اب وقت آگیا ہے کہ آغاز ہو جدال
خادم یہ اوج پائے جو لطفِ امامؑ سے
ہو ابتدائے نصرتِ مولا غلام سے

(۴۸)

بیٹے نے باپ سے جو کہا دل کا مدعا
دھچکا لگا یہ شاہؑ کو ، جی سن سے ہوگیا
خود کو مگر سنبھال کے مظلوم نے کہا
ہمت کو آفریں ہے ، شجاعت کو مرحبا
ورثہ ہے یہ جلال شہؑ قلعہ گیر کا
پوتا ہے میرا شیر جنابِ امیرؑ کا

(۴۹)

لیکن یہ امر ہم کو قیامت سے کب ہے کم
پیری میں کس سے اٹھتا ہے کڑیل جواں کا غم
نانا کی یادگار ہو تم ، میرے ذی حشم
اہلِ حرم ہوں ، دوست ہوں ،انصار ہوں کہ ہم
نازاں ہیں اپنی خوبیٔ تقدیر دیکھ کر
جیتے ہیں سب رسولؐ کی تصویر دیکھ کر

(۵۰)

انصارؓ و اقرباؑ ہیں شجاع و وفا شعار
زیدؓ و حبیبؓ و عابسؓ و مسلمؓ سے باوقار
پھر سب سے بڑھ کے قاسمؑ و عباسِؑ نامدار
جانے نہ دے گا رن کو تمہیں کوئی جاں نثار
تصویرِ مصطفیٰؐ سے کنارا کرے گا کون
تم سے جواں کی موت گوارا کرے گا کون

(۵۱)

اکبرؑ یہ سن کے چپ ہوئے ، پھر ماں کے پاس آئے
سینے پہ ہاتھ ، آنکھوں میں اشکِ الم چھپائے
پہلے تو چپ کھڑے رہے کچھ دیر سر جھکائے
آیا خیالِ خاطرِ مادر تو مسکرائے
منظر جو مامتا کے نگاہوں میں پھر گئے
کچھ کہہ نہ پائے ، دوڑ کے قدموں پہ گر گئے

(۵۲)

گھبرا گئی یہ دیکھ کے وہ غم کی مبتلا
بے تاب ہو کے چیخ اٹھی ، ہیں! یہ کیا ، یہ کیا
اے میرے لال ، میرے قمر ، میرے مہ لقا
جلدی کہو کہ پھٹتا ہے سینہ میں دل مرا
باتوں سے یاس کی مری جاں ، میری جاں نہ لو
اس دورِ ابتلا میں مرا امتحاں نہ لو

(۵۳)

اکبرؑ نے ہاتھ جوڑ کے مادر سے یہ کہا
آلِ نبیؐ کے خون کی پیاسی ہے کربلا
هَل مِن مُبارِزٍ کی اب آنے کو ہے صدا
دل چاہتا ہے پہلے میں بابا پہ ہوں فدا
لیکن پدر سے جنگ کی رخصت نہیں ملی
امّاں! امامِ دیں سے اجازت نہیں ملی

(۵۴)

کیا ہو ، خدا نخواستہ جو شہؑ پہ آنچ آئے
کیا ہو ، زمینِ دشت جو اک تازہ گل کھلائے
کیا ہو ، جو مجھ سے پہلے کوئی دوست رن کو جائے
کیا ہو ، جو یہ خبر کوئی اس ڈھنگ سے سنائے
اکبرؑ سے بڑھ کے اور کوئی کیا عزیز تھا
دنیا کہے گی باپ کو بیٹا عزیز تھا

(۵۵)

یہ ماجرا سنا تو وہ گھبرا کے رہ گئی
صورت پسر کی قلب کو تڑپا کے رہ گئی
چہرے کا رنگ دیکھ کے تھرّا کے رہ گئی
آیا اندھیرا آنکھوں میں ، چکرا کے رہ گئی
سنبھلی تو اٹھ کے گردِ پسر گھومنے لگی
رخ کی بلائیں لے کے جبیں چومنے لگی

(۵۶)

سینہ سے پھر لگا کے کہا ، ماں نثار ہو
اتنا نہ اشک بار ، نہ یوں بے قرار ہو
رخصت تمہاری کیوں نہ شہؑ دیں پہ بار ہو
اے میری جاں! رسولؐ کی تم یادگار ہو
ڈھارس بہت ہے تم سے شہِؑ مشرقین کو
پیارے بہت ہو لال مرے تم حسینؑ کو

(۵۷)

اچھا ، چلو ، پھوپھی سے اجازت دلائیں ہم
رخصت ملے تو لال کو دولہا بنائیں ہم
جوڑا شہانہ ہاتھ سے اپنے پنہائیں ہم
تم روٹھ جاؤ ماں سے تو تم کو منائیں ہم
بیٹا ، پھوپھی کے حق سے مرا حق سوا نہیں
میں کیسے اذن دوں جب انہوں نے دیا نہیں

(۵۸)

اتنے میں آئیں زینبؑ ناشاد خود وہاں
دیکھا تو روئے بانوئے شہؑ تھا دھواں دھواں
اک درد ، ایک کرب سا چہرے سے تھا عیاں
گھبرا کے پوچھنے لگی اکبرؑ سے نیم جاں
کیا بات ہوگئی ؟ مرے بھائی کی خیر ہو
امّاں کی عمر بھر کی کمائی کی خیر ہو

(۵۹)

اکبرؑ سے کچھ کہا نہ گیا ، چپ کھڑے رہے
بانو یہ عرض کرنے لگیں ہاتھ جوڑ کے
آقا سے جنگ پر ہیں ستم گر تلے ہوئے
اذنِ جہاد چاہتے ہیں اب یہ آپ سے
اللہ شہؑ کے سر سے بلاؤں کو رد کرے
بیٹا جواں ہے ، کیوں نہ پدر کی مدد کرے

(۶۰)

زینبؑ تڑپ کے بولیں کہ اکبرؑ ، نہیں نہیں
اے میرے لال ، میرے گلِ تر ، نہیں نہیں
یہ عمر اور نرغۂ لشکر ، نہیں نہیں
پالا تھا تم کو اس لئے دلبر ، نہیں نہیں
اس ان گنے برس کا تصدق اتار دوں
تم پر میں اپنے عونؑ و محمدؑ کو وار دوں

(۶۱)

اکبرؑ یہ بات سنتے ہی مایوس ہوگئے
اور اس طرف حسینؑ کے جاں باز منچلے
ایک ایک کر کے طالبِ اذنِ وغا ہوئے
وہ جنگ کی کہ فوج کے چھکے چھڑا دیئے
وہ باگ روکنے سے جو حرؑ شرمسار تھا
دینے کو اپنی جان بہت بے قرار تھا

(۶۲)

پہلے اسی نے جان فدا کی حسینؑ پر
تھے اس کے ساتھ بھائی ، غلام اور اک پسر
پھر ان کے بعد شاہؑ کے انصار خوش سیر
پہنچے حضورِ شاہؑ میں ہاتھوں پہ لے کے سر
سب نے شہید ہو کے سعادت حصول کی
ہر نذرِ پرُخلوص خدا نے قبول کی

(۶۳)

انصار ذبح ہوگئے ، پیاروں نے جان دی
اک پھول پر چمن کی بہاروں نے جان دی
اک جانِ گلستاں پہ ہزاروں نے جان دی
خورشیدِ حق پہ چاند ستاروں نے جان دی
فرقت میں سب کی حال جو شہؑ کا تباہ تھا
مظلوم کی نظر میں زمانہ سیاہ تھا

(۶۴)

جب دوست کام آئے ، عزیزوں نے کی مدد
کی اقربا نے نصرت مولا میں جدّ و کد
لاکھوں سے ایک ایک لڑا یوں بہ شدّ و مد
فوجِ عدو کے کشتوں کی کوئی رہی نہ حد
گنتی میں پیدلوں نہ سواروں کی بات ہے
ہے سیکڑوں کا ذکر ، ہزاروں کی بات ہے

(۶۵)

لیکن وہ بے شمار ، یہ کم اور بہت ہی کم
اور پھر یہ خستہ حال و پریشاں ، وہ تازہ دم
پیاسے یہ تین دن کے ، وہ غرق مئے حشم
یہ بھوک سے نڈھال ، وہ سیراب و پرُ شکم
سر دے کے نام کر گئے سب مشرقین میں
بس اب جوان بیٹا ہے فوجِ حسینؑ میں

(۶۶)

اکبرؑ پھوپھی کے پاس پھر آئے پئے رضا
بانو نے بھی پسر کی سفارش کو یہ کہا
اکبرؑ سے پہلے عونؑ و محمد ہوئے فدا
اب تک انہیں فدا نہ کیا ، یہ مری خطا
طالب یہ اذن کے ہیں ، میں عفو قصور کی
یہ آپ کے غلام ، میں لونڈی حضور کی

(۶۷)

زینبؑ کلیجہ تھام کے چلائی ، بی بیو
جاتا ہے رن کو باپ کا شیدائی ، بی بیو
مرنے کی نوجواں نے قسم کھائی ، بی بیو
گھر میں دلھن نہ آئی ، اجل آئی ، بی بیو
رخصت ہے اب شبیہِ رسالت مآبؐ کی
لٹتی ہے حق کی راہ میں دولت شباب کی

(۶۸)

یہ سن کے اہلِ بیتؑ میں کہرام مچ گیا
وہ گریہ و بکا تھا کہ اک حشر تھا بپا
رخ کر کے سوئے نہر سکینہؑ نے دی صدا
بھیا چلے ہیں مرنے کو ، جلد آیئے چچا
روکا اگر نہ ان کو تو محشر اٹھاؤں گی
اب بھی اگر نہ آئے تو میں روٹھ جاؤں گی

(۶۹)

سن کر بہن کے بین شبیہ رسولؐ نے
اک سرد سرد آہ بھری دل کو تھام کے
گودی میں لے کے پیار کیا اتنے پیار سے
بچی بھی روئی ، خود علی اکبرؑ بھی رو دیئے
ساری فضا کو غم میں ڈبوتے ہوئے چلے
ننھے گلے کو چوم کے روتے ہوئے چلے

(۷۰)

چلنے لگے تو ماں نے کہا ضبط توڑ کے
جاتے ہو میرے لال مجھے بن میں چھوڑ کے
اکبرؑ نے ماں سے عرض یہ کی ہاتھ جوڑ کے
صغراؑ سے بھی تو آئے تھے ہم منھ کو موڑ کے
نرغہ ہے دشمنوں کا امامِؑ انام پر
ہم کو نثار کیجئے امت کے نام پر

(۷۱)

ماں نے کہا کہ جاؤ ، مبارک سدھارنا
بیٹا! کسی بھی حال میں ہمت نہ ہارنا
نیزہ لگے جو سینہ پہ ، اس کو سہارنا
بابا کو وقتِ بد میں نہ لیکن پکارنا
کڑیل جواں ہو تم تو ، وہ پیرانہ سال ہیں
لونڈی کے تم پسر ہو ، وہ زہراؑ کے لال ہیں

(۷۲)

اکبرؑ یہ کہتے پیشِ پدر آئے شاد شاد
بابا ، خدا کا شکر کہ بر آگئی مراد
سب سے ملی ، اب آپ بھی دیں رخصتِ جہاد
راضی رضائے حق پہ ہوئے شاہِؑ خوش نہاد
اکبرؑ جو اذن پا کے بہ عزمِ دگر چلے
شبیرؑ پیچھے پیچھے کمر تھام کر چلے

(۷۳)

اس شان سے تھا پشتِ فرس پر وہ مہ لقا
رف رف پہ جس طرح شبِ معراج ، مصطفاؐ
سر پر جو تھا عمامۂ سردارِ انبیاؐ
بالکل نبیؐ کی شان تھی ، بالکل وہی ادا
دھوکہ ہوا جو رن میں نبیؐ کے ورود کا
غل پڑ گیا زمین و زماں میں درود کا

(۷۴)

جیسا سوار ویسا ہی رہوار ، خوش خصال
سرعت کو اس کی پائے ، تخیل کی کیا مجال
اسپِ فلک نورد کی رفتار کی مثال
رف رف ، براق ، برق ، تجلی ، نظر ، خیال
اک جست میں زمیں سے خلا تک سفر کرے
اک ثانیے میں چاند کی منزل کو سر کرے

(۷۵)

صیحہ کرے تو شیر کا پتا بھی پھاڑ دے
فوجوں میں رم کرے تو صفوں کو اجاڑ دے
اس کو جو آپ ہٹ کے نہ رستہ پہاڑ دے
ٹاپوں سے مار مار کے صورت بگاڑ دے
فرطِ غضب میں اس کی جبیں پر جو بل پڑیں
دہشت سے پیلِ مست کی آنکھیں نکل پڑیں

(۷۶)

تلوار میان میں ہے کہ بجلی ہے ابر میں
شہرہ ہے اس کی کاٹ کا ترسا و گبر میں
رکھتی ہے اختیار پہ بھی خود کو جبر میں
اکبرؑ کی یہ کنیز بھی فضہؑ ہے صبر میں
واقف جو ہے جہاد کے آدابِ عام سے
بے اذن کیا مجال جو نکلے نیام سے

(۷۷)

پہنچا اس آن بان سے رن میں جو وہ جری
دہشت سے پڑگئی دل اعدا میں تھر تھری
ڈالی نگاہِ غیظ جو لشکر پہ سرسری
شاہی کے اقتدار کے بت بول اٹھے ہری
نظروں کو تھا گماں کہ خدا کا حبیبؐ ہے
نکلے نبیؐ لحد سے ، قیامت قریب ہے

(۷۸)

اک اک سے کہہ رہا تھا کہ تعظیم کو بڑھو
حضرت کی پیشوائی کو ، تکریم کو بڑھو
اٹھو ، ادائے فرض میں تقدیم کو بڑھو
آداب کو ، سلام کو ، تسلیم کو بڑھو
سر رکھ دو اب قدم پہ رسولؐ انام کے
موتی لٹاؤ بڑھ کے درود و سلام کے

(۷۹)

یہ سن کے فوج کیں سے پرے کے پرے بڑھے
سینوں میں آلِ پاک سے کینہ بھرے بڑھے
تیغ و تبر پہ دستِ نحوست دھرے بڑھے
جھجھکے ، چلے ، لرز گئے ، سہمے ، ڈرے ، بڑھے
پہچانی پاس آکے جو صورت دلیر کی
پھر تیغیں کھینچنے میں نہ ٹھٹھکے ، نہ دیر کی

(۸۰)

اکبرؑ بھی بہر جنگ فرس پر سنبھل گئے
اعدائے دیں جلال سے ان کے دہل گئے
تیور جو ان کے دیکھے تو چتون کے بل گئے
ضیغم کے آگے بزدلوں کے دم نکل گئے
نعرہ کیا کہ تن کے بڑھو گر دلیر ہو
آنکھیں ملاؤ ، سامنے آؤ جو شیر ہو

(۸۱)

ہم ہیں شجاع ، شہؑ کے علمدار کی طرح
بازو ملے ہیں جعفر طیارؑ کی طرح
باطل شکن ہیں حیدرؑ کرار کی طرح
تلوار توڑ دیتے ہیں زنّار کی طرح
ہم ہیں ہژبرِ شیرِ خدا ، دیکھ لو ہمیں
تصویرِ مصطفیؐ ہیں ، ذرا دیکھ لو ہمیں

(۸۲)

اڈی یہ سن کے فوجِ ستم گر جو بے حساب
اک قہر بن کے ٹوٹ پڑا جانِ بوتراب
نکلے جری سے جنگ کو جو خانماں خراب
ان پر خدا کی مار تھی ، اللہ کا عذاب
تھی بھاگنے کی راہ ، نہ موقع لڑائی کا
ہر سمت ایک شور مچا تھا دُہائی کا

(۸۳)

تلوار شیر کی تھی کہ قتّالِ دہر تھی
اس کو چھوؤ تو آگ تھی ، چکھو تو زہر تھی
دریائے خوں کی موج تھی ، طوفاں کی لہر تھی
بھونچال تھی ، بلا تھی ، قیامت تھی ، قہر تھی
کھنچ کر مقابلے پہ جو باطل کے تن گئی
چینِ جبینِ حیدرِؑ کرار بن گئی

(۸۴)

یہ تیغ اور کیا تھی جو قہر خدا نہ تھی
باطل سے اس کے دل میں مروت ذرا نہ تھی
سچ مچ ہلاک کرتی تھی ، عشوہ نما نہ تھی
ہم شانِ ذوالفقار تھی ، تیغِ ادا نہ تھی
جھونکے چلے جو دشت میں ایسی حسام کے
بجھنے لگے چراغ سویرے سے شام کے

(۸۵)

ہلچل یہ تھی کہ تیغ کہیں تھی ، سپر کہیں
رہرو کہیں تھے ، راہ کہیں ، راہبر کہیں
بھائی کہیں تھا ، باپ کہیں اور پسر کہیں
بھگدڑ مچی تھی ، پاؤں کہیں تھے ، نظر کہیں
پیدل تو کیا ، سوار گرے اضطراب میں
سر خاک پر تھے ، پاؤں معلق رکاب میں

(۸۶)

محشر سے ہم کنار تھا میدانِ کارزار
نقارہ و دہل کی گرج ، شورِ گیر و دار
چیخیں وہ زخمیوں کی ، وہ کڑکیت کی پکار
گھوڑوں کی جست و خیز سے اڑتا ہوا غبار
لاشے نظر کی آخری حد تک پڑے ہوئے
اکبرؑ کی تیغِ تیز کے جھنڈے گڑے ہوئے

(۸۷)

بکھرے پڑے تھے دشت وغا میں اِدھر اُدھر
ہتھیار ، چار آئینے ، زرہیں ، جھلم ، سپر
دل ، ہاتھ ، پاؤں ، سینہ ، جگر ، سب تتر بتر
گھوڑوں کی ٹھوکروں میں تھے خیرہ سروں کے سر
جھکتے نہ تھے جو کبر سے اک آن کے لئے
گیندیں بنے تھے موت کی چوگان کے لئے

(۸۸)

چھینٹوں سے تھا لہو کی رخِ آفتاب سرخ
ہوتا ہے جیسے عکسِ شفق سے سحاب سرخ
جسموں پہ زخم تھے کہ کھلے تھے گلاب سرخ
بہتی تھی ہر سبوئے شکم سے شراب سرخ
فوّارے چھوٹ رہے تھے ، فضا لالہ زار تھی
دشتِ خزاں میں جوش پہ فصلِ بہار تھی

(۸۹)

برپا ابھی تھا دشت میں وہ شورِ دار وگیر
چلتے تھے چار سمت سے گرز و سنان و تیر
ناگہہ بن نمیرِ ستم گار و بے ضمیر
لے کر سنانِ ظلم چلا گھات میں شریر
چلائے انبیا یہ کلیجے سنبھال کے
تصویرِ مصطفیؐ ہے ، ذرا دیکھ بھال کے

(۹۰)

تھا وہ تو بے ضمیر و ستم گار و پر دغل
نیزہ چلایا ایسے کہ تھرّا گئی اجل
سینے میں گڑ کے رہ گیا موذی سناں کا پھل
اکبرؑ گرے زمین پہ گھوڑے سے منھ کے بل
جو آرزو تھی دل میں ، لہو بن کے بہہ گئی
مادر کلیجہ تھام کے ڈیوڑھی پہ رہ گئی

(۹۱)

گرتے ہی شاہؑ کو یہ صدا دی پکار کر
صد شکر ، کامیاب ہوا آپ کا پسر
خادم کو اب نہیں ہے تمنا کوئی ، مگر
بس دل یہ چاہتا تھا کہ مرنے سے پیشتر
دیدارِ شاہِ دیںؑ کی سعادت حصول ہو
بابا، سلام آخری میرا قبول ہو

(۹۲)

شبیرؑ نے سنی جو یہ آوازِ دل فگار
دوڑے یہ کہہ کے جانبِ میدانِ کارزار
لو ، الوداع ، اے مرے نانا کی یادگار
ہم سمجھے ، اس سلام کا مطلب ہے آشکار
کیسی جھجک یہ آخری زحمت کے واسطے
حاضر ہے باپ آپ کی خدمت کے واسطے

(۹۳)

یہ کہہ کے شاہؑ اشک بہاتے ہوئے چلے
بیٹے کے غم میں خاک اڑاتے ہوئے چلے
اک اک قدم پہ ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلے
فوجوں کو سامنے سے ہٹاتے ہوئے چلے
کھویا تھا نورِ چشم تو کچھ سوجھتا نہ تھا
منزل کہاں ہے ، راہ کدھر ، کچھ پتا نہ تھا

(۹۴)

ہر گام پر صدا تھی کہ اکبرؑ ، کہاں ہو تم
آؤں میں کس طرف ، مرے دلبر ، کہاں ہو تم
جائے کدھر یہ بے کس و مضطر ، کہاں ہو تم
بولو تو ہم شبیہ پیمبرؐ ، کہاں ہو تم
جلدی ہمیں پکار کے مشکل کو رد کرو
بیٹا! غریب باپ کی کچھ تو مدد کرو

(۹۵)

آئی صدا کہ آتے ہیں کیوں شاہِؑ کربلا
الجھا ہوا ہے قلب میں نیزہ تو کیا ہوا
نکلے گا آپ ، اور جو تڑپیں گے ہم ذرا
زحمت نہ آپ کیجئے ہم آپ پر فدا
کیا کیجئے گا آ کے یہاں اتنی دور سے
میت ہماری اٹھ نہ سکے گی حضور سے

(۹۶)

سن کر صدا جو شہؑ کو پسر کا پتا ملا
مقتل میں ہم شبیہِ رسولؐ خدا ملا
اس حال میں حسینؑ کو وہ مہ لقا ملا
کڑیل جواں زمیں پہ تڑپتا ہوا ملا
گہرا سناں کا زخم تھا دل میں دلیر کے
نیزہ گڑا ہوا تھا کلیجے میں شیر کے

(۹۷)

رو کر کہا حسینؑ نے ، اکبرؓ، ہم آئے ہیں
اٹھو مرے شبیہِ پیمبرؐ ، ہم آئے ہیں
تم تک ہزار ٹھوکریں کھا کر ہم آئے ہیں
زینبؑ نے ہم کو بھیجا ہے دلبر ، ہم آئے ہیں
ماں کے پھوپھی کے پاس تمہیں لے کے جائیں گے
پیری میں اپنی قوتِ دل آزمائیں گے

(۹۸)

بیٹھے زمیں پہ ، گود میں بیٹے کا سر لیا
سینے سے پھر نکالنے کو نیزۂ جفا
کھینچی سناں ، سنبھال کے دل یا علیؑ کہا
کھنچ کر سناں کے ساتھ کلیجہ نکل پڑا
اک آہ کر کے باپ کی گودی میں مرگئے
مولا تڑپ کے رہ گئے ، اکبرؓ گذر گئے

(۹۹)

مظلوم نے شہیدوں کو آواز دی کہ آؤ
مسلمؑ ، حبیبؑ ، حرؑ مرے اکبرؑ کی لاش اٹھاؤ
قاسمؑ ، کہاں ہو ، عون و محمدؑ کو ساتھ لاؤ
عباسؑ ، آکے بھائی کی ہمت تو کچھ بڑھاؤ
مشکل کشائی کیجئے ، مشکل کشا علیؑ
ٹوٹی کمر پہ لاش اٹھاتا ہوں ، یا علیؑ

(۱۰۰)

زینبؑ یہ سن کے خیمے سے نکلیں برہنہ پا
مقتل کی سمت دوڑ پڑیں دے کے یہ صدا
بھیا ، میں آرہی ہوں ، توقف کریں ذرا
عباسؑ سا وہ بھائی نہیں ہے تو کیا ہوا
میں رن سے اپنے لال کو خیمے میں لاؤں گی
ساتھ آپ کے جوان کی میت اٹھاؤں گی

(۱۰۱)

دیکھا بہن کو رن میں جو بے مقنع و ردا
شبیرؑ نے لرز کے کہا ، کیا غضب کیا
زینبؑ ، یہ کیا ، ابھی تو ہے زندہ یہ بے نوا
ہم کو ابھی سے شام کا منظر دکھا دیا
خیمے میں جاؤ ، بنتِ پیمبرؐ کا واسطہ
زینبؑ ، تمہیں جوانیٔ اکبرؑ کا واسطہ

(۱۰۲)

پلٹی جو رن سے خیمے کو زہرؑا کی نورِ عین
لاشِ پسر اٹھا کے چلے شاہِؑ مشرقین
عباس ہیں نہ قاسمؑ و سعد و زہیرِ قین
فریاد از غریبی و بے یاریٔ حسینؑ
اٹھو ، چلیں کہ ہم ابھی زندہ ہیں ، دوستو
مولاؑ جواں کی لاش پہ تنہا ہیں ، دوستو

(۱۰۳)

ساحرؔ ! بس اب خموش کہ ہے جوش پر بکا
پہلا یہ مرثیہ مرے مولاؑ کی ہے عطا
دستِ طلب بڑھا کے سوئے شاہؑ کربلا
کیجئے زبانِ فاخرؔ مغفور میں دعا
مطلب یہی ہے آپ سے بس اس حقیر کا
یا شاہ دیں ! قبول ہو ہدیہ فقیر کا

(ماخوذ از کتاب مجموعہ مراثی ''احساس غم''، مصنفۂ ساحرؔ اجتہادی)

مرثیہ گوشعراء کا تعارف

متعلق مرثیہ ''قطب شاہ سے ساحرؔ تک''

جناب ہلال نقوی صاحب، کراچی

جن مرثیہ گوشعراء کا جناب ساحرؔ لکھنوی نے اپنے مرثیہ کے چہرہ میں اشارتاً یا صراحتاً ذکر کیا ہے۔ ان کا مختصر تعارف حروفِ تہجی کی ترتیب سے سطورِ ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔

اثرؔ: جعفر علی خان اثرؔ لکھنوی شاعر ونقاد کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء میں لکھنؤ میں ان کی ولادت ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں اثرؔ نے جدید طرز کا پچاس بندوں پر مشتمل ایک مرثیہ کہا جو اہمیت کا حامل ہے۔

اثر جلیلیؔ: اثر جلیلی ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے متعلق ہیں قدیم رنگ کا مرثیہ کہتے ہیں، ہر سال مرثیہ پڑھنے کے لئے کراچی تشریف لاتے ہیں اور ڈاکٹر یاور عباس کے یہاں مرثیہ پڑھتے ہیں۔ (افسوس اب دنیا سے رخصت ہو چکے۔ ساحرؔ)

اخترؔ: اودھ کے آخری تاجدار نواب واجد علی شاہ اخترؔ۔ ان کے چار ضخیم دیوان موجود ہیں جن میں مرثیے بھی ملتے ہیں، اس کے علاوہ مرثیوں کی تین جلدیں بھی ہیں۔ مرزا دبیرؔ کے شاگرد تھے۔ ان کا شعر ہے:

بچپن سے ان کے دام سخن میں اسیر ہوں
میں کم سنی سے عاشقِ نظم دبیرؔ ہوں

اصغرؔ: اصغر رضوی۔نسیمؔ امروہوی کے شاگرد ہیں، عزیز آباد بلاک ۸ فیڈرل بی ایریا میں مقیم ہیں۔ پانچ مرثیے کہے ہیں جواب تک قلمی ہیں۔(یہ اُس وقت کی بات ہے۔ساحرؔ)

اطہرؔ: سید علی اطہر جعفری ۱۹۰۷ء میں بمقام ڈیگ ریاست جون پور میں پیدا ہوئے۔نسیمؔ امروہوی کے شاگرد تھے۔ ۱۹ راگست ۱۹۶۵ء کو وفات پائی۔ ان کے مرثیوں کا مجموعہ ''گلدستۂ اطہر'' ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا ۱۹۷۷ء میں ''گلدستۂ اطہر پر ایک نظر'' (مصنف راقم الحروف ہلال نقوی) طبع ہوئی۔

امیدؔ: امید میر انیسؔ کے ہم عصر تھے۔ان کا نام سید محمد جعفر تھا، ۱۲۹۳ھ ان کا سنہ وفات ہے۔ امامباڑہ غفراں مآبؒ کے دالان میں ان کی قبر ہے۔ان کے بڑے صاحب زادے محمد کاظم جاویدؔ بھی مرثیہ گو تھے۔(ان کی شہرت ان کی عرفیت بندۂ کاظم جاویدؔ کے نام سے ہے۔ساحرؔ)

امیدؔ: امید فاضلی ڈبائی ضلع بلند شہر کے باشندہ ہیں۔بنیادی طور پر غزل کے مشاق شاعر ہیں۔ ۱۹۷۳ء یا ۱۹۷۴ء سے مرثیہ کہنا شروع کیا ہے۔کراچی کے ایک ادبی رسالہ ''الفاظ'' سے وابستہ ہیں۔

انسؔ: ایک انسؔ وہ تھے جو عشقؔ و تعشقؔ کے والد تھے، ان کا پورا نام سید میرزا انسؔ لکھنوی تھا (متوفی ۱۸۸۷ء)۔لیکن اس مرثیہ میں جن انس کا ذکر ہے، وہ انیسؔ کے بھائی میر وحید کے والد میر مہر علی انسؔ ہیں ان کا سنہ وفات ۱۸۹۰ء ہے۔

انیسؔ: میر ببر علی انیسؔ وہ شاعر ہیں جن کا اثر انیسویں اور بیسویں صدی کے شعراء پر گہرا ہوا۔جس شاعر پر سیکڑوں مقالے اور اتنی ہی کتابیں لکھ دی گئی ہوں، اس کا تعارف کیا کرایا جائے۔سنہ وفات ۱۸۷۴ء ہے، سنہ ولادت پر البتہ تحقیق جاری ہے۔ضمیر اختر نقوی نے ''ماہِ نو'' انیسؔ نمبر ۱۹۷۲ء میں صفحہ ۳۵ پر ۱۸۰۱ء لکھا ہے۔اس سنہ کو کئی محققین نے تسلیم کیا ہے۔

اوجؔ: مرزا محمد جعفر اوجؔ ، مرزا دبیرؔ کے صاحب زادہ اور میر انشاء اللہ انشاؔء کے نواسے تھے۔ ۱۵رفروری ۱۸۵۳ءکولکھنؤ میں پیدا ہوئے ، ۱۸راپریل ۱۹۱۷ءکوانتقال ہوا۔ ''معراج الکلام'' مرثیوں کی جلد شائع ہوچکی ہے۔

آرزوؔ: سید آلِ رضا کے استاد علامہ انورحسین آرزوؔ کے پانچ مرثیے ''خمسۂ متحیرہ'' چھپ چکے ہیں ۔ پاکستان میں انہوں نے مرثیہ کی دوا ہم مجلسیں پڑھیں ، ایک زیڈ۔اے بخاری کے مکان پراورایک خیر پور میں جونسیمؔ امروہوی کی منعقدہ مجلس تھی ۔۱۹۵۱ء میں کراچی میں انتقال ہوا،علی باغ میں دفن ہیں۔

آشفتہؔ: حکیم آشفتہؔ کا تعلق خاندانِ اجتہاد سے تھا۔انہوں نے مرثیہ میں نفسیاتی پہلوؤں کوابھارنے پرزیادہ توجہ دی۔

اعظمیؔ: مشہورصحافی حسین اعظمی آج کل روزنامہ ''اعلان'' سے منسلک ہیں تین مرثیے ''حرفِ حق''، ''مشعلِ حق'' اور ''کشورِقلم'' طبع ہو چکے ہیں۔ان کا سنہ ولادت ۱۹۲۴ء ہے۔ (افسوس کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ساحرؔ)

آغاؔ: آغا سکندر مہدی رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔''مرثیہ معلیٰ'' کے نام سے تین جلدیں چھپ چکی ہیں۔''جامعۂ امامیہ'' میں ہر سال مرثیہ پڑھنے کراچی تشریف لاتے تھے ۔۱۲راپریل ۱۹۷۶ءکو بہاول پور میں انتقال ہوا۔

بدرؔ: بدرالٰہ آبادی ۱۹۰۹ء میں الٰہ آباد میں پیدا ہوئے ، ۱۹۷۶ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔نسیمؔ امروہوی کے شاگرد تھے۔۱۹۷۷ء میں ان کے مرثیوں کی ایک جلد ''بدرکامل'' چھپ چکی ہیں۔

برجیسؔ: عصرحاضر کی نامور مرثیہ گوشاعرنسیمؔ امروہوی کے والداور شمیمؔ امروہوی کے صاحب زادہ اور شاگرد بھی ہیں۔کم وبیش چودہ مرثیہ کہے ہیں۔خواندگی میں بے مثل تھے۔سنہ

وفات ۱۹۱۰ء۔

بنیاد: بنیاد تیموری ۱۳۰۱ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ پڑھت کلاسیکل اور مقبول تھی۔ ۱۹۷۱ء میں کراچی میں وفات پائی۔

بیاں: سید محمد مرتضیٰ ابن سید گوہر علی رضوی، اردو میں ''بیاںؔ'' تخلص کرتے تھے اور فارسی میں یزدانی۔ قصبہ جارچہ ضلع بلند شہر سے تعلق تھا۔ تین مرثیوں کی جلد ''رنگ شہادت'' ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر صفدر نے شائع کی۔

تعشق: سید میرزا نام اور تعشقؔ تخلص۔ میرزا انسؔ کے صاحب زادہ تھے۔ ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا۔ مرثیہ میں تغزل کا رنگ و آہنگ ان کی خاص ایجاد ہے۔ یہ انیسؔ کے ہم عصر تھے۔

اگرچہ اور تعشقؔ ہیں کہنے کو ہم عصر
مگر انیسؔ سا کوئی نہ خوش بیاں دیکھا

ثابت: سید افضل حسین ثابتؔ لکھنوی ۱۸۶۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ''حیات دبیرؔ'' اور ''دربارِ حسین'' ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ مرزا اوج کے شاگرد تھے۔ ۱۹۴۱ء میں انتقال ہوا۔ ان کے مراثی کی ایک جلد ''صبرِ جمیل المعروف بہ برقِ غم'' ۱۹۲۴ء میں طبع ہو چکی ہے۔

ثمر: بادشاہ مرزا ثمرؔ ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ تقریباً ۳۰ مرثیے کہے جو قدیم رنگ پر ہیں۔ کراچی میں ۱۹۷۰ء میں انتقال ہوا۔

جاوید: سید محمد کاظم ان کا نام تھا۔ یہ اوجؔ کے ہم عصر تھے۔ ان کے والد مولانا سید محمد جعفر امید انیسؔ و دبیر کے دور کے شاعر تھے۔ ان کا تعلق خاندان اجتہاد لکھنؤ سے تھا۔

جدید: جدیدؔ لکھنوی شدیدؔ لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ ان دنوں لکھنؤ میں قیام پذیر ہیں۔ جدید انداز کے مرثیے کہتے ہیں۔ (افسوس کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ساحرؔ)

جلیس: میر انیسؔ کے پوتے اور میر سلیسؔ کے صاحب زادہ جلیسؔ بھی مرثیہ گو شاعر

تھے۔ ۱۹۱۰ء میں عالم شباب میں انتقال ہوا۔

جلیلؔ: ایک جلیل لکھنوی تھے اور ایک جلیل مانک پوری۔ جلیل مانک پوری امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ جلیل لکھنوی کا انتقال لکھنؤ میں اور جلیل مانک پوری کا انتقال حیدرآباد دکن میں ہوا۔ دونوں مرثیہ کے شاعر تھے۔ جلیل لکھنوی کا تعلق خاندان انیسؔ سے تھا۔

جمیلؔ: علامہ جمیل مظہری یکم جنوری ۱۹۰۵ء (یا ستمبر ۱۹۰۴ء) کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ''عرفان جمیل'' چھ مرثیوں کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر صفدر حسین کے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۶۹ء میں لاہور میں شائع ہوا۔ جمیل مظہری نے ۱۹۳۰ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ انہیں جدید مرثیہ کی اہم کڑی سمجھنا چاہیئے۔

جوشؔ: شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ اپنی منفرد اسلوب کی نظموں کے باعث شاعر انقلاب کے نام سے شہرت پائی۔ ۱۹۱۸ء میں پہلا مرثیہ کہا لیکن ۱۹۴۰ء کے مرثیہ ''حسینؑ اور انقلاب'' کی اشاعت سے ممتاز مرثیہ گو شاعروں میں شمار کئے گئے۔ اب پاکستان میں مقیم ہیں۔ تقریباً ۹ مرثیے کہے ہیں آج کل حکومت کی وزارتِ تعلیم سے وابستہ ہیں (افسوس کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ساحرؔ)

جوہرؔ: جوہر نظامی (لاڑکانے والے) یہ پہلے حنفی المذہب تھے، اب اثناءعشری ہیں۔ مرثیہ کہتے ہیں۔

حبؔ: مہاراج کمار امیر حیدر خان آف محمودآباد کے بھائی، شیعہ پولٹیکل کانفرنس لکھنؤ کے صدر، مرثیہ کہتے ہیں اور حب تخلص کرتے ہیں۔

حرؔ: امیر امام حرؔ، راجہ صاحب محمودآباد کے داماد بھی ہیں اور بھانجے بھی۔ امداد امام اثرؔ ان کے دادا تھے۔ حرؔ ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے پانچ مرثیے کہے ہیں۔ ''سلسلۂ فکر وعمل'' کے عنوان سے ایک طویل مسدس (رزمیہ نظم) لکھ رہے ہیں جس کے تقریباً

دو ہزار اشعار رسالہ ''ارشاد'' کراچی میں اب تک چھپ چکے ہیں۔ بیشتر زبانوں کے ادب کا گہرا مطالعہ کئے ہوئے ہیں۔

حسانؔ: حسان جونپوری ذوالقدر بہادر، شاگردِ میر انیسؔ کے پوتے ہیں۔ جون پور (بھارت) میں رہتے ہیں۔ ایک سال پہلے کراچی میں تشریف لائے تھے اور مرثیہ کی کئی مجالس پڑھ گئے ان کی پڑھت قابل توجہ ہے۔ (اُس وقت کی بات ہے، اب نہیں ہیں۔ ساحر)

حسنؔ: ضیاء الحسن موسوی، جناب ناصر الملت کے نواسے ہیں۔ عربی علوم کے باکمال شاعر ہیں ۱۹۲۴ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں پہلا مرثیہ ''خطبۂ شقشقیہ'' کہا۔ ان کے بارے میں وحید الحسن ہاشمی کی رائے ہے تمام جدید مرثیہ نگاروں میں نسیمؔ امروہوی کے بعد بین نظم کرنے میں خاص ملکہ رکھتے ہیں ''عظمتِ انسان، ص ۲۸۳''۔ (افسوس کہ اب رخصت ہو چکے ہیں۔ ساحرؔ)

حسینؔ: چھنگا صاحب حسین خاندان اجتہاد کے ایک فرد تھے۔ فدا علی خنجرؔ نے اپنے ایک مقالہ میں لکھنؤ کے ان پڑھ شعراء میں ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ مرثیہ کے پہلے شاعر ہیں جو پیدائشی نابینا تھے۔ ان کی ایک صاحب زادی نارتھ کراچی میں مقیم ہیں۔ (یہ تحقیق بالکل غلط ہے۔ وہ میرے بزرگ تھے۔ میں جانتا ہوں کہ پیدائشی نابینا ہونا تو در کنار، زندگی کی آخری سانس تک ان کی بصارت متاثر نہیں ہوئی تھی۔ ساحرؔ)

خاکیؔ: ڈاکٹر مسعود رضا خاکیؔ ۱۹۲۶ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ''سرشار کی ناول نگاری'' پر ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۲ء کی درمیانی مدت میں پنجاب یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ سیمابؔ اکبر آبادی ان کے استاد تھے۔ دو مرثیے چھپ چکے ہیں۔

خبیرؔ: مرزا اوج کے شاگردوں میں خبیرؔ لکھنوی نے بڑی شہرت پائی۔ ۳۰/ اکتوبر ۱۸۹۷ء کو ولادت ہوئی، ۷/ جون ۱۹۶۵ء میں انتقال ہوا۔ ''بدرِ کامل'' ان کا بہت بڑا کارنامہ

ہے۔ یہ مجموعۂ مراثی دوجلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔اس میں چودہ معصومینؑ کے حال میں ۱۴ مرثیے ہیں۔

خلیقؔ: میر مستحسن خلیقؔ خودبھی نامورشاعراورنامورشاعر میرانیسؔ کےوالداورمیرحسن کے بیٹے۔نائب حسن نقوی نےنئی دہلی کے رسالہ ''آج کل'' کےانیسؔ نمبر(۱۹۷۵ء)میں صفحہ ۵۷ پران کےمرثیوں کی ۳۲۲ تعدادکاذکرکیاہے۔سنہ ولادت ۱۱۸۱ھ ہے۔

خورشیدؔ: نام سیداصطفیٰ حسین،عرفیت مولوی لڈن صاحب اورتخلص خورشیدؔ۔سیدمحمد جعفرامید کے بھانجے اورمولوی دلدارعلی صاحب مجتہدالعصر کےنواسے۔۱۹۰۱ء میں انتقال ہوا۔(اس تحقیق میں یہ غلطیاں ہیں:(۱)نام سیدمحمد اصطفیٰ تھا نہ کہ اصطفیٰ حسین (۲)عرفیت لڈن صاحب تھی نہ کہ مولوی لڈن (۳)حضرت امید کے بھانجے نہیں تھے، سگے چچازاد بھائی اورشاگرد تھے(۴)مولانا سیددلدارعلی صاحب (حضرت غفران مآبؒ) کےکےنواسے نہیں تھے، پرپوتے تھےاورحضرت سلطان العلماءؒ کے پوتے تھے۔ساحرؔ)

دانشؔ: صفی حیدردانش راولپنڈی میں ہرسال مرثیہ پڑھتے ہیں،تقریباً۵مرثیے کہے ہیں۔

دبیرؔ: مرزاسلامت علی دبیر ۲۹؍اگست ۱۸۰۳ءکودہلی کے بلی ماران میں پیداہوئے ضمیرؔ کے نامورشاگرد، انیسؔ کے ہم عصراور مدمقابل تھے۔کثرت سے مرثیے کہے ہیں۔ ۱۸۸۵ءمیں انتقال ہوا۔

دلگیرؔ: فصیحؔ،خلیقؔ اورضمیرؔ کے ہم عصرچھنولال دلگیرؔ کے مرثیوں کی سات ضخیم جلدیں مطبع نول کشورسے چھپ چکی ہیں۔ڈاکٹرابواللیث صدیقی نے''لکھنؤ کادبستان شاعری''میں ان کےشعروں کی تعدادچورانوّے ہزار پانچ سو بتائی ہے۔دلگیرکاسنہ ولادت تقریباً ۱۷۸۳ء ہے۔

ذاخرؔ: سید فرزند حسین ذاخرؔ، میر وارث حسین کے صاحب زادہ تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ تعلق خاندان اجتہاد سے تھا۔ مرثیہ نگاری کے علاوہ نوحہ گوئی کو اس منزل کمال پر پہنچایا کہ ''دعبلِ ہند'' مشہور ہوئے۔

رائقؔ: کیکا بھائی صالح بھائی بوہرہ اجین کے رہنے والے اور وہاں بواہر کی گلشن نجمی انجمن کے منتظم ہیں۔ مرثیہ خواں بھی ہیں اور مرثیہ گو بھی، عمر تقریباً ۷۰ سال ہے۔

رشیدؔ: سید مصطفیٰ مرزا عرف پیارے صاحبِ رشیدؔ، انیسؔ کے نواسے اور عشقؔ اور تعشقؔ کے بھتیجے تھے۔ مرثیہ میں ''ساقی نامے'' انہوں نے بہت کثرت سے نظم کئے ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں انتقال ہوا۔

رضاؔ: سید آل رضا جون ۱۸۹۵ء میں نیوتنی ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے۔ ۱۹۳۹ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ ۲۰ مرثیے کہہ چکے ہیں (دیکھئے ''جدید مرثیہ کے تین معمار'')۔ بقولِ فاضل لکھنوی ''جدید مرثیہ'' کے نقیبوں میں شامل ہیں (دیکھئے ''نفس مطمئن'')۔

رضیؔ: ۱۹۱۷ء میں کھیر تل میں پیدا ہوئے۔ دو مرثیے کہہ چکے ہیں۔ یہ دونوں مرثیے نسیمؔ امروہوی کے اصلاح کردہ ہیں۔ ان کی پڑھت میں دبیریت کے تیور نمایاں ہیں۔

رفیعؔ: مرزا اوجؔ لکھنوی کے صاحب زادہ اور مرزا دبیرؔ کے پوتے مرزا محمد طاہر رفیعؔ ۲۴ رجنوری ۱۸۶۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۸ء میں انتقال ہوا۔ دربارِ رام پور سے مرثیہ گو کے طور پر وابستہ تھے۔

رئیسؔ: رئیسؔ امروہوی دنیائے صحافت و ادب کی مشہور شخصیت ہیں۔ ان کا ایک مرثیہ ''حسینؑ اور حسینیت'' شائع ہو چکا ہے۔ یہ اردو میں سب سے پہلا مختصر مرثیہ ہے جو منظر عام پر آیا اور بعد میں اس نمونے کے مختصر مرثیے کا رواج ہوا۔ آپ کسی کے شاگرد نہیں مگر تین سو کے

قریب آپ کے شاگرد ہیں۔(''گلزارِخاص''ص ۷۱:خلش پیراصحابی)۔

ریاضؔ: میر ریاض الدین ریاض بارہہ کے باکمال شاعروں میں شمار کیئے جاتے ہیں۔میر انیسؔ کے شاگرد تھے،فن تحت خوانی میں بھی بے مثل تھے۔

زائرؔ: سید محمد اطہر زائرؔسیتا پوری ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے،انتقال ۱۹۶۶ء میں ہوا، انھوں نے جدید طرز کے مرثیے کہہ کر مرثیہ کے ارتقائی سفر میں نمایاں حصہ لیا ہے ان کے بھائی نادمؔ سیتاپوری نے مجھے زائرؔ کے مرثیوں کی تعداد ۱۸ بتائی ہے۔

زکیؔ: منے آغا صاحب زکیؔ میر انیسؔ کی نواسی کے بیٹے، پیارے صاحب رشیدؔ کے شاگرد اور داماد، تقسیم کے بعد لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

زیباؔ: نجمؔ آفندی کے شاگردوں میں زیبا ردولوی اہمیت کے حامل ہیں۔انکے صاحب زادہ کے پاس انکے چھ قلمی مرثیہ موجود ہیں۔ان کا سنہ ولادت ۱۹۰۷ء ہے۔انتقال جولائی ۱۹۶۸ء میں کراچی میں ہوا۔

سردارؔ: مشہور ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری مشہور شاعر ونقاد ہیں ہندوستان کی فلمی دنیا سے وابستہ ہیں۔انھوں نے مرثیے بھی کہے ہیں۔انھوں نے اپنی تصانیف ''لکھنؤ کی پانچ راتیں'' میں یہ اظہار کیا ہے کہ انھوں نے انیسؔ کے زیر اثر مرثیے کہے۔(افسوس کہ اب نہیں ہیں۔ساحرؔ)

سردارؔ: سردار نقوی کا تعلق امروہہ سے ہے۔فرزدقِ ہند حضرتِ شمیم امروہوی کی نواسی کے بیٹے ہیں۔تقریباً دس بارہ مرثیے کہہ چکے ہیں۔جیالوجی کے ایم۔اے ہیں اور ایک مقامی کالج میں لکچرار ہیں۔بورڈ آف انٹرمیڈیٹ کراچی کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔

سکندرؔ: ''تذکرۂ میرحسن''، ''تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا'' اور ''تذکرۂ ہندی'' وغیرہ میں سکندر کا ذکر ملتا ہے۔خلیفہ محمد علی سکندر کا تعلق پنجاب سے تھا۔ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے

تعارف مرثیہ میں صفحہ ۱۸ پر اسے مسدس کی ہیئت میں مرثیہ کہنے والا شاعر قرار دیا ہے۔اس کا سنہ وفات ۱۸۰۰ء ہے اس کا ایک بہت مشہور مرثیہ آج بھی شہرت رکھتا ہے۔

ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسولؐ

سلیسؔ: میر سلیسؔ میر انیسؔ کے صاحب زادے ہیں، عمر میں نفیس سے چھوٹے تھے۔ان کے تین صاحب زادے میر جلیسؔ، میر قدیم اور نواب محمد غیور شاعر تھے۔

سوداؔ: مرزا محمد رفیع سوداؔ کا دور ۱۷۱۲ء سے ۱۷۸۱ء تک ہے۔ رام بابو سکسینہ نے انہیں مسدس کی شکل میں مرثیہ کہنے والا پہلا شاعر لکھا ہے (تاریخ ادبِ اردو، ص ۳۱۲)۔مرثیہ کو اہم صنفِ سخن کا درجہ دے کر اس کا وقار قائم کرنے میں سودا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

شادؔ: شاد عظیم آبادی کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا۔شادؔ نہ صرف مرثیہ گو بلکہ غزل کے بھی بہترین شاعر تھے۔تنقیدی ذہن کے مالک تھے۔مرثیہ گو شعراء کے حالات اور کلام پر انہوں نے قابل قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔

شاداںؔ: شاداں کا تعلق دہلی سے ہے۔چھ یا سات مرثیے کہہ چکے ہیں۔کراچی میں مقیم ہیں اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں ملازم ہیں۔

شاعرؔ: مولانا سید اولاد حسین شاعرؔ لکھنوی حضرت ذاخرؔ لکھنوی کے صاحب زادہ تھے، خطیب اعظم شمس العلماء سید سبط حسن کے بھتیجے، نہایت بلند پایہ مرثیہ گو، ہمہ رنگ شاعر، اعلیٰ مرتبہ کے نثر نگار، بے مثل خطیب، مؤرخ اور صحافی تھے۔

شاہدؔ: شاہد نقوی ۱۹۱۷ء میں شکار پور ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ہر سال رضویہ امام بارگاہ میں مرثیہ پڑھتے ہیں۔ان کے ۸ مرثیوں کی جلد ''نفس مطمئن'' ۱۹۷۶ء میں شائع ہو چکی ہے۔

شدیدؔ: پیارے صاحب رشیدؔ کے نواسے سجاد حسین شدیدؔ لکھنوی لکھنؤ میں قیام پذیر

ہیں۔ یہ میر انیس کے شاگرد خلد لکھنوی کے بیٹے ہیں۔ ''ریاضِ شدید'' کے نام سے تین جلدیں چھپ چکی ہیں۔ ۱۹۵۴ء یا ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر یاور عباس کے مکان پر ایک مجلس پڑھ چکے ہیں اور ایک محفل شاہِ خراسان کراچی میں۔

شمیمؔ: ''خمخانۂ جاوید'' میں لالہ سری رام نے شمیم امروہوی کا سنہ پیدائش ۱۸۴۹ء لکھا ہے لیکن شمیم امروہوی کے پوتے نسیمؔ امروہوی نے مجھے ۱۸۳۹ء بتایا ہے۔ ان کا فرمان ہے کہ لالہ سری رام کی تحقیق غلط ہے۔ انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ ''ریاضِ شمیم'' ۱۷ مرثیوں کی جلد ہے جو اب نایاب ہے۔ شمیم اوجؔ کے ہم عصر تھے۔ ان کے صاحب زادہ اور نسیمؔ امروہوی کے والد برجیس بھی مرثیہ گو تھے۔

شوکتؔ: شوکت تھانوی کا نام محمد عمر تھا، بندرابن ضلع متھرا میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے ۔صرف ایک مرثیہ ''شہادتِ عظمیٰ'' لکھا جو ڈاکٹر یاور حسین کے مکان پر ایک مجلس میں پیش کیا گیا۔

شہیدؔ: شہید لکھنوی کا انتقال نومبر ۱۹۷۷ء میں ہوا۔ شدید لکھنوی کے شاگرد تھے ابتدائی مرثیوں پر نسیم امروہوی سے اصلاح لی تھی۔

شہیدؔ صفی پوری: مرثیہ گو شاعر ہیں۔ شیعہ کالج لکھنؤ میں پروفیسر ہیں۔ نقاد و ادیب کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔

صابرؔ: صابر تھاریانی ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۲ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ بمبئی میں کئی گجراتی اور اخبارات کے ایڈیٹر تھے۔ گجراتی کے مستند شاعر تھے۔ جوش نے گجراتی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ نسیم امروہوی کے صاحب دیوان شاگرد تھے۔

صباؔ: صبا اکبرآبادی ۱۴ راگست ۱۹۰۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام خواجہ محمد امیر ہے۔ کئی مرثیے کہہ چکے ہیں۔ (افسوس کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ساحر)

صفدرؔ: ڈاکٹر سید صفدر حسین کاظمی ۱۲ رمئی ۱۹۱۹ء کو سادات بارہہ کے قصبہ تسہ ضلع مظفر

نگر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کیا۔ان کے مرثیے جو الگ الگ چھپتے رہے ہیں، اب ۱۹۷۶ء میں مجموعہ کی شکل میں ''لب فرات'' میں شائع ہوئے ہیں۔اردو ادب خصوصاً اردو مرثیہ پر ہمہ وقت تحقیق کرنے والوں میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔کئی کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ان کی پڑھت کا انداز مشہور ہے۔آج کل ڈائرکٹر توسیع تعلیم و تخصیص تعلیم پنجاب کے طور پر کام کر رہے ہیں، لاہور میں مقیم ہیں۔(افسوس کہ اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے۔ساحرؔ)

ضمیرؔ: واجد علی شاہ کے عہد سلطنت میں میر ضمیرؔ کا انتقال ۶؍نومبر ۱۸۵۵ء میں ہوا۔مرثیے کا اجزاء پہلی بار باقاعدہ طور پر مرثیے میں ایک تنظیم کے ساتھ پیش کرنے میں ضمیرؔ کا نام مرثیہ گویوں کی فہرست میں سب سے اوپر ہے۔

ظریفؔ: ریاست الور کے رہنے والے تھے۔جبل پور میں ملازم ہوئے چنانچہ جبل پوری مشہور ہوئے۔اصلاً مزاح گو شاعر تھے۔ایک یا دو مرثیے کہے ہیں۔۱۹۶۴ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

ظفرؔ: ظفر جون پوری ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے۔۶؍یا ۷؍مرثیے کہے ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ان دنوں جامعہ کراچی کے شعبۂ معارفِ اسلامیہ سے منسلک ہیں۔آلِ رضا کے شاگرد رہے ہیں۔(افسوس کہ اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ساحرؔ)

عارفؔ: عارفؔ میر نفیسؔ کے نواسے، والد کا نام سید محمد حیدر تھا۔جنگ آزادی کے دو برس بعد ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ان کے ایک صاحب زادہ سید یوسف حسین ناظم آباد کراچی میں مقیم ہیں۔موصوف نے ایک بار مجھ سے فرمایا تھا کہ ڈاکٹر صفدر حسین، عارفؔ کے مرثیے شائع کرنے والے ہیں۔عارفؔ کا انتقال ۱۹۱۶ء میں ہوا۔

عروجؔ: میر خورشید حسن عرف دولھا صاحب عروجؔ، میر انیسؔ کے پوتے اور نفیسؔ کے

صاحب زادہ تھے ۱۳؍مئی ۱۹۳۱ءکوانتقال ہوا۔ان کی پڑھت بڑی شہرت رکھتی تھی۔

عزمؔ: عزم جونپوری سید آل رضا کے شاگرد تھے۔ ۱۹۰۷ء میں جون پور میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۶ء میں پہلا مرثیہ کہا۔مراثی اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔

عشقؔ: سید محمد میرزا انسؔ کے صاحب زادہ اور تعشقؔ کے بھائی ۱۸۸۷ء میں انتقال ہوا ۔ دوجلدیں چھپ چکی ہیں ۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے عشق کا ذکر ''اصلاح زبان کی تحریک کے سربراہ'' کہہ کرکیا ہے (اردو مرثیہ کا ارتقاء،''ص ۴۱۶)۔

عظیمؔ: عظیم امروہوی ۹؍اپریل ۱۹۴۶ءکوامروہہ میں پیدا ہوئے اوراب وہیں محلہ مجاپوتہ میں رہتے ہیں ۔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں مرثیہ پر بھی توجہ دی۔ اب تک چار مرثیے کہہ چکے ہیں ۔امروہہ کے مشہور بزرگ عالم مولوی عبادت صاحب عظیمؔ کے استاد ہیں۔

عقیلؔ: نام مولانا سید صادق حسین ۔نفیسؔ اور فاخرؔ کے ہم عصر تھے۔خاندان اجتہاد سے تعلق تھا۔نوحے بھی کہتے تھے۔کئی مرثیے کہےلیکن کوئی مرثیہ شائع نہیں ہوا۔

فاخرؔ: نواب اصغر حسین فاخرؔ جناب مہدی حسین ماہرؔ کے شاگرد بھی تھے اور بھتیجے بھی۔ نفیسؔ کے ہم عصر تھےاور کثیر التلامذہ تھے۔ پانچ دیوان غزلوں کے شائع ہوئےلیکن مرثیے غیر مطبوعہ ہیں۔فاخرؔ صاحب کے استاد بھی تھے اور ماموں بھی۔تعلق خاندان اجتہاد سے تھا۔

فارغؔ: سید محمد افضل ابن سید طاہر علی فارغؔ تخلص۔ ۲۷ جنوری ۱۸۴۳ءکو پیدا ہوئے۔ سیتاپور سے تعلق تھا۔ڈاکٹر صفدر آہؔ کی ان سے متعلق ایک تصنیف ''فردوسِ ہند'' ہے۔فارغؔ سیتاپوری میر انیسؔ کے شاگرد تھے۔۱۹ صفر ۱۳۱۸ھ میں انتقال ہوا۔

فائزؔ: خورشید حسن نام،لڈن عرفیت، فائزؔ تخلص ۔ میر انیس کے سلسلہ نسب کے آخری چشم و چراغ اور دولھا صاحب عروجؔ کے بیٹے۔ گیارہ مرثیے غیر مطبوعہ ہیں ۔ جب تک زندہ

رہے۔ میر انیسؔ کی سالانہ ۲۵ رجب والی مجلس ناظم صاحب کے امام باڑہ (لکھنؤ) میں پڑھتے رہے۔

فائقؔ: سید ظفر حسن بابو صاحب فائقؔ عارفؔ کے صاحب زادے اور شاگرد بھی تھے۔ ۱۹۴۴ء میں انتقال ہوا۔ مزار انیسؔ کے پہلو میں دفن ہیں۔ ان کے صاحب زادہ اصغر حسین ناظم آباد کراچی میں مقیم ہیں (تھے۔ساحرؔ)۔ تقریباً گیارہ مرثیے کہے جو غیر مطبوعہ ہیں۔

فراستؔ: سید فراست حسین فراست زید پوری ۲۶ جون ۱۸۷۱ء کو زید پور ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ان کے مرثیوں کی تین جلدیں ''ماہِ کامل''، ''تصویرِ وفا'' اور ''ماہِ ناتمام'' چھپ چکی ہیں۔ ''ماہِ کامل'' (۱۹۲۱ء) میں دو ہزار بند ہیں جن میں پوری تاریخ اہلبیت نظم کی گئی ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں انتقال ہوا۔

فریدؔ: سلطان صاحب فریدؔ۔ میر انسؔ کے پوتے، اور وحیدؔ کے بھتیجے تھے۔ ان کے مرثیے غیر مطبوعہ ہیں۔

فصیحؔ: فصیح کا سنہ پیدائش مصحفیؔ نے ''ریاض الفصحا'' میں ۱۷۸۲ء لکھا ہے فصیحؔ کی زبان بہت منجھی ہوئی ہے۔ شادؔ عظیم آبادی نے ان کی چار جلدوں کا تذکرہ ''پیغمبرانِ سخن'' میں کیا ہے۔ فصیحؔ کے بھائی مرزا نجف علی بلیغؔ کے پرپوتے جناب نجمؔ آفندی اس عہد کے نامور شاعر تھے۔

فہیمؔ: سید ساجد حسین نام، فہیمؔ تخلص۔ جاویدؔ اور ذاخرؔ کے ہم عصر تھے۔ خاندان اجتہاد سے تعلق تھا۔ ریاضی جنتری میں ان کے مرثیوں کا ذکر ہے اور بعض مرثیوں کے مطلعے بھی درج ہیں۔

فیضؔ: فیض بھرت پوری، نسیمؔ امروہوی کے شاگرد ہیں۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۱۱ء کو بھرت پور میں پیدا ہوئے۔ ''مراثیٔ فیض'' طبع ہوچکی ہے۔ شہدائے ٹھیڑی سے متعلق ان کا ایک مرثیہ

''داستانِ ظلم'' ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا ہے جس میں نیا انداز اور نئی سمت ہے۔

فیضؔ: فیض احمد فیضؔ ۱۹۱۰ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے عربی میں ایم۔اے کیا۔ غزل اور نظم کے پانچ مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ان کا ایک مرثیہ ''اخبارِ جہاں'' میں شائع ہوا ہے اور ایک غیر مطبوعہ ہے۔

فیضیؔ: فیضی راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں چند مرثیے بھی کہے ہیں۔

قدیمؔ: نبیرگان میر انیسؔ میں خاص شہرت کے مالک تھے۔ بہت زود گو اور خوش فکر شاعر تھے۔ مزاج میں انکساری، سادگی اور متانت تھی۔ توکل کی زندگی بسر کرتے تھے۔ دولھا صاحب عروجؔ کے ہم عصر تھے۔

قسیمؔ: نسیمؔ امروہوی کے صاحب زادہ قسیم ابن نسیم ۱۹۴۴ء میں خیالی گنج لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اب تک چار مرثیے کہہ چکے ہیں۔ ۱۹۷۲ء سے مرثیہ گوئی شروع کی ''اتحاد ملت'' کے نام سے ایک مرثیہ چھپ چکا ہے جس میں ابراہیم جلیس اور راقم الحروف (ہلال نقوی) کا مقدمہ شامل ہے (ناشر: سید علی سید امروہوی)۔

قطبؔ: قلی قطب شاہ گولکنڈہ کے چوتھے حکمراں ابراہیم قلی کا بیٹا اور جانشین تھا۔ اس کا دور ۱۵۸۰ء سے ۱۶۱۱ء تک کا ہے۔ قطب شاہ کی کلیات مجلس اشاعتِ دکنی مخطوطات حیدرآباد نے ۱۹۴۰ء میں شائع کی جس میں مرثیے بھی ملتے ہیں۔ یہ نہ صرف اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے بلکہ پہلا مرثیہ گو بھی ہے۔

قلقؔ: مولانا حکیم شیخ مولانا بخش قلقؔ میرٹھ کے رہنے والے تھے اور طب میں نقشبند خاں دہلوی کے شاگرد تھے۔ مومن خاں اور امام بخش صہبائی سے شعر و سخن میں استفادہ کیا۔ ۱۵/اگست ۱۸۸۳ء کو انتقال ہوا۔

قمرؔ: غزل کے مشہور شاعر، انھیں ''استاد کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ جلالی کے باشندہ تھے۔ انیسؔ کے انتقال سے دوسال قبل ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۸ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔ ان کے مرثیے بھی چھپ چکے ہیں۔

قیصرؔ: قیصر بارہوی مرثیہ کے مشہور شاعر ہیں۔ پنجاب کے شہروں اور دیہاتوں میں اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ مرثیہ پڑھتے ہیں۔ بقول خود انھیں کے اب تک ۷۵ کے قریب مرثیے کہہ چکے ہیں۔ انھوں نے امام حسینؑ کے علاوہ باقی ائمہؑ پر بھی مرثیے کہے ہیں۔ (افسوس کہ وہ بھی رخصت ہو چکے۔ ساحرؔ)

کاملؔ: نفیسؔ کے ہم عصروں میں مولوی سید علی میاں کاملؔ لکھنوی مشہور مرثیہ گو تھے، ۱۹۰۷ء میں وفات پائی۔ ''معیارِ کامل'' جلدِ اول ۱۹۵۱ء میں چھپ چکی ہے۔ اسے مہذبؔ لکھنوی صاحب نے مرتب کیا ہے۔

کرارؔ: ۱۹۱۱ء میں کرارؔ جون پوری کی ولادت ہوئی۔ ظریفانہ لٹریچر میں نئے نئے راستوں کے خالق ہیں۔ ''ہرثیہ'' کے باقاعدہ شاعر ہیں۔ مرثیے بھی کہتے ہیں۔ (افسوس کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ساحرؔ)

گداؔ: رجب علی بیگ سرور نے ''فسانہ عجائب'' میں جن شاعروں کا تذکرہ کیا ہے، ان میں گداؔ کا نام بھی ملتا ہے۔ اس نے باقاعدہ مرثیے کہے ہیں۔ اس کا سنہ ولادت ۱۷۴۵ء اور سنہ وفات ۱۸۱۶ء ہے۔

ماہرؔ: نواب مہدی حسین ماہرؔ کا تعلق خاندان اجتہاد سے تھا۔ ۱۹۱۰ء میں انتقال ہوا (یہ تاریخ غلط ہے۔ ان کا انتقال ۲۵ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں ہوا تھا۔ ساحرؔ)۔ کہا جاتا ہے کہ عزیزؔ لکھنوی کا قول تھا کہ ''اگر ماہرؔ کا کلام انیسؔ کے نام سے پیش کر دیا جائے تو پڑھنے والا غالباً مشکوک نہ ہوگا'' (مرثیہ بعدِ انیسؔ از ڈاکٹر صفدر، ص ۶۹)۔ فاخرؔ لکھنوی کے چچا بھی تھے اور استاد

بھی۔

محبؔ: راجہ صاحب محمود آباد محبوبؔ کے والد بھی محبؔ تخلص کرتے تھے۔ مہاراجہ محبؔ کا انتقال ۲۱ رمئی ۱۹۳۱ء کو ہوا۔ ان کے مرثیوں کا مجموعہ ''مراثئی محبؔ'' چھپ چکا ہے۔

محبوبؔ: راجہ صاحب محمود آباد، تخلص محبوبؔ غالباً گیارہ یا بارہ مرثیے کہے ہیں جن میں سے کئی چھپ چکے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں لندن میں انتقال ہوا۔ امام علی رضاؑ کے روضہ میں دفن ہیں۔

مسکینؔ: میر محمد مہدی دہلوی، مسکینؔ تخلص، عہد محمد شاہی کا مشہور مرثیہ گو ہے۔ اس کا زمانہ ۱۶۹۰ء سے ۱۷۶۵ء تک ہے۔ سودا نے مسکینؔ کو سر آمد مرثیہ گو لکھا ہے۔ درگاہ نے ''مرقعِ دہلی'' میں مسکینؔ کا تذکرہ بڑی اہمیت کے ساتھ کیا ہے۔

منظرؔ: منظر عظیمی، مرزا دبیر کے شاگرد، عظیم کے پوتے ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں ولادت ہوئی۔ ان کے مرثیے غیر مطبوعہ ہیں۔ منظر ان دنوں کراچی میں قیام پذیر ہیں۔ (افسوس کہ اب نہیں ہیں۔ ساحرؔ)

منظورؔ: ڈاکٹر سید منظور مہدی رائے پوری نسیمؔ امروہوی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۶۵ء میں ان کے مراثی کی جلد شائع ہو چکی ہے۔ سنہ وفات ۱۹۶۶ء ہے۔

مودبؔ: سلسلہ خاندان عشقؔ کے نامور مرثیہ گو۔ مودبؔ لکھنوی نے کئی مرثیے کہے ہیں لیکن تمام غیر مطبوعہ ہیں۔

مونسؔ: خلیقؔ کے صاحب زادہ اور میر انیسؔ کے بھائی، ۱۸۷۶ء میں انتقال ہوا۔ انہوں نے سلام بہت عمدہ کہے ہیں۔ شادؔ عظیم آبادی نے ان کی سلام نگاری پر پیغمبرانِ سخن میں اظہار خیال کیا ہے۔

مہذبؔ: مؤدبؔ لکھنوی کے بیٹے اور شاگرد۔ مرثیوں کی تین جلدیں چھپ چکی ہیں۔

ان دنوں لکھنو میں قیام ہے۔ آج کل ایک ضخیم لغت لکھنے میں مصروف ہیں جس کا نام مہذب اللغات ہے۔ (افسوس ہے کہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے۔ ساحرؔ)

میرؔ: میر تقی میرؔ ۱۱۳۶ھ میں آگرہ میں پیدا ہوئے، ۱۲۲۵ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ اردو غزل کے نامور شاعر ہیں۔ پانچ دیوان غزلیات کے ہیں اور چھٹا دیوان مرثیوں کا ہے۔

نانکؔ: نانک چند نانک مذہباً ہندو تھے۔ نظامی پریس نے ان کے دو مرثیے شائع کئے ہیں پیارے صاحب رشید کے شاگرد تھے۔

نجمؔ: نوحے اور سلام کو نئے تیور دینے میں نجم آفندی کا مقام بہت بلند ہے۔ انھوں نے دو مرثیے ''معراج فکر'' اور ''فتح مبین'' کہے ہیں۔ ۱۸۹۳ء میں ولادت ہوئی اور ۱۹۷۵ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ نجم آفندی کی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں پر بزم نجم آفندی نے ۱۹۷۷ء میں کراچی میں ایک شاہکار ضخیم مجلہ ''النجم'' شائع کیا ہے۔

ندیمؔ: حکیم ندیم لکھنؤ کے باشندہ تھے۔ چند سال پیشتر کراچی میں انتقال ہوا۔

نسیمؔ: ۱۹۰۸ء میں امروہہ میں ولادت ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ اب تک ۱۷۶ مرثیے کہہ چکے ہیں۔ ان کے کئی شاگردوں کے مرثیوں کی جلدیں چھپ چکی ہیں فاضل لکھنوی نے آپ کو جدید مرثیہ کا سربراہ کہا ہے۔ (''نفس مطمئن'')۔ کراچی میں مقیم ہیں اور ۱۹۶۱ء سے مرکزی حکومت کے عظیم منصوبہ کے مطابق اردو ڈکشنری ۱۳ جلدوں میں مرتب کر رہے ہیں جس کا نام ''تاریخی اردو لغت'' ہے۔ (افسوس کہ وہ بھی رحلت کر چکے۔ ساحرؔ)

نسیمؔ: نسیم پھپھرسری داغ کے شاگرد تھے۔ ریاست الور میں مشہور پھپھرسری سادات کے فرد تھے۔ کئی مرثیے تصنیف کئے جو بہت مقبول ہوئے۔ جس علاقہ کے وہ باشندہ ہیں، اس علاقہ میں ان جیسا مرثیہ گو شاید ہی پیدا ہوا ہو۔ غزل بھی خوب کہتے تھے۔

نظرؔ: نظر جعفری رام پور میں پیدا ہوئے اور رہنے والے میمن ضلع بجنور کے ہیں۔

سنہ ولادت ۱۹۳۵ء ہے۔ غالباً تین مرثیے کہے ہیں۔ غزل، نعت، سلام اور منقبت کے بھی مشہور شاعر ہیں۔ (افسوس کہ اب نہیں ہیں۔ساحرؔ)

نفیسؔ: ۱۸۱۶ء میں پیدا اور ۱۹۰۱ء میں انتقال ہوا۔ انیسؔ کے سب سے بڑے صاحب زادہ تھے۔انیسؔ کی اولاد میں انھیں سب سے بہتر مرثیہ گو قرار دیا جاتا ہے۔

نفیسؔ: ۱۹۱۰ء میں فتح پور ہسوہ میں نفیس کی ولادت ہوئی۔ ان کے مرثیوں کی جلد ''افکار نفیسؔ'' ۱۹۷۷ء میں شائع ہو چکی ہے۔

نوریؔ: کرار نوری ریڈیو پاکستان کراچی سے منسلک ہیں، اصل وطن دلی ہے بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ مرثیے بھی کہے ہیں لیکن یہ سلسلہ اب ختم ہو چکا ہے۔ (وہ بھی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ساحرؔ)

نیرؔ: مقبول حسین نیر کراچی میں قیام پذیر ہیں۔ کافی تعداد میں مرثیے کہے ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ (افسوس کہ وہ بھی رخصت ہو چکے۔ساحر)

وحشیؔ: ڈاکٹر تھونی لال دھون وحشی مظفر نگری پی ایچ۔ ڈی آج کل پٹنہ میں مقیم ہیں۔ جمیل مظہری کے شاگرد ہیں۔ (وہ پی ایچ ڈی نہیں تھے۔ساحرؔ)

وحیدؔ: سید محمد ہادی وحید، میر مہر علی انسؔ کے صاحب زادے اور انیسؔ کے بھتیجے تھے۔ ۱۸۳۲ء میں ان کی ولادت ہوئی اور ۵۴ سال کی عمر میں ۱۸۸۶ء میں انتقال ہوا۔

وحیدؔ: مشہور ادیب و نقاد وحید اختر نصیر آبادی علی گڑھ یونیورسٹی میں صدرِ شعبہ فلسفہ ہیں۔ انھوں نے جدید رنگ کے چند مرثیے لکھے ہیں۔

وصیؔ: سید آل رضا کے شاگرد تھے۔ فیض آباد سے تعلق تھا۔ ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ جناب آلِ رضا نے اپنے ایک خط میں، جو میرے نام ہے، اپنے چار شاگردوں، وصیؔ فیض آبادی، عزمؔ جون پوری، وحید الحسن ہاشمی اور ظفرؔ جون پوری کا ذکر کیا ہے۔ اس خط میں جناب آلِ رضا نے

وصی فیض آبادی کی صلاحیتوں کو سراہا ہے۔ آلِ رضا کا یہ خط میری کتاب ''جدید مرثیہ کے تین معمار ''میں شائع ہو گیا ہے۔

ہاشمی: وحید الحسن ہاشمی درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ ۱۵ر ستمبر ۱۹۲۸ء میں محلہ میرانی بازار جون پور میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں مقیم ہیں۔ دو تین مرثیے چھپ چکے ہیں۔ آلِ رضا نے انہیں ایک خط میں اپنا شاگرد لکھا ہے۔

ہلال: ۱۸ر مارچ ۱۹۴۸ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ جوش نے انھیں اپنا واحد شاگرد لکھا ہے۔ نسیم امروہوی کے تلامذہ میں اب نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ''جدید مرثیہ'' پر جامعہ کراچی سے پی ایچ۔ڈی کر رہے ہیں۔ تین مرثیے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں انقلاب کا لب ولہجہ ہے جس سے ان کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے (ساحر لکھنوی)۔ (اب وہ پی ایچ۔ڈی کر چکے ہیں۔ ساحر)

ہنر: سید لائق علی، ہنر ۱۲ر اگست ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ خبیر کے شاگرد ہیں۔ مرثیے غیر مطبوعہ ہیں، البتہ نوحوں کی دو بیاضیں ''حسینؑ حسنؑ'' اور ''شکوہ غم'' طبع ہو چکی ہیں۔ (افسوس کہ وہ بھی رحلت کر چکے ہیں۔ ساحر

یاور: ڈاکٹر یاور عباس ۱۹۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں مرثیہ کی مجالس کے انعقاد اور اس کے اہتمام وانتظام میں انھوں نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ''۱۹۶۲ء کے چند جدید مرثیے'' میں ان کا مرثیہ شائع ہو چکا ہے۔ ہر سال اپنے مکان پر مرثیہ پیش کرتے ہیں۔ (افسوس ان کے لئے بھی کہ اب وہ بھی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ساحر)

یاور: یاور اعظمی، نسیم امروہوی کے شاگرد ہیں۔ یکم مئی ۱۹۱۲ء کو موضع بہاء الدین پور کندھیا ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ مراثئ یاور ''۱۹۷۷ء میں چھپ چکی ہے، اس

میں چھ مرثیے ہیں۔

❁❁❁

نوٹ: یہ تعارف ہلال نقوی صاحب نے تقریباً چوبیس برس پہلے لکھا تھا جب اس مرثیہ میں مذکور بہت سے مرثیہ گو زندہ تھے مگر اب رخصت ہو چکے ہیں۔ اس لئے میں نے ان کے ناموں کے آگے ان کی وفات کے بارے میں لکھ دیا ہے۔ ساحرؔ

ماخوذ از احساس غم مجموعہ مراثی، مصنفہ ساحرؔ اجتہادی، پاکستان ص ۳۶۹ تا ۳۸۸

❁❁❁